

لايموت فير او لايحيى!

جہاں نہ انہیں موت آئے گی اور نہ وہ زندگی جنیں گے

# راشد شاز



# لايموت

ايک خودنوشت



Rs 450.00



**Milli Publications**  
New Delhi



لايموت محض ایک خودنوشت نہیں گو کہ اسے اس پیرائے میں لکھنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔ اس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے آپ کو بہت سی مانوس آوازیں سنائی دیں گی اور بسا اوقات تو ایسا لگے گا کہ آپ کا ان کرداروں سے جنم جنم کا رشتہ ہو۔ دبی کچلی آوازیں، کٹے پھٹے لوگ، مسخ شدہ زندہ لاشے جن سے زندگی کی رمت چھین لی گئی ہو۔ ان ستم نصیبوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے ساتھ دراصل ہوا کیا ہے۔ اہل یہود اپنے اوپر گزرنے والے سانچے کو ہولوکاسٹ سے موسوم کرتے ہیں اور فلسطینیوں نے اپنے قومی سانچے کو، جس نے ان کی معمول کی زندگی کو گذشتہ پچھتر برسوں سے تہہ و بالا کر رکھا ہے، نکتہ کا نام دے رکھا ہے جس کی یاد میں وہ ہر سال یوم نکتہ مناتے ہیں۔ البتہ غم کے مارے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ سہولت بھی حاصل نہیں کہ وہ اس وقوعہ عظیمی کو جو ان کے ساتھ پیش آیا ہے کوئی ڈھنگ کا نام ہی دے سکیں۔

کہنے کو تو یہ ایک شخص کی داستانِ حیات ہے مگر ان اوراق میں ہندوستانی مسلمانوں کے حقیقی شب و روز کچھ اس طرح رقم ہوتے چلے گئے ہیں کہ قاری ہر صفحے پر رک کر سوچتا ہے کہ اسے واقعات و حوادث کی اس ترتیب میں اس کے اندر پوشیدہ معانی کا علم اب تک کیوں کر نہ ہو سکا۔

بہتوں کے لئے یہ کتاب چشم کشا ثابت ہوگی۔ البتہ اس بیانیے کا ایک فطری نقص یہ ہے کہ یہ قصہ جائگاہ بھی اپنی تمام تر محشر بیانیوں کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کے اس حادثہ عظیمی کو کوئی نام دینے میں ناکام نظر آتا ہے۔ کیا عجب کہ یہی اس کی خوبی بھی ہو کہ جب تک غیر معمولی واقعات و حوادث کے بیان کے لئے ایک نئی اور مناسب لغت موجود نہ ہو لکھنے والا اسے گرفت میں لائے تو کیسے؟



راشد شاز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مرکز فروغِ تعلیم و ثقافت مسلمانانِ ہند میں پروفیسر اور نئی دہلی میں واقع غیر منفعتی ادارہ پیس انڈیا انٹرنیشنل کے سربراہ ہیں۔ مختلف اقوام و ملل کے مابین افہام و تفہیم کی کوششوں کو فروغ دینے کے لئے عالمی ادارہ ایسیسکو نے انہیں اپنا سفیر بھی متعین کر رکھا ہے۔

فاضل مصنفِ فکرِ اسلامی پر اپنی فکر انگیز تحریروں کے حوالے سے دنیا بھر میں جانے جاتے ہیں۔ ایک عرصے سے مختلف زبانوں میں ان کی کتابوں کے ترجمے عالمِ عرب اور عالمِ غرب کے شہروں سے شائع ہوتے رہے ہیں۔

اپنی پہلی باضابطہ تصنیف 'غلبہ اسلام: ہندوستان میں احیائے اسلام کا منشور' (۱۹۸۷ء) کی اشاعت سے لے کر اب تک وہ حالات میں خوشگوار تبدیلی کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ مارچ ۱۹۹۱ء میں انہوں نے نئی دہلی میں ہندوستانی مسلمانوں کا پہلا ملک گیر کنونشن منعقد کیا۔ ۱۹۹۳ء میں ملی پارلیامنٹ کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا جس کے ملک گیر اجلاس سے سال ۲۰۰۰ء تک ملک کی فضا گونجتی رہی۔ ۱۹۹۴ء میں ہفت روزہ ملی ٹائمز کے اجراء اور سال ۲۰۰۱ء میں اس کی اشاعت موقوف ہونے تک آپ اس کی سرپرستی کرتے رہے۔ ۲۰۰۴ء میں فکرِ اسلامی کی ترویج و اشاعت کے خیال سے اردو، انگریزی اور عربی میں بیک وقت ایک نئے الیکٹرونک مجلے فیوچر اسلام کی اشاعت عمل میں لائی گئی جس کے زیر اہتمام ۲۰۰۵ء میں لندن میں ایک کانفرنس بھی منعقد کی گئی۔ ۲۰۱۳ء میں برج کورس (برائے فارغین دینی مدارس) کے تعلیمی تجربے کے لئے مسلم یونیورسٹی نے انہیں پروفیسر شپ کی پیشکش کی جسے آپ نے قبول کر لیا۔

ایک نئی پرامن دنیا کے قیام کے لئے آپ مختلف بین الاقوامی فورمز پر بھی متحرک رہے ہیں اور اس سلسلے میں آپ نے دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر کیا ہے۔

لايموت



# لا بموت

ایک خودنوشت

لا بموت فیرا ولا یحییٰ  
جہاں نہ انہیں موت آئے گی اور نہ وہ زندگی جنیں گے

راشد شاز

ملی پبلی کیشنز، نئی دہلی - ۲۵

سال اشاعت ۲۰۲۱ء  
© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

*La Yamoot: A Memoir*  
by  
Rashid Shaz

ISBN: 978-93-81461-30-3

نام کتاب : لایموت: ایک خودنوشت  
مصنف : راشد شاز  
اشاعت : ستمبر ۲۰۲۱ء  
قیمت : ۲۵۰ روپے  
مطبع : گلورس آفسیٹ، نئی دہلی-۲

ناشر

ملی سپلی کیشنز

ملی ٹائمز بلڈنگ ابو الفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

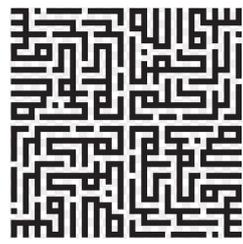
Tel: +91-11-26945499

Fax: +91-571-2400182

Email: millitimes@gmail.com

Mobile/ Whatsapp: +91 7017615883

www.millipublications.com





بارالہا!

تیرے مدح خانے میں میرے یقین کی کشتی ہچکولے لکھا رہی ہے۔  
تو کنزاً مخفیا تھا، مگر جب سے تیرا نظہور ہوا ہمارے حالات دگرگوں ہیں۔  
کمزور دبا لئے گئے، نقص من الاموال والنجوع کی باتیں اب ہمیں تسلی نہیں دیتیں۔  
کسی نے نازی تعذیب گاہ کی دیوار پر یہ کیا لکھ دیا:  
'اگر کوئی خدا ہے تو اسے ایک دن مجھ سے اس بات کے لئے معافی مانگنی پڑے گی جو مجھ پر گذر رہی  
ہے۔ آخر کس جرم کی پاداش میں؟'  
تنگ آمد جنگ آمد! یعقوب نے تجھ سے دودو ہاتھ کیے  
مگر ہم تو تیرے آخری علمبردار ٹھہرے، ہمارے حق میں بھی تو بروٹس بنا پھرتا ہے؟  
ہم نہ رہے تو تیری ربوبیت کا علم کون اٹھائے گا؟  
تو کہتا ہے ہم امتِ مختار ہیں، واقعی! لطیف طنز میں تیرا کوئی ثانی نہیں۔  
بہت ہو چکا اب ہمیں بخش دے، کارِ پیبری کسی اور کو تفویض کر  
یار قیب بالعباد! اب بس کر۔

## فہرست

۱۱	خالم حنول	۱
۲۲	ایں ہم برسر علم	۲
۳۲	معراج والی مسجد	۳
۳۸	یہ وہ سحر تو نہیں	۴
۴۵	علامہ خورش	۵
۵۵	دوسری ہجرت	۶
۶۱	جشن سیمیں	۷
۶۶	لکھنؤ والے ڈاکٹر صاحب	۸
۷۴	ما تعبدون من بعدی	۹
۸۳	سنگینوں کا پہرہ	۱۰
۹۲	بے مزہ آزادی	۱۱
۱۰۱	کہ سالک بے خبر	۱۲
۱۱۶	روح کا زخم	۱۳
۱۲۲	ترکمان گیٹ	۱۴
۱۳۰	ایک عظیم الشان اجلاس	۱۵
۱۴۱	ملا شدن چہ آسان	۱۶
۱۴۸	خوزریز ہنگامے	۱۷
۱۵۴	شیخ علی گڑھ کی مجلس میں	۱۸
۱۵۹	عقوبت گاہ کا 'مسلمان'	۱۹
۱۶۵	مولوی کا پو	۲۰

۱۷۰	دستوری تحفظات	۲۱
۱۷۷	سہ ماہی تجدید	۲۲
۱۸۴	چوہے، دیمک اور مسلمان	۲۳
۱۹۷	سرخ جال	۲۴
۲۰۳	معرکہ کفر و اسلام	۲۵
۲۰۷	شناخت بالجبر	۲۶
۲۱۳	بہتر کھانوں کا دسترخوان	۲۷
۲۲۴	شامِ غریباں	۲۸
۲۳۰	علی گڑھ میگزین	۲۹
۲۳۴	نیلی	۳۰
۲۴۵	یرغمال قیادت	۳۱
۲۵۶	رہ نورِ دِشوق	۳۲
۲۶۰	ت سے تفنگ	۳۳
۲۷۰	بیگو اچورہ	۳۴
۲۷۶	مسکین اقلیت	۳۵
۲۸۷	متاع بالمعروف	۳۶
۲۹۲	شیوہکتی کا جاپ	۳۷
۳۰۱	بولتی عمارتیں	۳۸
۳۱۱	بے نام حادثہ	۳۹
۳۱۴	خفیہ سرکلر	۴۰
۳۱۸	آتشِ نمرود	۴۱
۳۲۷	مولانا سبحانی	۴۲
۳۳۲	سرزمینِ دلی کی	۴۳
۳۳۸	بریف کیس داعی	۴۴
۳۴۷	گولامی کا بوجھا	۴۵

فہرست

۹

۳۵۸

۴۶ گر بھیم نہیں ہوتے

۳۶۶

۴۷ خدا کو معافی

۳۷۱

۴۸ قدسیوں کا جلوس

۳۸۲

۴۹ کریٹھال ناخت

۳۹۱

۵۰ حبّ کلام

۳۹۷

۵۱ گول کونے

۴۰۵

۵۲ جرأت کفر

۴۰۸

۵۳ تیسری ہجرت

۴۱۴

۵۴ Gasping for breath

۴۱۷

اشاریہ



شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست  
بایں خاک آفتابے را گزر نیست  
بما کن گوشہ چشمے کہ در شرق  
مسلمانے زما بیچارہ تر نیست

ہندی غلاموں کی شب کی کوئی سحر نہیں۔ اس مٹی میں سورج کا گزر نہیں۔ ہماری طرف نگاہ  
کرم کریں کہ مشرق میں ہندوستان کے غلام مسلمانوں سے زیادہ کوئی بے بس و بیچارہ نہیں۔

# ۱ خالم مخول

ایک دن والد مرحوم خواب میں نظر آئے۔ صدر دروازے کے باہر، جہاں وہ اکثر مجھے بیرونی اسفار کے لیے خیر باد کہتے، ان کے ہاتھ میں قرآن مجید کا وہی نسخہ تھا جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے۔ چہرے پر طمانیت اور مسرت کی غیر معمولی کیفیت، ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی گلابی جاڑے کی صبح چہل قدمی کے لیے نکلے ہوں۔ کہنے لگے تم کیوں نہیں لکھتے، داستان کا اگلا حصہ تو تمہیں ہی لکھنا تھا۔

ابا کے ہاتھ میں قرآن مجید کا وہ نسخہ جسے عرف عام میں حائل شریف کہا جاتا ہے، آج عرصہ بعد دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ ایمر جنسی کے ایام میں ظالموں نے انہیں اس نسخہ سے محروم کر دیا تھا۔ دنیا کے مختلف اطراف و اکناف کی سیر کرتے ہوئے جب بھی قرآن مجید کے کسی خوبصورت نسخے پر میری نظر پڑتی، میں اسے ان کے لیے بہترین تحفہ سمجھتا۔ ایک بار استنبول سے بڑی تقطیع کا روشن نسخہ ان کے لیے خاص طور پر لے کر آیا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا، بہت خوش ہوئے اور پھر خاموش خلا میں گھورنے لگے جیسے وہ اپنے بچپن کا حائل شریف تلاش کر رہے ہوں، جس کا ایک ایک صفحہ ان کے حافظے پر ہمیشہ ہمیش کے لیے مرتسم ہو کر رہ گیا تھا۔ قرآن مجید انہوں نے بالالتزام ہم سب بھائیوں کو خود پڑھایا۔ اس اہم فریضے کو انہوں نے کسی اتالیق کے سپرد کرنا کبھی مناسب نہ جانا۔ اور پھر اس کے مطالب و معانی پر بحث، ننھے دل و دماغ میں بڑے خیالات کی آبیاری، نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا، جیسی کہ وہ تھی بچپن سے ہی مختلف دکھائی دینے لگی۔ مگر یہ سب کچھ ایک ہلا مارنے والی دلخراش داستان تھی جس کے بیان کے لیے ایک نئی لغت کی ضرورت تھی۔ اس لغت کی تلاش میں، میں نے دنیا کے مختلف ملکوں کی خاک چھانی۔ ان اقوام و ملل کی تاریخ اور ان سے تعامل کی بھی کوشش کی جن پر گذشتہ صدیوں میں مصائب و آلام کے غیر معمولی حوادث پیش آئے ہیں۔ مسلم اسپین کے موریکو مسلمانوں کو اپنے دین کے تحفظ کے لیے جن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا، کولمبس کی نئی دنیا میں مقامی آبادی اور سیاہ فام افریقی غلاموں پر جو قیامت گزری، نازی جرمنی میں اہل یہود کے تعذیبی کیپ اور کمیونسٹ روس میں گلاگ آرکی پیلے گو کی دلخراش داستانوں میں ایک ایسے اسلوب کی تلاش میں سرگرداں رہا جو میرے ذاتی

کرب اور ملٹی محرومیوں کو بیان کرنے میں کسی قدر مدد و معاون ہو سکے۔ برسہا برس کی اس تلاش و جستجو کے دوران مجھ پر ایک وارفتگی کی کیفیت طاری رہی۔ ایام طالب علمی کا واقعہ ہے۔ ایک دن لندن میں بس کی بالائی منزل پر سوار تھا کہ اچانک ورجن میگا اسٹور پر نظر پڑ گئی۔ خیال آیا کہ شاید گوہر مقصود یہاں ہاتھ آئے۔ کرب و اندوہ کی ویڈیو یہاں کچھ زیادہ تو نہ ملی البتہ ایک مغنیہ انقلاب کے توسط سے ایک ریڈیکل بک شاپ تک رسائی ضرور ہو گئی، جہاں انقلابی لٹریچر، شعلہ بار خطیبوں کے کیسٹ اور مختلف اقوام و ملل پر ہونے والے مظالم کی ڈاکیومنٹری حتیٰ کہ اہل یہود پر گزرے مظالم کی فچر فلمیں بھی وافر تعداد میں دستیاب تھیں۔ ایک نئی لغت کی تلاش میں، میں نے ان تمام عجائب گھروں کو بھی چھان مارا جن کی زیارت سے عام انسانوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن تب بھی مجھے اس لغت کی تلاش میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

بات یہ ہے کہ یہودیوں کا ہولوکاسٹ، سیاہ فام غلاموں کا ڈی ہیومنائزیشن، نوآبادیاتی استعمار کے ہاتھوں مقامی آبادی کی نسل کشی جیسے واقعات کا تعلق ایک محسوس عمل سے تھا۔ لوگوں کے لیے ان مظالم سے آگہی کچھ زیادہ مشکل نہ تھی، لیکن آزاد ہندوستان میں مسلمانوں پر جو گزر رہی تھی اس کا حقیقی احساس و ادراک ہمارے کبار زعماء کو بھی کم ہی تھا۔ ان کا جسم تو جیل کی سلاخوں سے باہر تھا، لیکن ان کے دل و دماغ میں آہنی سلاخیں کچھ اس انداز سے اُگ آئی تھیں کہ اب ان کے لیے خود اپنی حقیقی قدر و قیمت کا ادراک مشکل ہو کر رہ گیا تھا۔ بظاہر ان کے پیر زنجیروں سے آزاد تھے، لیکن فی الواقع انھیں اپنی زنجیروں سے پیار تھا۔ وہ ایک مجبور و بے بس اور متہورا اقلیت میں تبدیل ہو چکے تھے اور انھیں اپنی اسی حیثیت کے برقرار رکھنے پر اصرار بھی تھا۔ ایک دن اپنے مشفق استاذ سیدی وقار حسین صاحب مرحوم کی مجلس میں بیٹھا تھا، کہنے لگے: ہمارے ہاں یہ جو تعذیب کا انداز ہے، شکست و ریخت کا داخلی عمل ہے، اس پر خود تعذیب کے ماروں کو بھی پتا نہیں چلتا کہ ان کے ساتھ ہو کیا رہا ہے، پھر بھلا دوسروں کو اس حادثہ فاجعہ کی اطلاع کیسے ہو۔



بچپن کی دھندلی یادوں میں بعض کرداروں کی سرّیت بہت بعد تک ایک معمہ بنی رہی۔ ان کا اصل نام تو کسی کو پتا نہ تھا۔ لوگ انھیں عرف عام میں پروفیسر کہتے۔ سیاہ اچکن میں ملبوس سر پر سیاہ ٹوپی، ہاتھ میں سفید موتیوں والی خوبصورت تسبیح اور جیب سے لنگتی ہوئی گھڑی کی سنہری چین، ان کے سچ جھج میں اضافہ کرتی۔ ایک چھوٹی سی ڈائری یا بیاض اپنے پاس رکھتے اور اکثر اس میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ پروفیسر کا کوئی گھر تھا اور نہ کوئی رشتہ دار، بال بچے تھے اور نہ خاندان۔ کسی کو پتا نہ تھا کہ یہ آتے کہاں سے ہیں اور جاتے کہاں ہیں۔ ان کی چلت پھرت میں ایک بے نیازانہ شان تھی۔ بولتے کم اور سوچتے زیادہ تھے اور پھر نہ

جانے کیا اپنی ڈائری میں کچھ لکھتے جاتے۔ لوگ ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کہتے۔ کوئی انھیں مجذوب اور دیوانہ گردانتا اور بعضوں کے نزدیک کثرت علم و دانش کے ہاتھوں ان کی شخصیت مجروح ہو گئی تھی۔ باتوں باتوں میں فرماتے: افغان خفی مخول است۔ شدت جذب میں خالمخول کی گردان کرتے اور جب کچھ نہ بن پڑتا تو انگریزی زبان میں جارج پنجم کو لکھے گئے اپنے مکتوب کے پیرا گراف کے پیرا گراف ان کی زبان پر آجاتے۔ یہ بات بہت بعد میں پتا چلی کہ پروفیسر ایک تعلقہ دار خاندان کے چشم و چراغ تھے جنھوں نے اعلیٰ تعلیم سے سرفراز ہو کر لاہور کی ایک سرکاری دانش گاہ میں ابھی اپنی عملی زندگی کا آغاز ہی کیا تھا کہ تقسیم کا سانحہ پیش آ گیا۔ کئی سال کی کشمکش کے بعد بالآخر وطن کی خوشبو انھیں ہندوستان لے آئی، لیکن یہاں ان پر جو قیامت گزری اس نے ان کے وجود کو اندر سے منہدم کر دیا۔ وہ عالم جذب میں اب دنیا کو تکا کرتے۔ آزاد ہندوستان میں ان کے لیے اب کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن جب وہ ہمارے گھر آتے، بزبان خود اپنی دعوت کا اعلان کر دیتے۔ ایسا صرف ہمارے ہاں نہ ہوتا بلکہ اکثر گھروں میں ان کی دعوت کے انعقاد کا یہی انداز تھا۔ ایک دن کھانے سے فراغت کے بعد جب ان پر وارفتگی کا عالم طاری تھا اور وہ فارسی کا کوئی مصرعہ گنگنارہے تھے، میں نے ان کے اس خوشگوار موڈ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے پوچھا: یہ آپ اپنی بیاض میں کیا لکھتے رہتے ہیں؟ کہنے لگے تمہیں پتا نہیں، دراصل میں خط لکھنے کا عادی ہوں، چھوٹے چھوٹے پیغامات لکھتا ہوں۔ کسے لکھتے ہیں اتنے سارے خط آپ؟ یہ سن کر زریب مسکرائے، اپنی جیب سے چھوٹے چھوٹے کئی لفافے نکالے جن پر لکھا تھا، مستقبل کے نام۔ مگر مستقبل تو کوئی شخص نہ ہوا، پھر آپ کے یہ خطوط ڈاکیہ کسے دے گا؟ یہ سن کر اچانک ایسا لگا جیسے انھیں کوئی صدمہ پہنچا ہو، وہ مہبوت ہو گئے ہوں۔ ان پر حزن و یاس کی وہی پرانی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ پھر سے دور خلا میں گھورنے لگے۔

پروفیسر جب بھی آتے ایک نئے مژدہ یا ایک نئی وعید کی اطلاع دیتے۔ کبھی کہتے سبز گنبد سے ندا آرہی ہے، بہت جلد اہل ایمان کو فتح نصیب ہوگی۔ کبھی کہتے اہل یہود کو عنقریب تابوت سیکندہ ملنے والا ہے، ہم ایک مملحہ کبریٰ کے قریب آ پہنچے ہیں۔ کبھی فرماتے مزامیر داؤد اب مغرب کو منتقل ہو گیا ہے، اب مشرق میں کچھ نہیں رکھا۔ سننے والے کہتے: لگتا ہے پروفیسر نے آج کوئی نیا خواب دیکھا ہے، مگر وہ ان باتوں سے بے پروا اپنی بیاض میں بڑی سرعت کے ساتھ کچھ لکھتے جاتے۔ ایک دن جو قریب سے دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پورے صفحہ پر بار بار یہی دو الفاظ لکھے گئے تھے: خالمخول خالمخول خالمخول.....

پروفیسر کی سیاہ اچکن ہم بچوں کے لیے خاصی دلچسپی کی چیز تھی۔ اس اچکن میں نہ جانے کتنی حبیبیں تھیں اور ہر جیب میں ایک الگ دنیا آباد تھی۔ کسی جیب میں بیاض اور قلم رکھا ہے تو کہیں جیبی گھڑی لٹک رہی

ہے۔ کہیں تہہ بہ تہہ کا غذات ہیں تو کہیں تازہ بہ تازہ لکھے گئے خطوط اور کہیں ضرورت کی مختلف چیزیں۔ گویا اچکن نہ ہو پورا سفری خیمہ ہو، جسے پروفیسر ہمہ وقت اپنے ساتھ لیے چلتے۔ گرمی کے موسم میں یہ اسے خاص انداز سے موڑ کر اپنے شانوں پر آویزاں کر لیتے۔ فرشی مجلسوں اور خاص طور پر کھانا کھاتے ہوئے وہ اسے اپنے پاس ہی نگاہوں کے سامنے رکھتے، لیکن اٹھتے ہوئے ایک ندائے وحشت بلند کرتے: ہائے میری اچکن، کہاں گئی میری اچکن۔ حالانکہ وہ سامنے ہی پڑی ہوتی اور انہیں نظر نہ آتی۔ کبھی کبھی تو خوب واویلا کرتے۔ لوگ ان کی اچکن اٹھا کر ان کی گود میں رکھ دیتے، پھر وہ اچکن کی جیبوں کو ٹٹولتے، تب انہیں یقین آتا کہ ان کی اچکن انہیں دوبارہ مل گئی ہے۔ ویسے تو وہ اخبار کی باریک تحریریں بھی پڑھ لیتے لیکن نہ جانے اچانک ان کے ساتھ کیا ہوتا کہ وہ شور مچاتے کہ ارے کہاں گئی میری بصارت، مجھے کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ کبھی کبھی لنگڑاتے ہوئے چلتے اور یہ کیفیت ان پر کئی دنوں تک طاری رہتی، حالانکہ ان کی دونوں ٹانگیں سلامت تھیں۔ چلتے چلتے اچانک دائیں طرف کچھ اس طرح جھک جاتے گویا کسی گولہ باری کا شکار ہونے سے بچ رہے ہوں۔ کبھی ہم کلامی کچھ اس انداز سے کرتے جیسے جنوں کی مجلس میں بیٹھے ہوں اور بیک وقت کئی لوگوں کو الگ الگ جواب دے رہے ہوں۔ کبھی اچانک اٹھ کھڑے ہوتے، کہتے چلیے چلیے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ حالانکہ ان کے ساتھ کوئی نہیں ہوتا۔ بچے ان ہی حرکتوں کے سبب ان سے تفرقہ لیتے اور بڑی عمر کے سنجیدہ لوگ انہیں مجزوب سمجھتے۔ ایک دن میں نے والد صاحب سے پوچھا: یہ پروفیسر صاحب اس طرح کی حرکتیں کیوں کرتے ہیں؟ اپنی اچکن کو خود ہی گم کرتے ہیں، حالانکہ وہ سامنے پڑی ہوتی ہے، ڈائری میں خالم مخلول لکھتے ہیں اور اچھے بھلے چلتے چلتے اچانک لنگڑانے لگتے ہیں۔ بولے: بیٹا حالات کا مارا ہے، آگ و خون کے دریا سے گزرا ہے، تعذیب کے سفر میں اپنے آپ کو بحال نہ رکھ پایا، ہر شخص میں غم سہارنے کی قوت نہیں ہوتی، اس کے اندرون میں کوئی کاری زخم لگا ہے، زخمی روح اسے بے چین کیے رکھتی ہے، اللہ اس پر اپنا فضل کرے اور ایسی آزمائش سے دوسروں کو محفوظ رکھے۔

بچپن کی یادوں میں پروفیسر تنہا ایسے کردار نہیں جو حالات کی فتنہ انگیزیوں کے سبب اپنا آپ برقرار نہیں رکھ پائے تھے۔ مجذوبوں اور دیوانوں کی ایک کہکشاں تھی جو والد صاحب سے ہمدردی کے دو بول سننے اور حسن سلوک کی توقع میں ان کے گرد جمع رہتی۔ ایک صاحب تھے بوٹل میاں، ان کی عمر ایک سو چار سال بتائی جاتی۔ کمر خمیدہ ہو کر کمان بن گئی تھی، لاٹھی ٹیکتے ہوئے چلتے۔ آواز میں وہی ترنگ، جذبہ جہاد سے سرشار، اکل حلال کی تلاش میں سرگرداں۔ اس عمر میں بھی وہ مسجد کے سامنے کتابوں کا اٹھال لگاتے اور اپنی محنت سے اپنا رزق حاصل کرتے۔ خمیدہ کمری کے باوجود ان کے کندھے سے ہمیشہ ایک تھیلا لٹکتا رہتا جس

میں دینی کتابیں اور سپارے وغیرہ ہوتے، گویا یہ ان کی چلتی پھرتی دکان تھی۔ اکل حلال کے ساتھ ساتھ تبلیغ و اصلاح کا کام بھی جاری رہتا۔ معاملات میں انتہائی کھرے، چھوٹوں پر شفیق اور جود و سخا میں اوروں سے بڑھ کر لیکن کیا مجال کہ ان کے سامنے کوئی اجلی پیاز کا تذکرہ کر دے۔ اجلی پیاز کا نام سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ جاتے۔ ایک دن کسی کے کہنے پر میں نے اپنی معصومیت میں ان سے پوچھ لیا: بڑے میاں! کیا آپ کے پاس اجلی پیاز ہے؟ بس نہ پوچھئے ایک قیامت گزر گئی۔ میں نے اتنے کریم اور شفیق بزرگ کو اچانک اس طرح رخ بدلتے نہ دیکھا تھا، میں رونے لگا۔ بعد میں پتہ چلا کہ بڑے میاں تحریک خلافت کے ہراول دستہ میں رہے ہیں۔ محمد علی اور شوکت علی کی تحریک میں انھوں نے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا تھا۔ یہ کیفیت کچھ اس طرح ان کی شخصیت کا حصہ بنی کہ وہ آج بھی اسی طرح اپنا عصا اٹھا کر نعرہ تکبیر بلند کرتے، گویا ابھی ابھی محمد علی کے جلسہ خلافت سے واپس آرہے ہوں۔ ایک عرصہ گزرا، حالات بدل گئے، خلافت ختم ہوئی، ملک تقسیم سے دوچار ہوا، لیکن بڑے میاں پر مجاہدانہ جذب کی وہی کیفیت طاری رہی۔ اب اگر انھیں کوئی خمیدہ کمری کا حوالہ دیتا اور اجلی پیاز کے استعارے سے ان کی کبر سنی پر طنز کرتا تو وہ اسے اپنے جذبہ ایمانی کی نفی سمجھتے۔

ایک صاحب تھے منشی ایوب، ان کا تعلق جنوبی ہند کی کسی ریاست سے تھا۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں ہمارے پڑوس میں آ کر بس گئے تھے۔ غالباً ان کے آگے پیچھے بھی کوئی نہ تھا۔ یہ صاحب تنہا ایک بڑے مکان میں رہتے تھے۔ ان کی شیریں مقالی کی یاد آج بھی میرے کانوں میں رس گھولتی ہے۔ فنا ان کا خاص موضوع تھا۔ وہ موت کا بیان کچھ اس دلچسپی اور رنگ آمیزی کے ساتھ کرتے کہ زندگی کے مقابلہ میں موت ایک بہتر متبادل معلوم ہونے لگتی۔ اس وقت تو یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ منشی ایوب اپنی ہر گفتگو میں موت کی کیفیت کا بیان کیوں لے بیٹھتے ہیں، بعد میں پتہ چلا کہ ایام شباب میں وہ اسلامی ریاست کی تمنا میں پاکستان جانچنے تھے۔ شومئی قسمت کہ وہ جس ٹرین میں سوار تھے اس میں پاکستان پہنچتے پہنچتے چند ہی لوگ زندہ بچ پائے تھے۔ خود منشی ایوب پر کئی دنوں تک سکتہ کی کیفیت طاری رہی۔ حملہ آوروں نے مردہ سمجھ کر ان سے اعراض نہ کیا۔ پھر جب ہوش میں آئے تو گویا ایک دنیا بدل چکی تھی۔ پاکستان میں انھیں کوئی جاذبیت نظر نہ آئی سو بالآخر وہ ہندوستان لوٹ آئے۔ دو تین دن یا اس سے زیادہ منشی ایوب پر سکتہ (coma) کی جو کیفیت رہی یہ تجربہ ان کا حاصل سفر بن گیا۔ جب کبھی موڈ میں ہوتے بڑی دلآویزی کے ساتھ عالم بالا کے اس سفر کی روداد سناتے۔ فرماتے: موت خوف کھانے کی چیز نہیں، یہ تو دروازہ ہے، ابدیت میں داخلہ کا دروازہ۔ بس جانو ایک طویل سرنگ ہو جس کے دوسرے سرے پر نور ہی نور ہو۔ ارواح اور فرشتے آپ کے استقبال کے لیے پلکیں بچھائے ہوں۔ سرنگ میں داخلہ کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے آپ ہلکے ہو کر فضا میں تیرنے لگے ہوں۔ غم و اندوہ، تفکر و الم

سب کچھ کہیں بہت پیچھے رہ گیا ہو۔ ایک ناقابل بیان انبساط آپ پر سایہ فگن ہو، جیسے جیسے آپ سرنگ کا سفر کرتے جاتے ہیں پچھلی زندگی کے جاہ و حشم ہیچ معلوم ہوتے ہیں، گویا مدت بعد قیدی کو رہائی نصیب ہوئی ہو۔ حریت ابدی کی مسرتوں کا بیان انسان کے بس کی بات نہیں۔

اس زمانہ کی مقبول عام کتابیں دوزخ کا کھڑکا اور موت کا جھٹکا جسے پڑھ کر موت سے وحشت پیدا ہوتی تھی، منشی ایوب کی سحر بیانی ان سب پر پانی پھیر دیتی تھی۔ دو چار بار جو بھی ان کی مجلس میں بیٹھ جاتا اس کے اندر سے موت کا ڈر غائب ہو جاتا۔ اب جوان کی باتوں کو یاد کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ بظاہر ایک عام سے تاجر کو دل و دماغ کی تقلیب نو reconditioning پر یہ قدرت کہاں سے حاصل ہو گئی تھی۔ مایوس لوگوں میں وہ زندگی کی جوت جگاتے اور مال و جاہ کے اندھے خوگروں کا تناظر کچھ اس طرح بدلتے کہ ان کے دل و دماغ کی کایا پلٹ ہو جاتی۔ وہ اپنی معجز بیانی کے سبب اکثر محفل پہ چھا جاتے۔ یہ اور بات ہے کہ ڈاکٹر اسٹیفن سے ان کی نوک جھونک جاری رہتی جو اس شہر میں انگریزی دواؤں کے بڑے تاجر تھے۔ ڈاکٹر اسٹیفن ہمیشہ سوٹ بوٹ اور ٹائی میں ملبوس رہتے۔ ان کے ہاتھ میں انگریزی کا کوئی اخبار یا رسالہ ضرور ہوتا۔ اندرون تو ان صاحب کا بھی مجروح تھا، البتہ انھوں نے اپنے غم کو مغربی طرز معاشرت میں چھپا رکھا تھا۔ جون جولائی کی سخت گرمی میں بھی ڈاکٹر اسٹیفن جب رکشہ سے اترتے تو ان کے سوٹ اور ٹائی کے تکلف میں کوئی کمی نظر نہ آتی۔ اس زمانہ میں سائیکل کو بھی ایک معزز سواری کا رتبہ حاصل تھا، ان کے ایک دوست جنھیں لوگ عرف عام میں کالا صاحب کہتے، سیاہ سوٹ میں ملبوس بیدل سائیکل لے کر چلتے کہ سائیکل انھیں چلانا نہ آتی تھی۔ وہ اس سے شخصی وجاہت میں اضافہ کا کام لیتے تھے۔ تب یہ باتیں کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھیں۔ اب ان واقعات کو تقسیم ہند کے تناظر میں دیکھتا ہوں تو اس عہد کا ناقابل بیان کرب اور اس کا احساس ایک جھرجھری سی پیدا کر دیتا ہے۔ آزادی کے نام پر انسانی تاریخ کی سب سے بڑی نقل مکانی عمل میں آئی۔ کوئی ڈیڑھ کروڑ لوگ اپنی جڑوں سے اکھڑ گئے۔ دس سے بیس لاکھ کے قریب، بہیمانہ قتل و غارت گری کا شکار ہوئے اور پھر نفرت کی آگ کچھ اس طرح لگی کہ اسے آنے والے دنوں میں بھی مختلف انداز سے سلگتے رہنا تھا۔ بھلا عام گوشت پوست کے انسان اس درندگی کو کہاں سہار پاتے، سو کوئی مجذوب بنا، کسی نے تصوف کے دامن میں پناہ لی، کوئی موت کی لذت آمیز تمنا میں جیتا رہا اور کسی نے اپنے زخموں پر مغربی طرز معاشرت کا پردہ ڈال لیا۔

ہندوستانی مسلمانوں پر کچھ اس انداز سے غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹا کہ بڑے بڑوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ ابھی ۱۸۵۷ء کے سقوطِ دہلی کے اسرار و عواقب کا پوری طرح اندازہ نہ کر پائے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں

عثمانی خلافت کے سقوط کا سانحہ پیش آ گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی بساط سے کہیں بڑھ کر خلافت کو بچانے کی کوشش کی، لیکن یہاں بھی انھیں مایوسی اور محرومی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا، اور اب تقسیم ہند کے سانحہ نے تو ان کی جڑوں پر ہی تیشہ چلا دیا تھا۔ ان کی ملی اور عددی قوت پاش پاش ہو کر رہ گئی تھی۔ گویا ہندوستانی مسلمان کئی نسلوں سے ایک تعذیب مسلسل اور فکری بحران کی کیفیت میں جی رہے تھے۔ شاید ہی ایسا کوئی خاندان ہو جو صوفی، مجذوب یا دیوانہ کے وجود سے خالی رہ گیا ہو۔ ایک اضطراب مسلسل نے ہمارے خاندان کو بھی اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا۔ دادا مرحوم اس ذہنی الجھن کے شکار رہے کہ بچوں کو کس ڈھب پر ڈالا جائے۔ کبھی وہ انھیں پیرسٹر بنانے کی سوچتے اور کبھی تمسک بالمدین کے خیال سے مولوی بنانا انھیں بہتر آپشن لگتا۔ بڑے ابا اس کشمکش کی تاب نہ لا کر جامعہ ملیہ میں تعلیم کے لیے نکل آئے۔ راستہ پھر بھی کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس صورت حال نے دادا کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا، وہ اپنا ذہنی توازن برقرار نہ رکھ پائے۔ مشرقی علم و ورع کے اس روایتی خاندان میں تاریخ و ثقافت پر خاص زور تھا۔ الیاس چچا نے اپنی ساری توانائی عہد اسلامی کے ہندوستان اور خاص طور پر بہار میں اس کے اثرات پر صرف کر رکھی تھی۔ صاف ستھری خوبصورت نثر میں ان کی تحریریں ہمارے ہاں موضوع بحث رہیں۔ ان بحثوں کو اس وقت نئی مہینزل جاتی جب ہماری رشتہ کی ایک پھوپھی مہینہ دو مہینہ کے لیے ہمارے ہاں مہمان ہوتیں۔ ان کے شب و روز ایک خاص قسم کی روحانیت سے مملو ہوتے۔ صبح سے شام تک اوراد و وظائف میں مصروف رہتیں۔ حزب الاعظم، مجربات ویربی اور اس قسم کی دسیوں کتابیں ان کے مطالعہ میں رہتیں۔ بعض کتابوں میں مختلف قسم کے وفق اور نقوش بھی ہوتے، دشمن کو زیر کرنے کا طریقہ، دعا کی قبولیت کے مجرب لمحات، ان جیسی باتوں پر مشتمل بعض مجلد بیاضیں بھی انھوں نے تحریر کر رکھی تھیں۔

ایک بار شہر میں ہندو مسلم فساد کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہم لوگ جس علاقہ میں رہتے تھے وہاں مسلمان کم اور ہندو زیادہ تھے۔ عام مسلمان خوف زدہ تھے، وہ چاہتے تھے کہ ہم لوگ بھی مسلم علاقوں میں فوری طور پر منتقل ہو جائیں۔ صورت حال سنگین تھی مگر والد صاحب نقل مکانی پر آمادہ نہ ہوئے، ان کا کہنا تھا کہ اس طرح ہماری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ اس دوران ہماری پھوپھی پر اطمینان کی عجیب کیفیت طاری رہی، وہ ہم لوگوں سے کہتیں فکر نہ کرو کچھ بھی نہیں ہوگا اور خود وظائف کے اہتمام میں پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ لگ جاتیں۔ یہ ان کی صحبت کا ہی اثر تھا کہ چھوٹی عمر میں میرا تعارف نافع الخلاق اور نقش سلیمانی جیسی کتابوں سے ہو گیا۔ اس قبیل کی اور بھی بہت سی کتابیں تھیں جو خوبصورت چرمی جلدوں میں ہماری دسترس میں رہتیں۔ بالعموم کئی مختلف کتابوں اور رسالوں کو ایک ضخیم مجلد کا حصہ بنا دیا جاتا، لہذا قصیدہ بوعیری کی ورق گردانی کرتے

ہوئے داستان یوسف زلیخا سے بھی تعارف حاصل ہو جاتا۔ وفق و نقوش کی کتابوں میں میری غیر معمولی دلچسپی دیکھ کر ایک دن والد صاحب نے تادیباً فرمایا: یہ کیا اخور بخور پڑھتے رہتے ہو، مگر منع بھی نہیں کیا، اچھا خیر! کہہ کر بات ختم کر دی۔ ابا کی روحانیت عقل و دانش سے مملو تھی، جبکہ پھوپھی اس روایت کی امین تھیں جو انھیں ہمارے خاندانی بزرگ سید بشارت کریم سے منتقل ہوئی تھی۔ بشارت کریم کی کرامتوں اور خرق عادت واقعات کا علاقے میں چرچا تھا۔ لوگ ان کی قبر کی مٹی کو خاک شفا سمجھ کر لے جاتے تھے۔ اس عقلی اور روایتی طرز فکر میں ایک کشمکش تو ضرور محسوس ہوتی تھی لیکن تصادم کی کیفیت نہ تھی۔

مقامی کالج میں ریاضی کے ایک پروفیسر تھے جو تقریباً ہر روز ہمارے مکتبہ میں آتے۔ ملٹی اور قومی مسائل پر ان کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی۔ کبھی وہ حالات کی تبدیلی کے لیے پر عزم دکھائی دیتے اور کبھی ان کی گفتگو یاس و محرومی سے مملو ہو جاتی۔ احیائی تحریکوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور کبھی ان کے اقدامات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے، ارے اس سے کیا ہوگا۔ اکثر گفتگو کے دوران ان کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔ والد صاحب دلاسہ دیتے، ہمت بندھاتے اور یہ سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی کبھی ایک بزرگ ترکی ٹوپی اور سیاہ اچکن میں ملبوس آوارہ ہوتے۔ اہل تشیع کے حلقہ میں ان کا بڑا نام تھا، ان کے شعری مجموعے شعلہ ندا کی شعرو سخن کی دنیا میں بڑی دھوم تھی۔ بعد میں وہ کسی یونیورسٹی کے پروفیسر چانسٹر بھی ہو گئے تھے۔ انھوں نے بھی تکلفات کے پردہ میں اپنے کرب کو چھپا رکھا تھا۔ وہ بہت کم کھلتے مگر جب کھلتے تو ان کے بیان میں آبشار کی سی روانی ہوتی، ایسا لگتا جیسے اجڑتے مکان اور جلتے سا بنان کی تپش آپ کے دامن تک آ پہنچی ہو۔

صبح کے جھپٹے میں ایک صاحب اکثر ہمارے ہاں دستک دیتے اور والد صاحب کو ساتھ لے کر صبح کی سیر کو نکل جاتے۔ چند ایک بار میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ ایک طرح کی سیمابیت ان کی شخصیت کا حصہ تھی۔ عزم و ارادے کے دھنی تھے۔ مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے منصوبے بناتے رہتے۔ صبح کی سیر ان ہی باتوں سے مملو ہوتی۔ اس وقت تو یہ باتیں کچھ زیادہ سمجھ میں نہ آتیں، بعد میں پتا چلا کہ وہ کئی ملٹی اداروں کے سرپرست تھے۔ آگے چل کر جمعیت اہل حدیث کے آل انڈیا صدر بھی ہو گئے تھے۔ زخم خوردوں کی یہ کہانیاں جسے والد صاحب نے اپنے ارد گرد سجا رکھا تھا، گویا ایک (continuing discourse) تکبیر مسلسل سے عبارت تھی اور اس صورت حال میں جاڑے کی آمد سے پہلے جب یادوں کے صندوقے نکالے جاتے اور پاکستان جانے والے عزیز واقارب کی امانتوں کو دھوپ دکھائی جاتی، چچا کی اچکن، بہنوں کے غرارے اور چچی کے طلائی سنگار دان کو صاف کر کے دوبارہ ان صندوقوں میں واپس ڈالا جاتا، تب ابا کا غم بھی بالآخر چھلک پڑتا۔ کہتے: پتہ نہیں جیلانی بھائی آئیں گے بھی یا نہیں۔ انھیں آبدیدہ دیکھ کر والدہ تسلی دیتیں: ہاں ہاں کیوں نہیں،

چاہے رہنے کے لیے نہ آئیں، ملاقات کے لیے اور اپنا سامان لینے کے لیے تو ضرور آئیں گے۔ امانتوں کے یہ صندوقچے تو اگلی برسات تک کے لیے بند ہو جاتے، لیکن ان سے نکلنے والی عزیز واقارب کی خوشبو ہر سال زخموں کو ہرا کر دیتی۔

ابا کی زندگی میں ویسے تو عقلی رویے کو بڑا دخل تھا، لیکن ان کے اکثر فیصلے وجدان اور اشاروں کے تابع ہوتے۔ ان کے ہاں عقل اور وجدان ایک دوسرے کے مخالف نہ تھے، بلکہ باہم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے تھے۔ ایک شب انھوں نے کوئی خواب دیکھا۔ صبح کو چھپٹے میں گاؤں کے سفر کی تیاری ہونے لگی۔ اس زمانہ میں ٹرین کا سفر اور وہ بھی بال بچوں کے ساتھ بڑی جوگھم کا کام سمجھا جاتا تھا۔ ابتداءً تو اس بات کا اندازہ نہ ہوا کہ اچانک اس طرح بیٹھے، بٹھائے گاؤں کے سفر کی کیا حاجت پیش آگئی۔ والد صاحب مہربلب تھے، والدہ بھی کوئی شافی جواب دینے سے گریزاں تھیں۔ البتہ ٹرین جب اگلے اسٹیشن پر پہنچی تو گاؤں سے آرہے ایک فرستادہ سے معلوم ہوا کہ ہمارے خاندان میں کسی کی موت ہو گئی ہے اور مرنے والے نے والد صاحب کے لیے جنازہ پڑھانے کی وصیت کی ہے۔ اس زمانہ میں موبائل یا انٹرنیٹ کا رواج نہ تھا، اہل دل اسی طرح کے اشاروں سے کام چلایا کرتے تھے۔ دوسرے پہر ٹرین منزل مقصود کو پہنچی۔ اسٹیشن پر ریل گاڑی موجود تھی جس پر بانس کی کچھجیوں سے ایک مختصر سا خیمہ نصب کر دیا گیا تھا۔ ہم بچوں کے لیے یہ بڑا دلچسپ سفر تھا۔ سڑک کے دونوں طرف تا حد نظر کھیت، کھلیان اور باغات کا سلسلہ، البتہ والد صاحب نے پیدل چلنے کو ترجیح دی۔ غالباً اس زمانہ میں مردوں کے لیے سفر کی اس آسائش کو مناسب نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ ریل گاڑی کا یہ لطف زنانہ سواروں اور بچوں کے لیے مخصوص تھا۔ گھر پہنچے تو دیکھا یہاں سب کچھ بدلا بدلا سا ہے۔ مردان خانہ اور زنان خانہ ہر جگہ لوگوں کا ہجوم ہے۔ آنگن کے ایک گوشہ میں سفید کفن میں ملبوس ایک جنازہ رکھا ہے، جس کی ہر نیا آنے والا باری باری زیارت کر رہا ہے۔ پتہ چلا کہ یہ ماں کا جنازہ ہے۔ دراصل یہ ہماری رشتہ کی دادی تھیں جنھیں خاندان کے تمام بچے فرط محبت میں ماں کہتے۔ ان کی اپنی چونکہ کوئی اولاد نہ تھی اس لئے وہ ہم بچوں پر جان چھڑکتیں اور ان سے اپنی حقیقی اولاد کی طرح پیار کرتیں۔ مجھے اس بات کا اندازہ تو نہ تھا کہ میں گاؤں کے اس سفر میں ماں کو اس طرح دیکھوں گا، لیکن یہ بات بھی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ لوگ آخر افسردہ کیوں ہیں، رو کیوں رہے ہیں، بلکہ غصہ اس بات پر تھا کہ ماں اس طرح ہمیں اکیلی چھوڑ کر کیوں چلی گئی ہیں۔ منشی ایوب کی مجلسوں میں بیٹھ کر یہ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ ماں اس وقت موت کے پردے میں مزے کر رہی ہیں۔ خود تو نور کے ہالے میں گھری فرشتوں پر حکم چلا رہی ہیں، عالم ملکوت میں ان کے استقبال کی دھوم ہے، خادمان کے ہٹو بچو میں ہم بچوں کو وہ اس طرح بھول جائیں گی، مجھے اس بات کی

ان سے توقع نہ تھی۔ اسی دوران کسی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: دیکھئے یہ تو رویا بھی نہیں۔ اس پر کسی بڑی بوڑھی نے طرح لگائی: ہائیں بیٹا بچہ ہے، اسے کیا پتہ موت کیا چیز ہوتی ہے۔ لیکن مجھے تو اس بات کا غصہ تھا کہ وہ سرنگ کے اس پار نورانی دنیا کا لطف لینے اکیلی کیوں چلی گئیں، یہ تو بڑی خود غرضی کی بات تھی اور ماں سے مجھے اس کی توقع نہ تھی۔

کچھ دن عزیز واقارب کی ہماہمی رہی، تعزیت کے لیے آنے والوں کا سلسلہ جاری رہا، پھر رفتہ رفتہ جب معمول کی زندگی واپس آئی تو پتہ چلا کہ اب کچھ عرصہ تک ہم لوگوں کو گاؤں میں ہی رہنا ہے۔ مجھے ایک طرف تو والد صاحب کی مجلسوں کے چھوٹے کاغذ تھا اور دوسری طرف گاؤں کی نامانوس زندگی۔ لیکن جلد ہی اپنے ہم عمروں اور خاندان کے دوسرے بچوں کے شوق جگانے پر ان کے ساتھ مدرسے سے جانے لگا۔ دو چار دنوں تک تو کسی نے توجہ نہ دی، خوب تفریح رہی۔ جب چاہا مدرسے سے گھر واپس آگئے۔ پھر ایک دن داخلہ ٹسٹ ہوا اور اساتذہ کے لیے یہ ایک معمرہ بن گیا کہ مجھے کس کلاس میں داخل کیا جائے۔ اردو کی کتابیں، قصے کہانیاں فر فر پڑھتا اور سمجھتا تھا۔ پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی تمام جماعت کی کتابیں پڑھوالی گئیں، لیکن جب املا لکھنے کا وقت آیا تو ہر حرف الگ الگ لکھا۔ ریاضی اور دوسرے مضامین کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ کسی نے کہا کہ دوسری جماعت میں ڈال دو، کسی نے اعتراض کیا کہ نظم و نثر تو چوتھی جماعت کی پڑھ لیتا ہے مگر ریاضی تو پہلی جماعت کی بھی نہیں آتی، سو کچھ دنوں تک اسی مختصے کا فائدہ اٹھاتا رہا۔ اس طرح میری دعا سلام کئی جماعت کے طالب علموں سے ہو گئی۔ ایک دن والدہ نے اناج کے تلف شدہ دانوں کو جلا کر روشنائی بنائی اور لکڑی کی ایک نئی تختی مدرسے سے جاتے ہوئے میرے حوالے کی۔ شاید یہ میرے باقاعدہ داخلے کا عندیہ تھا۔ مجھے چاول کی روشنائی سے تختی پر لکھنا اور پھر اسے سبزہ زاروں پر گھس کر صاف کر دینا بڑا بھلا لگتا تھا۔ خاص طور پر جب بچے اپنی اپنی تختیوں کو سبزہ زاروں سے گھستے ہوئے آپس میں ریس لگاتے تو انبساط کی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی۔ مجھے توقع تھی کہ میرا ہم جلیس عاصم اس نئی تختی کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا جس کی تختی سے میں کبھی کبھی ریس لگا لیا کرتا تھا، لیکن آج وہ کسی مسرت کے اظہار کے بجائے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا: جانتے ہو قیامت قریب آگئی ہے، مسلمانوں پر بہت برا وقت آنے والا ہے۔ امی کہہ رہی تھیں کہ معراج والی مسجد میں آگ لگا دی گئی ہے، اب کوئی بڑی انہونی ہونے والی ہے۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ زیادہ نہ آیا لیکن جب کئی دنوں تک بچوں کی زبان پر معراج والی مسجد کی بابت تشویش ناک باتیں سنتا رہا تو والدہ سے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اسرائیل اور مشرق وسطیٰ کی سیاست تو زیادہ سمجھ میں نہ آئی لیکن بچوں کی مجلسوں میں تشویش کی لے مسلسل تیز ہوتی گئی تب گاؤں کی مسجد میں بعض جوشیلی تقریریں ہوئیں اور

طلباء کی مجلسوں میں اہل یہود سے نپٹنے کے لیے خیالی منصوبے بنائے جانے لگے۔

یہ مدرسہ جس کے لوح پر درس گاہ اسلامی کمہر ولی کندہ تھا، ہمارے گھر سے بالکل متصل تھا۔ مدرسے کے اردگرد خالی میدان اور اس سے کوئی سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے سے قدرے بلندی پر گاؤں کی مسجد تھی، جس کے احاطہ میں خاندان کے بزرگوں کی قبریں واقع تھیں اور دوسری طرف اشیائے ضروریہ کی دکانیں۔ مسجد اور مدرسہ کو گاؤں کے قلب کی حیثیت حاصل تھی۔ مدرسہ کا سبزہ زار فارغ اوقات میں بھی بچوں کے کھیل کود اور ان کی سرگرمیوں سے معمور رہتا اور مسجد کے احاطہ میں بزرگوں کی مجلسیں آباد رہتیں۔ اب جو معراج والی مسجد میں آتش زنی کا واقعہ پیش آیا تو بچوں میں سراسیمگی اور بڑوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اس زمانہ میں غالباً تجلی کے کسی شمارے میں سانحہ مسجد اقصیٰ سے متعلق مولانا مودودی کا کوئی مفصل مضمون شائع ہوا تھا۔ والد صاحب جب اختتامِ ہفتہ پر گاؤں آئے تو اپنے ساتھ یہ شمارہ بھی ساتھ لائے۔ بزرگوں کے حلقہ میں بڑی بحثیں ہوئیں۔ ایک دن مردان خانہ میں یہی مسئلہ زیر بحث تھا کہ کسی نے پوچھا کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خدا ہم مسلمانوں کو اہل یہود کے ہاتھوں کیوں ذلیل کر رہا ہے۔ اہل یہود تو راندہ درگاہ ٹھہرے، ان پر خدا کا غضب نازل ہوا۔ مسلمانوں کی تذلیل اور وہ بھی اس مغضوب علیہم قوم کے ہاتھوں؟ کیا خدا نے اپنا دستِ شفقت ہم مسلمانوں سے اٹھالیا ہے؟ اس وقت ان سوالوں کی چھن کا کچھ اندازہ نہ ہوا۔ اب جو غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ سانحہ اقصیٰ نے اس عہد کے مسلمانوں کی الہیاتی فکر میں کس قدر اتھل پتھل پیدا کر دی تھی۔

## ایں ہم برسرِ علم

گاؤں کی زندگی ایک تفریحِ مسلسل سے عبارت تھی۔ بڑی عمر کے لڑکوں کے ساتھ کبھی پیرا کی کا پروگرام بنتا، کبھی گنے کے کھیتوں میں جانگلتے، کبھی چڑیوں اور مچھلیوں کے شکار کی سوجھتی اور کبھی موسم کے پھلوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے باغوں کا رخ کرتے۔ نوعمر بچوں پر تمام گھروں کے دروازے کھلے ہوتے اور پھلدار درختوں پر ان کا مشترکہ حق سمجھا جاتا۔ اکثر گھروں میں اخبار و رسائل پڑھنے کا رواج تھا۔ اس زمانہ میں ماہنامہ مولوی، ماہنامہ مخزن اور ماہنامہ نگار جیسے رسالوں کی بڑی دھوم تھی۔ بیشتر گھروں میں اس کی فائلیں محفوظ ہوتیں۔ گوکہ یہ بڑوں کے رسالے تھے، لیکن ہم بچوں کے لیے بھی ان میں دلچسپی کی کوئی نہ کوئی چیز نکل آتی تھی۔ غالباً مخزن کا کوئی شمارہ تھا جس میں فارسی محاوروں کا سیاق و سباق بتایا گیا تھا۔ باتوں باتوں میں محاورے ذہن نشین ہو جاتے۔ ایک آدھ قصہ تو ذہن سے ایسا چپکا کہ آج بھی یاد ہے۔ مثال کے طور پر 'ایں ہم برسرِ علم'۔ سیاق اس کا یوں ہے کہ ایک مولوی صاحب چوری کے خلاف وعظ کہہ رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا: چوری صرف یہ نہیں کہ باقاعدہ نقب لگائی جائے، ڈاکہ ڈالا جائے بلکہ بعض چوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی شناخت کا ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً اسی درزی کے پیشہ کو لیجئے جو بڑے شوق سے کپڑے بچاتے ہیں اور اسے اپنی کاریگری اور فنکاری پر محمول کرتے ہیں۔ حالانکہ قیامت کے دن جب انھیں ان کا علم تھمایا جائے گا تو چوری کے یہ تمام ٹکڑے حتیٰ کہ معمولی کترنیں بھی اس کے علم پر لٹک رہی ہوں گی۔ اس وقت اس سے اپنی یہ ذلت و رسوائی چھپائی نہ جائے گی۔ سخت افسوس ہوگا کہ ان معمولی کترنوں کے طفیل اس نے اپنی آخرت خراب کر لی۔ کہتے ہیں کہ اس مجلس میں ایک درزی بھی تھا، وہ اس وعظ سے متاثر ہو کر تائب ہو گیا اور اس نے یہ طے کیا کہ اب وہ اس حرکت سے باز رہے گا۔ ایک عرصہ گزرا، درزی اپنے عہد پر قائم رہا۔ جب بھی کپڑے کی چوری کا خیال آتا اس کی نگاہوں میں آخرت کا علم اور اس پر ٹنگے چوری کے رنگ برنگے کپڑے جھلملانے لگتے اور وہ اس عمل سے باز رہتا۔ اتفاق سے ایک دن ایک ایسا تھان آیا جس نے اس کے ارادے میں لرزش پیدا کر دی۔ وہ بار بار تھان کو چھوتا، پھر اس خیال سے رکھ دیتا کہ وہ

چوری کر کے اپنی عاقبت خراب نہیں کرے گا۔ دو چار دن اسی طرح کپڑے کی سلانی ملتوی کرتا رہا۔ اب گاہک کے آنے کے دن قریب آگئے تھے۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے اپنی فنکاری دکھانے کی ٹھان لی۔ بولا، 'ایں ہم برسر علم، یعنی جس علم پر اتنے سارے کپڑے لٹک رہے ہوں گے اس پر ایک اور سہی۔'

اسی طرح کا ایک محاورہ، جو شاید اب اردو میں کم مستعمل ہے، 'رو میں روا ہے' تھا۔ سیاق اس محاورہ کا یہ بتایا گیا تھا کہ ایک مولوی صاحب کے پڑوس میں مرغیاں پلٹی تھیں جو اکثر ان کے گھر آ جاتیں۔ جا بجا آنگن میں غلاظت کر دیتیں، گھر میں رکھے اناج کے ڈھیر سے حسب مقدور چگ لیتیں۔ مولوی صاحب تو خیر سے کام پر نکل جاتے۔ مرغیوں نے ان کی بیوی کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ایک دن بیگم صاحبہ کو غصہ آیا اور انھوں نے بڑی ترکیب سے ایک مرغی کو دھرد بوجا۔ ذبح کے بعد پروں کو احتیاط سے آنگن میں دفن کیا اور بوٹیاں چولھے پر چڑھا دیں۔ دل ہی دل میں کہتی جاتی تھیں، ان مرغیوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا، یہ مجھے تپاتی تھیں، آج میں انھیں پکا رہی ہوں۔ شام میں جب مولوی صاحب گھر آئے تو انھیں گوشت کی خوشبو معلوم ہوئی۔ پوچھا خیریت ہے کیا پکایا ہے؟ بولیں کیا کرتی مرغیوں نے تنگ کر رکھا تھا، میں نے غصہ میں آ کر پڑوسی کی ایک مرغی ذبح کر ڈالی۔ مولوی صاحب بہت غضبناک ہوئے بولے، خدا کی بندی تم نے یہ کیا کیا، یہ تو سراسر حرام ہے۔ میں تو یہ حرام مال نہیں کھا سکتا۔ بیوی بولیں، ہے ہے تمہارا فتویٰ بھی عجیب ہے۔ ان مرغیوں نے اب تک نہ جانے ہمارا کتنا غلہ چٹ کر ڈالا، اس پر سے گندگی الگ۔ اب اگر ایک مرغی میں نے ذبح ہی کر ڈالی تو وہ حرام کیسے ہوئی، ویسے رہنے دو اگر تم اس کا گوشت نہیں کھاتے تو میں تمہارے لیے لہسن اور مرچ کی چٹنی پیسے دیتی ہوں۔ یہ سن کر مولوی صاحب ذرا سٹپٹائے، بولے: ارے خدا کی بندی گوشت تو رہنے دے، وہ تو ہم نہیں کھائیں گے لیکن اس میں پانی اور مصالحہ تو ہمارا لگا ہے، ایندھن تو ہمارا خرچ ہوا ہے، ہم اس کا شوربہ پی لیں گے۔ اب مولوی صاحب کی بیوی نے ایک کٹورے میں شوربہ انڈیلنا شروع کیا۔ ساتھ میں بوٹیاں بھی آنے لگیں تو انھوں نے چچھ سے روکنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر مولوی صاحب بولے، خدا کی بندی چچھ نہ لگاؤ جو خود سے آ رہا ہے آنے دو رو میں روا ہے۔ یہ سن کر مولوی صاحب کی بیوی کی ہنسی نکل گئی۔

جب ایک عام درزی سے لے کر علم و ورع کے حاملین تک طمع دنیا میں اس طرح غوطے لگا رہے ہوں اور جب عامی سے لے کر عالم تک فکر و عمل کے تضاد میں اس طرح مبتلا ہو تو اس احساس کا پیدا ہونا فطری ہے کہ اہل ایمان کی روحانی زندگی کا کس بل نکل چکا ہے۔ پھر بھلا انھیں خدا کے لمس شفقت سے کیا واسطہ؟ ایک عمومی محرومی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

ہر سال عید قربان کے موقع پر گاؤں میں ایک اجتماع عام ہوتا۔ مدرسے کے احاطے میں بڑی بڑی دیکھیں چڑھتیں، ایک جشن کا ماحول ہوتا۔ امیر غریب، بوڑھے بچے، خواتین و حضرات سبھی اس اجتماعی کھانے میں شریک ہوتے۔ بچوں کے لیے تو اس کی اہمیت ایک سیر و تفریح سے زیادہ نہ تھی، البتہ بڑے بزرگ رات ڈھلے قندیلوں کی روشنی میں مختلف مسائل پر بحث و مباحثہ کرتے۔ مدرسہ کی تعلیمی صورت حال، گاؤں کی عمومی فلاح و بہبود اور ملت اسلامیہ کو پیش آنے والے مسائل پر غور و خوض ہوتا۔ جلسہ تو اس دفعہ بھی منعقد ہوا لیکن اس میں جشن کی وہ کیفیت نہ تھی۔ سانحہ مسجد اقصیٰ کے سبب ایک عمومی افسردگی اور حزن کی کیفیت چھائی رہی۔

مدرسے کا سالانہ جلسہ بڑے تڑک و احتشام سے منایا جاتا۔ بڑی بوڑھیوں کو انتظار ہوتا۔ ان جلسوں کی خاص بات یہ تھی کہ پورا گاؤں خود کو اس سے متعلق محسوس کرتا۔ مدرسے کے صحن میں ناظرین کے لیے کرسیاں اور جازم بچھادی جاتیں اور اس کے پیچھے تاحد نظر چار پائیوں سے باڑ بنادی جاتی، جس کے چلمن سے خواتین جلسہ کی کارروائی کا مشاہدہ کرتیں۔ اپنے بچوں اور ناتی پوتوں کے تعلیمی مظاہروں کو دیکھ کر ان کا دل خوشی سے نہال ہوا جاتا۔ سچ کہیے تو مدرسہ کی مرکزیت نے پورے گاؤں کو ایک معنویت کے احساس سے جوڑ دیا تھا۔ چار پائیوں کی باڑ کے پیچھے سے پروگرام کے مشاہدے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ مردوں کی صفوں میں بیٹھ کر ایک طرح کے ڈسپلن اور شرافت کا مظاہرہ ضروری سمجھا جاتا تھا، جبکہ عورتوں کے خیمہ میں بچوں کی اچھل کود، شور شرابے اس تفریحی شام میں چار چاند لگا دیتے تھے۔ تقریری مقابلوں کے بعد تمثیلی مشاعروں کا دور شروع ہوا۔ ایک طالب علم نے جو ترکی ٹوپی اور سیاہ اچکن میں نظیر اکبر آبادی کا روپ دھارے ہوئے تھا، کچھ اس شان سے قوالوں کے انداز میں نغمہ سرائی شروع کی کہ سماں بندھ گیا۔

’ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدلیس پھرے مارا

قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کرنقارا

گانے والا جب اس شعر پہ پہنچا:

قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا

دھن، دولت، ناتی، پوتا کیا، اک کنبہ کام نہ آوے گا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لا دچلے گا نجارا

تو میں نے محسوس کیا کہ اکثر بڑی بوڑھیوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری رہ جاوے گی

ایک بدھی تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے آوے گی  
یہ کھیپ جو تونے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی  
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی... سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا  
تمثیلی شاعر کے ساتھ طلباء کی ایک ٹولی بڑی خوبصورتی کے ساتھ بند کے مصرعے میں کچھ اس طرح اپنا حصہ  
ڈالتی کہ ایسا لگتا جیسے روانگی کا نقارہ عام بچ چکا ہو اور صور اسرافیل اب چند ہی ثانیے کی بات ہو۔ ایک  
صاحبزادے جن کی آنکھوں پر کھلونوں والا چشمہ اور سر پر اونچی دیوار کی ٹوپی تھی، کوئی عظیم آبادی شاعر کی  
حیثیت سے سامنے آئے۔ اس کی آواز میں بلا کا سوز تھا۔ جب وہ اس مصرعہ پر پہنچا:

تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم  
تو ماحول پر ایک پراسرار سناٹا طاری ہو گیا۔  
ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں پاس اپنے بلا لے بہتر ہے  
اب درد جدائی سے ان کی اے آہ بہت بیتاب ہیں ہم  
تو ایسا لگا کہ یہ شاعر کا شخصی درد نہ ہو بلکہ وہ ہماری ملتی صورت حال پر تبصرہ کر رہا ہو۔ اور خاص طور پر اس مصرعہ  
نے کہ

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پر پہنچتے ہیں دو ایک  
ایسا لگتا تھا ہماری ملتی سفر کی ناکامیوں کی تکلیف دہ یادیں پھر سے تازہ کر دی ہوں۔

مدرسہ کا سالانہ جلسہ یوں تو عمومی جشن کی حیثیت سے منایا جاتا، لیکن مضامین کے انتخاب، نظموں کی  
پیشکش اور موضوعات کی ترتیب شاید غیر ارادی طور پر کچھ اس طرح ہو جاتی کہ جشن کے ان مواقع پر بھی ایک  
عمومی حزن کی کیفیت کا واضح احساس ہوتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دنیا کی بے بضاعتی اور فنا کے استعاروں  
سے مذہبی زندگی کچھ اس طرح مملو تھی کہ حزن کو ہماری نفسیاتی اور قومی شناخت کے علاوہ ایک مستند مذہبی  
علاسیے کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ کچھ تو ہے کہ خدا نے اس قوم کو حالات کے رحم و کرم پر اس طرح چھوڑ  
دیا ہے، ان دنوں بڑی بوڑھیوں کے وظیفوں میں 'میری باریکیوں دیر اتنی کری' کی تکرار کثرت سے سننے کو ملتی۔  
گو کہ گاؤں میں ایک عمومی خوشحالی کا ماحول تھا۔ لوگوں کے پاس ضرورت سے کہیں زیادہ اجناس اور  
اشیائے خور و نوش موجود تھیں۔ باہمی لین دین اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کو تحسین کی نگاہ  
سے دیکھا جاتا۔ تعلیم عام تھی اور بہت سے لوگ کلکتہ، بمبئی جیسے شہروں میں تجارت کی غرض سے جا بسے تھے۔  
بعضوں نے خلیجی ممالک حتیٰ کہ یورپ اور امریکہ میں بھی اپنے مستقر بنا لیے تھے۔ عید، بقرعید کے سالانہ

جلسوں میں ان حضرات کی شرکت اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے سے ایک عمومی بیداری کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، لیکن اس مرفہ الحالی کے باوجود ایک مہیب خلا کا احساس ہوتا۔ بڑے ابا جب بھی شہر سے آتے مدرسہ کے دالان میں ایک جلسہ ضرور منعقد ہوتا، جس میں وہ اس گاؤں کو ایک مثالی بستی میں تبدیل کرنے کا منصوبہ پیش کرتے۔ درس گاہ (مدرسہ) کا قیام ان کی ہی تحریک پر عمل میں آیا تھا، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کو تعلیم و ترقی کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ مدرسہ کی حیثیت گاؤں کے ٹاؤن ہال کی تھی جہاں گاہے بگاہے اہم بیرونی شخصیات کی تقریریں بھی ہوتی رہتیں۔ ایک بار غالباً لکھنؤ سے کوئی بڑے عالم تشریف لائے تھے، انھوں نے سانحہ مسجد اقصیٰ کے مجرم ڈینس کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں بتائی تھیں۔ اس وقت یہ باتیں تو کچھ زیادہ سمجھ میں نہ آئیں کہ ڈینس اگر ذہنی مریض تھا تو اس نے مسجد اقصیٰ میں آتش زنی کیوں کی۔ مسجد کی تباہی سے حضرت مسیح کے ظہور کا کیا تعلق ہے، البتہ یہ بات بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز معلوم ہوئی کہ ڈینس کو خیالی آوازیں آتی تھیں۔ کوئی اس سے کہتا تھا کہ تم یہودی ہو اور تمہیں مسیح کی آمد سے پہلے ایک اہم رول کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ بسا اوقات اسے ایسا محسوس ہوتا کہ حضرت موسیٰ کی طرح خدا اس سے ہم کلام ہو۔ اس کا کہنا تھا آتش زنی کا یہ حکم اسے خدا کی طرف سے ملا تھا جسے اس نے امر ربی سمجھ کر انجام دے ڈالا ہے۔ جلسہ کے خاتمہ پر جب وہ عالم ہمارے گھر تشریف لائے تو میں نے سوچا کہ ان سے پوچھوں کہ اجنبی اور نامانوس آوازیں تو ہمارے پروفیسر صاحب کے کانوں میں بھی آتی رہتی ہیں۔ تو کیا وہ بھی ہمیشہ امر ربی کے گرداب میں رہتے ہیں بلکہ پروفیسر تو یہ بھی کہتے ہیں کہ انھیں کوئی اشارہ کرتا ہے۔ وہ اکثر اپنی دعوتوں کا تعین ان ہی اشارات کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ سوچا یہ بھی پوچھوں کہ غیبی آوازوں کو سننے اور اشاروں کو سمجھنے کا صحیح طریقہ کیا ہو سکتا ہے، لیکن مردان خانہ میں لوگوں کے اثر دہام اور بزرگوں کی نہ ختم ہونے والی گفتگو نے مجھے ان سوالوں کے جواب سے محروم رکھا۔

گاؤں میں مسجد سے کسی قدر متصل منگل شاہ کا مزار بھی تھا، مگر یہاں نہ چراغ جلتے اور نہ ہی اگر بتی کی خوشبو پھیلتی۔ ایک ویرانی نے یہاں بھی حزن کا ماحول طاری کر رکھا تھا۔ اس زمانے میں لوگ عام طور پر کسی اہل دل کے ہاتھوں پر بیعت ہو جاتے۔ مسلم دل و دماغ پر پے بہ پے حوادث نے جو نفسیاتی زخم لگایا تھا، اس کی تلافی کا ایک مقبول عام نسخہ تصوف کو سمجھا جاتا تھا، مگر مصیبت یہ تھی کہ بڑے ابا کے مثالی بستی کے پروجیکٹ نے صرف منگل شاہ کے مزار پر ہی خاک نہیں اڑائی تھی بلکہ اہل دل کے سلسلہ بیعت کی اثر آفرینی بھی جاتی رہی۔ خلافت کے سقوط کے بعد مثالی بستی کا قیام ایک نفسیاتی تدبیر تھی اس خلا کو پر کرنے کی جس کی شدت کا واقعی ادراک شاید ہی کسی کو تھا۔ مجروح دل و دماغ ماضی گزینی میں پناہ لیتے۔ اچھے دنوں کی یادیں تازہ کی

جاتیں، بزرگوں کے جاہ و حشم کی داستانیں بیان ہوتیں۔ ایک دن میرے بڑے بھائی ڈاکٹر نجیب اختر، جنہیں ہم لوگ بھائی جان کہتے، آئینہ ترہٹ کا ایک بوسیدہ نسخہ کہیں سے لے آئے۔ ابھی ہم لوگ اس کتاب کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہے تھے کہ والد صاحب کا گزر ہوا، پوچھا یہ کون سی کتاب ہے؟ میں نے کہا کہ آئینہ ترہٹ ہے، سنا ہے کہ اس میں اپنے بزرگوں کے واقعات ہیں، خاندان کا تذکرہ ہے اور اس کے تفصیلی کوائف موجود ہیں۔ یہ سن کر ان کے چہرے پر ایک لمحہ کے لیے حسرت آمیز مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ بولے بیٹا ان باتوں کی اب کیا اہمیت ہے۔ اب تو یہ دیکھو کہ تم خود کیا ہو؟ پدیرم سلطان بود سے اب کچھ ہونے کو نہیں۔

ہفتہ کے اختتام پر جب والد صاحب گھر آتے تو مردان خانہ کی چہل پہل میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا۔ البتہ معراج والی مسجد میں آتش زنی کے بعد مردان خانے کو گاؤں کے چوپال کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، جہاں اس سانحہ کے اسرار و عواقب پر کچھ اس طرح گفتگو جاری رہتی کہ کبھی جنگ عظیم اول کی تفصیلات زیر بحث آتیں اور کبھی ترک ناداں کے خلافت کی قباچاک کرنے پر ایک نوحہ دلگیر بلند ہوتا۔ ایسا لگتا تھا کہ مصائب و آلام کا ایک نہ تھمنے والا سلسلہ بالآخر ہمارے وجود کو ملیا میٹ کر دے گا۔ سرا سیمگی کے اس ماحول میں اندرون ملک سے بھی تشویشناک خبریں آنے لگیں۔ ابتداً تو میری سمجھ میں کچھ زیادہ نہیں آیا کہ احمد آباد میں بلوایوں نے جس منظم طریقہ سے مسلم آبادی، مساجد، درگا ہوں اور مسلمانوں کی املاک پر حملہ کیا ہے اس کے اثرات ہم تک کیسے پہنچیں گے، لیکن جب ان تشویشناک خبروں کے سلسلے نے طول کھینچا تو ہمارا وجود لرز کر رہ گیا۔

’محبوب بھائی! احمد آباد کا یہ فساد محض ہندو مسلم فساد نہیں بلکہ یہ ہماری جڑوں کو اکھیڑ پھینکنے کی منظم اسکیم ہے۔ آپ نے بلراج مدھوک کی وہ تقریر نہیں سنی، وہ تو صاف کہتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا بھارتیہ کرن کرنے کی ضرورت ہے، اب انے تشویش ظاہر کی۔

جی ہاں، ان کی تنگ نظری سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

’یہ ہم سے قیام پاکستان کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری ازلی وفاداری پاکستان کے ساتھ ہے۔ حالانکہ ہمارے لیے نظری طور پر قومی سرحدیں تو کچھ بھی معنی نہیں رکھتیں اور نہ ہی نیشن اسٹیٹ کے لیے اسلام میں کوئی جگہ ہے، ہمارے لیے تو ہر ملک ملک ماست ملک خداے ماست، عبدالاحد صاحب نے لقمہ دیا۔

اچھا کچھ پتہ چلا اتنے بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری کی ابتداء کیسے ہوئی؟ ماسٹر تفضیل صاحب نے تفصیل جاننا چاہی۔

بولے: ویسے تو بہت سی باتیں کہی جا رہی ہیں، اس وقت گائے کے تقدس کے حوالے سے ملک بھر میں مسلمانوں کے خلاف فضا بنائی جا رہی ہے۔ احمد آباد میں بھی بنیادی تنازع گائے کے حوالے سے ہی شروع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد اقصیٰ میں آتش زنی کے بعد ملک گیر سطح پر جو مسلمانوں نے احتجاجی جلوس نکالے اسی سلسلے کا ایک مظاہرہ احمد آباد میں بھی ہوا، جس میں بڑے پیمانے پر مسلمانوں نے شرکت کی۔ اس جلوس میں جو بہت سے نعرے لگائے جا رہے تھے اس میں ایک نعرہ یہ بھی تھا کہ 'جو ہم سے ٹکرائے گا مٹی میں مل جائے گا'۔ مظاہرے نے تنگ دل ہندوؤں کو جو کسی ایسے موقع کی تاک میں بیٹھے تھے اس پر وہ پکینڈے کا موقع دیا کہ مسلمان پھر سے متحد اور مضبوط ہو رہے ہیں۔ جلوس کے چار پانچ دن بعد ہی رام لیلا کی تقریب نکل آئی، جہاں ایک مسلم انسپکٹر کے ہاتھوں رامائن کی بے حرمتی کی کہانی عام کی گئی۔ پھر مت پوچھے آنا فانا ہندو دھرم رکشا سمیٹی بن گئی۔ ہزاروں کا جلوس رامائن کی دفاع کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ پھر دیکھتے دیکھتے مسلمانوں کی بستیاں جلائی جانے لگیں اور عین سرکاری سرپرستی میں آزاد ہندوستان کا سب سے بھیا تک فساد برپا ہو گیا۔

'دیکھئے ہندو ذہن علامتوں کی تلاش میں ہے۔ اسے اس بات سے سخت کوفت ہوتی ہے کہ الاقصیٰ کا سانحہ مسلمانوں کو متحد کر دیتا ہے۔ مسلمان خود کو ایک عالم گیر امت سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوؤں کو باہم متحد کرنے والی کوئی چیز نہیں۔ اب اس رامائن کو ہی لیجئے، بظاہر تو انھوں نے اسے قرآن کی سی عظمت دینے کی کوشش کی ہے، شاید آپ کو معلوم ہو کہ ابھی کچھ دنوں پہلے پیر بخاری صاحب کے عرس کے موقع پر کتابوں کا ایک ٹھیلہ پولس کی دھکائی میں گر گیا تھا۔ جب مسلمانوں کو یہ پتہ چلا کہ اس ٹھیلے پر قرآن مجید کا کوئی نسخہ بھی تھا تو ان کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ دفعتاً چار پانچ ہزار کا مجمع اکٹھا ہو گیا اور پولس والوں کو معافی تلافی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ ہندو ذہن یہی کام رامائن سے لینا چاہتا ہے، لیکن اسے اس بات کا احساس بھی ہے کہ ان مذہبی شہ پاروں میں نسل پرستی جس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہے اس سے کسی عمومی علامت کا کام نہیں لیا جاسکتا۔'

'پھر ان کے پاس اپنی قوم کو متحد کرنے کا نسخہ کیا ہے؟' ماسٹر مرٹضیٰ نے سوال کیا۔

بولے: اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ مسلم دشمنی اور پاکستان کے خیالی دشمن کو اپنی گفتگو کا محور بنائیں۔ آپ نے گولوا لکر کی حالیہ تقریر نہیں سنی، احمد آباد ہی کی تو بات ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے اس نے کہا تھا کہ ہندوستان میں مسلم اقلیت کو دستوری تحفظات حاصل ہیں اور اقلیتوں کے لیے خصوصی قوانین موجود ہیں، لیکن ہندوؤں کے لیے کسی دستوری تحفظ کی بات نہیں کی گئی ہے۔ بقول گولوا لکر ہندوؤں کا تحفظ تو ہندو راشٹر

میں ہی ہو سکتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں مسلم دشمنی کی یہ لے مزید تیز ہوگی۔ والد صاحب یہ کہہ کر تفکرات میں ڈوب گئے۔

پھر اس صورت حال میں مسلمانوں کے لیے کیا راستہ رہ جاتا ہے؟ عبدالاحد صاحب نے محبوب عالم صاحب کی طرف سوالی نگاہوں سے دیکھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، ماسٹر مرتضیٰ صاحب نے مداخلت کی۔ بولے: ابھی پچھلے سال احمد آباد میں جمعیت علماء کے جلسہ میں اسعد مدنی صاحب نے تو جن سنگھ اور آر ایس ایس کی خوب خبر لی۔ انھوں نے میرٹھ فسادات کا انھیں ذمہ دار ٹھہرایا، کانگریس میں جو ان کا اثر ہے تو آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ حکومت انتہا پسندوں کی سازشوں کو کامیاب نہیں ہونے دے گی۔

’عزیزم آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ کیا جمعیت علماء والے واقعی اتنے ہی سادہ لوح ہیں کہ وہ اب بھی کانگریس کی حکومت سے کسی خیر کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ گجرات میں اوپر سے نیچے تک، محکمہ پولس کے اہلکاروں سے لے کر سیاست دانوں تک اور خود مرکز میں جن ہاتھوں میں زمام کار ہے یہ سب کے سب تو کانگریس کے ہی لوگ ہیں۔ ٹرکوں میں بھر کر مسلمانوں کی لاشیں اجتماعی تدفین کے لیے آسمانوں سے تو نازل نہیں ہو رہی ہیں۔ سنگھیوں اور کانگریسیوں کی یہ نوراکشتی جمعیت علمائی مولویوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی، عبدالاحد صاحب جواب تک کسی گہرے تفکر میں ڈوبے تھے، انھوں نے کسی قدر جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا۔

حافظ صاحب! کانگریس کو جب تک اس ڈھب کے مولوی ملتے رہیں گے اس ملک میں مسلمانوں پر کوئی نئی صبح طلوع نہیں ہو سکتی، محبوب عالم صاحب کے لہجے میں افسردگی نمایاں تھی۔

بولے: ہمارے مولویوں کی مت ماری گئی ہے۔ جو سنگھی حکومت سے باہر مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کر رہے ہیں، ان کی مذمت میں تو ہماری زبانیں خوب چلتی ہیں، البتہ حکومت کے اندر کانگریسی سنگھیوں کی مسلم دشمنی پر ان کی زبانوں سے ایک لفظ نہیں نکلتا، بلکہ الٹا ان مجرموں کے حق میں یہ جمعیت علمائی مولوی ایکشن کی مہمیں چلاتے ہیں۔ خدا ان کی آنکھوں پر بندھی پٹیاں کھول دے۔

’یہی تو سب سے بڑا سانحہ ہے، والد صاحب نے اپنے کرب کا اظہار کیا۔ بولے: ان مولوی نما سیاست دانوں کی شکل و صورت پر نہ جائیے، ان کے نماز و روزے سے دھوکہ نہ کھائیے، یہ دراصل ظالم کانگریسی آقاؤں کے سیارچے ہیں جو عین مسلم معاشرے کے مدار میں اس اذیت ناک صورت حال کو برقرار رکھنے کی مہم میں مصروف ہیں۔ حالات خواہ کیسے بھی ناگفتہ نہ ہوں۔ کانگریس سے ان کی وفاداری پر کوئی حرف نہیں آئے گا، یہ ایک عجیب مکروہ طلسم ہے۔ ایک طرف سنگھی ذہنیت کی ریشہ دوانیاں اور دوسری

طرف سنگھی کانگریسیوں کی مسلم نسل کشی کا منظم منصوبہ۔ مولوی پہلے کو دشمن اور دوسرے کو دوست بتاتا ہے۔  
یا للعجب!

### متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی

والد صاحب نے یہ مصرعہ کچھ اس انداز سے پڑھا کہ مجلس پر ایک مضطربانہ خاموشی چھا گئی۔  
'جی ہاں حافظ صاحب آپ صحیح کہتے ہیں، محبوب صاحب نے ہلا مارنے والی خاموشی سے نکلنے کی  
کوشش کی۔ بولے: 'حالات واقعی سنگین ہیں، انتہا پسند ہندوؤں کی نئی نئی تنظیمیں قائم ہو رہی ہیں، چار پانچ  
سال پہلے وشو ہندو پریشد کا قیام عمل میں آیا تھا، سنا ہے شیوسینا کے نام سے بمبئی میں جوئی تنظیم بنی ہے اس کا  
مقصد وحید بھی مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا ہے اور سب سے تشویش کی بات تو یہ ہے کہ حالیہ الیکشن میں جن  
سنگھ ایک سیاسی قوت کے طور پر سامنے آئی ہے، صاف لگتا ہے کہ ملک کا قبلہ تیزی سے بدل رہا ہے۔'  
'جی ہاں نوشتہ دیوار تو یہی ہے کہ آنے والے دنوں میں حالات سخت تر ہوتے جائیں گے، کاش کہ  
کانگریسی مولوی مسلمانوں کو جھوٹی تسلیاں دینے اور تھپکیاں دے کر سلانے کے بجائے اصل صورت حال سے  
مقابلہ کے لیے آمادہ کرتے، عبدالاحد صاحب نے ایک آہ سرد بھرتے ہوئے کہا۔

'حیرت ہے کہ اس بہیمانہ قتل و غارت گری کو مذہبی رنگ دیا جا رہا ہے، دھرم دیدھ کی بات کی جا رہی  
ہے، بربریت کے ان لرزہ خیز واقعات کے خلاف بڑے بڑے ہندو مٹھوں اور ان کی روحانی شخصیات کی  
طرف سے کوئی آواز نہیں اٹھتی، ایسا لگتا ہے جیسے اہل ہنود کے اجتماعی ضمیر کی موت ہو چکی ہو۔ ابانے کہا۔  
'جی ہاں! احمد آباد سے جو رپورٹیں آرہی ہیں اُسے پڑھ کر تو ایسا ہی لگتا ہے کہ اب ان لوگوں کے  
درمیان زندہ رہنا شاید زندگی کی توہین ہے۔ معصوم بچوں کو جس طرح ان کی ماؤں کے سامنے قتل کیا گیا،  
خاندان کے بڑوں کے سامنے جس طرح بہو بیٹیوں کی عصمت دری اور پھر انھیں انتہائی بہیمیت کے ساتھ مار  
ڈالا گیا، آبادی کی آبادی خالی ہو گئی حتیٰ کہ پولس کی پناہ میں آنے والے رفیوجی مسلمان بھی پناہ گزیں کیمپوں  
میں پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں قتل کر دیے گئے۔ معصوم بچوں کی آہ و بکا اور چیخ پکار بھی ان پتھر دل فساد یوں  
پر بے اثر ثابت ہوئیں۔' محبوب عالم صاحب نے افسوس کا اظہار کیا۔

ہاں آپ صحیح کہتے ہیں، آزادی کے وقت تو چلے لوگوں پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا، لیکن اب بیس  
بائیس سال بعد تو حالات ٹھہرے ٹھہرے ہیں، اب اسے محض پاگل پن نہیں کہا جاسکتا۔ یہ سب کچھ ایک منظم  
سوچی سمجھی سازش ہے۔ عبدالاحد صاحب نے پھر اپنی رائے دی، بولے: ایک بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے۔  
احمد آباد کے اس فساد میں مسجدوں اور درگاہوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا ہے۔ دراصل یہ ہماری ہر علامت کو

اس ملک سے مٹا ڈالنا چاہتے ہیں۔

انہیں شاید معلوم نہیں کہ اسلام کی فطرت میں قدرت نے کچک دی ہے۔ اس سے پہلے کہ مرتضیٰ صاحب اپنا شعر پورا کرتے گاؤں کی مسجد سے عشاء کی اذان بلند ہوئی۔ والد صاحب کی زبان سے بے ساختہ نکلا: واللہ المستعان۔ اور مردان خانہ کی یہ مجلس برخاست ہوگئی۔

کھانے کے بعد والدہ کی خدمت میں، میں نے مردان خانہ میں ہونے والی گفتگو کی روشنی میں احمد آباد فساد کا اپنا ورژن پیش کیا، خاص طور پر معصوم بچوں کے حوالے سے صورت حال پر روشنی ڈالی اور ساتھ ہی بے ساختہ یہ بھی پوچھ بیٹھا کہ لٹاں فساد کی کیا گاؤں میں بھی آنے والے ہیں، کیا وہ ہم لوگوں کو بھی واقعی مار ڈالیں گے؟ یہ سنتے ہی والدہ نے مجھے فرطِ محبت سے گود میں بھینچ لیا، پیشانی چومتے ہوئے بولیں: بیٹا! اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے، ہم لوگوں کا محافظ تو خدا ہے نا، وہ ہم لوگوں کو بے سہارا نہیں چھوڑے گا۔

والدہ کی ان باتوں سے کسی قدر تسلی تو ضرور ہوئی، لیکن ایک خوف تھا جو ایسا لگتا تھا اندرون میں سرایت کر گیا ہو۔ چاندنی رات میں آنگن کے اس حصے سے جہاں کیاریوں میں گلاب کے پھول کھلے تھے، میں نے غیر ارادی طور پر ایک پھول توڑا۔ اس کی خوشبو میں آج بھی نشاط کا وہی احساس تھا۔ ان کیاریوں کی دیکھ ریکھ منگلا کے ذمہ تھی جو کبھی بڑے چاؤ سے مجھے پھول پیش کرتا، کبھی درختوں سے پھل توڑ کر لاتا اور فصل کے موقع پر تو اس کا پورا خاندان کچھ اس طرح مصروف ہوتا کہ ہم بچوں کے لیے بہت سے تفریحی مشاغل ہاتھ آجاتے۔ گاؤں کی زندگی میں فصلوں کی کٹائی کے موقع پر ویسے بھی ایک جشن کا سماں ہوتا تھا۔ منگلا مذہباً ہندو تھا لیکن جب اذان کی آواز سن کر بڑی بوڑھیاں اپنے پلو درست کر رہی ہوتیں اور بزرگوں کی مجلسوں میں سکوت طاری ہو جاتا تو منگلا بھی بڑی عقیدت کے ساتھ اذان کے بول کو اس طرح سنتا جیسے وہ ایک ایک لفظ کو اپنے اندر جذب کرتا جا رہا ہو۔ منگلا ہم بچوں پر اپنی جان لٹاتا۔ وہ ہمارے شب و روز کا حصہ تھا۔ کبھی کبھی ایک اجنبیت کا احساس تو ہوتا جب وہ مذہب کے حوالے سے اپنے ناؤنوش کا اہتمام الگ کر لیتا، لیکن یہ خیال کبھی نہ آتا کہ وہ ہمارے خاندان کا حصہ نہیں ہے۔ اب جو احمد آباد کے فسادات کے حوالے سے ہندوؤں کے بہیمانہ ظلم کے تناظر میں مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کرتا تو یہ گتھی لائیکل معلوم ہوتی۔

## معراج والی مسجد

گاؤں سے کوئی میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہندوؤں کی ایک تاریخی زیارت گاہ اہیلا استھان کے نام سے واقع تھی۔ کہا جاتا تھا کہ وہاں سینتا کے قدموں کے نشانات موجود ہیں۔ بعضے کہتے کہ اہیلا دراصل گوتم رشی کی بیوی تھیں جو کسی کی بددعا سے پتھر میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ رام چندر جی جب اپنے قافلہ کے ساتھ ادھر سے گزرے تو انہوں نے اپنا قدم مبارک پتھر زدہ اہیلا پر رکھا جس کے طفیل وہ پھر سے اپنی اصل انسانی شکل میں واپس آ گئیں۔ یہ خیال عام تھا کہ مندر کے قریب جو تالاب ہے وہاں غوطہ لگانے سے جلد کی بیماریاں زائل ہو جاتی ہیں۔ اہیلا کے اس مندر میں بیکنوں کی بہت تو قیر تھی۔ زائرین خاص طور پر بیکنوں کا نذرانہ پیش کرتے۔ ایک سہ پہر غالباً رام نومی کے موقع پر جب اہیلا استھان کا سالانہ میلہ اپنے شباب پر تھا میں خاندان کے دوسرے بچوں کے ساتھ میلے میں جا نکلا۔ ہزاروں کا مجمع تھا، طرح طرح کے کھلونے، مختلف اشیاء کی دکانیں، لذت کام ودہن کا وافر انتظام، گویا جشن کا ایک سماں تھا۔ مندر کے قریب پرشاد لینے والوں کا ہجوم، پجاریوں نے دیکھا کہ ہم بچوں کے قدم اس ہجوم کی طرف نہیں اٹھ رہے ہیں تو وہ خود بڑھ کر ہماری طرف آیا اور ہمارے ہزار تکلف کے باوجود یہ کہتے ہوئے ہمارے ہاتھوں میں مٹھائیاں رکھ دیں کہ بھگوان کی کرپا ہے، یہ سب بیوئے سب کے لیے تو ہے۔ واپسی پر جب ہم لوگوں نے گھر میں بڑی بوڑھیوں سے مفت کی مٹھائی کا واقعہ بتایا تو وہاں یہ بحث چل نکلی کہ اس کا کھانا ہمارے لیے حلال تھا یا نہیں۔

اس مندر کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں پجاری کے عہدے پر ایک خاتون متمکن تھیں اور ہزاروں برس سے اس مندر کی یہی روایت چلی آتی تھی۔ ازمنہ قدیم کی مختلف داستانوں اور رامائن کے مختلف حوالوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے اہیلا استھان کا یہ مندر معبد سے کہیں زیادہ اس علاقے کا ایک ثقافتی مرکز تھا۔ سینتا کا میکہ یہاں سے قریب تھا۔ رام چندر جی یہیں سے ہو کر گزرے تھے جن کے قدموں کے طفیل گوتم رشی کی کنیا میں زندگی پھر سے لوٹ آئی تھی۔ ہر سال زندگی کی مسرتوں کے اس جشن میں بلا تفریق مذہب و ملت لوگ میلے کی بہاریں دیکھنے آتے۔ ہندومت کا یہ تصور بھی مانوس مانوس سا لگتا۔ پھر وہ کون سے لوگ ہیں اور کیسے ہندو ہیں

جو مسلمانوں کو اس ملک سے فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ بہت کچھ غور و فکر کے بعد بھی بات کچھ سمجھ میں نہ آئی۔  
 لہریا سرائے میں والد صاحب کے ساتھ صبح کی سیر کو جاتے ہوئے مندر کے لاؤڈ اسپیکر سے کچھ  
 دعائیہ نغمے جب سماعت سے ٹکراتے تو ایک عجیب مسرت کا احساس ہوتا۔ ایسا لگتا جیسے کوئی مقامی زبان میں  
 حمد و منقبت کے نغمے گارہا ہو۔

شری رادھے گووندا      من بھلے ہری کا پیارا نام ہے  
 گوپالا ہری کا پیارا نام ہے  
 نندالہ ہری کا پیارا نام ہے  
 شری رادھے گووندا      من بھلے ہری کا پیارا نام ہے  
 مورمکٹ سرگلبن مالا      کیسرتک لگائے  
 ورنداون کی کج گلی میں      سب کو ناناچ نچائے  
 سب کو ناناچ نچائے  
 من بھلے ہری کا پیارا نام ہے

شری رادھے گووندا

شجر و حجر کی جا بجا پرستش دیکھ کر ایک طرح کی الجھن تو ضرور ہوتی اور کبھی کالی کے مندر کے سامنے  
 سے گزرتے ہوئے اس کی شعلہ بار زبان کو دیکھ کر وحشت بھی ہوتی، لیکن چھٹھ کے میلوں میں خواتین کی بھگی  
 اور عبودیت میں لٹ پٹ تپسیا دیکھ کر اور جا بجا بھجن کیرتن کے ہاؤ ہو سے ایک عمومی تاثر یہی پیدا ہوتا کہ حق  
 ناشناسوں کے یہ طائفے بھی اپنے انداز سے روشنی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ گوشت پوست کے یہ عام ہندو  
 جن سے ہمارے حواس آشنا تھے اپنی تمام تر تہذیبی اجنبیت کے باوجود ایک طرح کی مانوسیت کا احساس  
 دلاتے۔ میری نگاہوں میں صبح کا وہ منظر بھی گھوم جاتا جب پھولوں کی ٹوکری لیے محلہ کا برہمن ہماری قیام گاہ  
 کے سامنے سے نارائن نارائن کی صدا لگاتے گزرتا تو ایک لمحہ کے لیے رک کر والد صاحب سے دعا سلام کرتا،  
 خیریت پوچھتا، مسکراہٹیں بکھیرتا اور پھر نارائن نارائن کا نعرہ مستانہ بلند کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ میں نے  
 بہت سوچا یہ سب بھی تو آخر ہندو ہی ہیں، پھر احمد آباد میں ان کے ہم قوموں کو آخر کیا ہو گیا ہے کہ وہ مسلمانوں  
 کے درپے آزار ہیں اور انھیں اس ملک سے اکھیڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔

ایک دن خیال آیا کیوں نہ اس بارے میں چچا بشیرا سے پوچھا جائے، آخر وہ بھی تو دنیا جہان کا علم  
 رکھتے ہیں۔ جب دیکھو اخبارات کی ورق گردانی میں مصروف یا پھر ریڈیو کی سوئی پران کی انگلیاں گردش کرتی

رہتی ہیں۔ چچا بشیرا کو جب بھی دیکھا انہیں ایک نعرہ الست سے سرشار پایا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ بارگاہِ رسولؐ میں جب وہ اپنی پرسوز آواز میں ”یا رسول خدا آسرا دیجئے“ کا نغمہ الاپتے تو سننے والوں پر بے خودی کی ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ بڑی بوڑھیوں کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔

یا رسول خدا آسرا دیجئے ورنہ اشکوں کے موتی بکھر جائیں گے

اب عنایت نہ ہوگی تو مر جائیں گے

یہ زمانے کے غم یہ ہزاروں ستم،

یا نبی تم سہارا نہ دو گے اگر، کس کو آواز دیں گے کدھر جائیں گے؟

چچا بشیرا زیادہ تر مردان خانہ میں ہی پڑے رہتے۔ بعض لوگ ان پر بویا حاجی کی پھبتی کہتے۔ یہ شاید اس لیے کہ وہ حاجیوں کے کسی قافلہ کے ساتھ بمبئی تک گئے تھے اور وہیں سے واپس لوٹ آئے تھے۔ گا ہے منقبت گاتے ہوئے خود کو تسلی دیتے کہ ابھی اذن نہیں ہے، مگر ایک دن سرکارِ مدینہ کا بلاوا ضرور آئے گا۔ ”غم اٹھاتے رہو مسکراتے رہو“ کی لے وہ اس وارفتگی سے بلند کرتے جیسے سبز گنبدِ چند منزل کے فاصلہ پر ہو

نعت پڑھتے رہو گنگناتے رہو

آفتیں ان کے صدقہ میں ڈھل جائیں گی

درد و غم آئیں گے اور گزر جائیں گے

اس زمانے میں ریڈیو سیلون سے تو ابلی میں ڈھلی ایسی نعتیں کثرت سے نشر ہوتیں تب یہ بات سمجھ میں کم آتی تھی کہ منقبتِ سماعیوں اور قوالیوں میں دکھے دلوں کی مداومت کا کتنا سامان پنہاں تھا۔

پہلے تو چچا بشیرا نے ٹالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے میری آمد کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ وہ شاید کسی اور ہی دنیا میں کھوئے تھے۔ ریڈیو کی سوئی غوں غاں کی آواز کے بعد اب ایک جگہ ٹھہر گئی تھی جہاں کوئی مغنیہ غم و اندوہ سے ڈوبی سحر انگیز آواز میں یہ نغمہ گارہی تھی:

کیسے چلے گی ہم سے یہ زندگی کی ٹیا

کیوں چھوڑ کر چلے ہو طوفان میں کھوٹیا

منجدھار میں ہماری ٹیا نہ ڈوب جائے

ڈوبا گنگن میں سورج لو چھا گیا اندھیرا

نہ جانے زندگی میں کب آئے گا سویرا

مجھے ایسا لگا جیسے یہ غم انگیز نغمہ ہماری اپنی محزون ملی زندگی پر تبصرہ ہو۔ اب تک ان ریڈیائی نغموں کو

میں محض لہو و لعاب میں شمار کرتا تھا، آج پچا بشیرا کی صحبت میں بیٹھ کر ایسا لگا جیسے اس نوحہ خوانی سے ہماری اپنی زندگی کے تار جڑے ہوئے ہوں۔ اس سے پہلے کہ پچا بشیرا کی انگلیاں ریڈیو کی سوئی پر پھر سے چلنے لگتیں اور کسی اسٹیشن سے کوئی نیا نغمہ یا قوالی جاری ہو جاتا، میں نے پچا بشیرا کی طرف تازہ اخبار بڑھاتے ہوئے کہا کہ اخبار بعد میں پڑھئے گا، پہلے یہ بتائیے کہ احمد آباد سے مسلمانوں کے قتل و خون کی جو خبریں آرہی ہیں اس کی اصل وجہ کیا ہے؟ اچانک ان ہندوؤں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہمیں اس ملک سے در بدر کر دینا چاہتے ہیں۔

بولے: سیاست ہے، مذہب کا تو بس حوالہ ہے۔

کیا مطلب؟ میری سمجھ میں کچھ بات نہ آئی، میں نے پوچھا۔ آخر ہمارے گاؤں کے اطراف میں بھی تو ہندو رہتے ہیں اور اپنا منگلا اور اس کا سارا خاندان بھی تو ہندو ہے، کتنا پیارا ہے وہ۔

میرے ان معصومانہ سوالات کو سن کر پچا بشیرا کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہویدا ہوئی، بولے:

بیٹے! عام ہندو ہمارے خلاف نہیں، ان سے تو ہمارا صدیوں کا میل ملاپ رہا ہے، البتہ ہندوؤں کا مقتدر طبقہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ان کی بالادستی کو چیلنج کیا جائے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں ہزاروں سال سے نیچی ذات کے ہندوؤں کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسلام کی تعلیم مساوات سے متاثر ہو کر ان میں سے بہتوں نے اسلام قبول کر لیا اور اب آزادی کے بعد دستور میں نہ صرف یہ کہ مساوات، انصاف، حریت اور مواخات کی ضمانت دی گئی بلکہ نیچی ذات کے ہندوؤں کو ریزرویشن جیسی مراعات بھی عطا کر دی گئیں۔ ہندوؤں کا مقتدر طبقہ اس سماجی اور نظری انقلاب کے لیے اسلام اور مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ ان کی بعض تنظیمیں یہ سمجھتی ہیں کہ جب تک مسلمان اپنے نظری پیغام کے ساتھ اس ملک میں موجود ہیں اونچی ذات کے ہندوؤں کی بالادستی مستحکم نہیں ہو سکتی۔

اس وقت پچا بشیرا کی یہ توجیہ کچھ زیادہ سمجھ میں نہ آئی، ہاں اس بات کا اندازہ ضرور ہوا کہ ہندو دراصل دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اچھے ہندوؤں میں اپنا منگلا اور مندر کا چھوٹا پجاری جو اکثر پچا شبراتی کے ساتھ گپیں مارتا دکھائی دیتا اور جس نے میلے کے موقع پر ہم بچوں کو مٹھائیاں کھلائی تھیں، البتہ برے ہندوؤں کا اب تک میرا کوئی ذاتی تجربہ نہ تھا، ان کے دل و زمزم کی داستانیں ہمیں اخبارات کے ذریعہ پہنچی تھیں۔

ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک عورت اپنے سر پر پانی کا ایک گھڑا لیے چلی آرہی ہے، اس کے ساتھ اس کا سات آٹھ سالہ بچہ ہے۔ ارے یہ تو احمد ہے، ہمارے کھیل کا ساتھی۔ اچانک تیز ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے، اس کی ماں اپنا توازن کھو دیتی ہے، گھڑا اس کے سر سے گرتے ہی ایک چیخ بلند ہوتی ہے اور احمد کا سر ایک فٹ بال کی طرح اس کے شانے سے لڑھک کر دور جا گرتا ہے۔ کٹے سر کے بچہ کے ساتھ وہ آگے بڑھتی

ہے۔ اس کے قدم نہیں رکتے۔ اچانک شور سنائی دیتا ہے۔ لوگوں کا ہجوم ہاتھوں میں نیزے اور زبان پر جئے بجرنگ بلی کے نعرے۔ مندر کا پجاری، ارے ہاں اور وہ اپنا منگلا اور اس کے ہاتھوں میں گرز بالکل ویسا ہی جیسا طلسماتی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ گرز کی نوک سے شعلے نکل رہے ہیں۔ وہ میری طرف بڑھتا ہے، لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہو، میری چیخ نکل جاتی ہے۔ والدہ مجھے جھنجھوڑ کر اٹھاتی ہیں۔ کیا کوئی خواب دیکھ رہے تھے، ڈراؤنا خواب۔ میں کہتی ہوں کہ سوتے وقت طلسماتی کہانیاں نہ پڑھا کرو۔

اب انھیں میں کیسے بتاتا کہ یہ خطرہ حقیقی ہے۔ احمد آباد میں بے شمار ماؤں پر جو قیامت گزری ہے اس کے چیدہ چیدہ واقعات کا سلسلہ اب بھی اخبار و رسائل میں جاری تھا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ گھر کے اطراف میں جہاں باغات کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، ہرن فلائیں بھر رہے ہیں، آسمان بادلوں سے ڈھکا ہے، بچے طرح طرح کے کھیلوں میں مگن ہیں اور اسی اثناء اچانک گھوڑے پر سوار ایک شخص ہاتھ میں تلوار لئے ہماری طرف بڑھتا ہے۔ ارے اس کے ہاتھ میں تو وہی ذوالفقار ہے جو ہمارے گھر میں بڑے افتخار و اہتمام سے آویزاں رہتی ہے اور یہ شہسوار کون ہے؟ یہ تو منگلا سے مشابہ لگتا ہے، ارے یہ تو وہی ہے۔ وحشت کے مارے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں نے سوچا، اپنا منگلا تو ایسا نہیں، پھر یہ خواب میں تلوار سونت کر میری طرف کیوں بڑھتا ہے۔

ایک شب سوتے ہوئے معراج والی مسجد میں جا پہنچا، کیا دیکھتا ہوں کہ مسجد کے طاق میں جو شمع روشن ہے اسے کچھ لوگ خاموش کرنے کے درپے ہیں۔ یہ لوگ جیسے ہی شمع بجھا کر جاتے ہیں، میں اسے پھر سے روشن کر دیتا ہوں۔ جلنے بجھنے کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے۔ خوابوں کا یہ سلسلہ جو دراز ہوا تو اب دن کے وقت بھی اپنے گرد و پیش پر ایک طلسماتی دنیا کا گمان ہوتا۔ برآمدے میں دیواروں پر بارہ سنگھے، نیل گائے اور دوسرے شکار کردہ جانوروں کے سردت سے نمائشی طور پر آویزاں چلے آتے تھے، اب ہر لمحے یہ دھڑکا لگا رہتا کہ نہ جانے کب کون سا طلسم انھیں دوبارہ متحرک کر دے۔ کھیت و کھلیان اور ہرے بھرے پھلدار درختوں کے لامتناہی سلسلے، جا بجا تالابوں میں تیرتے بطخ اور مرغائیاں جو کبھی فرحت و انبساط کا احساس دلاتیں، فطرت کی گود میں چڑیوں کی چچہاہٹ لوریوں کا سا لطف دیتی، اب ان ہی سبزہ زاروں اور باغات سے وحشت ہونے لگی۔ اندیشہ لگا رہتا کہ نہ جانے کب کس جھاڑی کے پیچھے سے دشمن تلوار سونت کر سامنے آ جائے۔ کٹے سر والا احمد میرے چشم تصور میں پھر سے آ موجود ہوتا۔ ایک دن عین دوپہر کی دھوپ میں گھر کو لوٹتے ہوئے، مجھے ایسا لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہو خدا حافظ۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ آگے بڑھا پھر وہی آواز آئی۔ میں نے جب والد صاحب سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے اس واقعہ کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی۔ کہنے لگے خدا حافظ ہی تو کہہ رہا تھا، اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔

ان دنوں گاؤں میں جن بھوت کی کہانیوں کا بھی بڑا چرچا رہتا۔ کچھ کہانیاں تو شاید بڑی بوڑھیوں کے تخیل کی پیداوار تھیں، جو بچوں کو شام ڈھلے گھر میں مقید رکھنے کے لیے ازراہ تنبیہ سنا دیا کرتیں۔ پھر ان کی مستقل روایت اور تخیل کی تخم ریزی سے بچوں کو قابو میں کرنا آسان ہو جاتا اور چھوٹے بچے ان کہانیوں کے خوف سے نوالے بھی بلا چوں چرا اور جلد کھا لیتے۔ البتہ میرا تجربہ ان کہانیوں سے ذرا مختلف تھا۔ ابتداءً جب میں گاؤں میں آیا تھا تو یہاں کی بتول فطرت ہرے بھرے پھلوں سے لدے درخت اور مرغزاروں کا سربز و شاداب سلسلہ ایک ناقابل بیان حظ کا احساس دلاتے۔ گھر سے مدرسے جاتے ہوئے مجھے یاد نہیں ہے کہ کبھی میں بے کیف اور بوجھل چلا ہوں گا۔ وہی ہرنوں والا انداز جیسے چلتے نہ ہوں فلاں نہیں بھرتے ہوں۔ تب میرے لیے اس عمل کی عقلی توجیہ مشکل تھی، اب جو پلٹ کر دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ فطرت کی گود میں جہاں ہر طرف زندگی اپنی اصل ابعاد پر قائم ہو، فطرت مسخ نہ کی گئی ہو اور انسانوں کے دل و دماغ کو رنگ و نسل، امیر و غریب اور ہندو مسلمان کے امتیازات نے آلودہ نہ کیا ہو اور اس پر سے بچپن کی معصومیت، تو بھلا فطرت کی ایک ایسی وادی میں کون نہ اترائے چلے گا۔ لیکن معراج والی مسجد میں آگ زنی کا واقعہ اور احمد آباد میں مسلمانوں کی خانہ بربادی کے نہ تھمنے والے واقعات نے سچ پوچھئے تو مجھ سے میرا بچپن چھین لیا تھا۔ وہی کھیت و کھلیاں جہاں کبھی میں اکیلا دور تک نکل جاتا، اب مجھے ان سے وحشت ہونے لگی۔ یہ جھاڑیاں اور یہ درخت جب خوابوں میں مجسم ہوتے تو ان کی وحشت ناقابل بیان ہو جاتی۔

ایک دن اچانک جو آنکھ کھلی تو ایسا لگا کہ خوابوں کے وحشت ناک مناظر عالم بیداری سے جڑ گئے ہوں۔ ارے وہ دیکھو پکڑو... آگ، دھواں، نیزہ.... اور اس کے ہاتھوں میں تو ذوالفقار بھی ہے، میں نے چیخ پکار کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ کہاں؟ کوئی نہیں، لوگوں نے مجھے جھنجھوٹنے اور بیدار کرنے کی کوشش کی۔ میں مختلف سمتوں میں اشارے کرتا رہا۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں، وہاں صحن میں۔ ارے یہ تو منگلا ہے۔ اب جو حواس بحال ہوئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ منگلا پھولوں کی کیاریوں کو پانی دے رہا ہے۔ مجھے وحشت زدہ دیکھ دانت نکوستے ہوئے بولا: 'ننیا میں ڈر گینل'۔ اور یہ کہتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ میں تازہ گلاب تھما دیا۔ خوابوں کا یہ سلسلہ طویل ہوا تو والد صاحب کو فکر ہوئی کہ صاحب زادے کب تک طلسماتی کہانیوں میں گم رہیں گے۔ اب ان کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے، سو ایک دن وہ مجھے اپنے ساتھ شہر لے آئے۔ عام طور پر اختتام ہفتہ پر رخصت ہوتے ہوئے والد صاحب ڈیوڑھی پر رک کر شیر وانی کے بٹن درست کرتے، والدہ کو خدا حافظ کہتے ہوئے ان کے ہاتھوں سے الوداعی پان قبول کرتے، حالانکہ وہ پان کے رسیا نہ تھے۔ اس دفعہ پان کے ساتھ والدہ نے مجھے بھی مختصر زادراہ کے ساتھ ان کے حوالے کر دیا۔

## یہ وہ سحر تو نہیں

گاؤں چھوٹے کا ابتداً تو کوئی افسوس نہ ہوا، شاید یہ اس لیے بھی کہ میرا یہ سفر آناً فاناً ترتیب پایا اور مجھے اس کے اسرار و عواقب پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا، لیکن ٹرین نے جب چلنے کی سیٹی بجائی اور کھڑکی سے لہلہاتے کھیت اور درختوں کے قطار الوداع کہنے لگے تو گاؤں کی مسرت بھری زندگی، ہم عمروں کی مجلسیں اور مردان خانے کی صحبتیں بہت یاد آئیں۔ مگر پھر اس خیال سے تسلی ہوئی کہ وہاں شہر میں طرح طرح کی دلچسپ کتابوں کے انبار ہوں گے، اخبارات و رسائل کی فراوانی ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مکتبہ کے علمی چوپال میں حاضری کا موقع رہے گا۔ ویسے بھی ادھر کچھ دنوں سے ہم جلیسوں کی صحبت میں خود کو تنہا محسوس کرتا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی میرے کانوں میں سرگوشی کرتا ہو، کھیت و کھلیان کی وسعت سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی، سو یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ شہر میں اس وحشت سے بچھا تو چھوٹ ہی جائے گا۔

ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک صبح اچانک دروازہ پر دستک ہوئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ عالم رکشے والا کچھ کہتے کہتے فرط جذبات میں رو پڑتا ہے۔ والد صاحب اسے تسلی تو دے رہے ہیں، لیکن اس عمل میں خود ان کی اپنی آنکھیں بار بار نم ہو جاتی ہیں۔ پتہ چلا کہ احمد آباد کے جس فساد کا تذکرہ ہم لوگ اخباروں میں پڑھتے رہے ہیں، اس آگ کی لپٹ عالم رکشے والے کے گھر تک آ پہنچی ہے۔ عالم رکشے والے اپنی محنت اور ایمان داری کے لیے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ ان دسیوں لوگوں میں تھے جو والد صاحب کے پاس اپنی امانتیں اور پس انداز کی ہوئی رقمیں جمع کرتے رہتے تھے تا کہ آنے والے دنوں میں کسی مناسب کاروبار کا ڈول ڈال سکیں۔ اس طرح کے نہ جانے کتنے لوگوں کے لیے والد صاحب نے خود کو بینکر بنا رکھا تھا۔ عالم رکشے والے نے بھی شب و روز کی محنت کے بعد ایک معقول رقم پس انداز کر لی تھی، لیکن احمد آباد کے فساد نے ان کی امنگوں کا خون کر دیا تھا جہاں ان کے بھائی فساد میں مارے گئے اور ان کا آدھا خاندان بھی تباہ ہو گیا تھا۔

اب بچا ہی کیا ہے، آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ کہتے ہوئے عالم رکشے والے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

حوصلہ سے کام لو، اب اپنے بھائی کے بچوں کی کفالت بھی تمہیں کرنی ہے اور ان کی بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام بھی، اب پہلے سے کہیں زیادہ ہماری ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔ ہمیں ہر حال میں ثابت قدم رہنا ہے، ورنہ دشمنوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے۔

عالم رکشے والے تو اپنی رودادِ غم سنا کر چلے گئے لیکن ان کی باتیں سن کر مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ احمد آباد میں مسلمانوں کو جس سنگین صورت حال کا سامنا ہے وہ محض دور دراز کی خبر نہیں بلکہ بیٹا اور محسوس تجربہ ہے، جس نے عالم رکشے والے کے مستقبل کی ساری منصوبہ بندی پر پانی پھیر دیا ہے۔

اگلے دن ذکی صاحب نے احمد آباد کے فساد کا ذکر دوبارہ چھیڑ دیا۔ ویسے تو ذکی صاحب مقامی کالج میں ریاضی کے پروفیسر تھے، لیکن ہم نے انہیں ہمیشہ امت کے سود و زیاں کا حساب لگاتے دیکھا۔ وہ اکثر کالج سے لوٹتے ہوئے مکتبہ میں کچھ دیر کے لیے رکتے، حالات حاضرہ پر اظہار خیال کرتے یا کسی علمی موضوع پر گفتگو چھیڑ دیتے۔ آج ان کی آنکھوں میں ایک طرح کی فکر مندی، بلکہ مایوسی نظر آئی۔

بولے: حافظ صاحب، حالات بہت خراب ہیں، بس یہ سمجھئے کہ ایک بار پھر سقوطِ دہلی والی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ پھر کہنے لگے، احمد آباد کے فسادات کی جو تفصیلات اب چھن چھن کر آرہی ہیں اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ ایک قیامت تھی جو گزر گئی۔ کیا نادر شاہ کے حملے کو لوگ یاد کرتے ہیں۔

جی ہاں اللہ خیر کرے صورت حال بہت سنگین ہے۔ والد صاحب نے تشویش کا اظہار کیا، فرمایا: دراصل سینتالیس کے بعد یہاں ہر روز ایک سقوط کا سامنا ہے۔ سقوطِ دہلی تو قاتل نگاروں کو نظر آجاتا ہے، لیکن اس سقوط کا علم عام طور پر لوگوں کو کم ہی ہوتا ہے جس سے ہم سینتالیس کے بعد سے دوچار ہیں۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ہر روز مسلسل کوئی چیز ٹوٹی بکھرتی جاتی ہو اور یہ سلسلہ روکے نہیں رکتا؟

ہاں بات تو درست ہے۔ ذکی صاحب نے تائید کی۔ بولے: ہم لوگ تو یہ سمجھتے تھے کہ تقسیم کا زخم جلد ہی مندمل ہو جائے گا اور زندگی معمول پر لوٹ آئے گی، لیکن احمد آباد کے فسادات نے تو خطرہ کی گھنٹی بجادی ہے۔ کانگریسی مسلمانوں میں بھی سراسیمگی ہے۔ مولانا عبدالعلیم کل بھائی صاحب کے پاس آئے تھے، اس سے پہلے ہم نے ان کو کبھی اس قدر وحشت زدہ نہیں دیکھا۔ کہتے تھے کانگریس نے مسلمانوں سے منہ پھیر لیا ہے۔ اندرا گاندھی کو مسلم مسئلہ پر اپنے رفقاء کی مخالفت کا سامنا ہے۔ ایسے وقت میں مولانا کا کہنا تھا کہ وزیراعظم پر طعن و تشنیع کے بجائے ان کا ساتھ دیا جائے۔

’عجیب! والد صاحب نے حیرت کا اظہار کیا، بولے: یہ مولانا لوگ آخر کب سمجھیں گے؟

پھر آگے کیا ہونے والا ہے، حافظ صاحب؟

ذکی صاحب نے سوال کی دھار صیقل کرتے ہوئے پوچھا۔  
میرے خیال میں ایک نسل تو صرف اس فریب کاری کو سمجھنے میں گزر جائے گی۔ اور جب آنکھ کھلے گی  
تو پتہ چلے گا کہ کہاں کی آزادی اور کیسی جمہوریت؟

وہ کہا ہے نافیض نے 'وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں'۔ شاداں فاروقی صاحب جو بظاہر کسی کتاب  
کے خاموش مطالعہ میں مصروف یہ گفتگو سن رہے تھے، انھوں نے مداخلت کی۔ بولے: مایوسی تو سرحد کے  
دونوں طرف ہے، مسلمانوں کے لیے تو یہ آزادی تقسیم بن کر طلوع ہوئی جس نے ان کی عددی قوت کو تین  
جغرافیائی حصوں میں تقسیم کر دیا اور یہ جو آپ سقوطِ دہلی کی بات کہہ رہے تھے تو یہ سچ ہے کہ اس کا نفسیاتی زخم  
ابھی تک تازہ ہے اور اس زخم سے اب تک خون رس رہا ہے۔

ان بزرگوں کی باتیں کچھ سمجھ میں آئیں کچھ نہ آئیں۔ میں نے سوچا پتہ نہیں یہ کون سا زخم ہے جس  
سے خون رستا بھی ہے اور دکھائی نہیں دیتا۔ شاداں صاحب بے سروالے بچے کی بات تو نہیں کر رہے ہیں، جو  
مجھے خوابوں میں نظر آتا اور پھر ایک قسم کی سراسیمگی مجھے کئی دنوں تک اپنی گرفت میں لیے رہتی ہے۔ بچے کے  
سر کا اچانک جسم سے الگ ہو کر لڑھک جانا اور شہہ رگ سے بہتے خون کے دھارے میری نگاہوں میں  
پھرنے لگتے۔ میں نے سوچا عالم رکشہ والے سچ ہی تو کہتے تھے۔ انھوں نے کتنے جتن اور کتنی مشقت سے کچھ  
رقم پس انداز کی تھی، ان کا ارادہ تھا کہ وہ جلد ہی احمد آباد سے اپنے بھائی کو بلائیں گے اور پھر اس کے ساتھ اسی  
شہر میں کسی چھوٹے سے کاروبار کی کوشش کریں گے۔ مجھے ان کا بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا اور یہ کہنا کہ  
کیا مسلمانوں کو اس ملک میں ایک باعزت اور پر امن زندگی کا حق حاصل نہیں؟ ان کا یہ جملہ مجھے بار بار یاد  
آتا، لیکن سقوط کا زخم اور اس کا مسلسل رینا، بے سر کا بچہ اور خون کے بہتے دھارے، یہ سب مل کر بھی کوئی واضح  
تصویر پیش کرنے سے قاصر رہتے۔

ملکتہ میں روز ڈاک سے کچھ نہ کچھ ضرور آتا۔ طرح طرح کے اخبارات و رسائل، پوسٹ کارڈ اور  
لفافے، نئی کتابوں کی فہرست، فاتحہ کرانے کے اشتہاری خطوط، قتل اور نیاز کے پیسے بھیجنے کے لیے مختلف  
خانقاہوں کے مطبوعہ منی آرڈر فارم۔ بعض دفعہ ان لفافوں سے قتل کے شکر پارے بھی برآمد ہوتے، جو بطور  
تبرک اس خیال سے بھیجے جاتے کہ شاید ان کی برکتوں سے لوگوں میں رقم ارسال کرنے کا داعیہ پیدا ہو۔ ایک  
دن منادی نام کے رسالہ پر میری نگاہ اٹک کر رہ گئی جس میں ایک نئی کتاب 'اعمال حزب البحر' کا اشتہار شائع  
ہوا تھا۔ لکھا تھا کہ 'اعمال حزب البحر' کے اس نئے ایڈیشن میں ان خاص اعمال کو درج کیا گیا ہے جن کو مشائخ  
برسوں خدمت لیے بغیر ظاہر نہیں کرتے اور سب سے اہم بات یہ کہ تقدیر بدلنے کا عمل بھی اس میں موجود

ہے، جو حضرت خواجہ نے خاص محرم راز اشخاص کے لیے قلمبند کیا تھا اور ان سب خوبیوں کے باوجود اس کتاب کا ہدیہ صرف تین روپے پچاس پیسے علاوہ محصول ڈاک۔ اشتہار پڑھ کر کتاب میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اسی رسالہ میں خواجہ صاحب کی ایک اور کتاب کا اشتہار بھی شائع ہوا تھا، لکھا تھا: اسرار کلام اللہ واسم اعظم (نیا ایڈیشن)۔ لیکن شرط یہ تھی کہ یہ کتاب رازداری کا تحریری اقرار نامہ بھیج کر ہی حاصل کی جاسکتی تھی۔ لکھا تھا کہ یہ شرط اس لیے ہے کہ اس میں کلام اللہ اور اسم اعظم کے نہایت خفیہ راز درج کیے گئے ہیں، جن کا نااہل لوگوں تک پہنچنا مناسب نہیں۔ (ہدیہ تین روپے)۔ اگلے صفحہ پر سترہویں شریف میں شرکت کا بلاوا کے عنوان سے قارئین کو باخبر کیا گیا تھا کہ اس موقع پر حل مشکلات کے لیے ہمیشہ کی طرح خاص ختم بھی پڑھوائے جائیں گے، سو حاجت مندوں سے گزارش کی گئی تھی کہ عرس سے قبل مطلع فرمادیں کہ کس کام کے لیے ختم پڑھوانا ہے یا دعا کرانی ہے۔ نیچے ٹیلی فون نمبر کے ساتھ تاریخ اور ڈاک کے پتے بھی درج تھے۔

میں نے سوچا کیوں نہ اس نسخہ کو بھی آزما یا جائے۔ کیا عجب کہ حل مشکلات کا یہ تیرا اپنے نشانے پر جا لگے، البتہ دل میں ایک طرح کا شبہ بلکہ وسوسہ باقی رہا۔ بالآخر تجسس کا داعیہ غالب آیا اور میں نے ایک پوسٹ کارڈ حجرہ قدیم، درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین کی خدمت میں ارسال کرنے کی ٹھان لی۔ چند دن خاموشی رہی، پھر ایک دن ایک اشتہاری لفافہ قل کے سفید شکر پاروں کے ساتھ موصول ہوا، ساتھ میں پانچ روپے کا ایک مطبوعہ منی آرڈر فارم مکتوب الیہ کے مکمل پتے کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ یہ پہلی برکت تھی جو میرے قلم سے ظاہر ہوئی۔ والد صاحب کو جب یہ پتہ چلا کہ میں نے حل مشکلات اور تقدیر بدلنے کے خیال سے خواجہ حسن ثانی کی خدمت میں پوسٹ کارڈ ارسال کیا تھا جس کے جواب میں یہ شکر پارے موصول ہوئے ہیں تو وہ صرف زیر لب مسکرا کر رہ گئے۔

جاڑے کی آمد آمد تھی اور نئے سال کی ابتدا سے ارشد بھائی جو مجھ سے عمر میں دو ڈھائی سال بڑے ہوں گے، انھیں اسکول میں باضابطہ داخل کرنے کی تیاری چل رہی تھی۔ ایک استاد انگریزی اور ریاضی کی تعلیم اور خوش خطی کی تربیت کے لیے ہر دن آیا کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب کی تحریر بڑی خوش خط تھی، جب وہ سفید دبیز کاغذ پر بانس کی پکچھیوں سے تراشے گئے قلم سے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تو میں بس محو حیرت ان کی انگلیوں کی جنبش اور فن کے کمال کو دیکھتا رہتا۔ ایک دن ماسٹر صاحب کی خدمت میں چائے کی پیالی لے کر آ رہا تھا کہ کواڑ سے لٹکی ہوئی چھڑی پر نظر پڑ گئی۔ ایک نادر خیال میرے تصور میں کوند گیا۔ ماسٹر صاحب فرش پر چٹائی بچھا کر آلتی پالتی بیٹھتے۔ بڑے تقطیع کا کاغذ ان کی گود میں ہوتا اور وہ فرش پر رکھے ہوئے دوات میں قلم کو ڈبو تے اور فن کی تخلیق میں محو ہو جاتے۔ میں نے چھڑی کے دستہ کو الماری کے پیچھے سے چھپ کر کچھ اس طرح

جنہنش دی کہ چشم زدن میں دوات اُلٹ گئی۔ ماسٹر صاحب کا انہماک جاتا رہا۔ ارشد بھائی اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن اس سے پہلے کہ لوگ اس افتاد کو سمجھ پاتے میں منظر سے غائب ہو چکا تھا۔ گھر میں یہ خبر پھیلی تو لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہ شرارت بھلا مجھ سے کیسے سرزد ہو سکتی ہے۔ چھڑی کا دستہ نشانہ پر لگا تھا سو ایک لمحہ کے لیے تو مجھے خوشی ہوئی، لیکن جلد ہی پشیمانی نے اپنی حصار میں لے لیا۔ والد صاحب نے سرزنش کرنے کے بجائے صرف اتنا کہا کہ جسے خدا عاصی جیسی چیز دیتا ہے اس کی ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت اس قول کے فلسفیانہ پہلو پر توجہ نہ گئی، آج جب سوچتا ہوں تو ان کے اس طرز تربیت کی قدر ننگا ہوں میں بڑھ جاتی ہے۔

ابھی اسکول میں میرے داخلہ کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ تیاری تو بڑے بھائی کو کرائی جا رہی تھی، میں ان کے ساتھ اسکول جانے کے لئے مصر ہو گیا۔ وہاں ماحول کچھ مانوس مانوس سا لگا۔ ایک بات تو یہ دیکھی کہ اسکول کے زیادہ تر اساتذہ کچھ جانے پہچانے سے ہیں، جن کی گاہے بہ گاہے مکتبہ میں آمد و رفت رہتی ہے۔ ماسٹرانس صاحب جو چھٹی جماعت کے کلاس ٹیچر تھے، طلباء کو ڈرائنگ کی تعلیم دے رہے تھے۔ انھوں نے پنسل کی نوک سے سفید کاغذ پر کچھ اس طرح لکیریں کھینچیں کہ پہلے تو ایک خوبصورت سا اسٹول طلوع ہوا اور پھر دیکھتے دیکھتے اس اسٹول پر پشتری اور چائے کی پیالی وجود میں آ گئی۔ اب انھوں نے پیالی کے اوپر آڑی ترچھی پنسلوں کو کچھ اس طرح حرکت دی کہ پیالی سے بھاپ اٹھتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ مجھے یہ پورا عمل بڑا دلچسپ معلوم ہوا۔ میں نے سوچا اگر چھٹی جماعت میں پڑھائی کا یہی انداز ہے پھر تو یہاں لطف و انبساط کا بڑا سامان رہے گا۔ میرے غیر معمولی اصرار پر ارشد بھائی کے ساتھ ہی چھٹی جماعت میں میرا بھی داخلہ ہو گیا۔

اسکول سے گھر کا فاصلہ کوئی ڈیڑھ دو کلومیٹر کا تھا۔ راستہ میں کچھ اور بھی اسکول پڑتے تھے اور گھر سے کسی قدر قریب شہر کا سب سے بڑا سرکاری اسکول بھی واقع تھا، لیکن اس اسکول کا انتخاب اس بنا پر کیا گیا تھا کہ یہاں نسبتاً ایک دینی ماحول تھا اور غالب اکثریت مسلم طلباء و اساتذہ کی تھی۔ شہر کے بالکل آخری سرے پر ایک عیسائی مشنری اسکول بھی تھا، مگر وہاں مسلمان اپنے بچوں کا داخلہ کرانا بمنزلہ گناہ سمجھتے تھے یا کم از کم وہاں بھیجنے کو معیوب تو سمجھا ہی جاتا تھا۔ اسکول میں اردو زبان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہاں صرف ذریعہ تعلیم ہی اردو نہ تھا بلکہ بزمِ اردو کی ہفت روزہ سرگرمیوں کے علاوہ ہر کلاس میں کتب و رسائل کا ایک چھوٹا سا کلب متحرک رہتا تھا۔ یہیں مجھے طلباء کی زبانی پہلی بار اس بات کا اندازہ ہوا کہ مسلم معاشرہ اشراف اور اجلاف کے دو مختلف طبقات پر منقسم ہے۔ یہیں میں نے پہلی بار عبدالقیوم انصاری کا نام سنا۔ طلباء کی اکثریت

جو شہر کے مسلم اکثریتی علاقوں سے آتی تھی ان کے نام کے دیوانے تھے۔ عبدالقیوم مومن کانفرنس کے قائد تھے اور ان کے ماننے والے اندرا گاندھی کو مسلمانوں کا ہمدرد و نمگسار سمجھتے تھے۔ نہ تو ان طلباء کے پاس کانفرنس کی حمایت کے لیے کوئی عقلی دلیل تھی اور نہ ہی میری سیاست پر کوئی ایسی نظر کہ میں اس قضیہ کا فیصلہ کر پاتا۔ بس ذہن پر یہ تاثر قائم ہوا کہ احمد آباد میں جہاں کانگریس کی حکومت میں مسلمانوں پر قیامت صغریٰ برپا ہوئی اور جس کی تفصیلات سے اب بھی روٹ گئے کھڑے ہو جاتے ہیں، اسی کانگریس کو اپنا دشمن قرار دینے کے سلسلے میں مسلمانوں میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔

ایک دن پتہ چلا کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی شہر میں آنے والی ہیں۔ پولو میدان جہاں انھیں عوامی مجمع سے خطاب کرنا تھا، ہمارے گھر سے دور نہ تھا، بلکہ اس زمانہ میں جب دور دور تک غیر آباد زمینیں ہوا کرتی تھیں، مکتبہ سے پولو میدان صاف نظر آتا تھا۔ یہ ایک نادر موقع تھا۔ میں نے والد صاحب سے اجازت لی اور ان کی انتخابی ریلی میں جا پہنچا۔ شہر میں جب بھی کوئی بڑے سیاسی لیڈر یا علمی و مذہبی شخصیت کی آمد ہوتی تو ایسے موقعوں پر ہم لوگوں کو وہاں جانے کی اجازت مل جاتی۔ مسز گاندھی کی آمد پر بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ ان کی تقریر جوش و جذبہ سے خالی مگر التجا اور گذارش سے پڑتی۔ آواز میں ایک طرح کا نسوانی سحر تھا، جس سے سننے والے کے اندر یہ داعیہ پیدا ہوتا کہ یہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہو، اسے ووٹ دینے میں کوئی حرج نہیں اور اگر انھیں بھاری اکثریت مل گئی تو وہ اس ملک سے غربت کا نام و نشان مٹا ڈالیں گی۔ واپس آ کر جب میں نے والد صاحب کو یہ رپورٹ پیش کی کہ اندرا گاندھی اس ملک سے غریبی ہٹانا چاہتی ہیں تو انھوں نے میری سادگی پر تبسم فرمایا، بولے: وہ دراصل غریبی کو نہیں بلکہ غریب ہی کو ختم کر دینا چاہتی ہیں۔ نہ رہے بانس نہ بچے بانسری۔

مسز گاندھی کے انتخابی دورے نے شہر میں ایک ہلچل کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ غریبی ہٹاؤ کے دلفریب نعرے نے عام لوگوں کے درمیان ان کی مقبولیت بڑھادی تھی، لیکن احمد آباد کے فسادات کے زخم ابھی تازہ تھے جو خود کانگریس کی حکومت کے زیر انصرام انجام پائے تھے۔ مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک طرح کا کنفیوژن تھا۔ فساد نے ان کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔ تو کیا مسلمان پھر کانگریس کو ہی ووٹ دیں گے؟ مجھے پولو میدان میں مسز گاندھی کی شیریں مقالی یاد آتی۔ کتنی فکر مندی تھی ان کے لب و لہجہ میں، غریبوں اور کمزوروں کے لیے۔ پھر والد صاحب کا رویہ ان کی طرف ناقدانہ بلکہ مخالفانہ کیوں ہے؟ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا۔ والد صاحب کا معمول تھا کہ وہ اکثر روزنامہ اخبارات ہم بھائیوں سے پڑھوا کر سنتے۔ گاہے بہ گاہے یہ خدمت میرے حصہ میں بھی آتی۔ ایک دن میں نے انھیں خبروں کے حوالے سے بتایا کہ

مومنین کی جماعت نے متحدہ طور پر اندرا گاندھی کی حمایت کا فیصلہ کیا ہے اور مسلمانوں سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ گائے بچھڑے کے انتخابی نشان پر مہر لگائیں۔ بولے: اخبار لے کر آؤ کون سی خبر ہے۔ میں نے درمیانی صفحہ کھول کر دکھایا جس پر آل انڈیا مومن کانفرنس کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ اچھا یہ جماعت مومنین نہیں بلکہ مومن کانفرنس ایک سیاسی بلکہ ثقافتی تنظیم ہے۔ الملتمس کے نیچے لکھا تھا عبدالقیوم انصاری۔ ارے یہ تو وہی عبدالقیوم انصاری ہیں جن کا تذکرہ اسکول کے بعض بچے بڑے جوش و خروش سے کرتے ہیں۔ مجھے اچانک یاد آیا، مگر پھر بھی یہ عقده حل نہ ہو سکا کہ اندرا گاندھی جیسی شائستہ خاتون جنہیں غریبوں اور کمزوروں کی اس قدر فکر ہے، انہوں نے احمد آباد میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے والے ظلم و ستم کو خود اپنے حکومتی انصرام میں کیوں کر رو رکھا۔

ایک دن اخبار 'دعوت' کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ مکتبہ میں ایک بزرگ تشریف لائے۔ سفید کرتے پا جامے اور بندھی میں ملبوس، روشن چہرہ، بڑے فریم سے جھانکتی ہوئی بارعب آنکھیں، میں ان بزرگ سے واقف تھا۔ یہ اخبار 'دعوت' کے استحکام کی مہم میں اکثر ملک گیر دورے پر رہا کرتے۔ ابا کے حلقہ احباب میں تھے اور ہمارے رشتے کے نانا بھی لگتے تھے۔ والد صاحب موجود نہ تھے، سومو ق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے دانشوروں کے سے انداز میں ان سے سوال کر ڈالا۔

نانا! کیا آپ بھی اپنا ووٹ اندرا گاندھی کو دیں گے؟

میرے اس برجستہ سوال پر وہ مسکرائے، بولے: بیٹا ہم لوگ کسی کو اپنا ووٹ نہیں دیتے۔ ہم تو اپنا ووٹ اللہ میاں کو دے چکے ہیں۔ اس وقت تو بات زیادہ سمجھ میں نہ آئی، بعد میں پتہ چلا کہ جماعت اسلامی سے وابستگان نظام کفر کو اپنے ووٹوں سے مستحکم کرنا خلاف ایمان جانتے تھے۔ اسی اثناء والد صاحب تشریف لے آئے۔ میرا سوال تو ادھورا رہ گیا، لیکن ان دونوں کی باہمی گفتگو سے اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ مسز گاندھی کی شیریں بیانی ہمارے بزرگوں کو رام کرنے میں ناکام رہی ہے۔

## علامہ خورش

جمعہ کے دن مکتبہ میں چہل پہل رہتی۔ اطراف کے گاؤں اور قصبات سے صبح ہی سے لوگوں کی آمد کا سلسلہ لگا رہتا۔ کوئی اپنی شیمپی میں آتا، یہ ٹم ٹم کے قسم کی ایک سواری تھی جس کے آگے گھوڑے جتے ہوتے، لیکن لکڑی کے بند دروازوں کے اندر آسائش کا پورا سامان ہوتا۔ شممہ چچا جب اپنی شیمپی سے اترتے تو لطیف خوشبوؤں کا ایک جھونکا اطراف کو معطر کر جاتا۔ نواب پیغمبر پورا اکثر چھڑی ٹیکتے ہوئے آتے۔ کوئی سواری کی بابت پوچھتا تو کہہ دیتے کہ ڈاکٹروں نے انھیں پیدل چلنے کا مشورہ دیا ہے۔ شرفاء جانتے تھے کہ اس قسم کے عذر دراصل اپنی تنگ دستی پر پردہ ڈالنے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ ایک صاحب تھے جو ہمیشہ عالم جذب میں رہتے۔ نام تو پتہ نہیں ان کا کیا تھا، لیکن لوگ انھیں علامہ خورش کہتے۔ ویسے تو ان کی بینائی جاتی رہی تھی، لیکن اچھے دنوں میں انھوں نے کیا کچھ نہ پڑھ ڈالا تھا۔ ان کی گفتگو فارسی اور اردو کے بر محل اشعار سے مملو ہوتی، لیکن جب سے جذب و مستی نے انھیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا وہ اکثر خاموش رہتے۔ جب طبیعت آمادہ ہوتی تو علم و معرفت کے دریا بہاتے البتہ کبھی کبھی ان کی طلاق لسانی کننت کا شکار ہو جاتی، الفاظ ٹوٹتے بکھرتے، انھیں اپنے اوپر قابو نہ رہتا۔ ایک تشیح کی کیفیت ان کے چہرے پر طلوع ہوتی جیسے کسی نے ان کی گویائی سلب کر لی ہو اور پھر وہ نمناک آنکھوں سے دور خلا میں نہ جانے کیا ڈھونڈنے لگتے۔ ایسے موقعوں پر ان کی بے بسی دیدنی ہوتی۔ آج اتفاق سے جمعہ کی مجلس میں علامہ خورش کے ساتھ پروفیسر صاحب بھی موجود تھے۔ پروفیسر جہاں پر تکلف کھانوں کے عادی تھے وہیں کھانے کی طرف علامہ خورش کا رویہ بے نیازانہ تھا۔ خوشی خوشی ماحضر تناول فرماتے اور کبھی کوئی کلمہ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ آج ان کی طبیعت خلاف معمول رواں تھی۔ کہنے لگے: پتہ نہیں کب ہندوستانی مسلمانوں کو جمعہ کی نماز نصیب ہوگی، یہ سب تو رسم ہے جس میں ہم لوگ پھنس گئے ہیں، روح سے خالی۔ محکومی میں تو ہر جمعہ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی زخموں پر نمک پاشی کر رہا ہو۔

ہاں اب ان باتوں کو سمجھنے والے لوگ کہاں رہے۔ شممہ چچا نے تائید کی، بولے: اب تو سیکولرازم کے

استحکام کو ہی ملی ہدف قرار دے دیا گیا ہے۔ دیکھئے کیسے بڑے بڑے جغادری اندرا کانگریس کی حمایت کو عین اسلامی فریضہ قرار دینے پر مصر ہیں۔

لیکن کیا بھی کیا جائے مسلمانوں کے پاس کوئی اور آپشن بھی تو نہیں۔ کانگریس بھلی بری جیسی بھی ہے، مسلمانوں کی ہمدردی میں دو جملے بولتی تو ہے۔ نواب صاحب نے رائے دی۔

ایسے خالی بول کا کیا فائدہ، ویسے بھی اب یہ نہرو گاندھی والی پارٹی نہیں رہی۔ گاؤکشی کے مسئلہ کو ہی لیجئے، گاندھی عوامی دباؤ کے باوجود گاؤکشی پر پابندی لگانے کے خلاف رہے۔ نہرو نے بھی گاؤکشی کے خلاف قانون سازی کی اجازت نہیں دی، البتہ مستقبل کے رہنما اصولوں میں گاؤکشی کی ممانعت کو قبول کر لیا۔ لیکن اندرا تو ایسا لگتا ہے کہ احیاء پرست ہندوؤں سے بھی مقابلہ میں آگے نکل جانا چاہتی ہے۔ شتمہ صاحب نے اپنے کرب کا اظہار کیا۔

اندرا بھی کیا کرے، آپ نے دیکھا نہیں کس طرح لاکھوں لوگوں نے گاؤکشی کے خلاف پارلیامنٹ کا محاصرہ کر لیا۔ تین شکر اچار یہ مظاہرین کی حمایت میں نکل آئے۔ خود وزیر داخلہ گلزاری لال نندا کی ہمدردی مظاہرین کے ساتھ تھی، بلکہ بعضے تو کہتے ہیں کہ وہ اندر سے ملے ہوئے تھے، پھر بیچاری اندرا کرتی بھی تو کیا کرتی۔ اس نے وہی کیا جو ایسے موقعوں پر کوئی سیاست داں کرتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ملک کا مزاج بدل رہا ہے۔ شتمہ صاحب نے اپنے موقف کو مدلل کرنے کی کوشش کی، بولے: اور یہ جو احمد آباد کا فساد ہے اس کے پیچھے بھی تو کانگریس کی اندرونی چپقلش ہے۔ مرارجی ڈیسائی کا گروپ اندرا کو کمزور کرنا چاہتا ہے اور اس عمل میں انھیں احیاء پرست ہندوؤں کی حمایت حاصل ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں اندرا مسلمانوں کا جھنڈا نہیں اٹھا سکتی۔

پھر یہ علماء کی انجمنیں، مومن کانفرنس کے قائدین اور مسلمانوں کی سرکردہ شخصیات کانگریس سے یہ کیسے امید لگائے بیٹھی ہیں کہ وہ مسلمانوں کے تحفظ اور ان کی بہبود کا کام انجام دے گی۔ نواب صاحب نے اعتراض وارد کیا۔

خالم مخول ہیں یہ لوگ خالم مخول۔ پروفیسر نے فتویٰ صادر کیا۔

تم درست کہتے ہو، مولویوں کی انجمنیں ہوں یا مسلمانوں کے سیکولر سیاست داں، ان بے چاروں کو اس بات کا سرے سے اندازہ ہی نہیں کہ ان کے ساتھ یہاں کون سا حادثہ پیش آیا ہے۔ اگر آپ کو اس بات کا پتہ ہی نہ چلے کہ آپ سے کیا چیز چھن گئی ہے تو آپ ایک حیرانگی کے عالم میں خوف و دہشت کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ ہر روز کچھ نیا چھنتا ہے اور اس سے پہلے کہ آپ اس حادثہ فاجعہ کو اپنی گرفت میں لائیں یا اس



عقل واقعی خبط ہوگئی ہے یا آگ و خون کے مسلسل بڑھتے سائے نے انھیں دہشت زدہ کر دیا ہے۔ میں جتنا زیادہ سوچتا مجھے علامہ خورش کی یہ بات درست لگتی کہ حالات کی سنگینی کے آگے مسلم قائدین کی عقلیں منجمد ہوگئی ہیں۔ پھر خیال آتا ابا سچ ہی تو کہتے ہیں اندرا کی کانگریس جیتے یا مرارجی کی، کمیونسٹوں کو کامیابی ملے یا حزب اختلاف کی دوسری پارٹیاں حکومت بنائیں، ہمارے حصے میں محرومی کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ آنے کو نہیں۔

آخر وہی ہوا، ’غریبی ہٹاؤ‘ کے نعرے نے مسز گاندھی کو غالب اکثریت سے کامیابی دلادی۔ الیکشن کے خاتمہ کے ساتھ ہی عوامی ڈسکورس سے مسلم مسئلہ بھی غائب ہو گیا، البتہ اسکول میں باہمی مباحثے کی مجلسوں نے ایک نئی شکل اختیار کی۔ بزم اردو کے جلسوں میں جو ہفتہ عشرہ پر منعقد ہوتا تھا، عام طور پر ادبی و ثقافتی موضوعات ہوا کرتے تھے، اس دفعہ منتظمین نے جو موضوع تجویز کیا تھا اس کا عنوان تھا ”ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل“۔ میں نے سوچا موضوع جانا پہچانا ہے، کیوں نہ طبع آزمائی کی جائے۔ کسی تقریری مقابلہ میں شرکت کا کوئی تجربہ تو نہ تھا، لیکن اسی موضوع پر طفیل احمد منگھوری کی کتاب ’ہندوستانی مسلمانوں کا روشن مستقبل‘ مکتبہ میں آویزاں دیکھ چکا تھا۔ ابوالکلام آزاد کی خطابت کا بھی بڑا شہرہ سن رکھا تھا۔ والد صاحب کہتے تھے کہ وہ جب جنگل میں تقریر کرتے تو چرند پرند، حجر شجر انھیں سنا کرتے۔ اقبال کی نظموں اور حالی کی مسدس سے بھی کسی قدر واقفیت تھی۔ جو کچھ جہاں سے ملا اسے کام پر لگایا،

کھویا گیا کس طرح ترا جوہر ادراک

ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک

تقریر کی ابتدا اس شعر سے کی۔ کچھ اس میں آزاد کی خطابت ڈالی، کچھ مولانا منگھوری کی رجائیت۔ پھر خیال آیا کیوں نہ اس شئی پر توجہ کی جائے جسے ہندوستانی مسلمانوں نے کھودیا ہے اور جس کا انھیں احساس بھی نہیں اور جس کا تذکرہ علامہ خورش جب بھی کرتے ہیں ایک سماں باندھ دیتے ہیں اور پھر اقبال کا یہ شعر ٹانگ دیا جائے:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

’لوگو! اگر تمہیں پتہ چل جائے کہ وہ چیز ہے کیا جو کھوئی گئی تو تمہیں بڑی حیرت ہوگی۔ حد تو یہ ہے کہ ہمارے علماء و قائدین بھی اس بات سے واقف نہیں۔ میں آج اس راز سے پردہ اٹھانے والا ہوں، اسی طرح کے خطابیے (rhetoric) سے پوری تقریر مملو تھی۔ آخر میں اقبال کے اس شعر کو کام پہ لگایا گیا تھا:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا  
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

تقریر پر دوبارہ نگاہ ڈالی، نوک پلک درست کی مگر یہ خلش باقی رہی کہ وہ چیز جس کے کھونے کا اس پر شور انداز سے تذکرہ کیا گیا ہے اس کے بارے میں آخر تک پتہ نہیں چلتا کہ وہ شئی ہے کیا۔ پھر سوچا علامہ خورش بھی تو اسی بلند آہنگی سے کسی گمشدہ شئی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کی باتوں سے تو اہل مجلس پر رعب و دبدبہ طاری ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی تقریر کے بعد سوال و جواب کا کوئی موقع تو ہوتا نہیں، سو اس سوال کو مبہم چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ بالآخر وہ دن آ گیا جب اسکول کے مرکزی ہال میں تقریری مقابلہ کی محفل سچی۔ جب میری باری آئی اور میرا نام پکارا گیا تو ایسا لگا کہ کسی نے اچانک مجھے محشر میں پیش کر دیا ہو۔ پورے اسکول کی نگاہیں آج میری طرف تھیں، میں اس صورت حال سے بچنے کے لئے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ تقریر اسی کڑو اور بلند آہنگی کے ساتھ جاری رہی، لیکن جہاں سامعین سے نگاہیں ملتا تو اسان خطا ہونے لگتے۔ جیسے تیسے تقریر ختم ہوئی، البتہ میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ماسٹر ظفیر صاحب نے تائید میں اپنا سر ہلایا اور برجستہ بولے، یہ ہوئی تقریر۔ ظفیر خان صاحب فزکس کے ٹیچر تھے، لمبے چوڑے، قوی ہیکل، دوسرے اساتذہ کے مقابلہ میں لیے دیئے رہتے۔ کلاس میں جب کبھی ایک بار نو نوائز (No Noise) کہہ دیتے تو سناٹا طاری ہو جاتا۔ ان کی بر ملا تائید کا مطلب تھا کہ میری تقریر اسکول کے سالانہ جلسہ کے لیے منتخب کر لی گئی تھی۔

ان ہی دنوں مولانا مودودی کا ایک مضمون میری نظر سے گزرا جس میں انھوں نے اپنے بچپن کے حالات و کوائف لکھے تھے۔ 'میرا بچپن' کے عنوان سے یہ مضمون غالباً کسی درسی کتاب کا حصہ تھا۔ مودودی صاحب نے لکھا تھا کہ کس طرح ان کی پیدائش سے پہلے ان کے گھر کوئی فقیر آیا جس نے ان کے والدین کو ابوالاعلیٰ نام رکھنے کا مشورہ دیا۔ مضمون پڑھ کر اس بات کا بھی اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا خاندانی سلسلہ بڑے بزرگوں بشمول سرسید احمد خان سے جا ملتا تھا۔ ان کے بچپن کی شراوتوں میں، اپنے حصے کی چیز کھانے کے بعد بڑے بھائی کے حصہ میں مال غنیمت تلاش کرنا، یہ اور اس قسم کے دسیوں واقعات جس میں خاندانی تفاخر کی آمیزش شامل تھی، ایسا لگا جیسے میری اپنی ذاتی کہانی سے مملو ہو۔ اس کو پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ میں بھی اپنی سوانح حیات لکھ ڈالوں۔ کیا عجب کہ اس طرح بڑا آدمی بننے کی کوئی سبیل نکل آئے۔ شرافت و نجابت، روحانیت اور تصوف کا مسالہ تو خاندان میں پہلے سے موجود تھا۔ پھر کیا ضرورت تھی کہ بڑا آدمی بننے کے لئے چالیس اشرفیوں کے ساتھ سفر کیا جائے اور راستہ میں ڈاکوؤں کا ڈر اور جان کا دھڑکا لگا رہے۔

تقریری مقابلہ میں کامیابی سے یہ اندازہ ہو چلا تھا کہ اگر علامہ خورش کی فکر مندی اور ان کے کرب انگیز بیان میں مولانا آزادی کی بلند آہنگی اور اقبال کے اشعار کا آمیزہ لگا دیا جائے تو سامعین کی داد و وصول کی جاسکتی ہے۔ اور ایسے اساتذہ بھی جو عام دنوں میں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے، ان کے سر تائید میں ہل جاتے ہیں۔ پھر کیوں نہ مودودی صاحب کی طرح اپنے بچپن کے بیان کو اس طرح مرصع کیا جائے کہ اس پر کسی بڑے آدمی کی سواخ کا گمان ہو۔

اب دل ہی دل میں اپنی سواخ مرتب کرنے کا پروگرام بنانے لگا۔ اسکول میں اپنے استاد شاداں فاروقی صاحب کو اکثر دیکھتا کہ وہ سفید تقطیع پر پہلے خوبصورت بارڈر بناتے اور پھر خوشخط الفاظ میں اپنی نظمیں کچھ اس طرح لکھتے جاتے کہ اس پر مطبوعہ ہونے کا گمان ہوتا۔ خیال آیا کہ اس مقصد کے لیے ایک مجلد کا پی خریدنی چاہیے، بالکل ویسی ہی جیسی شاعروں کے پاس ان کی بیاض ہوتی ہے۔ کچھ پیسے اپنے پاس تھے، کچھ والدہ سے لے کر سوارو پئے میں ایک خوبصورت کا پی خرید لایا۔ صفحات بڑے دبیز، چکنے اور سفید تھے۔ ہاتھ پھیرنے پر لکھنے کا جی چاہتا۔ گھر میں طرح طرح کے قلم اور خوشخط لکھنے کا سامان موجود تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ میری اپنی تحریر نہایت بدخط اور گنجلک تھی۔ سو اس کا حل یہ نکالا کہ اپنے بڑے بھائی شکیب ارشد صاحب کو کتابت کے لیے آمادہ کیا اور ان سے یہ قول و قرار بھی لے لیا کہ یہ انتہائی خفیہ پروجیکٹ ہے، جب تک تکمیل کو نہ پہنچے اس بارے میں کسی کو نہ بتایا جائے۔ اب کام اس طرح شروع ہوا کہ میں بولتا جاتا اور وہ کمال احتیاط کے ساتھ کا پی میں لکھتے جاتے۔ اس دوران کبھی جملہ کی ساخت اور اسلوب بیان پر کچھ اختلاف بھی ہوتا، لیکن باہمی مشاورت سے حل نکل آتا۔ دو چار دن انتہائی رازداری اور خوش اسلوبی کے ساتھ لکھنے کا سلسلہ جاری رہا، لیکن ایک دن نہ جانے کس بات پر اختلاف ہوا کہ انھوں نے کہا کہ میں تو اس طرح نہیں لکھتا۔ میرے خیال میں اسے اس طرح لکھا جانا چاہیے۔ اس سے پہلے وہ میری بہت سی باتیں مان چکے تھے، شاید اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ جھگڑا جب آگے بڑھا تو بات والد صاحب تک پہنچی۔ انھوں نے معاملہ فہمی کے لیے کا پی منگوائی، الٹ پلٹ کر دیکھا، میری اس معصوم جسارت پر مسکرائے، بولے: بیٹا! ابھی تم نے کیا ہی کیا ہے، ابھی تمہاری سواخ عمری کون پڑھے گا، پہلے کچھ بن جاؤ پھر سواخ عمری لکھ لینا۔

شخصی اور خاندانی علوم مرتبت کے اظہار پر والد صاحب نے روک لگا دی، البتہ دانشورانہ بلند آہنگی اختیار کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ تقریری مقابلہ میں نہ صرف یہ کہ اول انعام کا حقدار قرار پایا بلکہ ججوں کی صف میں بیٹھے ہوئے ایک سفید ریش بزرگ نے مجھے پاس بلا کر تحسین کے کلمات بھی کہے۔ پوچھا: کس کے بیٹے ہو؟ اور اگلے ہی دن گھر تشریف لے آئے۔ پتہ چلا کہ ان کا نام ماسٹر محمد یعقوب ہے، والد صاحب کے

پرانے شناساؤں میں ہیں اور اب سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد شہر میں مسلم لڑکیوں کے لئے ایک اسکول کے قیام و استحکام میں مصروف ہیں۔ انھوں نے میری پڑھائی کے بارے میں کچھ رسمی سوالات کیے۔ والد صاحب کے سامنے میری تقریر کے حوالے سے حوصلہ افزا کلمات کہے، بولے: میں راشد میاں کو اپنی شاگردی میں لینا چاہتا ہوں۔ صبح کے وقت کچھ لڑکوں کو پڑھاتا ہوں، ان کا جی چاہے تو یہ بھی آسکتے ہیں۔ یعقوب صاحب ویسے تو ریاضی پڑھاتے تھے لیکن ادب، فلسفہ اور مشرقی علوم پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک کلاسیکی استاد تھے۔ سائنس ہو یا تاریخ، سیاست ہو یا دیگر امور ملٹی، جب ان کی گفتگو شروع ہوتی تو ہم طلباء شوق و جہتو کی تصویر بننے کچھ اس طرح سنا کرتے جیسے ان کی سحر الکلامی نے ہمیں پتھر کے بے جان مجسموں میں تبدیل کر دیا ہو۔ ادق سے ادق مسائل کو دلچسپ اور آسان بنانا اور اس میں حکایات و قصص کو کام پر لگانے میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ نہ جانے ان کے بیان میں کیا جادو تھا کہ سننے والوں کی بشاشت میں کمی نہیں آتی۔ ایک دن کچھ پریشان سے تھے، کہنے لگے: جانتے ہو ملک میں جنگ کے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں بڑا قتل و خون ہو رہا ہے، حالات اگر بے قابو ہو گئے تو ہندوستان اور پاکستان کے مابین ایک بار پھر جنگ چھڑ جائے گی اور جنگوں سے تباہی کے علاوہ کچھ اور ہاتھ نہیں آتا۔

تو کیا ہم اس خطرے کو نہیں روک سکتے؟ ایک طالب علم نے اپنی سی پیشکش کی۔

بولے: ہاں کیوں نہیں مگر تم لوگ ابھی بہت چھوٹے ہو، ان باتوں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

ایسا لگا جیسے ہماری طفلانہ معصومیت ان کی گہری باتوں کی شاید متحمل نہ ہو۔ میں نے اسپین کے مورسکو مسلمانوں کے بارے میں کچھ واقعات پڑھ رکھے تھے کہ کس طرح والدین اپنے بچوں کو انتہائی رازداری کے ساتھ اس بات سے آگاہ کرتے کہ وہ دراصل مسلمان ہیں، ان کا تعلق کبھی مسلمانوں کی نسل سے رہا ہے، لیکن اندلس میں مسلم ریاست کے خاتمہ کے بعد محض اپنی جان بچانے کے لیے انھوں نے مجبوراً عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ میں نے اپنی کچی پکی معلومات کو کام پر لگاتے ہوئے کہا: اسپین میں بھی تو مسلمانوں کے ساتھ کچھ ایسی ہی صورت حال پیش آئی تھی۔ میرے اس سوال پر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ چند ثانیے خاموش رہے، جیسے ادق اور پیچیدہ تاریخی حقائق کے بیان کے لیے کوئی آسان اسلوب تلاش کر رہے ہوں، بولے: جانتے ہو مسلمانوں کا اس ملک میں سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟

یہ کہ ان کی اپنی کوئی سیاسی پارٹی نہیں۔ مجاہد نے جواب دیا۔

یہ تو مسئلہ کا صرف ایک پہلو ہے، یہ چھلکا ہے مغز نہیں۔

انھیں اپنے فرض منصبی کا احساس نہیں۔

بولے: اس سے بھی بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔

میرے خیال میں فسادات سے بڑا کوئی مسئلہ نہیں۔ ایک دوسرے طالب علم نے رائے دی۔  
بولے: اس سوال کا کوئی ایک جواب تو نہیں ہو سکتا، البتہ ایک زخم جو بڑا گہرا ہے اور مسلسل رِس رہا ہے، اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، یوں سمجھو کہ تمہارے رشتہ داروں کو کسی نے قتل کیا ہو، تمہیں معلوم ہو کہ قاتل کون ہے، وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے رہتا ہو، لیکن تم اس کے اقدام کی تعریف کرنے اور اس کے ساتھ نباہ کرنے پر خود کو مجبور پاؤ، اپنے باپ کے قاتل کے ساتھ رہنا، اس کی تعریف کیے جانا اور ہر مصیبت میں اس کی طرف دیکھنا حالانکہ اس کے دل میں تمہارے لیے آج بھی اتنی ہی نفرت بھری ہو، اس صورت حال میں اگر کوئی شخص پھنس جائے تو تم لوگ اس کے بارے میں کیا خیال کرو گے؟

ہماری سمجھ میں صرف اتنا آیا کہ معاملہ پیچیدہ ہے، مورسکو مسلمانوں سے بھی زیادہ سنگین۔

بولے: اس ملک میں عرصہ سے مسلمانوں پر منافقت اور مداہنت کا عذاب مسلط ہے۔ قاتل کو قاتل کہنے سے ان کی زبانیں انکاری ہیں، اب ان ہی فسادات کے مسئلہ کو لو، مسلمانوں نے اپنا سب کچھ کانگریس کے حوالے کر رکھا ہے اور یہی کانگریس فسادات میں مسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ بلوائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے بلکہ حکومتی مشنری بھی بلوائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے قتل عام میں شریک ہو جاتی ہے۔ ان سب کے باوجود مسلم قائدین کانگریس کی حمایت میں تشہیری مہمیں چلاتے ہیں، اس سے اپنے تحفظ کی بھیک مانگتے ہیں اور کانگریس کی مسلم دوستی کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے۔

منافقت کے لفظ سے تو میں واقف تھا، میں نے پوچھا: یہ مداہنت کیا چیز ہوتی ہے؟

بولے: جان بوجھ کر کلمہ حق سے اعراض کرنا، حقیقت پر پردہ ڈالنا۔ ہندوستانی مسلمان خوب جانتے ہیں کہ ان کے خون سے کس کے دامن رنگین ہیں۔ ہمارے قائدین بزبان عمل یہی کہتے ہیں کہ اب رہنا ان ہی کے ساتھ ہے تو نباہ کی کوئی صورت نکالنی ہوگی، ظالم کے ساتھ نباہ کرنا، یہ جانتے ہوئے کہ اس نے ظلم و جور سے توبہ نہیں کی ہے، ایک ایسا عذاب ہے جس کے تذکرے سے جہنم کا بیان بھی خالی ہے۔

پھر ہم سب مل کر کچھ کرتے کیوں نہیں؟

بولے: مسلمان فرقوں اور طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں، مثلاً انصاری برادران کانگریس کو ووٹ دیتے ہیں تاکہ ان کو چھوٹی موٹی سرکاری مراعات ملتی رہیں اور ان کے دوچار لوگ پارلیمنٹ اور اسمبلی میں لے لیے جائیں۔ جمعیۃ العلمائے مولوی بھی یہ نہیں چاہتے کہ مسلمانوں میں کوئی انڈینڈنٹ سیاسی فکر پیدا ہو، کانگریس انہیں بھی مراعات کے چند ٹکڑے ڈال دیتی ہے۔ اب رہے عام مسلمان تو وہ ان سیاسی اور مذہبی قائدین کے

ذریعہ یرغمال بنا لیے گئے ہیں۔

اور مسلم لیگ بھی تو ہے نا، پھر مسلمان اسے ووٹ کیوں نہیں دیتے؟  
مسلم لیگ کی مسلمانیت بھی ہمارے کام کی نہیں۔

مگر مسلمان تو پہلے ہی کانگریس اور مسلم لیگ میں بٹ گئے تھے، میں نے اپنی معلومات کو پھر کام پہ لگایا۔  
بولے: کرتے بھی کیا، مسلم لیگ طبقہ اشراف کے مفادات کے تحفظ کے لیے سامنے آئی تھی۔  
'شرفاء؟'

ارے ہاں جنھیں اونچی ذات کا مسلمان کہا جاتا ہے، حالانکہ سب آدم کی اولاد ہیں اور خدا کی نظر میں  
تو سب برابر ہیں، پھر نیچی ذات والے مسلمان کیا کرتے، انھوں نے کانگریس کے سایہ عاطفت میں پناہ لی۔  
مگر مولانا آزاد تو بہت بڑے آدمی تھے، وہی قول فیصل والے مولانا، میں نے اپنی کتب آشنائی کا  
سکہ جماتے ہوئے کہا۔

بولے: ہاں ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی اپنی سماجی حیثیت کے باوجود خاندانی اعتبار سے اعلیٰ  
نسب نہ تھے، سو مسلم لیگ میں انھیں قیادت کا عالی مقام نہیں مل سکتا تھا، ان کے لیے کانگریس کے سایہ  
عاطفت میں پناہ لینے کے علاوہ کوئی اور متبادل نہیں رہ گیا تھا۔  
آ آں! میرے منہ سے حیرت سے بلا ساختہ نکلا۔

بولے: تمھیں حیرت ہوگی کہ بڑے بڑے اللہ والوں کے دامن بھی اس خباثت سے آلودہ رہے  
ہیں۔ بہشتی زیور میں تو میل جول اور برابر کے لوگوں کے بارے میں باقاعدہ عنوان باندھا گیا ہے۔ تبلیغی  
جماعت کے مولانا زکریا جن کی کتاب تبلیغی نصاب کا نام شاید تم نے سنا ہو وہ بھی ذات پات کے قائل ہیں،  
بلکہ انھوں نے تو اپنے ایک خواب کے ذریعہ تیسرے امیر مولانا رحمت اللہ کو صرف اس بنا پر معزول کر دیا کہ  
ان کا تعلق نیچی ذات کی تیلی برادری سے تھا۔ اچھا خیر! بات کہاں سے کہاں نکل گئی، چلو اس قصہ کو یہیں رہنے  
دو۔ یہ کہتے ہوئے یعقوب صاحب نے مجلس برخواست کر دی۔

مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ مسلم معاشرے میں ذات پات کے حوالے سے اتنا تضاد موجود ہے۔  
مجھے اسکول کے دوستوں کی وہ گفتگو یاد آئی جب انھوں نے میرے نام کے آگے یا پیچھے خان، سید یا انصاری  
نہ دیکھ کر پوچھا تھا کہ تم کیا ہو؟ میرا جواب تھا مومن۔ اس پر وہ سب خوب ہنسنے، بولے: مومن تو تم ہونے نہیں  
سکتے کہ تمہارے نام کے آگے انصاری کا لاحقہ نہیں ہے۔ اب میں انھیں کیسے سمجھاتا کہ ایک دن جب میں  
نے اپنی رشتہ کی پھوپھی، جن کے زہد و ورع کا والد صاحب بھی احترام کرتے تھے، ان سے یہ جاننا چاہا کہ ہم

لوگ خاندانی اعتبار سے کیا ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ بیٹا جب تم سے کوئی یہ سوال کرے تو بس یہ کہو کہ ہم مومن ہیں۔ مگر اب اسے کیا کیا جائے کہ میرا مومن ہونا اسکول کے دوستوں کے نزدیک معتبر نہیں تھا۔

ایک دن اپنے چند ہم جماعتوں کے ساتھ مسلم محلہ میں جا نکلا۔ کھیل کود کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ مغرب کی اذان ہو گئی۔ اذان سنتے ہی ایسا لگا جیسے اچانک کسی نے چلتی پھرتی زندگی پر حکم امتناعی جاری کر دیا ہو۔ دیکھتے دیکھتے محلہ کی مسجد نمازیوں سے پٹ گئی۔ کیا بوڑھے، کیا بچے اور کیا جوان جسے دیکھو وضو کے اہتمام میں سرگرداں ہے۔ دوران نماز ادھر امام نے سورہ فاتحہ کی قرأت ختم کی، ادھر نمازیوں کی صف سے آمین کا مترنم کورس بلند ہوا۔ کسی آمین بالجہر والی مسجد میں نماز پڑھنے کا میرا یہ پہلا اتفاق تھا۔ گھر آ کر میں نے والدہ کو بتایا کہ کس طرح وہاں مغرب کی نماز میں بھی عیدین کی بھیڑ بھاڑ جیسا سماں تھا۔ بولیں: ہاں کیوں نہ ہو، یہی تو سبب ہے کہ وہ لوگ ہم سے دین اور دنیا دونوں میں آگے بڑھ گئے ہیں۔ البتہ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ اتنے سچے پکے مسلمانوں کا محلہ، جن کے آمین کی صداؤں سے دلوں پر ایک ایمان افروز تاثر قائم ہوتا ہے، اتنے بھلے لوگ آخر مدت سے کانگریس کی حمایت میں کیوں کھڑے ہیں؟

## دوسری ہجرت

الیکشن میں مسز گاندھی کی شاندار فتح کے بعد احمد آباد کے فسادات کی باتیں پس منظر میں چلی گئی تھیں۔ اب تشویشناک خبریں مشرقی پاکستان سے آرہی تھیں۔ ایک دن والد صاحب کو یہ کہتے سنا کہ بھی انصاف تو یہ ہے کہ مجیب کو حکومت سازی کا حق ملنا چاہیے تھا، یہ جو بھٹو نے ادھر ہم ادھر تم کا ماحول پیدا کیا ہے اس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا ہوگا۔ ہندوستانی اخبارات تصویر کا صرف ایک رخ دکھاتے تھے۔ یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہاں واقعتاً ہو کیا رہا ہے۔ اسی دوران چٹاگانگ سے جیلانی پچا کا ایک خط موصول ہوا جس نے پورے گھر کو سرا سیمہ اور متوحش کر دیا۔

کالرگھاٹ، چٹاگانگ  
مشرقی پاکستان

۲۳ جون ۱۹۷۱ء

عزیزی، سیدی حافظ محمد نور الہدی صاحب زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ تمام اہل خانہ بعافیت ہوں گے۔ ادھر مشرقی پاکستان کے حالات انتہائی دھماکہ خیز ہوتے جا رہے ہیں۔ مسلمان مسلمان کے خون کا پیاسا بنا ہے۔ کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی۔ جائیں تو جائیں کہاں؟ تقسیم کے وقت تو یہ سمجھ کر یہاں آئے تھے کہ سابق دارالاسلام ہندوستان سے نئے دارالاسلام مشرقی پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ اب ادھر کچھ دنوں سے مغربی پاکستان جانے کی راہ تلاش رہے ہیں۔ ہمارے ایک دوست جو پاکستانی فوج میں اعلیٰ عہدے پر ہیں، انھوں نے انتظام کا وعدہ کر رکھا ہے۔ بعض خاندان جو ہماری ہی طرح بہار اور یوپی سے ہجرت کر کے آئے تھے، ہندوستان واپسی کی کوششوں میں ہیں، لیکن یہ راستہ بھی خطرناک ہے۔ اکثر مسافروں کے لوٹ مار اور قتل و خون کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ ہم لوگ دوبارہ دارالکفر کی طرف واپسی کی سوچ بھی نہیں سکتے۔

تمہاری بھابھی کی بڑی خواہش ہے کہ ایک بار ہندوستان جا کر عزیز و اقارب سے مل آئیں۔ ابھی کل کی بات لگتی ہے کہ ہم لوگ اپنا کھیت کھلیاں چھوڑ کر اپنی آنکھوں میں پاکستان کا خواب سجائے یہاں آئے تھے، لیکن اب یہ زمین ہم پر تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ بنگالی مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ مغربی پاکستان کی اشرافیہ نے انھیں غلام بنا رکھا ہے۔ ان کا رویہ بنگالی زبان و ثقافت کی طرف حقارت کا ہے، جبکہ ملک کا سارا زرمبادلہ مشرقی پاکستان لگا کر دیتا ہے، جس کا ذریعہ چائے اور کپاس کی پیداوار ہے۔ بنگالیوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اگر ہم اپنے فطری وسائل مشرقی پاکستان میں ہی خرچ کریں تو ہمارے ہاں خوشحالی آجائے گی۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اردو بولنے والے کلیدی مناصب پر قابض ہو گئے ہیں۔ اب بہت سے بنگالی دانشور برملا یہ کہنے لگے ہیں کہ اسلام کے نام پر ہم سے دھوکہ کیا گیا۔ اب پتہ نہیں دھوکہ کس کے ساتھ ہوا۔ ہم جیسے مہاجرین پر تو یہ بات اب واضح ہوتی جا رہی ہے کہ ہم لوگ اب تک ایک سراب کے پیچھے بھاگتے رہے ہیں۔

ادھر چند مہینوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی تاراجی کے اتنے واقعات دیکھے اور سنے ہیں کہ اب تحریک آزادی ہند کے قائدین سے ایمان اٹھ گیا ہے۔ کیا جناح پر یہ بات واضح نہیں تھی کہ پاکستان کے دو خطوں کو انتظامی طور پر سنجانا کتنا مشکل ہوگا۔ کتنی جاں نثاہ ہوئیں، تقسیم اور ہجرت کے خونیں سمندر میں لاکھوں انسان غرق ہو گئے۔ ان سب کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہی ناکہ ہم لوگ پہلے مہاجرین کہلاتے تھے اور اب ہمارا شمار محصورین میں ہوتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی لگتا ہے کہ جناح، گاندھی اور جنگ آزادی کے تمام بڑے لیڈران ہمارے ہی خواہ نہیں بلکہ دراصل انگریزوں کے آلہ کار تھے، جنھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی آرزوؤں اور اقتدار کے لیے برصغیر کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ جو کچھ ہوا بہت برا ہوا۔ اللہ ہم لوگوں کو نیک عمل کی توفیق دے۔

خدا کرے ہم لوگ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔ زندگی اور موت میں فاصلہ اب بہت تھوڑا ہے۔

خیر اندیش م۔ ک۔ جیلانی

ابا اب زیادہ تر خاموش رہنے لگے تھے۔ ان کا دایاں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے ہوتا اور وہ کسی گہری فکر میں ڈوبے ہوتے، پھر ایک عالم اضطراب میں یہ کہتے ہوئے خود کو تسلی دیتے کہ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ یہ ایک طرح سے ان کا تکیہ کلام تھا، خاص طور پر جب وہ کسی پریشانی میں ہوتے اور ان کی نگاہیں آسمانوں کی طرف

اٹھتیں تو شدید بے بسی کے عالم میں ان کی زبان سے یہی نکلتا کہ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ ایک دن مکتبہ میں اپنے دوست ذکی صاحب سے رازدارانہ انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ حالانکہ مکتبہ میں گفتگو کا انداز چوپال جیسا ہوتا جہاں ہر شخص کو حسب مراتب شرکت کی اجازت ہوتی، کہہ رہے تھے کہ جیلانی بھائی کا خط آیا ہے، پتہ نہیں اب کس حال میں ہیں۔ خط تو چار مہینے پرانا ہے، شاید سینسر کی وجہ سے دیر سے پہنچا۔

کہاں سے لکھا ہے انھوں نے، سننے میں تو یہ آرہا ہے کہ محصورین کے الگ کمپ بنا دیے گئے ہیں۔ چٹاگانگ سے لکھا ہے، پتہ نہیں مغربی پاکستان جانے کی کوئی سہیل پیدا ہوئی یا نہیں، والد صاحب نے تشویش ظاہر کی۔

بڑے افسوس کی بات ہے، اب پاکستان میں بھی امان نہ ملے تو آدمی کیا کرے۔ ذکی صاحب نے شکوہ کیا، پھر تسلی کے انداز میں بولے: ویسے جیلانی بھائی مجاہد آدمی ہیں، انھوں نے کوئی راستہ ڈھونڈ نکالا ہوگا۔

جیسے جیسے مشرقی پاکستان میں ہندوستان کی فوجی اور نیم فوجی ٹکڑیوں کا عمل دخل بڑھتا جاتا، اتا کے اضطراب اور ہمارے گھر میں حزن و ملال کی کیفیت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا۔ طرح طرح کی خبروں میں یہ اندازہ لگانا تو مشکل تھا کہ ظلم کون کر رہا ہے، پاکستانی فوج یا ہندوستانی نیم فوجی دستے یا بنگلہ قومیت کے علم بردار۔ البتہ یہ بات طے تھی کہ یہ سب لوگ مل کر جیلانی چچا اور ان جیسے لاکھوں شریف انفس لوگوں کو جنھوں نے ایک ایمانی بستی کا خواب آنکھوں میں لئے ہجرت کی تھی، یہ سب مل کر ان معصوم اور بے گناہ مہاجرین کے درپے آزار ہو گئے ہیں۔ ایک دن پاکستانی افواج کی طرف سے بمباری کی خبریں آئیں، پھر اچانک شہر میں اعلان ہوا کہ شام ڈھلے شہر کی روشنی گل کر دی جائے، ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ نہ جانے کوئی بم کہاں آگرے۔ اتنا ریڈیو کے کبھی شوقین نہ تھے، لیکن ان دنوں ریڈیو پاکستان اور بی بی سی سے نشر ہونے والی خبروں کا ہندوستانی سرکاری پروپیگنڈے کی روشنی میں تجزیہ کرتے اور جب ہندوستانی نشریہ سے ڈھا کہ اور چٹاگانگ پر بمباری کی اطلاع آتی تو ماہی بے آب کی طرح تڑپ کر رہ جاتے۔ پورا گھر ذہنی طور پر اس قضیہ میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ ہندوستانی فضائیہ کا ہر بم ایسا لگتا جیسے جیلانی چچا کے عین اوپر گر رہا ہو۔ ایک طرف ہندوستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ ہندوستانی افواج ہماری ہیں، ہمیں ان کی معرکہ آرائیوں اور فتوحات پر فخر کرنا چاہیے، دوسری طرف ان معرکہ آرائیوں کی زد میں خود ہمارا اپنا خاندان آ رہا تھا۔ پھر جیلانی چچا سے صرف ہمارا خونی رشتہ نہ تھا بلکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے صدقِ دل

سے اسلام کے لیے ہجرت کی تھی۔ ایک طرف اپنا دین اور اپنا خاندان تھا اور دوسری طرف اپنا ملک اور اس کی حوصلہ مند افواج۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ مجھے کس کی طرف داری کرنا چاہئے۔ اسلام کی حمایت سے، ایسا لگتا تھا جیسے مجھ پر ملک سے بے وفائی کا الزام آتا ہو۔

ایک دن اچانک یہ خبر آئی کہ مشرقی پاکستان میں ہندوستانی افواج کو فیصلہ کن فتح حاصل ہو گئی ہے۔ ہندوستان میں جشن کا سماں تھا۔ مسز گاندھی نے پارلیامنٹ میں یہ خوش خبری سنائی کہ ڈھاکہ اب ایک آزاد ریاست کا آزاد دار الحکومت بن چکا ہے۔ یہ خبر اٹا پر بجلی بن کر گری۔ ایسا لگا جیسے کوئی چیز ہمارے اندرون میں ٹوٹ گئی ہو۔ پورا گھر سکتے میں تھا۔ مکتبے کی علمی مجلس ویران تھی۔ ابا زیادہ تر خاموش لیٹے رہتے۔ ویران آنکھوں سے خلا میں ہکا کرتے۔ اب انھیں نہ تو جیلانی بھائی کی فکر تھی اور نہ ہی ان کے کسی تازہ خط کا انتظار، جیسے ایک طویل بے چینی کو قرار آ گیا ہو۔ والدہ ہم بچوں کو تسلی دیتیں کہ انھیں اختلاج کی شکایت ہے، ان شاء اللہ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ اب اس درد کو کس کس سے بیان کیا جاتا کہ ان پر دراصل کیا گزر رہی ہے۔ مجھے سقوطِ دہلی والی بات بار بار یاد آتی، سوچتا ابا ٹھیک ہی تو کہتے ہیں، ہندوستانی مسلمانوں پر سقوطِ دہلی کا سلسلہ نہیں رکتا، سقوطِ ڈھاکہ بھی تو اسی کا تسلسل ہے۔

ایک دن لکھنؤ سے نکلنے والے 'صدقِ جدید' کا تازہ شمارہ آیا۔ اس خیال سے کہ شاید اس طرح ابا کی طبیعت بہل جائے، میں نے اخبار کا ایک حصہ پڑھ کر سنانے کی کوشش کی۔ بولے: کیا ہے؟ صدقِ جدید۔ پھر بڑی بے دلی سے پوچھا: کیا لکھا ہے؟ میں نے چند ابتدائی سطریں پڑھ کر سنائیں، لکھا تھا '۱۹۲۴ء میں کسی غیر مسلم نے نہیں بلکہ مصطفیٰ کمال نے خلافت کے باوقار ادارے کا خاتمہ کر دیا اور پوری مسلم دنیا بے بسی سے دیکھتی رہ گئی۔ ۱۹۴۸ء میں صرف تین دنوں کی مزاحمت کے بعد سلطنتِ آصفیہ کا چراغ گل ہو گیا۔ اسی سال اسرائیل کی ریاست وجود میں آ گئی اور اب اسی سلسلہ کی اگلی کڑی بنگلہ دیش کا قیام اور متحدہ پاکستان کے خاتمہ کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آگے پڑھتا، میں نے دیکھا کہ ابا کی آنکھیں نمناک ہو گئی ہیں۔ بولے: رہنے دو، اب ان باتوں پر ماتم سے کیا فائدہ۔ مجھے فکر مند دیکھ کر تسلی دی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں، مجھے اختلاج کا عارضہ ہے، کبھی کبھی دورہ کی کیفیت ہو جاتی ہے۔ جب میں تمہاری عمر کا تھا، ایک بار دوڑتے ہوئے سڑک پر سینے کے بل گر گیا تھا تب سے قلب پر جو زور پڑا تو اس کا اثر اب بھی کبھی کبھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ مجھے اس بات کا تو اندازہ تھا کہ ابا فطرتاً رقیق القلب واقع ہوئے ہیں۔ قربانی کے جانوروں کو بھی وہ اپنے سامنے ذبح ہوتا ہوا نہیں دیکھ پاتے تھے۔ مشرقی پاکستان سے آنے والی قتل و خون کی خبریں انھیں مضطرب کیے رکھتیں، پھر بھی انھوں نے ہمت نہ ہاری، لیکن اب جو مسلمانوں کی وحدت ملی پر حملہ ہوا تو

وہ اپنے حواس برقرار نہ رکھ پائے اور اب کتنی معصومیت سے اپنے اس درد کو بچپن میں گرجانے اور سینے پر چوٹ لگنے کے واقعات کے پیچھے چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ابا کی علالت کی خبر جب ذرا عام ہوئی تو ایک دن ماسٹر یعقوب صاحب مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے۔ ابا ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کی آمد پر اٹھ بیٹھے۔ علیک سلیک کے بعد دونوں بزرگ چند لمحے ایک دوسرے کو بس دیکھتے رہے۔ ایک بوجھل خاموشی نے ماحول کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دونوں ایک دوسرے کے درد سے واقف ہوں۔ پھر یعقوب صاحب نے خاموشی توڑی، بولے: 'حافظ صاحب میں تو تین چار دنوں تک بستر سے نہ اٹھ پایا، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ بغداد اور غرناطہ کے سقوط کی تاریخ پڑھی تھی، اب پتہ چلا کہ کتنا سفاک ہے یہ تاریخی عمل، لیکن ایک بات سمجھ میں آتی ہے چاہے یہ لوگ جتنے بھی شادیاں بجالیں بنگلہ دیش ایک مسلم اکثریت کا ملک ہے، وہ جلد ہی اپنی اصل پر لوٹ آئے گا۔'

'یہ بات درست ہے پاکستان کے دولخت ہونے سے بھی دنیا میں ایک نئے مسلم ملک کا اضافہ ہو گیا ہے۔ دیر یا سویر دشمنوں کو جب اس بات کا احساس ہوگا تو ان کی امیدوں پر اوس پڑ جائے گی۔' لیکن ابھی تو وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے پاکستان کو دولخت کر کے ہزار سالہ مسلم حکمرانی کا انتقام لے لیا ہے۔

'ہاں بڑا زہر ہے اس کی باتوں میں، ویسے تو خود کو مسلمانوں کا بڑا ہمدرد کہتی ہے مگر دیکھئے اپنے دل میں کیا کیا خباثیں چھپائے بیٹھی تھی۔ نہرو کی بیٹی سے اس قدر منافقت کی توقع نہ تھی، مگر اس کا بھی کیا قصور جب خود ہمارے درمیان تالی پیٹنے والے موجود ہوں تو وہ تکلف سے کام کیوں لے۔ اب دیکھئے نارودو اخبارات کے مدیروں کا جو جلسہ اس نے اپنی حمایت میں طلب کیا تھا اس میں کتنے بڑے بڑے جغادری اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔'

'ایسے لوگ تو ہر زمانے میں مل جاتے ہیں، مگر مؤثر اردو اخبارات کے مدیران تو اب بھی نظر بند ہیں۔ حکومت کو اس بات کا اندازہ ہے کہ مسلمان خواہ جتنے بھی کمزور ہوں وہ اپنی وحدت ملی پر کسی حملے کو ٹھنڈے پیڑوں برداشت نہیں کر سکتے۔'

'بڑی عجیب صورت حال ہے، کاش کہ مسلمانوں میں محمد علی جیسا شخص ہوتا جو اس موقع پر ملت اسلامیہ کو سہارا دینے کے لیے سامنے آتا۔' یہ کہہ کر یعقوب صاحب خاموش ہو گئے۔ مجلس میں ایک بار پھر گھٹن آمیز خاموشی طاری ہو گئی۔ چند ثانیے توقف کے بعد بولے: 'ندائے ملت' کا تازہ شمارہ دیکھا ہے، ایک

عجیب رپورٹ شائع ہوئی ہے۔

نہیں ادھر کہاں کچھ دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

بولے: رابطہ عالم اسلامی کے حوالہ سے یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ تین صہیونی ایجنٹوں کو اسرائیل نے مشرقی پاکستان میں اس کام پر مامور کر رکھا تھا کہ وہ بنگالی عوام کو مغربی پاکستان کے خلاف بغاوت پر آمادہ کریں۔ رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ رحمان سبحان جو مشہور بنگالی اکا نومسٹ ہیں، انھوں نے پیرس میں ڈینیل کوہن سے ایک خفیہ ملاقات بھی کی تھی۔ 'ندائے ملت' نے اس پر اپنا کوئی تبصرہ تو نہیں لکھا ہے لیکن اس سے اس بات کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے کہ اس سازش کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔

'اور وہ' شبستاں' میں بھی تو مضمون شائع ہوا ہے۔

کون سا؟ یعقوب صاحب نے میرے شوقِ مداخلت کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے پوچھا۔

'وہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشن گوئیوں والا'۔

اچھا! یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔

مجھے دفعتاً احساس ہوا کہ میں نے بزرگوں کی گفتگو میں مغل ہو کر بے ادبی کی ہے۔ اس خفت کو مٹانے

کے لیے چائے کی پیالیاں سمیٹیں اور مجلس سے نکل آیا۔

## ۷ جشنِ سیمیں

ایک طرف سقوط ڈھا کہ پر مسلمانوں کے دل سخت مجروح تھے اور دوسری طرف ملک بھر میں جشن کی لے مسلسل بڑھتی جاتی تھی۔ اندرا گاندھی جب فتح کے اعلان کے لئے پارلیامنٹ پہنچیں تو ان پر تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے۔ اٹل بہاری واجپئی نے تو ایک قدم آگے بڑھ کر انھیں درگا کا اوتار قرار دیا۔ البتہ مسلمان خود کو پہلے سے کہیں زیادہ الگ تھلگ محسوس کر رہے تھے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ اس ملی سانحہ پر منعقد ہونے والے جشن میں کیسے شریک ہوں۔ اسی دوران ایک دن اسکول میں یہ اعلان ہوا کہ اس سال حکومتی سطح پر جشن آزادی کی سلور جوہلی منائی جائے گی۔ سقوط کا زخم ابھی تازہ تھا، سخت غصہ آیا، کون سا جشن، پھر خیال آیا کہ کیا عجب کہ اس میں کوئی گہری بات ہو جو میری سمجھ میں نہ آتی ہو۔ دل و دماغ کنفیوژن کا شکار تھا۔ ایک دن 'صدقِ جدید' کے تازہ شمارہ میں یہ بات پڑھنے کو ملی کہ 'مسلمانوں کے غم و غصے کی اصل وجہ یہ ہے کہ عام طور پر بنگلہ دیش کی آزادی اور پاکستان سے اس کی علیحدگی کے واقعہ کو مسلمانوں کے خلاف فتح کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ ان کے خلاف تحقیر آمیز اور اشتعال انگیز نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کی ناراضگی کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ انھیں لگتا ہے کہ یہ جنگ بنیادی طور پر پاکستان کی سالمیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے لڑی گئی ہے۔ ہماری وزارت اطلاعات جو ہر طرح کے پروپیگنڈے کا بروقت ازالہ کرتی ہے اس نے مسلمانوں کے غم و غصے کے تدارک کے لیے کوئی بروقت قدم نہیں اٹھایا۔ میرے چھوٹے سے دماغ میں یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ یہ جنگ تو لڑی ہی اسی لیے گئی تھی کہ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے کاٹ دیا جائے تاکہ ہزار سالہ مسلم حکمرانی کا انتقام لیا جاسکے، پھر وزارت اطلاعات اس تاثر کو کیسے زائل کرتی۔ کبھی سوچتا شاید ان باتوں میں کوئی گہرا نکتہ ہو۔ پھر یہ بھی خیال آتا کہ ہمارے اساتذہ بھی تو ملت کے تئیں کم درد نہیں رکھتے، سو اس خیال سے سلور جوہلی کے لیے بنائی جانے والی کمیٹی میں شامل ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق سال بھر اسکول میں مسابقہ کے چھوٹے بڑے پروگرام ہونے تھے، کلاس روم کو سجایا جانا تھا اور پھر ایک دن وقت موعود پر ساتویں جماعت کے تمام طلباء کو شہر اور قصبات کے

دوسرے اسکولوں کے طلباء کے ساتھ ایک خاص یونیفارم میں آزادی کے پریڈ میں شریک ہونا تھا۔ میں چونکہ اس وقت اتفاق سے ساتویں جماعت میں تھا جسے پریڈ کے حوالے سے پورے اسکول میں مرکزی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ اب ہم لوگوں کا زیادہ تر وقت غیر نصابی سرگرمیوں میں صرف ہوتا۔ طلباء کے چھوٹے چھوٹے غول نئی نئی اسکیمیں بنانے میں مصروف رہتے۔ اسی دوران ایک دن کسی نے اطلاع دی کہ روٹری کلب میں بنگلہ دلش سے لوٹ کا بہت سا سامان آیا ہے جو بہت ارزاں قیمتوں پر فروخت ہو رہا ہے۔ جانتے ہو کر کٹ کا بالکل نیا بلا شانہ صرف آٹھ آنے میں لے کر آیا ہے اور اس کے ساتھ چمڑے کی چمچاتی ہوئی گیند مفت، خورشید نے راز دارانہ انداز میں بتایا۔ طرح طرح کے سامان ہیں، ابھی شاید کم لوگوں کو معلوم ہے ورنہ بڑی بھیڑ ہوتی۔ بلے میں تو میری دلچسپی نہ تھی لیکن لوٹ کا مال اور وہ بھی بنگلہ دلش سے، یہ سن کر میری رگ تجسس پھڑک اٹھی۔ روٹری کلب ہمارے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ شام کے وقت ہم دو تین بچے وہاں جا پہنچے۔ برآمدے میں کپڑوں کے کھلے گٹھڑ جس میں طرح طرح کی گھریلو اشیاء اور استعمال کے سامان بکھرے پڑے تھے۔ شاید کام کی زیادہ چیزیں لوگ لے جا چکے تھے۔ میری نظر کریم کلر کی ایک اچکن پر پڑی، میں چونک اٹھا۔ ارے یہ تو جیلانی چچا کی اچکن لگتی ہے، بالکل ویسی ہی جسے ہم لوگ دھوپ دکھا کر ان کی یادوں کی امانت کے طور پر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے کمال وارفتگی سے اسے اٹھایا، الٹ پلٹ کر دیکھا جیسے اس سے انسیت کا کوئی رشتہ ہو، لیکن یہ کیا، ارے اس پر تو خون کے دھبے ہیں۔ میرے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ایسا لگا جیسے ہم کسی مقتل میں نکل آئے ہوں۔ مشرقی پاکستان سے آنے والی ہولناک کہانیاں نگاہوں میں پھر سے مجسم ہو گئیں۔ تین پیسے کی سائیکل اور وہ گلابی فراک اور ایک پیر کا چھوٹا سا موزہ۔ میں نے اسے اٹھانا چاہا مگر ہمت جواب دے گئی۔ خیال آیا نہ جانے یہ کس کی سائیکل ہو، کتنے چاؤ سے اس نے خریدی ہوگی، شاید اس گلابی فراک والی بچی کی ہو، پتہ نہیں وہ زندہ بھی ہے یا موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔ لاکھوں لوگ مارے گئے ہیں، وہ کچھ نہ کچھ تو پہنتے اوڑھتے ہوں گے، ان میں معصوم بچے بھی ہوں گے۔ انھوں نے ضد کر کے اپنے والدین سے طرح طرح کی چیزیں خریدوائی ہوگی۔ یہ تو چند چیزیں ہیں جو یہاں برآمدے میں بکھری ہیں۔ نہ جانے ان کے استعمال کرنے والے اب کہاں کس حال میں ہوں گے۔ شاید ان کے بارے میں دنیا کو کبھی کچھ پتہ نہ چل سکے۔ ان بوڑھوں اور بچوں کی کہانیاں جن کے سامان یہاں عالم بے سروسامانی میں بکھرے ہیں، ان کی کہانیاں کون لکھے گا۔ جب تک اخباروں میں یہ پڑھتا تھا کہ نو ماہ کی خونریزی میں اتنے لوگ مارے گئے، تعداد کی کثرت بھی ایک عددی کھیل معلوم ہوتی تھی، آج جو مرحومین کی اشیاء نگاہوں کے سامنے آئیں تو وہ اپنے اصل مالکوں پر بیٹے مصائب کا قصہ کچھ اس طرح

سنانے لگیں کہ مشرقی پاکستان کی خون آلودہ سرزمین پھر سے چشم تصور میں جھلملانے لگی۔

اسکول میں جیسے جیسے جشن آزادی کی تیاریاں آگے بڑھتی جاتیں، کلاسوں کا نظام ڈھیلا پڑتا جاتا۔ اسکول کے کیمپس سے ملحق شہر کا مشہور میڈیکل کالج تھا۔ ایک دن چند احباب کے ساتھ کالج کی سیر کو جانکا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نیم تاریک کمرے میں دو حنوط شدہ لاشیں رکھی ہیں۔ کمرے میں کیمیکل کی ناگوار بو پھیلی ہوئی ہے۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کو اس طرح بے یار و مددگار پڑا دیکھ کر خوف و دہشت کی کیفیت پیدا ہوئی۔ سوچا پتہ نہیں یہ کون لوگ ہوں جو شوئی قسمت سے یہاں پڑے ہیں۔ پھر اچانک روٹری کلب کی وہ اشیاء یاد آئیں، پھر سے وحشت کے وہ دن واپس آگئے جب میں خواب میں کئی گردن کا بچہ دیکھ کر ڈر جاتا تھا۔ اب حنوط شدہ لاشوں کے ساتھ پورا مقتل آباد ہو گیا، پھر سے کانوں میں مہم اور پراسرار آوازیں آنے لگیں۔

اس دوران ابا کی بیماری نے طول پکڑا۔ ایک دن نزلہ کی کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ عام طور پر اس قسم کی بیماری کا علاج خود ہی کر لیتے تھے، لیکن بخار جب تیز ہوا تو ہم لوگوں کو تشویش لاحق ہوئی۔ انہیں اس طرح بستر پر لیٹے دیکھنے کے ہم لوگ عادی نہ تھے۔ طے پایا کہ باقاعدہ علاج ہو۔ ابا اس تجویز کی مخالفت کرتے رہے، انہیں شاید پتہ تھا کہ یہ معمولی نزلہ زکام کا حملہ ہے، لیکن گھر والوں کے مسلسل اصرار پر ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ طرح طرح کی رنگ برنگی دواؤں کے اثر سے بخار تو اتر گیا لیکن اپنے پیچھے نقاہت اور دوسری پیچیدگیوں کا ایک سلسلہ چھوڑ گیا۔ ڈاکٹر پھر آئے، اب کی انہوں نے انواع و اقسام کی دواؤں سے پوری میز آباد کر دی۔ جاتے جاتے وہ بڑی رازداری کے ساتھ گھر والوں کو کچھ ایسی نصیحتیں کر گئے کہ پورے گھر پر سراسیمگی کی ایک چادر تن گئی۔ ابا سمیت ہم بچے اس راز سے ناواقف تھے۔ پھر بھی مجھے کسی نہ کسی طرح یہ سن گئی کہ مرض خطرناک ہے اور زندگی کے دن بس گئے چنے ہیں۔ ابا بار بار کہتے رہے کہ انہیں کچھ نہیں ہوا ہے، لیکن گھر والوں کے اصرار پر دوائیں کھاتے رہے۔ دواؤں نے الٹا اثر دکھایا، ان کے جسم پر جابجا زخم نکل آئے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے انہوں نے دوائیں موقوف کر دیں اور زندگی کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ کہنے لگے مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرض کی تہہ تک نہیں پہنچ پائے ہیں۔

چند دنوں میں یہ زخم رسنے لگے، سینہ اور پیٹھ اور کلائیوں ہر طرف زخم ہی زخم۔ ان زخموں کی تکلیف انہیں ہر کل بے چین کئے رکھتی۔ سقوط ڈھاکہ سے ان کے دل پر جو زخم لگا تھا اسے تو وہ کسی طرح چھپانے میں کامیاب ہو گئے تھے، لیکن ان زخموں کی تکلیف ان سے چھپائے نہ چھپتی تھی۔ طرح طرح کے مرہم آزمائے

گئے لیکن سب بیکار۔ ایک دن گرمی کی دوپہر میں جب وہ بے کلی کے عالم میں یا مسبب الاسباب کی صدا لگا رہے تھے، ایک اجنبی شخص مکتبہ میں وارد ہوا۔ دیکھنے میں وہ کوئی دہقانی لگتا تھا، اس کے ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے میں مختصر سی گٹھری جس سے ایک لوٹا بندھا تھا۔ اس نے والد صاحب کو اس تکلیف میں دیکھ کر تسلی دی، کہنے لگا فکر مت کیجئے، ان زخموں پر سرخ مرچ کی لیپ لگائیے، چند دنوں میں یہ زخم ہوا ہو جائیں گے۔ کھلے زخموں پر سرخ مرچ کی لیپ؟ پہلے تو ہم لوگوں کو اس خیال سے ہی وحشت ہوئی، لیکن کرتے بھی کیا وہ خدائی فرستادہ یہ نسخہ تھا کر جا چکا تھا۔ لیپ لگاتے ہی ابا کی تکلیف میں غیر معمولی کمی آگئی، انھیں ایسا لگا جیسے کسی نے ان کے زخموں پر پھاہا رکھ دیا ہو۔ چند دنوں میں زخم مندمل ہونے لگے۔ مکتبہ میں معمول کی زندگی لوٹ آئی۔

اُدھر اسکول میں بالآخر وہ وقت موعود آ پہنچا جس کے لیے مہینوں سے تیاری ہو رہی تھی۔ تقریری اور تحریری مقابلوں میں تو انبساط کا سامان رہتا۔ کھیل کود کے مسابقتی بھی اکثر لطف دے جاتے، لیکن پریڈ میں شرکت کا معاملہ بالکل الگ تھا، اس کے تصور سے ہی پولیس لائن میں جوانوں کی میکینکی لیفٹ رائٹ، قدموں کے پٹننے کی دھک اور کیپٹن کی پاٹ دار آواز کا منظر نگاہوں کے سامنے آ جاتا جس سے میں ایک خاص قسم کی اجنبیت محسوس کرتا۔ اب جو سفید شرٹ اور نیلی نیکر کے مخصوص یونیفارم میں صبح اسکول پہنچا تو یہ دیکھ کر وحشت ہوئی کہ میری طرح کلاس کے سبھی طالب علموں نے یہی لباس پہنا ہوا ہے، ایسا لگا جیسے میری انفرادیت جاتی رہی ہو۔ ہمارے اسکول میں یونیفارم کا رواج نہ تھا۔ ہر شخص خدا کا دیا اپنی پسند کا لباس پہنتا۔ البتہ صبح سیر کو جاتے ہوئے کبھی کبھی جیل کے قیدیوں کے چھوٹے چھوٹے غول ایک خاص یونیفارم میں لے جاتے ہوئے دکھائی دیتے۔ آزادی کے یونیفارم کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہم لوگوں کو کلاس رول نمبر کے حساب سے قطار میں کھڑا کیا گیا اور اس خیال سے کہ بچوں کو پولو میدان تک پیدل جانا ہے اور وہاں ہزاروں بچوں میں یہ کھونہ جائیں، ہر طالب علم کی پشت پر ان کے نمبر چپکا دیئے گئے۔ ہر طالب علم کو اسی ترتیب میں اپنا سفر جاری رکھنا تھا۔ کچھ اساتذہ اس بات پر مامور تھے کہ وہ ان نمبروں کی ترتیب پر نگاہ رکھ سکیں۔ میرا رول نمبر تیرہ تھا، پہلے تو اس بات پر کوفت ہوئی کہ پہلی بیچ پر بیٹھنے والے طالب علم کو قطار میں تیرہویں نمبر پر جگہ ملی۔ جب کبھی قطار میں میرے قدم سست پڑ جاتے تو آواز آتی، ارے تیرہ نمبر کہاں پیچھے رہ گیا، ذرا تیز چلو۔ کبھی آواز آتی: ارے اس تیرہ نمبر والے لڑکے سے کہو وہ قطار سے باہر نہ چلے۔ اسکول میں اساتذہ مجھ سے خاص شفقت فرماتے، والد صاحب کی مجلسوں میں بھی جب کبھی میری طالب علمانہ شوخی سوائے ادب تک جا پہنچتی، اس پر مجھ سے کوئی مواخذہ نہ کرتا۔ لیکن آج مجھے یہ جان کر سخت کوفت ہوئی کہ

آزادی کے اس پریڈ میں، میں محض 'تیرہ نمبر والا لڑکا' بن کر رہ گیا ہوں۔

جیسے تیسے آزادی کے قیدیوں کا یہ جلوس پولو میدان پہنچا۔ وہاں طلباء و طالبات کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہر طرف رنگ برنگے غبارے اور جھنڈوں کی بہارت تھی۔ لوگوں کے چہرے مسرت سے سرشار تھے۔ اس تماشے میں تیرہ نمبر والے لڑکے کو کون پوچھتا۔ بادل خواستہ ایک قطار میں جگہ لی۔ پرچم کشائی کی رسم کے بعد چھوٹی بڑی کچھ تقریریں ہوئیں۔ کچھ سمجھ میں آئیں کچھ نہ آئیں، البتہ یہ اندازہ ضرور ہوا کہ بھارت اب ایک مہان دلش بن چکا ہے۔ گزشتہ چند مہینوں سے بھارت کی اس مہانتا اور اس کی فوجی قوت کا ہر طرف چرچا تھا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد یہ لے جس طرح بلند ہوئی تھی اس نے مسلمانوں کو ایک مخصوصے میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ بنگلہ دیش کی آزادی کے جشن میں قومی دھارے سے کٹ کر رہ گئے تھے یا یہ کہنے کہ قومی دھارا اب اس ملک میں مسلمانوں کے جذبات اور ان کی حمیت ملی کے خلاف بہنے لگا تھا۔ ان بے کیف تقریروں سے زچ ہو کر تیرہ نمبر کا یہ لڑکا بجھے دل کے ساتھ گھر واپس آیا۔ اسے ایسا لگا جیسے جشنِ آزادی کی یہ تقریب دراصل اس کے زخم خوردہ غیرت ملی پر نمک پاشی کے لیے منعقد کی گئی تھی۔ اسے اس غم کے اظہار کی اجازت بھی تو نہ تھی، مبادا اس کا شمار آزادی کے مخالفین میں کر لیا جائے۔ آج اس نے خود کو بہت بے بس محسوس کیا، اس نے سوچا جیلانی پچانہ جانے اب کہاں ہوں گے، کس حال میں ہوں گے، زندہ بھی ہوں گے یا نہیں اور چیچی اور ان کے وہ بچے جن کے اس نے صرف نام سن رکھے تھے، پیہ نہیں ان لوگوں پر کیا گزری ہوگی۔ کاش انھیں کوئی بتا سکتا کہ جشن کے اس ہنگامے میں ہمیں ان کے مصائب پر آنسو بہانے کی بھی اجازت نہیں۔

## لکھنؤ والے ڈاکٹر صاحب

جشن سیمین کے ہنگاموں سے فارغ ہوا تو پتہ چلا کہ اس دوران ملک میں ایک بڑی تبدیلی آچکی ہے۔ علی گڑھ، فیروز آباد اور بنارس سے فسادات کی جو خبریں آئی تھیں وہ محض مسلم مخالف فسادات نہ تھے، بلکہ مسلمانوں پر مسلح پولیس کا راست حملہ تھا۔ اس خطرے کا انکشاف اس وقت ہوا جب ایک مقامی کانگریسی لیڈر، جو ملتبہ میں کبھی کبھی ملاقات کے لیے آجاتے تھے، ایک دن متوحش نظر آئے، کہنے لگے: فیروز آباد اور بنارس میں جو کچھ ہوا وہ پولیس کی ایک طرفہ کارروائی تھی۔ چرن سنگھ نے تو صاف الفاظ میں کہا ہے کہ اسے ہندو مسلم فساد کا نام دیا جانا غلط ہے۔ یہاں تو نئے مسلمان مظاہرین پر پولیس نے ایک طرفہ کارروائی کی۔ اس میں دوسرا فریق جسے الزام دیا جاتا ہے وہ دوسرے سے شامل ہی نہیں تھا، یہ کہتے ہوئے چچا عباس کی آواز میں لرزش آگئی، ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انھوں نے بمشکل اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا: حافظ صاحب! اب کیا کیا جائے، جن پہ نکیہ تھا وہی پتے ہو ادینے لگے۔

’اندر اکو اس بات پر بڑا غصہ ہے کہ مسلمانوں نے مشرقی پاکستان پر حملہ کی پوری طرح تائید کیوں نہ کی۔‘ مجلس میں بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے صورت حال کے تجزیہ کی کوشش کی۔

اب اس سے زیادہ اور کیا کرتے؟ مسلمانوں کے بڑے بڑے قائدین اس سانحہ عظیمی کی لیڈرپوتی میں لگے رہے۔ اگر کسی نے ہمت بھی جٹائی تو بس اتنا کہا کہ مشرقی پاکستان میں مسائل کے حل کے لیے وزیراعظم کو پاکستانی صدر سے براہ راست گفتگو کرنی چاہئے تھی، کسی نے کہا کہ اگر مشرقی پاکستان علیحدہ نہ کیا جاتا تو بہتر ہوتا اور کسی نے اتنا اور اضافہ کر دیا کہ ایسا نہ ہو کہ جس طرح ہم نے مشرقی پاکستان کے مسئلہ میں مداخلت کی ہے، یہ عمل بیرونی قوتوں کے لیے تمل ناڈو میں اٹھنے والی تحریک کو سہارا دینے کا جواز فراہم کر دے۔

’یہی تو جرم ہے ہم مسلمانوں کا۔ حکومت ہم سے غیر مشروط وفاداری چاہتی ہے، اسے مسلمانوں کی صف سے ویر عبد الحمید چاہئے اور جب پھل کھانے کا وقت ہو تو انھیں یہ احساس دلایا جائے کہ تمہیں کلیدی

عہدے اس لیے نہیں دیئے جاسکتے کہ اس سے اکثریت کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔  
یہ سن کر چچا عباس نے اپنی سفید گاندھی ٹوپی درست کی، بولے: آپ کا اعتراض بالکل صحیح ہے۔ بہار  
میں مسلم وزیر اعلیٰ کی جب بھی بات آئی، عبدالقیوم انصاری اور ڈاکٹر محمود جیسے لوگ اپنی تمام تر خدمات کے  
باوجود حاشیہ پر چلے گئے۔ ہمیں اس بات کا اندازہ ہے، مگر کریں بھی کیا، مسلمانوں کے لیے کوئی اور راستہ بھی  
تو نہیں۔

راستہ نکلے گا مگر آپ لوگ ساتھ تو دیں۔ اب دیکھئے وہ ہیں نالکھنؤ والے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر فریدی کی بات کر رہے ہیں آپ؟

’جی ہاں عبد الجلیل فریدی، اللہ انھیں قائم رکھے، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہیں وہ۔  
ڈاکٹر فریدی کے لیے تو صوفی کلمات سن کر چچا عباس کچھ جزبہ ہوئے، جیسے کسی نے ان کی دکھتی رگ پر  
انگی رکھ دی ہو۔ بولے: ہمارے اکابرین ہمت نہیں جٹا پارہے ہیں، ہم چھوٹے لوگ ہیں، ہم کر بھی کیا سکتے  
ہیں، فیصلہ تو بڑوں کو لینا ہے۔

’بڑے کیا کریں گے، وہ تو ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اب ان ہی عبدالقیوم انصاری کو دیکھئے، اتنا  
قد آور لیڈر کہ جب مسٹر کرپس نے نہرو سے یہ پوچھا تھا کہ جناح کے مقابلہ میں مسلمانوں کے وہ کون قد آور  
لیڈر ہیں جو کانگریس میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں تو نہرو نے خان عبدالغفار خان، حسین احمد مدنی اور  
عبدالقیوم انصاری کا نام لیا تھا۔ اب اتنے اہم لیڈر کا حال یہ ہے کہ انھیں بہار میں ٹکٹ سے محروم کیا گیا۔ وہ  
ناراض بھی دکھائی دیئے لیکن پھر راجیہ سبھا کی رکنیت مل جانے کے بعد ان کی ناراضگی رفع ہوگئی۔ اگر ان جیسے  
لیڈر ان بھی ڈاکٹر فریدی کی طرح جرأت کا مظاہرہ کریں تو کانگریس کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔

چچا عباس نے کہا: ’آپ کی بات درست ہے۔ کانگریس کو مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی اس  
بے چینی کا احساس بھی ہے اور شاید اسی لیے وہ ان کے سر اٹھانے سے پہلے ہی ان کی ہمتیں توڑ دینا چاہتی  
ہے۔ یہ جو مسلم مظاہرین پر علی گڑھ، فیروز آباد، بنارس اور دوسری جگہوں پر پولیس آپریشن کا حربہ آزمایا گیا ہے  
اس کا مقصد یہی پیغام دینا ہے کہ مسلمانوں کو بلاچوں چراکانگریس کی قیادت میں اپنا سیاسی سفر جاری رکھنا ہے  
ورنہ اس سے سرتابی کی انھیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

’قیمت چاہے جو بھی ادا کرنی پڑے، مسلمانوں کے لیے اب ڈاکٹر فریدی کے راستے پر چلے بغیر کوئی  
چارہ نہیں، اللہ انھیں قائم رکھے۔ یہ کہتے ہوئے ان بزرگ کی آواز میں ایک ملتجیانہ ارتعاش پیدا ہوا، انھوں  
نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی، جیسے خدا کی بارگاہ میں اپنی بے بسی کا مقدمہ رکھ رہے ہوں۔

ڈاکٹر فریدی کے مداحوں میں ایک اور بزرگ جو اکثر مکتبہ کی شبینہ مجلس میں حاضر رہتے، ان کے نام سے تو ہم لوگ واقف نہ تھے، البتہ سب لوگ انھیں کمپاؤنڈر صاحب کہتے۔ وہ ریلوے کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد شہر کے ایک مسلم علاقہ میں اپنا مطب کرتے تھے۔ دن میں مطب ہوتا اور شام میں مکتبہ کی مجلسوں میں شرکت۔ حس مزاح اور بذلہ سنجی سے قدرت نے انھیں خاص طور پر نوازا تھا۔ لو بھئی عبد المنان پیدل حج کو چلے، اب انھیں اس کبر سنی میں پیدل جانے کی کیا سوچھی، دیکھو بیٹے اخبار والے نے کیا سرنجی لگائی ہے، پھر کہتے یہ کاتب کی ستم ظریفی ہے، پیدل کو اضافی نقطے لگا کر پیدل کر دیا۔ اب جو بات سے بات نکلتی تو حضرت کاتب کی ستم ظریفی کے لطائف کے انبار لگا دیتے۔ ایک دن ایک حضرت مولانا قسم کے مولوی صاحب سے یہ پوچھ بیٹھے کہ کیوں صاحب آپ کا مرزوم کہاں ہے؟ یہ سنتے ہی مولوی صاحب ہتھ سے اکھڑ گئے۔ پھر جب انہیں یہ پتہ چلا کہ وہ دراصل حضرت کی جائے پیدائش کے بارے میں استفسار فرما رہے تھے تو جھینپ سے گئے۔ کبھی کبھی ان کے ہاتھ میں 'قائد' اخبار کی کوئی کاپی دبی ہوتی، چھوٹے ہی کہتے: ارے بھئی دیکھئے 'قائد' نے کیا کہا ہے۔ شروع میں تو مجھے یہ سمجھنے میں خاصی دشواری ہوتی کہ ان کی مراد قائد اخبار سے ہے یا وہ اپنے ممدوح ڈاکٹر فریدی کی بات کر رہے ہیں۔ ایک دن بڑے غصے میں تھے، کہنے لگے: 'پچھلے دنوں فیروز آباد میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، اب تو یہ آگ پھیلتی ہی جا رہی ہے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے اخبار کے اندر سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا جس پر سرخ قلم سے کچھ اعداد و شمار لکھ رکھے تھے۔ بولے: 'اب دیکھئے ستمبر کے مہینہ میں دادری میں مسلمانوں کے گھر جلانے گئے، نوناری میں نومبر کے مہینہ میں ۷۲ مسلم گھروں کو زمیں بوس کر دیا گیا، دسمبر کے مہینہ میں سجنی اور رانی منو میں، جنوری میں درگا جوت اور فروری میں گونڈا اور بستی میں عین ریاستی سرپرستی میں مسلمانوں کو تاراج کیا گیا۔ آخر یہ عورت چاہتی کیا ہے؟ کیا یہ ہر مسلم علاقے پر مشرقی پاکستان کی طرح چڑھائی کرنا چاہتی ہے؟ یہ درگا آخر کتنا خون چنے گی؟'

کمپاؤنڈر صاحب کو اس قدر طیش میں دیکھ کر تعجب ہوا۔ وہ اکثر بذلہ سنجی کی باتیں کرتے اور سنجیدہ علمی ماحول میں بھی اپنے نکاتِ دل پذیر سے ظریفانہ رنگ بھر دیتے۔ آج ان کے غصہ میں خوف کی جھلک نظر آئی۔ بولے: 'شہر کے حالات بھی خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر فریدی نے ذرا آواز کیا اٹھائی، اس عورت نے مسلمانوں کو سبق سکھانے کا تہیہ کر لیا۔ جب سے کمان اس کے ہاتھ میں آئی ہے صورت حال نازک ہوتی جا رہی ہے۔'

'صورت حال تو پہلے بھی اچھی نہیں تھی، لیکن ہاں جب تک نہرو اور آزاد جیسے لوگ زندہ تھے ایک بھرم باقی تھا، آنکھوں میں مروّت کا پانی تھا اور اب تو بڑی بے شرمی کے ساتھ ان ہی مسلمانوں پر ظلم کیا جا رہا ہے،

جن کے ووٹ پر کانگریس جیت کر آئی ہے۔ ذکی صاحب نے صورت حال پر اپنا تجزیہ پیش کیا۔  
 ’آزاد تو ویسے بھی آخری دنوں میں خود کو ایک شکست خوردہ انسان سمجھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ ان کی سنتا کون ہے، انھوں نے دارالمصنفین کو جب پچاس ہزار روپے کی سرکاری اعانت دی تھی تو اس پر بھائی لوگوں نے کتنا شور مچایا، والد صاحب نے اظہار خیال کیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولے: ’بے چارے آزاد کرتے بھی کیا؟ منقسم ہند میں ان کی حیثیت ایک صدائے گم گشتہ کی ہو گئی تھی۔ کیا سحرانگیز نعرے تھے یاد ہے آپ کو، یہ کہتے ہوئے انھوں نے کمپاؤنڈر صاحب کی آنکھوں میں جھانکا، بولے: ’پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ، مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ، وحدت کے ترانے شوق سے گا۔ لوگ اس فریب کو نہ سمجھ پائے کہ پاکستان کا یہ غیر فطری منصوبہ جغرافیائی طور پر اسلامیان ہند کو تین حصوں میں تقسیم کر دے گا اور اس طرح آنے والے دنوں میں ان کی ہوا اکھڑ جائے گی۔‘

’جی ہاں کسے پتہ تھا کہ منقسم ہندوستان میں مسلمانوں پر ایک دن ایسا بھی آئے گا جب انھیں اپنی زبان اور اپنی شناخت کی حفاظت کے لیے احتجاج کرنا پڑے گا، ذکی صاحب نے کہا۔  
 مگر یہ احتجاج ہی تو اسے پسند نہیں، یہ محترمہ اسی بات پر تو ناراض ہیں کہ مسلمانوں کو احتجاج کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ یہ مسلمانوں کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔ کمپاؤنڈر صاحب نے مزید وضاحت کی۔  
 بولے: ’ڈاکٹر فریدی نے تو بڑی وضاحت سے یہ بات لکھی ہے، انھوں نے تاریخ، مقام اور اس میٹنگ تک کا حوالہ دیا ہے جس میں مسز گاندھی نے مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ الیکشن جیتنے کے بعد وہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار اور اردو زبان کے تحفظ کو یقینی بنائے گی، لیکن اب کیا کیا اس نے؟ بالکل الٹا، یونیورسٹی وزارت تعلیم کے ماتحت کر دی گئی اور جب مسلمانوں نے اپنے غصہ کے اظہار کے لیے عوامی مظاہرے کا راستہ اپنایا تو ان پر گولیاں چلوادیں۔ بھلا بتائیے صرف فیروز آباد میں چھیا سٹھ لوگ پولیس کی گولیوں سے مارے گئے۔ ظلم ہے ظلم۔ کمپاؤنڈر صاحب نے خفگی کا اظہار کیا۔‘

’ہمارے خیال میں نئے مظاہروں سے خود مسلمانوں کا نقصان ہوگا۔‘

’پھر کیا کرنا چاہئے؟‘ کمپاؤنڈر صاحب نے پوچھا۔

’ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوت کا۔ ذکی صاحب نے جو اخبار ’دعوت‘ کے مستقل قاری تھے اور

جن کی ہمدردی جماعت اسلامی کے ساتھ تھی، انھوں نے کمپاؤنڈر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بولے: ’دعوت‘ سے کسے انکار ہے، لیکن راستہ تو ’قائد‘ دکھائے گا نا! یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنے

ہاتھ میں مڑے اخبار ’قائد‘ کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاکٹر فریدی کے خلوص میں شبہ نہیں، وہ دبنگ آدمی ہیں۔ انھوں نے مسلم مجلس کے قیام سے پہلے غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کی فریب کاریوں کا مشاہدہ کیا ہے، لیکن خطرہ ہے کہ ان کے گرد جو مولوی لوگ جمع ہیں وہ انھیں پھر سے کانگریس کے ذریعہ ڈسے جانے پر مجبور کر دیں گے۔ کانگریسی ڈسین تو خیر سے تکلیف کا پتہ تو چلتا ہے، مولوی ڈسے تو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ حادثہ کب اور کیسے پیش آگیا۔ یہ کہتے ہوئے کمپاؤنڈر صاحب نے رخصت کی اجازت لی۔



یوپی کے اطراف و اکناف میں ہونے والے فسادات کی لپٹ اب شہر میں محسوس ہونے لگی تھی۔ ہر روز ایک نئی افواہ سننے کو ملتی کہ ہندوؤں کے فلاں فلاں محلے میں مسلمانوں پر حملہ کے لیے منصوبہ بندی ہو رہی ہے، اسلحے اکٹھے کیے جا رہے ہیں۔ ہم لوگوں کی رہائش مکتبہ سے ملحق پچھلے حصے میں تھی۔ یہ بازار کا علاقہ تھا جہاں ضلعی انتظامیہ اور پولیس کے دفاتر تھے، لیکن خطرہ تو پولیس والوں سے ہی تھا۔ جنھوں نے یوپی کے مختلف شہروں میں مسلمانوں پر یا تو راست حملہ کیا تھا یا حملوں کی سرپرستی کی تھی۔ اطراف میں غیر مسلموں کے مکانات تھے، گویا ایک اعتبار سے ہم لوگ پہلی صف کے معرکہ آراؤں میں تھے۔ شہر کے مسلم محلوں میں مقابلہ کی تیاری تھی، لیکن مسلح پولیس کے آگے ان کے ڈنڈے اور لاٹھیاں کیا کر پاتیں۔ شہر کے احباب نے بہت زور ڈالا کہ ہم لوگ مسلم محلے میں منتقل ہو جائیں، لیکن والد صاحب کا کہنا تھا کہ اس طرح ہمارے محاذ کو چھوڑ کر بھاگ جانے سے مسلمانوں کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ سو یہ طے پایا کہ یہیں رہ کر حالات کا مقابلہ کیا جائے۔ گھر میں بزرگوں کے جو آثار تھے اس میں ایک قدیم طرز کے جرمن لیمپ کے علاوہ ذوالفقار جیسی تلوار کونیاں حیثیت حاصل تھی۔ اب اس موقع پر تلوار کی افادیت سمجھ میں آئی۔ کوئی ذوالفقار کو منتقل کرنے میں لگا تو کسی نے روزمرہ کے استعمال کی چھری چاقو اور اس جیسی اشیاء کی فہرست بنانی شروع کی۔ تاریخی ناولوں میں جنگوں کے بارے میں جو کچھ پڑھ رکھا تھا اس کی روشنی میں مدافعتی جنگ کا منصوبہ ترتیب دیا جانے لگا۔ یہ تو ہم بچوں کی تیاری تھی۔ ادھر ابا کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔ وہ کبھی ہم لوگوں کی ہمت بندھاتے کہ ان شاء اللہ کچھ نہیں ہوگا اور کبھی عالم جذب میں کہتے کہ یا اللہ تو ہی مسبب الاسباب ہے۔ ادھر ذوالفقار کی چمک میں جتنا اضافہ ہوتا جاتا ہماری آنکھوں میں بھی چمک بڑھتی جاتی۔ ہمارے بھائیوں میں کوئی اس کی اساطیری عظمت کا بیان کرتا تو کوئی قرون اولیٰ کے سو ماؤں کا حوالہ دیتا اور ہم لوگ چشم تصور میں خود کو میدان کارزار میں پاتے۔ ایک ذوالفقار اور اتنے سارے علی، ایسا لگتا جیسے ہمارا پلڑا بھاری پڑ رہا ہو۔

ہر روز نئی نئی افواہیں سنائی دیتیں۔ کبھی پتہ چلتا کہ آج کی شب شہر کے شمالی حصہ سے حملہ آوروں کے

غول نکلیں گے۔ جمعہ کی شب حملے کی خبر عام تھی۔ اب جو رات ڈھلی تو پتہ چلا کہ شام غریباں واقعی کتنی طویل ہوتی ہے۔ مغرب سے عشاء کا ایک ایک لمحہ، ایسا لگا جیسے صدیوں پر بھاری ہو، بڑی مشکل سے عشاء کی اذان ہوئی، لیکن آج اس میں وہ دم خم نہ تھا۔ مومنین کو فلاح کی طرف بلانے والی دعوت، ایسا لگتا تھا جیسے مسلسل ڈوبتی جا رہی ہو، جیسے یہ آخری اذان ہو، آج کی رات کے بعد اس شہر کو خدا کی کبریائی کی دعوت دینے والے لوگ شاید باقی نہ رہ سکیں۔ پھر بھی دل کے ایک گوشہ میں یہ امید کہیں باقی تھی کہ خدا ہمیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔ رات گزرتی رہی، اس کی خاموشی سے بھی ڈر لگتا اور جب دور سے چیخ و پکار کی آواز سنائی دیتی تو ہمارے معصوم دل دہل جاتے۔ جیسے تیسے یہ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ چند دن بیم ورجا کی اس کیفیت میں رہ کر ایک ذوالفقار اور رب ذوالفقار کے سہارے ہم لوگ اس خطرے سے نکل آئے۔ ایسا لگا جیسے دشمنوں کے حوصلے پست ہو گئے ہوں اور انہوں نے حملے کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔

شہر میں فسادات کا خطرہ تو ٹل گیا لیکن دس بارہ دن زندگی جس اذیت میں گزری اس نے ہمارے قلب و روح کو بری طرح مجروح کر دیا۔ دن کی روشنی میں بھی گھر سے باہر نکلتے ہوئے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ نہ جانے کب کس ہاتھ سے خنجر بلند ہو اور کس رخ سے بندوق کی کوئی زناٹے دار گولی ہمارا کام تمام کر دے۔ جب بھی ذوالفقار پر نظر پڑتی یہ خیال آتا کہ اس بوسیدہ تلوار کے سہارے آخر ہم کب تک اپنی راتیں صبح کرتے رہیں گے۔ اس دفعہ تو کسی طرح بچ نکلے، لیکن اگر حالات اسی رخ پر چلتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب اس ملک میں صبح ہمارے بغیر ہی ہوا کرے گی۔

مجھے مسلم محلہ کی وہ مجلس یاد آئی جہاں ایک بزرگ مسلمانوں کے اتحاد پر گفتگو فرما رہے تھے۔ قصہ اس تقریب کا کچھ یوں ہے کہ ایک شادی میں شرکت کے لیے والد صاحب نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ میرے لیے یہ بالکل ہی نیا تجربہ تھا کہ میں کسی سماجی تقریب میں والد کی نمائندگی کروں۔ پہلے تو لوگوں کا اژدہام دیکھ کر وحشت ہوئی، ایسا لگتا تھا جیسے پورا محلہ ہی الٹ آیا ہو، لیکن جب اہل خانہ کی مجھ پر نظر پڑی تو انہوں نے خصوصی اکرام کا معاملہ فرمایا اور بزرگوں کی طرح مجھے بھی خصوصی مدعوئین کی مجلس میں لا بٹھایا۔ یہاں محلہ کے سرکردہ افراد جمع تھے اور بات مومنین کے اتحاد کی چل رہی تھی۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اہل مجلس کے پیش نظر دراصل مومنین کی سر بلندی کے بجائے مومن کافر نس کی شیرازہ بندی ہے۔ ایک سفید ریش بزرگ جنہوں نے کھادی کے کرتے پر رہنمایان قوم والی بٹڈی پہن رکھی تھی اور جن کی گاندھی ٹوپی اور محراب عینک سے جھانکتی بارعب آنکھیں اس بات کا عندیہ دیتی تھیں کہ انہوں نے عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ ملٹی اور قومی کاموں میں صرف کیا ہے۔ نام تو پتہ نہیں ان کا کیا تھا، البتہ لوگ انہیں ڈاکٹر صاحب کے نام سے

پکارتے تھے۔ جب وہ بولتے تو مجلس میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتیں۔ فرما رہے تھے کہ ہمیں اپنے اتحاد کو برقرار رکھنا ہوگا، یہ ہمارا اتحاد ہی ہے جس نے حکومت کو ہماری طرف ملتفت ہونے پر مجبور کیا۔ اب بنگروں کے لیے نئی اسکیمیں بنائی جا رہی ہیں، حکومت نے پاور لوم کے لیے قرض کے منصوبے منظور کیے ہیں۔ پسماندہ طبقوں کے لیے ریزرویشن سے ہمارے لیے نئے راستے کھلیں گے۔ اب ہم لوگ اس بات کی بھی کوشش کر رہے ہیں کہ حکومت براہ راست ہم سے بعض مصنوعات خریدے۔ خاص طور پر درمی کی سپلائی پولیس اور فوج میں بڑے پیمانے پر ہو سکتی ہے۔ اس سے ہماری معاشی حالت میں سدھار آئے گا، لیکن حکومت اسی وقت تو ہمارے لیے کچھ کرے گی جب اسے یقین ہو کہ ہم بھی اس کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کچھ اور نہیں کر سکتے، یہ تو کر ہی سکتے ہیں کہ ہمارا ووٹ اکٹھے کانگریس کی جھولی میں جائے۔ یہ ٹکڑے ٹکڑے ووٹ دینے کا آخر فائدہ بھی کیا ہے۔ کچھ لوگ کانگریس کے بارے میں بددلی پھیلا رہے ہیں۔ ارے بھئی! آپسی لین دین میں کچھ اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ ہمارے اکابرین ان مصالحوں سے خوب واقف ہیں، ہر ایرے غیرے کا کام نہیں کہ وہ رہنمائی کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لے۔

گفتگو جب ذرا طویل ہوئی تو ایک صاحب نے بڑے ادب سے کانگریس کی سردمہری بلکہ مسلمانوں کے سلسلے میں اس کے بدلتے رخ کا شکوہ کیا۔

بولے: کہا تو یہ باتیں ہماری نظر سے پوشیدہ نہیں، ہمارے اکابرین اس صورت حال پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ہم تو آگے کے لیے سوچیں، حکومتی منصوبوں سے فائدہ اٹھائیں، اب چادریں اور لنگیوں کے بجائے آپ لوگ درمی بنائیں درمی، کوالٹی کا خیال رکھئے تاکہ ہماری کوآپریٹو سوسائٹی اچھی قیمت پر براہ راست محکمہ پولیس کو سپلائی کر سکے۔

کس کے لیے حضور؟ ایک منہنی سے شخص نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے پوچھا۔ کہنے لگا: ڈاکٹر صاحب! آپ کس کے لیے درمی بنا رہے ہیں، وہی پولیس والے نا جو موقع ملتے ہی ہمارے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں؟ وہ ہماری بنائی ہوئی درمیوں پر استراحت فرمائیں تاکہ نشاط اور تازگی کے ساتھ ہم پر حملہ کر سکیں۔ کیسی عجیب اسکیم لائے ہیں آپ؟

ڈاکٹر صاحب اس اعتراض کے لیے شاید تیار نہ تھے، بولے: ارے بھئی تم سمجھتے نہیں ہم ان کے لیے درمی بنا رہے ہیں، کوئی بندوق تو نہیں۔

لیکن ہم تو انھیں بندوق سے زیادہ خطرناک اسلحہ یعنی اپنا قیمتی ووٹ ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہم انھیں اپنے اوپر برضا و رغبت حکمرانی کا اختیار عطا کر دیتے ہیں۔ جب ایک بار آپ نے اپنے

اموران کے حوالے کر دیئے تو پھر وہ کیوں نہ آپ کی غیرتِ ملی سے کھیلیں، آپ کو جب چاہیں لہولہان کر دیں اور آپ اس صورت حال پر احتجاج بھی کریں تو انھیں گراں گزرے۔

ارے بھئی اس بات سے ہم لوگ بھی دکھی ہیں، ہمارے بڑے خالی نہیں بیٹھے ہیں، آخر میری بھی تو زندگی گزری ہے، سیاست میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے،

مگر فیروز آباد کے مسئلہ پر آپ نے مسز گاندھی کا بیان نہیں پڑھا۔ ۶۸ مسلمان پولیس کی گولیوں کا شکار ہوئے۔ این. جی. گورے جو رکن پارلیامنٹ ہیں، انھوں نے مسز گاندھی کو صاف لفظوں میں لکھا تھا کہ فیروز آباد کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے ہر حربے آزمائے گئے، لوٹ مار، گولہ باری، آتش زنی، مسلمان عورتوں کی عصمت دری اور سب سے شرمناک بات یہ تھی کہ اس پورے تماشے میں حکومتی مشنری غنڈوں کی معاون بنی رہی۔ لیکن پتہ ہے مسز گاندھی نے کیا کہا؟ وہ بڑی معصومیت کے ساتھ کمشنر اور انسپکٹر جنرل آف پولس کی اس صفائی پر ایمان لے آئیں کہ پولس پر یہ الزامات درست نہیں ہیں۔ کس قدر تحقیر ہے اس کے لہجہ میں مسلمانوں کے تئیں، وہ تو ہماری آہ و فغاں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی اور آپ کہتے ہیں کہ مسلمان اکٹھے انھیں ووٹ دیتے رہیں۔ بس روٹی کے چند ٹکڑوں کے لیے؟ میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی۔

خیر چلئے یہ موقع نہیں، کھانا لگ چکا ہے۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے گفتگو کو اپنے خلاف جاتے ہوئے دیکھ کر لگام دینے کی کوشش کی۔

میں نے سوچا ڈاکٹر صاحب گو کہ جہاں دیدہ ہیں اور اہل محلہ پران کا بڑا دبدبہ ہے، لیکن اس منہنی سے شخص نے جو بات پھینکی تھی وہ ان کی مصلحت اور حکمت کے تمام مواعیظ کو چشم زدن میں عصائے موسیٰ کی طرح نکل گئی۔

## ما بعدون من بعدی

مجھے خفیہ پولیس کا وہ آفیسر بھی آج بہت یاد آیا جو فساد کی بوسوگھتا ہوا ایک دن مکتبہ میں آیا تھا۔ اس نے اپنے تئیں والد صاحب کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ اس بات پر حیرت زدہ تھا کہ ہم لوگ اس نازک صورت حال میں بھی کہیں منتقلی کا ارادہ نہیں رکھتے۔ پھر حالات کنٹرول سے باہر ہو گئے تو آپ کیا کریں گے، اس نے پوچھا۔ مرگ انبوہ جشن دارد، والد صاحب نے کمال بے نیازی سے جواب دیا۔ یوں تو خفیہ پولیس کے اہلکار اکثر مکتبہ کا چکر لگاتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض ہماری صحبتوں کے طفیل بھلے مانس بن جاتے یا کم از کم بھلے مانس بنے رہنے کا ڈرامہ رچاتے۔ ایک بات البتہ شدت سے محسوس ہوتی کہ ہماری حرکات و سکنات پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ حالانکہ مکتبہ کی مجلسوں میں حریت فکری اور بلندی افکار کے علاوہ اور ہوتا بھی کیا تھا، لیکن یہ باتیں ان کے لیے خطرناک حد تک ناقابل برداشت تھیں، جو چاہتے تھے کہ مسلمان اب اس ملک میں آزادانہ طور پر کچھ بھی نہ سوچیں۔ خفیہ پولیس کے تعاقب سے تنگ، بہت دنوں بعد، بڑے ابا نے بالآخر ذاکر صاحب سے شکایت کی جو ان دنوں صدر جمہوریہ کے منصب پر فائز ہو گئے تھے۔ ان کی مداخلت کے بعد پولیس والوں کے رویے میں وہ پہلی سی جراحت نہ رہی۔

والد صاحب کی بیماری کے موقع پر اس بات کا کسی قدر اندازہ ہو چکا تھا کہ ابا کے گرد درد مند مسلمانوں کا ایک بڑا نیٹ ورک دور دراز کے علاقوں تک قائم ہے۔ کوئی دن نہ جاتا جب ان کی مزاج پر سی کے لیے ایسے لوگ حاضر نہ ہوتے جن کے بارے میں ہم لوگوں کو کچھ زیادہ پتہ نہ ہوتا۔ ان میں مختلف مسالک و مشارب کے لوگ ہوتے جن کا درد ایک تھا، وہ یہ کہ کسی طرح دین و ایمان کو بچائے رکھا جائے۔ یہی وہ جرم تھا جس کے سبب ہم لوگوں پر نگرانی کا عذاب مسلط کر دیا گیا تھا۔ منقسم ہندوستان میں آزادی کا یہ مفہوم صرف ان لوگوں کو معلوم تھا جو اس صورت حال سے خود گزر رہے تھے۔

والد صاحب کا معمول تھا کہ وہ اکثر قرآن مجید کے تراجم اور تفسیری حواشی ہم بچوں سے پڑھوا کر سنتے۔ شاید یہ ان کے اپنے مطالعہ و تحقیق کا طریقہ تھا یا اس سے ہماری تربیت مقصود تھی۔ ایک دن سورۃ البقرہ

کی تلاوت کرتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچا: إذا حضر يعقوب الموت... ما تعبدون من بعدی، تو انہوں نے آگے پڑھنے سے روک دیا، خاموش کچھ سوچنے لگے، ایسا لگا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ میں نے ترجمہ پڑھ کر سنایا، بولے: رہنے دو۔ پھر ایک آہ بھری، فرمایا: بہت بڑی امانت ہے۔ میں نے سمجھا یقیناً کوئی گہری بات ہے جو شاید ابھی پوری طرح میرے لیے سمجھنا مشکل ہو۔ اس زمانے میں بچوں کی تفسیر کے نام سے قرآن مجید کے بعض اجزاء شائع ہوئے تھے تب بھی چھوٹے سے ذہن کے لیے قرآن مجید کے معارف سے آگہی مشکل ہی بنی رہی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس طریقہ سے قرآن مجید پڑھنے کے سبب میرے لیے قرآن مجید کا 'ختم' کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ آگے چل کر یہی خلش اس کتاب کے راست مطالعہ پر ابھارتی رہی۔ میں نے سوچا کہ شاید والد صاحب ہماری سلامتی فکر و ایمان کے حوالے سے فکرمند ہیں۔

ان ہی دنوں اسپین کے مورسکو مسلمانوں کے سلسلے میں کوئی تاریخی ناول پڑھی تھی جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ میری ہی عمر کا ایک لڑکا اپنے والدین کے بعض افکار و خیالات کے سلسلے میں حیرانی کا شکار ہے۔ اسے ایسا لگتا ہے جیسے والدین اپنی بعض باتیں اس سے چھپاتے ہیں۔ گھر کے اندرونی حصے میں ایک کمرہ ہے جس میں والد صاحب رازدارانہ طور پر جاتے ہیں۔ ایک دن والد صاحب نے اسے کمرے میں بلایا، بولے: بیٹا! اب تم بلوغ کی منزل کو پہنچنے لگے ہو، میرے دل پر ایک بوجھ ہے، میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس سے آگاہ کر دوں، بشرطیکہ تم اسے صیغہ راز میں رکھنے کا وعدہ کرو۔ 'یسوع مسیح کی قسم ابا جان میں اسے کسی کو نہیں بتاؤں گا'، لڑکے نے اطمینان دلایا۔ یہ سن کر اس کے والد کی آنکھیں نم ہو گئیں، بولے: 'بیٹا! یہ جو ہم نے عیسائیت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے یہ ہماری اصل مذہبی شناخت نہیں، یہ تو نظام کا جبر ہے جس کے سبب ہم عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، ورنہ اندر سے ہم مسلمان ہیں اور اب شاید وقت آ گیا ہے کہ دین حنیف کی یہ امانت تمہیں منتقل کر دوں'۔ میں نے سوچا کہ والد صاحب کہیں اسی امانت کی طرف اشارہ تو نہیں کر رہے ہیں۔

اسپین اور ہندوستان دونوں جگہ مسلمانوں نے کم و بیش سات سو سال تک بڑی شان و شوکت سے حکمرانی کی۔ اندلس کی تاریخ سے ہم ہندوستانی مسلمانوں کا کیا رشتہ ہے۔ اور یہ جو اردو زبان کو ختم کرنے کے درپے ہیں تو کیا اس کے پیچھے بھی اسپین سے عربی زبان کے انخلاء جیسی تاریخ کا فرما ہے؟ میں نے سوچا کیوں نہ ماسٹر یعقوب صاحب سے پوچھا جائے، جو بزرگوں والے سنجیدہ موضوعات میں بھی کہانی کا لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ ماسٹر یعقوب صاحب سے گوہر مطلوب حاصل کرنا کچھ اتنا آسان بھی نہ تھا۔ پہلے تو وہ موضوع سے متعلق طالب علم کی معلومات کا اندازہ لگاتے، پھر اسی مناسبت سے اسے مناسب جواب تھما دیتے۔ البتہ اگر طالب علم موضوع آشنا ہوتا تو ماسٹر صاحب کا چہرہ کھل اٹھتا۔ ان کی گفتگو میں آبتبار کی سی

### کیفیت پیدا ہو جاتی۔

سوال سن کر ماسٹر صاحب نے پہلے تو مجھے ٹٹولنے کی کوشش کی، پوچھا: آج کل کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے ان کے سامنے مورسکو مسلمانوں کے حوالے سے ان مشکل حالات کا تذکرہ کیا جب انھیں اپنی اصل اسلامی شناخت چھپانا پڑی تھی تو ماسٹر صاحب کے چہرے پر فکر مندی کے آثار دکھائی دئے۔ بولے: اسپین کے مسلمانوں پر سقوطِ غرناطہ کے بعد بڑا سخت وقت گزرا۔ انھیں سرکاری حکم نامہ کے زور پر جبراً عیسائی بنایا گیا۔ بظاہر تو وہ عیسائی بن گئے، مگر اندر سے مسلمان ہی رہے۔ ان کا رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا حتیٰ کہ عربی زبان سے ان کے تعلق میں بھی کمی نہ آئی۔ حکومت نے بار بار یہ احکامات جاری کیے کہ مسلمانوں کی کوئی بھی دینی یا ثقافتی علامت قابلِ مواخذہ ہوگی، لیکن تمام خطرات کے باوجود ایک نسل دوسری نسل کو ایمان کی امانت منتقل کرتی رہی۔ پھر ایک وقت وہ آیا جب عربی کتابیں گھروں میں رکھنا، ان کی تعلیم دینا بھی جرم قرار پایا۔ خفیہ پولیس والے گھروں کی تلاشی لیتے۔ اگر عربی زبان میں کوئی کتاب برآمد ہو جاتی تو وہ فی الفور ضبط کر لی جاتی۔ لیکن مسلمان اپنی علمی و دینی وراثت کو اتنی آسانی سے چھوڑنے والے کہاں تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عورتیں اس مہم میں سب سے آگے تھیں۔ وہ قرآن مجید کے صفحات کو گدوں اور لباس کے اندر سل دیتیں اور اگر اچانک چھاپہ پڑتا تو ان مسودات کو اپنے لباس میں چھپا لیتیں۔ لیکن ان سب سے دلچسپ ایک بات تمھیں بتانا چلوں، تمھیں حیرت ہوگی، یعقوب صاحب نے گفتگو کو اب ایک دلچسپ کہانی کا رخ دینے کی کوشش کی۔ بولے: جانتے ہو مسلمانوں نے عربی زبان کے تئیں ان کی نفرت کو کیسے لگام دیا۔ یہ کہتے ہوئے یعقوب صاحب نے تھوڑی دیر توقف کیا، جیسے کچھ سوچ رہے ہوں، پھر بولے: غرناطہ کی لیڈ بکس (Lead Books) کا نام سنا ہے تم نے۔ پھر خود ہی بولے: یہ قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ مسلمانوں نے لیڈ کے اسکرول پر عربی زبان میں حضرت مسیح کی تعلیمات پر مشتمل کچھ صحیفے تیار کیے۔ یہ سمجھو اسلامی نقطہ نظر سے ہم حضرت مسیح کو جس جلالت کا مستحق سمجھتے ہیں اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ اسکرول تیار کیے گئے، یعنی اسلامی نقطہ نظر سے بائبل کی تعلیمات کندہ کی گئیں اور یہ بھی لکھا کہ حضرت مریم نے جب بلنسیا کی طرف اپنا مشن بھیجا تو انھوں نے اپنے عرب حواریوں کے لئے عربی زبان میں بائبل کی یہ تعلیمات نقل کروائیں۔ یہ اسکرول اس طرح تیار کیے گئے کہ دیکھنے میں صدیوں پرانے معلوم ہوں۔ انھیں قریب کے غاروں سے اچانک اس طرح برآمد کیا گیا کہ اسپین میں عربی زبان میں عیسائی اسکرول کی دریافت سے ایک غلغلہ انگیز کیفیت پیدا ہوگئی۔ عیسائیوں کو ایسا لگا کہ عربی زبان کے یہ اسکرول اسپین کی عیسائی ثقافت کا خاصہ ہیں۔ ان اسکرول پر باقاعدہ تحقیق کے لیے اب عربی جاننے والوں کی ضرورت نکل آئی اور سب سے بڑی بات یہ کہ عربی زبان کے سلسلے

میں جو سخت نفرت پیدا ہو چلی تھی، اس کا بڑی حد تک ازالہ ہو گیا۔

مگر عیسائی دنیا نے اس پر کوئی واویلا نہ کیا؟ میں نے پوچھا۔

بولے: واویلا کرنے سے کیا ہوتا، روم کے عیسائی علماء تو بار بار یہ کہتے رہے کہ یہ اسکروول اپنی تعلیمات کے اعتبار سے اصلی نہیں ہو سکتے، لیکن جب کوئی بات عوام میں چل پڑتی ہے تو اسے روکنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ معاملہ اسپین کے قومی تقاضے سے بھی جڑا تھا۔ عام عیسائی دنیا کے مقابلے میں غرناطہ کے عیسائیوں کے پاس اب حضرت مریم کا ایک خاص پیغام تھا جو انھوں نے بزبان عربی ارسال کیا تھا۔ Lead Books کی سیاست نے عربی زبان کے سلسلے میں ان کے رویے میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دی۔

تو کیا اردو والوں کو بھی کوئی ایسی ہی ترکیب سوچنی چاہئے؟

بولے: اردو زبان کا معاملہ الگ ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ ہماری واحد مذہبی زبان نہیں، دوسرے یہ

کہ اردو دراصل ہماری مشترکہ زبان ہے۔ ہندو شعراء اور ادباء کا ایک طویل سلسلہ ہے۔

پھر یہ کیوں اردو زبان کو ختم کرنے کے درپے ہیں؟ چلبست، فراق گورکھپوری، دیانشر نسیم اور تاریخ

زبان اردو والے رام بابوسکسینہ آخر یہ لوگ انھیں نظر کیوں نہیں آتے؟ میں نے اپنی کتب شناسی کو کام پر لگاتے ہوئے کہا۔

بولے: تعصب ہے، تنگ نظری ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ان کم بختوں کے دماغ میں یہ بات

بیٹھ گئی ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ دراصل اس کے پیچھے اصل محرک معاشی وجوہات ہیں۔ اب دیکھو

آزادی کے بعد اردو اسکول رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔ اس سے بنیادی نقصان مسلمانوں کا ہوا۔ ہندو ہندی رسم الخط

سے واقفیت کے سبب سرکاری نوکریوں اور اداروں میں ہر طرف چھا گئے، مسلمان بے چارہ پیدل ہو گیا۔ اب

یہ چاہتے ہیں کہ اردو زبان میں اسلام پر جو واقعہ سرمایہ ہے اس سے ہماری نئی نسل تہی دست ہو جائے۔

پھر مسلمانوں نے ابتداء میں ہی اس سازش پر کیوں نہ بند باندھا؟ میں نے پوچھا۔

بولے: کوشش تو کی تھی لیکن ان کے مکر و فریب کے آگے مسلم قائدین کی ایک نہ چلی۔

اور مولانا آزاد؟

مولانا آزاد بیچارے کیا کرتے، ان کی سنتا کون تھا۔ پہلے تو مہاتما گاندھی نے یہی یقین دلایا تھا کہ

نئے ہندوستان کی قومی زبان نہ اردو ہوگی اور نہ ہندی، بلکہ ہندوستانی ہوگی، جو دونوں رسم الخط یعنی عربی اور

دیوناگری میں لکھی جائے گی، مگر ہوا کیا، اردو کو دلیس نکالا دیا گیا اور ہندی کو سرکاری سرپرستی عطا کر دی گئی۔

اور یہ جو اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی تحریک چل رہی ہے؟

بولے: دیکھو آگے کیا ہوتا ہے۔ مسلمان بہر حال آسانی سے ہار ماننے والے نہیں۔ انھیں اس ملک میں ایسے منافقوں سے واسطہ ہے جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔ پہلے اردو میڈیم کے اسکولوں کو ختم کیا، سرکاری دفاتر سے اردو کو بے دخل کیا اور اب کہتے ہیں کہ ہماری حکومت اردو زبان کا فروغ چاہتی ہے۔ منقسم ہندوستان میں اردو کا مسئلہ بے وفائی اور دھوکہ دھڑی کی المناک داستان ہے۔

یعقوب صاحب کی مجلس سے نکلا تو مجھے پھر سے تاریخی ناول کی وہ باتیں یاد آئیں جس میں میری عمر کے اس لڑکے پر چند ہی برسوں میں مصائب کے وہ پہاڑ ٹوٹے جن کو پڑھتے ہوئے میری آنکھوں سے بار بار آنسو ڈھلک جاتے تھے۔ سقوطِ غرناطہ کے بعد ڈیڑھ دو سو سال تک مسلمان اپنی سلامتی ایمان کی جنگ لڑتے رہے۔ پہلے انھیں جبراً عیسائی بنایا گیا، پھر انھیں ان کی زبان و ثقافت سے محروم کرنے کے لئے قوانین وضع کیے گئے۔ عربی بولنا، عربی کتابوں کا گھر میں رکھنا، عربوں جیسی وضع قطع کے ساتھ باہر نکلنا، عربی لباس پہننا، حتیٰ کہ عربوں کی طرح روز روز کا نہانا یہ سب کچھ غیر قانونی قرار پایا۔ زندگی جب اجیرن بن گئی تو انھیں مال کے عوض ہجرت کی اجازت دی گئی، لیکن ظالموں نے شرط یہ لگا دی کہ وہ اپنے کمسن بچوں کو سرکار کی تحویل میں دے کر ہجرت کریں۔ ظالموں کی دلیل یہ تھی کہ یہ بچے چونکہ سرکاری طور پر عیسائی ہیں، پتہ سمہ کے عمل سے گزرے ہیں اس لیے ریاست اپنے ننھے عیسائی شہریوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری مسلمان والدین پر نہیں ڈال سکتی۔

میرے ذہن میں پانچ سال کی معصوم بچی فاطمہ کی تصویر ابھرائی جسے اس کے والد آخری بار فاطمہ مع السلامہ کہتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے تھے، ان کی آواز زندہ گئی۔ وہ جانتے تھے کہ اب آج کے بعد کوئی اسے اس عربی نام سے بلانے والا نہ ہوگا۔ ناول پڑھتے ہوئے بار بار میں اپنے آنسو خشک کرتا رہا۔ سوچتا ان والدین پر کیا گزری ہوگی۔ بہت سی ماؤں نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ خودکشی کر لی۔ بہتوں نے علم بغاوت بلند کیے، لیکن سب بے سود۔ اندلس کے عیسائی حکمران مسلمان بچوں کی ایک ایسی نسل اٹھانا چاہتے تھے جو اپنی تاریخ اور شناخت سے ناواقف ہوں۔ میں نے سوچا یعقوب صاحب سچ ہی تو کہتے ہیں کہ نئے ہندوستان کے حکمران اردو زبان کو اس لئے مٹانا چاہتے ہیں تاکہ وہ مسلمانوں کی نئی نسل کو ان کے عظیم الشان تاریخی ورثہ سے یکسر منقطع کر سکیں۔

اردو زبان کا خیال آتے ہی مجھے ٹاؤن ہال میں منعقد ہونے والی وہ کانفرنس یاد آئی جس میں اپنی صغر سنی کے باوجود مجھے عمائدین کے ساتھ فرشی اسٹیج پر بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ رات گئے تک شعلہ بار تقریریں ہوتی رہیں۔ 'اردو کا حق لے کے رہیں گے' جیسے نعروں سے دیر تک فضا معمور رہی۔ جلسہ کے خاتمہ پر مجھے بھی مہمانوں والی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ شعیب منزل میں عشائیہ کا نظم تھا۔ اتفاق سے میرے پہلو میں غلام سرور

ایڈیٹر روزنامہ سنگم، فروکش تھے۔ بزرگوں کی اس مجلس میں بھلا مجھ جیسے نووارد کی موجودگی کا نوٹس کون لیتا۔ اب جو گفتگو کا سلسلہ دراز ہوا تو پتہ چلا کہ در بھنگہ کی یہ کانفرنس دراصل پورے صوبہ میں اردو بیداری کی مہم کا ایک حصہ ہے۔ غلام سرور صاحب کی جیل کی ڈائری 'گوشہ میں نفس کے' میں الٹ پلٹ کر دیکھ چکا تھا اور ان کے اخبار 'سنگم' کا تو میں مستقل قاری تھا۔ آج ٹاؤن ہال میں ان کی شعلہ بیانی سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملا تھا۔ اس زمانہ کے بیشتر کامیاب مقررین کی طرح ان کی تقریر میں بھی مترادفات کی کثرت دیکھنے کو ملی۔ ہر دو منٹ بعد شاید عمداً وہ کچھ اس طرح کے اسماء کا ذکر کرتے اور پھر ناموں کی ایک طویل فہرست کچھ اس طرح فٹ کرتے چلے جاتے کہ دو چار دس ناموں کے بعد سامع کو یہ محسوس ہوتا کہ اس شخص کے پاس اسماء والفاظ کا ایک لاتنا ہی خزانہ ہے، جسے وہ اگر لٹانے پر آئے تو سننے والوں پر حیرت کی کیفیت پیدا کر دے۔ مثلاً اس خوبصورتی سے باتوں باتوں میں کبھی دریا کا ذکر لاتے تو ملک و بیرون ملک کے سارے دریاؤں کے نام گنا دیتے، کبھی پھول کا تذکرہ آتا تو اس خوبصورتی سے پھولوں کے نام گناتے چلے جاتے کہ سننے والا عیش عیش کر اٹھتا، مجمع سے واہ واہ سبحان اللہ کی صدا بلند ہوتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے نثر میں مشاعرہ پڑھ رہے ہوں۔

اب جو اس تقریر کے بعد انھیں عشائے کی مجلس میں قریب سے سننے اور دیکھنے کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ تقریر بھی ایک فن ہے اور عوامی تقریر کے لئے تو خاص طور پر مقررین کو ایک الگ قسم کا جتن کرنا پڑتا ہے۔ سرور صاحب تو واپس پٹنہ چلے گئے، البتہ اپنے پیچھے بڑے بڑے منصوبے اور انقلاب انگیز اسکیمیں چھوڑ گئے۔ شہر میں ہر طرف کانفرنس کا تذکرہ تھا، ایسا لگتا تھا کہ اردو والے اب آسانی سے ماننے والے نہیں۔ اگلا منصوبہ شہر میں ایک بڑے احتجاجی جلوس کا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ یوم مطالبہ اردو کا جلوس نکلتا بھائی جان اچانک گرفتار کر لیے گئے۔

بہی کوئی مغرب کا وقت ہوگا۔ شب برأت کا موقع تھا، محلے میں حلوے کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ چھوٹی عمر کے بچے ایک دوسرے کے گھروں میں حلوے کی تقسیم کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے تھے، چہل پہل کا سماں تھا۔ ہمارے گھر میں حلوہ بننے کا رواج تو نہ تھا، لیکن اس خیال سے کہ بچے ادھر ادھر محلہ پڑوس کے کھانے کی خوشبوؤں کی طرف نہ لپکیں ایسے موقع پر والدہ پلاؤ زردہ کا اہتمام کر دیتیں۔ والدہ کے ہاتھوں کے شامی کباب کا لطف ہی کچھ اور ہوتا اور جب گھر میں مضافیر کی خوشبو پھیلتی تو بڑی بے صبری سے کھانے کے وقت کا انتظار ہونے لگتا۔ لیکن بھائی جان کی اس اچانک گرفتاری نے مزید رکھانوں کی اس معصومانہ شام کو ایسا بے رونق کیا کہ اب کسی کو کھانے پینے کا ہوش نہ رہا۔ پولیس اسٹیشن چند قدم کے فاصلہ پر تھا۔ ہم لوگ وقفہ وقفہ سے اس کا چکر لگاتے رہے، لمحہ لمحہ کی رپورٹ والدہ کو لا کر دیتے۔ رات آنکھوں میں کٹی، یہ اندیشہ لگا رہا

کہ پیہ نہیں آگے کیا ہو۔ والد صاحب کی زبان پر یا مسبب الاسباب کا ورد جاری رہا۔ خدا خدا کر کے دوسرے دن رہائی نصیب ہوئی۔

بھائی جان اس وقت انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے اور 'توازن' کے نام سے اردو کا ایک ضخیم ادبی مجلہ نکال چکے تھے۔ درہنگہ میں منعقد ہونے والی آل بہار اردو کانفرنس کے پیچھے بھی ان ہی کا ہاتھ تھا۔ اب جو اچانک ان کی گرفتاری ہوئی تو مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ اس ملک میں اپنی زبان و ثقافت کے فروغ کے لئے کوئی عملی قدم اٹھانا خطرے سے خالی نہیں۔ والد صاحب سے ۱۹۶۷ء کے رانچی کے فساد کا تذکرہ سن رکھا تھا، جو اردو تحریک کو کچلنے کے لئے ہی برپا کیا گیا تھا۔ میں اس بات کا تو قائل تھا کہ دین کے لئے بڑی سے بڑی صعوبت برداشت کی جاسکتی ہے، قربانیاں دی جاسکتی ہیں، لیکن زبان کے لئے آدمی جیل جائے، اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں نے سوچا کیوں نہ یعقوب صاحب سے اس بارے میں استفسار کیا جائے کہ کیا زبان کا واقعی ہم پر اتنا حق ہے کہ اس کے لئے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی جائیں۔

ایک دن یعقوب صاحب از خود مکتبہ میں تشریف لائے، شاید وہ اسی واقعہ کے پس منظر میں اظہار ہمدردی کے لئے آئے تھے، کہنے لگے زبان بھی تو ہماری شخصیت کا حصہ ہے۔ زبان، ثقافت، افکار و نظریات اور مذہب، یہ سب مل کر انسان کی شخصیت بناتے ہیں۔ کسی آدمی سے اس کی زبان چھین لی جائے تو بس یہ سمجھو کہ وہ آدمی ادھورا رہ گیا۔ اب اگر ثقافت اور دین بھی اس کے ہاتھ سے جاتا رہا تو پھر اس کے پاس بچا ہی کیا، خالی خولی میکا نیکی آدمی تو جانوروں کی مانند ہے۔ اور ہاں ایک بات اور سمجھ لو، زبان کا تعلق شہریت سے بھی ہے۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: یہ ذرا ادق موضوع ہے، سردست بس اتنا سمجھو کہ زبان کے بغیر جب آدمی ادھورا ہے تو وہ شہری بھی تو ادھورا ہی ہوا۔ زبان ہمیں اختلاف کرنے کا فن سکھاتی ہے، ہم اس کے ذریعہ سوچتے ہیں اور پھر جو چیز ہمیں پسند نہیں آتی ہم اس کی مخالفت کا برملا اظہار کر دیتے ہیں۔ اگر انھوں نے ہماری زبان چھین لی تو ہم سوچنے اور بولنے سے محروم ہو جائیں گے۔

یعقوب صاحب کی باتیں اس وقت کچھ زیادہ سمجھ میں نہ آئیں، ہاں یہ اندازہ ضرور ہوا کہ اردو زبان کی لڑائی سے ہماری ملی اور دینی شخصیت کا بھی کوئی گہرا تعلق ہے۔ والد صاحب اکثر کہتے کہ بیشتر لوگ حالات کے جبر کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں، مگر ہر شخص ایسا نہیں ہوتا۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو ڈٹ جاتے ہیں، مقابلہ کرتے ہیں اور بالآخر حالات کا رخ پھیر دیتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم لوگوں کا تعلق

آخر الذکر کے قبیل سے ہو۔

اردو تحریک کے حوالے سے شہر میں ہمارے اسکول کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ جغرافیائی طور پر ہمارا اسکول شہر کے قلب میں واقع تھا اور یہ واحد اردو میڈیم اسکول تھا جسے مسلمان اپنے انتظام و انصرام میں پوری دینی شناخت کے ساتھ چلا رہے تھے۔ بزم اردو کے سالانہ جلسوں کے موقع پر مسلم محلوں میں چہل پہل کا سماں ہوتا۔ تحریری اور تقریری مقابلوں کے انعامات کا انتظام شہر کی مسلم آبادی بڑے ذوق و شوق سے کرتی۔ شہر کی سرکردہ شخصیات تحریری مقابلوں کے لئے اپنی پسند کے موضوعات متعین کرتیں اور ان موضوعات پر اپنی طرف سے وقیع انعامات کا پیشگی اعلان بھی کرتیں۔ گویا اسکول کے معاملات سے شہر کی مسلم آبادی خود کو متعلق محسوس کرتی۔

اسکول میں سائنس کے مضامین بھی خالصتاً اردو میں پڑھائے جاتے، حتیٰ کہ علم کیمیا کی تجربہ گاہ میں تطہیر اور تقطیر جیسے تجربہ کے لئے جب ضروری اشیاء کی فہرست بناتے تو اس میں تھرما میٹر طلب کرنے کے لئے آلہ مقیاس الحرات لکھا جاتا۔ گوکہ زبان کی اس پاسداری کے سبب بورڈ کے امتحان میں طلباء کو اس وقت دشواریاں پیش آتیں جہاں غیر اردو داں حضرات سائنسی آلات کے اردو ناموں سے سرے سے واقف ہی نہ ہوتے، لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود اسکول کے اس جزیرے میں اردو زبان پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ تھی۔

اب جو یومِ مطالبہ اردو کی تجویز سامنے آئی تو پورا اسکول اس انقلابی مہم کی تیاری میں لگ گیا۔ طے پایا کہ اس موقع پر ہزاروں لاکھوں خطوط صدر جمہوریہ کو ارسال کیے جائیں اور ان سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ صوبہ بہار میں جہاں بڑی تعداد میں اردو ذریعہ تعلیم کے اسکول باقی ہیں، اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کر دیا جائے۔ اب طلباء کی چھوٹی چھوٹی ٹیمیں پوسٹ کارڈ کے گٹھروں کے آگے بیٹھ گئیں۔ پہلے تو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہماری خطوط نویسی اور خطوط کی ہزاروں، لاکھوں کی تعداد صدر جمہوریہ کو ایک انقلابی فیصلہ لینے پر مجبور کر دے گی۔ لیکن عبدالرشید نے یہ کہہ کر ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا کہ اگر محض خط لکھنے سے اتنی بڑی تبدیلی ممکن ہوتی تو اردو کب کی سرکاری زبان بن چکی ہوتی۔ انھیں تو سب معلوم ہے کہ مسلمان کیا چاہتے ہیں۔ یہ جو تم لوگ خط لکھ کر حکومت کو اردو کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہاری سادہ لوحی ہے۔ اب دیکھو یہاں بھی تو حکومت ہی کا فائدہ ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں خطوط کی ترسیل سے فائدہ تو محکمہ ڈاک کو ہی حاصل ہوگا اور تم لوگ اپنی سادہ لوحی میں سارا جوش ان خطوط میں انڈیلے دیتے ہو، میرے خیال میں تو ان طفل تسلیوں کا کچھ بھی حاصل نہیں۔

’ارے ہاں! بات تو تم صحیح کہتے ہو، فائدہ تو یقیناً ڈاک خانہ والوں کا ہے، ہم لوگ شاید یہاں بھی بے وقوف بن رہے ہیں، مہتاب نے تائید کی۔

میں نے خطوط کی اس مہم کو بے دلی اور مایوسی کا شکار ہوتے دیکھ کر یہ کہا کہ ’ارے بھئی ہر چیز کا فائدہ اور نقصان پیسوں کے جوڑ گھٹاؤ میں نہیں دیکھا جاتا۔ اب جو یہ ہزاروں لاکھوں خطوط مختلف شہروں سے مختلف ہاتھوں میں ہوتے ہوئے صدر جمہوریہ کو پہنچیں گے تو چھوٹے سے ڈاک خانہ سے لے کر دلی کے بڑے ڈاک خانہ تک ایک ہلچل مچ جائے گی۔ لوگ سوچیں گے کہ آخر اچانک کیا بات ہوگئی کہ صدر جمہوریہ کو ہر روز ہزاروں لاکھوں خطوط پہنچ رہے ہیں اور ہر پوسٹ کارڈ ایک علیحدہ طرز تحریر کا حامل ہے، جہاں ہم لوگوں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ ان میں ہمارا مطالبہ بھی ہے اور غصہ بھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اردو والے اب سوچنے اور بولنے لگے ہیں۔ انھیں اپنے جمہوری حقوق کا ادراک ہو گیا ہے۔ ہمارے اندر زندگی لوٹ آئی ہے۔ عبدالرشید ہمارے یہ خطوط کا غز کے بے جان نکلنے نہیں بلکہ یہ حوصلوں کے چراغ ہیں جو جل اٹھے ہیں، اب انھیں کوئی نہیں بجھا سکتا۔ میں نے مقررہ والے انداز میں اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

بولا: چلو مانے لیتے ہیں، اصل امتحان تو بدھ کو ہے، دیکھتے ہیں جلوس میں کتنے لوگ آتے ہیں۔

بدھ کے دن اسکول میں طلباء کی ایک اسمبلی ہوئی جس میں جلوس کی اہمیت، اس کے راستے اور دوسری حفاظتی تدابیر سے آگاہ کیا گیا۔ کون سے نعرے لگانے ہیں اور کس نعرے کے جواب میں کیا کہنا ہے۔ جب ان باتوں کی کسی قدر آگہی ہوگئی تو ہم لوگ خاموش جلوس کی شکل میں مدرسہ حمید یہ قلعہ گھاٹ پہنچے جہاں مختلف اطراف و اکناف سے مہمان اردو کے جلوسوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگوں کا ایک سیلاب تھا جو اٹھ چلا آتا تھا۔ جوش و خروش سے معمور۔ اردو کا حق لے کے رہیں گے، کا عزم بڑے بڑے بینروں پر آویزاں۔ کہیں ’سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے، جیسے مصرعے۔ پر جوش تقریروں اور فلک شکاف نعروں کے جلو میں مہمان اردو کا یہ جلوس کلکٹریٹ کی طرف روانہ ہوا۔ جن راستوں سے اس جلوس کو گزرنا تھا ان میں بیشتر حصہ تو مسلم آبادی کا تھا، البتہ بعض غیر مسلم آبادی میں جلوس پر حملے کا خطرہ تھا، لیکن اب اردو والے اس شرانگیزی کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ جب جلوس مکتبہ کے قریب سے گزرا تو مانگ میرے ہاتھوں میں تھا اور میں پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے ہم جماعتوں کے بیچ نعرے بلند کر رہا تھا، تبھی میری نظر والد صاحب پر پڑی، وہ شوق و حیرت کا مجسمہ بنے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے شرما کر کچھ خفت بھرے انداز میں مانگ اپنے ساتھی کے حوالے کیا اور خود جلوس سے نکل کر مکتبہ میں گھس گیا۔ کلکٹریٹ کی عمارت قریب ہی تھی، میرے حصہ کا جلوس یہیں اتمام کو پہنچا۔

## سنگینوں کا پہرہ

ملک ایک ہنگامی صورتِ حال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بنگلہ دیش کی آزادی کا بخار اب بڑی حد تک اتر چکا تھا۔ ایک عمومی بے چینی ملک کو اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔ ایک طرف جنگ کے اخراجات، دوسرے ملک میں قحط سالی اور پھر مسلمانوں کے خلاف نفرت کی مہم، فسادات کا سلسلہ، نتیجہ یہ ہوا کہ کل تک جو لوگ مسلم دشمنی میں مسز گاندھی کو درگا کا اوتار کہتے نہیں تھکتے تھے وہ اب ان کے خلاف کھل کر سامنے آ گئے۔ ہر طرف ہڑتال اور چکا جام کی صورت پیدا ہو گئی، ضروری اشیاء کی قلت نے ذخیرہ اندوزی کو جنم دیا۔ اب اسکول سے گھر آتے ہوئے راستے میں کچھ اس طرح کے مناظر دکھائی دیتے: کہیں مٹی کے تیل کا ٹینکر کھڑا ہے اور اس کے پیچھے دو تین سو لوگوں کی قطار لگی ہوئی ہے۔ پتہ چلتا کہ ابھی یہاں تیل فروخت ہونے والا ہے۔ ایک دوسری جگہ صابن کے لئے قطار لگی ہوئی ہے۔ کہیں ماچس کی ڈبیہ مل رہی ہے تو کہیں سگریٹ کے پیکٹ۔ اب ہر طرف شہر کا یہی منظر نامہ تھا۔ قطار کو قابو میں رکھنے کے لئے پولیس لاٹھی چارج کرتی۔ اشیائے ضروریہ کا حصول جب آسان نہ رہا تو لوگوں نے قطار بننے سے پہلے ہی ٹرکوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ ملک میں ایک عام انار کی صورت حال تھی۔ رات آٹھ بجے گھروں سے ڈھول تاشے بجنے کی آوازیں آتیں، لوگ چمچہ، تھالی بجاتے۔ یہ سب عوامی احتجاج کا طریقہ تھا جس کی قیادت بزرگ رہنما جے پرکاش نارائن نے سنبھال رکھی تھی۔ ملک میں سمپورن کرانتی کی یہ لئے مسلسل بلند ہوتی جاتی تھی۔ ہر طرف سے ایک ہی آواز آتی تھی: راج سنگھان خالی کرو کہ جتنا آتی ہے۔

ادھر اسکول میں ششما ہی امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ آج پہلا پرچہ تھا۔ صبح اٹھا تو والد صاحب کو غیر معمولی طور پر فکر مند پایا۔ پتہ چلا کہ ملک میں ایمر جنسی لگ چکی ہے۔ اسکول جاتے ہوئے راستے میں جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں کچھ راز و نیاز کے انداز میں تبادلہ خیال کرتی نظر آئیں۔ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ایمر جنسی ہوتی کیا ہے، پھر ذہن پر امتحان کا بوجھ بھی تھا۔ گھر واپس آیا تو دیکھا کہ مکتبہ میں اردو اور انگریزی کے کئی اخبارات رکھے ہیں۔ ایک اخبار کی شہ سرخی تھی: Emergency Declared۔

چند دنوں بعد یہ خبر آئی کہ چھبیس جماعتوں کو کالعدم قرار دیا گیا ہے، جس میں جماعت اسلامی کا نام بھی شامل ہے۔ بنیادی حقوق معطل کر دیئے گئے ہیں۔ اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔ ابا نے یا مسبب الاسباب کا آوازہ بلند کیا اور ایسا لگا جیسے ان کی فکر مندی پر سکینت غالب آگئی ہو۔

چند دن اسی طرح گزرے، پھر خبر آئی کہ بڑے ابا میسا کے تحت گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ ابا کی فکر مندی کی وجہ اب سمجھ میں آئی۔ اس حادثہ پر دو چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک دن میرے عم زاد محترم جمیل اختر اسکول میں آئے، میں امتحان گاہ میں تھا۔ مجھے باہر بلا کر یہ اطلاع دی کہ ابا گرفتار ہو گئے ہیں اور مکتبہ بھی پوری طرح سیل کر دیا گیا ہے، اس لئے تم لوگ امتحان سے فراغت کے بعد گھر جانے کے بجائے اسلام نگر آجانا۔ والد کی گرفتاری میرے لئے غیر متوقع تھی۔ ابا اور گرفتار ہو جائیں، ہم سے الگ کر دیئے جائیں، میرے لئے یہ خبر ایک صدمہ جانکاہ تھی۔ میرے تصور میں جیل کی وہ بلند و بالا دیواریں ابھرنے لگیں جن کے قریب سے میں اکثر صبح کی سیر کے دوران گزرا کرتا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ دوستوں نے تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن میرے چشم تصور میں کبھی والد کا فکر مند چہرہ ابھرتا اور کبھی جیل کی بلند اور مہیب دیواریں میرے اور ان کے بیچ میں حائل ہوتی نظر آتیں۔ اسلام نگر اسکول سے قریب ہی واقع تھا جہاں ہماری والدہ بڑے ابا کی گرفتاری پر اہل خانہ کی مزاج پر سی کے لئے آج صبح ہی گئی تھیں۔ بد بختوں نے ان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر مکتبہ اور اس سے متصل ہماری رہائش گاہ کو مکمل طور پر سیل کر دیا تھا۔ والدہ پریشان تھیں پھر بھی مجھے تسلی دیتی رہیں۔ ہر رات کے بعد صبح ہوتی ہے، پریشان مت ہو، حالات بدلیں گے۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ اچانک یہ سب ہوا کیسے۔ کیا انھیں اس بات کا انتظار تھا کہ والدہ گھر سے باہر قدم نکالیں اور وہ اس صورت حال کا فائدہ اٹھا کر مکتبہ کے ساتھ ہماری رہائش گاہ کو بھی مقفل کر دیں۔

ششماہی امتحان کے کچھ پرچے ابھی باقی تھے، مگر اب امتحان کی کسے فکر تھی۔ کتابیں بند، کپڑے مقفل، ایسا لگا جیسے اچانک ہم خانماں برباد لوگ کھلے آسمان کے نیچے آگئے ہوں۔ نہ جانے ابا کس حال میں ہوں۔ یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا۔ میری آنکھوں سے آنسو تھمنے کا نام نہ لیتے، پھر خود کو سمجھاتا کہ راہ حق کے مسافروں کو دار و رسن کی آزمائش سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ خیال آیا ابا رات کی تاریکی میں جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں تو خدا ان کی سن لیتا ہے، پھر وہ انھیں کیوں کر ضائع ہونے دے گا۔ یہ سوچ کر دل کو تھوڑا قرار آتا، پھر اگلے لمحہ اندیشوں کی دھند بیز ہو جاتی۔

مغرب کے وقت بھائی جان کی آمد ہوئی، انھوں نے والدہ کو ابا کی گرفتاری اور مکتبہ کی مقفلی کی تفصیلات سے آگاہ کیا، بولے، ابھی تھانہ میں ہیں کل کورٹ میں پیشی کے بعد جیل میں منتقل ہو جائیں گے۔

چاہو تو ملاقات کے لئے چل سکتے ہو۔ عشاء کے وقت ہم لوگ تھانہ پہنچے۔ ابا ایک تخت پر مصلیٰ بچھائے عشاء کی نماز میں مصروف تھے۔ خشوع و خضوع کا وہی عالم جیسے تہجد کی نماز میں ہوں اور اپنے رب سے سرگوشی کر رہے ہوں۔ سلام پھیرا، ہم لوگوں پر نظر پڑتے ہی اشارے سے قریب بلایا، بولے، گھبراؤ نہیں، اللہ پر بھروسہ رکھو، وہی مسبب الاسباب ہے، اپنی پڑھائی کی طرف سے غفلت مت برتنا، ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا، حالات یکساں نہیں رہتے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے میری پیٹھ پر اپنا دست شفقت پھیرا، ایسا لگا جیسے ان کے لمس نے اچانک میرے اندر غیر معمولی توانائی بھردی ہو۔ غم و اندوہ کے بادل چھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اب تک میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو کیا ہوا تھا، مگر ان کی یہ باتیں سن کر میری آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے اچانک نکل آئے، جسے میں نے بڑی ہوشیاری سے چپل ٹھیک کرنے کا بہانہ بنا کر جھکتے ہوئے اپنی آستین سے کچھ اس طرح پوچھا کہ ابا کو اس کا پتہ نہ چل سکے۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کیے اور پھر صبر کی چٹان بن کر ان کے سامنے کچھ اس شان سے بیٹھا کہ انھیں ہماری حوصلہ مندی سے قوت ملتی رہے۔

رات بھر دل و دماغ پر مختلف قسم کے وساوس کا ڈیرہ رہا۔ کبھی قید و بند کی صعوبتوں کے خیال سے دل ڈوبتا اور کبھی تھانہ کی اس ملاقات سے اطمینان ہوتا، جب میں نے ابا کے چہرے پر ثبات و سکینت کی غیر معمولی جھلک دیکھی تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ والد صاحب ایک درخت کے نیچے ایک تخت پر متمکن ہیں، ان کے ہاتھ میں حمال شریف کا وہی نسخہ ہے جس سے وہ اکثر تلاوت کیا کرتے ہیں۔ ارد گرد خدام کھڑے ہیں اور مرصع کرسیوں پر خوبصورت لباسوں میں بہت سے لوگ فروکش ہیں، ان میں سے بعض شناسا چہرے بھی دکھائی دیئے جو اکثر مکتبے میں آیا کرتے تھے۔ یہ پر فضا مقام کسی آبشار کے قریب واقع تھا۔ طلوع آفتاب سے چند لمحے پہلے کا یہ منظر مجھے ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا تھا۔ یہی وقت ہوتا جب ابا تلاوت سے فارغ ہو کر اپنا مصحف لپیٹتے اور میں ان کے ساتھ صبح کی سیر کے لئے چل پڑتا۔ والد صاحب کو صبح کے اس لمحہ میں اس پر فضا مقام پر دیکھ کر میرا دل خوشی سے مچل اٹھا۔ میں نے سوچا آج سیر میں بہت لطف آئے گا۔ بے ساختہ ان کی طرف دوڑا، لیکن اس سے پہلے کہ ان تک پہنچتا میری آنکھ کھل گئی۔ ابھی صبح ہونے میں خاصا وقت تھا۔ بڑی کوشش کی مگر پھر نیند نہ آسکی، البتہ اس خیال سے اطمینان ہوا کہ ابا مسرور و مطمئن ہیں اور حمال شریف کی معیت میں پر فضا مقام کے باسیوں میں مقام علیا کے سزاوار ٹھہرائے گئے ہیں۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ شاید وہ اپنا خاص نسخہ قرآن طلب کر رہے ہوں۔ اس خیال سے صبح مکتبہ کا چکر لگایا لیکن یہ دیکھ کر سخت کوفت ہوئی کہ مکتبہ متفعل ہے اور وہاں ایک بندوق بردار سپاہی پہرہ دے رہا ہے جو کسی کو

قریب پھلکنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اگلا دن بڑے ذہنی انتشار میں گزرا۔ ایک طرف والد صاحب کی عدالت میں پیشی جہاں ان پر ملک میں بد امنی پھیلانے کا الزام عائد کیا گیا تھا اور دوسری طرف ہماری خانماں بربادی کا یہ منظر کہ ہم چھ بھائیوں کو تعلیمی انقطاع کا خطرہ لاحق تھا۔ اب تک ایمر جنسی کے اسیران کی مدد کے لئے جو کوئی بھی سامنے آیا تھا خود اسے گرفتاری کا خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔ ڈرا اور خوف کے اس ماحول میں اکثر عزیز واقارب نے نگاہیں پھیر لینے میں عافیت جانی تھی۔ ابھی ہم آگے کا لائحہ عمل ہی بنا رہے تھے کہ ایک روح فرسا خبر یہ آئی کہ چھوٹے ابا بھی گرفتار کر لیے گئے ہیں، گویا دائرہ اپنے اتمام کو پہنچا۔

گھر کے تمام مرد پابند سلاسل تھے، اب مدد کے لئے دیکھیں تو کس کی طرف دیکھیں۔ جب سارے زمینی سہارے ٹوٹ گئے تو قدرت کی اپنی اسکیم سامنے آئی۔ ہمارے ایک پڑوسی جو والد صاحب کے قدر دانوں اور دوستوں میں تھے، انھوں نے اپنے گھر کی چابی اس اصرار کے ساتھ بھجوائی کہ جب تک مکتبہ مقفل ہے ہم لوگ یہاں منتقل ہو جائیں اور بغیر کسی تحفظ ذہنی کے اسے اپنی ہی رہائش گاہ سمجھیں۔ ہمارے لئے مکتبہ کے پہلو میں پھر سے آکر آباد ہو جانے کا خیال ہی بڑا حوصلہ انگیز تھا۔ ہم لوگ فی الفور یہاں اٹھ آئے۔ لیکن اٹھ کیا آتے، ساتھ میں کوئی ساز و سامان یا لاؤ لشکر تو تھا نہیں۔ ضروریات زندگی کی ساری چیزیں تو مکتبہ اور اس سے ملحق رہائش گاہ میں بند تھیں جہاں صبح و شام سنگینوں کا پہرہ تھا۔ زندگی اشیائے ضروریہ کے بغیر کیسے بسر کی جاتی ہے، پہلی بار اس کا تجربہ ہوا۔ والدہ نے نئے گھر کا نقشہ کچھ اس انداز سے ترتیب دیا کہ اس بے سروسامانی میں بھی صبر و شکر اور تعلیم و تعلم کا ماحول پیدا ہو گیا۔ ہفتہ عشرہ اس تقلیب ذہنی میں لگے۔ اس دوران جیل سے والد صاحب کی خبریں مختلف ذرائع سے چھن چھن کر آتی رہیں۔ پھر ایک دن یہ خبر آئی کہ (DIR) ڈی آئی آر کے قیدیوں سے ملاقات کے لئے بدھ کا دن مخصوص کیا گیا ہے۔

بدھ کے دن ہم لوگ مقررہ وقت پر جیل پہنچے۔ یہی کوئی ڈھائی تین بجے کا عمل ہوگا، برسات کی گرمی اپنے عروج پر تھی، فضا میں جس کی کیفیت تھی۔ جیل کے صدر دروازے سے ملحق تین دروازہ نما کھڑکیاں تھیں جس میں لوہے کی مضبوط سلاخیں آویزاں تھیں۔ ان دروازوں سے کچھ دوری پر ایک دیوار کچھ اس طرح کھینچی گئی تھی کہ قیدی اور ملاقاتی کے بیچ دس بارہ فٹ کا فاصلہ حاصل رہے۔ دیوار کی اونچائی یہی کوئی تین چار فٹ رہی ہوگی۔ دیوار کے باہر ملاقاتیوں کا ہجوم اور اندر آہنی جھروکوں میں قیدیوں کی بھیڑ بھاڑ۔ جہاں اتنے سارے لوگ ایک ساتھ ملاقات کر رہے ہوں اور انھیں مخاطب تک اپنی بات پہنچانے کے لئے بلند آہنگی کا سہارا لینا پڑتا ہو، وہاں آوازوں کا ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جانا اور ناقابل فہم بن جانا فطری تھا۔ ہماری

آنکھیں ابا کو تلاش کر رہی تھیں، وہ کہیں نظر نہ آئے۔ کھلے آسمان کے نیچے گرمی کی شدت میں کچھ دیر امید بھری نظروں سے ان جھروکوں کی طرف ٹکلی باندھے دیکھتے رہے۔ دفعتاً ابا کی جھلک دکھائی دی۔ سلام کی آواز آئی، ایسا لگا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں، لیکن اس شور شرابے میں ان کی آواز کچھ سنائی نہ دی یا پھر گلے میں رندھ کر رہ گئی ہو۔ پریشاں حالی ان کے چہرے سے نمایاں تھی، آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے بے خوابی کا شکار ہوں۔ ان کو اس حال میں دیکھ کر کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ ملاقات کے لئے آتے وقت مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی، سوچا تھا کہ آج میں ان سے مل کر لپٹ جاؤں گا، انھیں ہمت دلاؤں گا اور انھیں یہ بتاؤں گا کہ ان کی غیر موجودگی میں ہم لوگوں کی تعلیمی سرگرمیاں ان کی توقع سے بھی کہیں بڑھ کر کس طرح جاری ہیں۔ سوچا تھا کہ وہ یہ سب سن کر فرط مسرت سے ہمیں گلے لگالیں گے، میری پیٹھ تھپتھپائیں گے اور میری پیشانی پر اپنا دشت شفقت کچھ اس طرح رکھیں گے کہ اس لمس پدیری سے میرے اندر زندگی کی نئی امنگ جاگ اٹھے گی۔ لیکن یہاں تو ملاقات کے نام پر ایک اذیت تھی۔ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں عزیز ی شاہد سلمہ اور مرشد سلمہ کو گود میں اٹھا کر ان کی شکل دکھائی۔ دونوں طرف حسرت بھری نگاہوں کا تبادلہ تھا، محرومی تھی، بے بسی تھی اور ایک ناقابل بیان کرب تھا، جو کبھی ہماری آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑتا اور کبھی والد صاحب کی رندھی ہوئی آواز میں باہر آ جاتا۔ کچھ دیر ہم لوگ ایک دوسرے کو اسی طرح دیکھتے رہے۔ والدہ حسرت و یاس کا مجسمہ بنی نقاب کے اندر سے اس رقت آمیز منظر کا مشاہدہ کرتی رہیں کہ کس طرح چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ملاقات کے دوران بھی باپ کے لمس سے محروم کر دیئے گئے ہیں، وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن شور شرابے کے اس ماحول میں کیا کہتیں۔ زنداں کی پہلی ملاقات اس طرح بے بسی اور محرومی کا شدید احساس دلاتے ہوئے اپنے انجام کو پہنچی۔

واپسی پر ذہن سخت پراگندہ تھا۔ ابا کی بے خواب آنکھیں جو غالباً کثرت گریہ سے سو جی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، بار بار نگاہوں کے سامنے آ جاتیں۔ دل ہی دل میں ان کے لئے دعا کرتا جاتا، یا اللہ! ابا پر زنداں کی صعوبتیں آسان کر دے۔ ابا ہمارے شب و روز کا حصہ تھے، ان کے گرد پوری فیملی حتیٰ کہ بڑا مشترکہ کنبہ بھی کچھ اس طرح مربوط تھا کہ وہ اس کے مرکز میں بیٹھ کر عزیز واقارب کی خبر گیری کرتے اور اپنی وسعت سے کہیں بڑھ کر ان کی دادرسی میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ خاندان سے باہر کمزور، بے سہارا مسلمانوں، حوصلہ مندوں جو انوں اور زندگی میں کچھ کر گزرنے کا عزم رکھنے والوں کے لئے بھی ان کی حیثیت ایک محور کی تھی۔ دسیوں لوگ ان سے اپنے خانگی اور سماجی معاملات میں مشورہ لیتے۔ اب ان کے اچانک اس طرح پس زنداں چلے جانے سے یہ غیر محسوس نیٹ ورک بحران میں آ گیا۔ کسی کی امانت تو کسی کو دی جانے والی ممکنہ

اعانت، یہ سب اچانک رک گئی۔ حکومت نے تو ان پر ملک میں بد امنی پھیلانے کا الزام عائد کیا تھا، لیکن مزاج پرسی کے لئے آنے والے، ان کے حسن سلوک اور ان کی خاموش مدد کا جس طرح تذکرہ کرتے تو اس سے ابا کی ایک ایسی فرشتہ صفت تصویر ابھرتی جس کا کسی قدر اندازہ تو ہم لوگوں کو ضرور تھا، لیکن اتنی صراحت کے ساتھ ان باتوں کا علم ہمیں ان کے جیل جانے کے بعد ہی ہوا۔ ان دہقانیوں اور دور دراز سے آنے والے شناساؤں اور ناشناساؤں کو سن کر ایسا لگتا جیسے یہ سب ابا کے ساتھ کسی مضبوط روحانی رشتے میں بندھے ہوں۔ ابا اتنی بڑی فیملی کے کفیل تھے اور ان کا خاندان اتنا بڑا تھا اس کا اس سے پہلے ہم لوگوں کو اس قدر اندازہ نہ تھا۔

ملاقات سے واپسی پر مجھے اس بات کا شدید افسوس تھا کہ میں نے ملاقات کے لئے جاتے ہوئے تو یہ سوچا تھا کہ ان سے پیکر ثبات بن کر ملوں گا، اپنے عزم اور حوصلے سے انھیں یہ اطمینان دلاؤں گا کہ ہم لوگوں نے اس صدمہ کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ راضی برضا ہیں، ہم ٹوٹنے والے نہیں، لیکن ان کی صورت دیکھتے ہی جذبات کچھ اس طرح بے قابو ہوئے کہ آنسو کے چند قطرے آنکھوں سے ٹپک ہی پڑے۔ میں نے عزم مصمم کیا کہ اب اگلی ملاقات میں ان کے پاس بے بسی کی تصویر بن کر نہیں جاؤں گا۔ مجھے ابا کی یہ بات بھی یاد آئی، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ زندگی اعلیٰ مقاصد اور ارفع خیالات کے بغیر موت ہے۔ انسان اور جانوروں میں یہی تو فرق ہے کہ جانور کھاپی کر خوش اور مسرور رہتے ہیں، انسان خیالات کے بغیر جانوروں کے مثل ہے۔ وہ اکثر کہتے کہ ہم عام لوگ نہیں، خیر امت ہیں، خدا کے برگزیرہ نفوس، ہم اس آسمانی ذمہ داری سے، جو خدا نے مسلمان کی حیثیت سے ہم پر ڈالی ہے، منہ نہیں موڑ سکتے۔ ابا اس جرم کی پاداش میں پس دیوار زنداں ہیں، یہ تو اعزاز کی بات ہے، مگر یہ کیسا اعزاز ہے کہ خدا سے خاص تعلق رکھنے والے لوگ اس قدر مجبور اور بے بس بنا دیئے گئے ہیں۔ اے خدا! ابا کسی اور سے تو مانگتے نہیں، میں نے جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھا کہ مشکل اوقات میں ان کی نگاہیں ہمیشہ آسمان کو ہنکا کرتی ہیں، پھر تو نے انھیں کس کے بھروسے چھوڑ دیا ہے۔ مجھے حالی کے وہ اشعار بے ساختہ یاد آئے جن کی مسدس کے بند کے بند خوش الحانی کے ساتھ سنا کر میں اپنے بزرگوں سے انعام وصول کیا کرتا تھا:

اے خاصہ خاصانِ رسل وقت دعا ہے امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے پردیس میں وہ آج غریب الغریاء ہے

مکتبہ پر سنگین بردار پولیس کا پہرہ اب بھی جاری تھا۔ میں جب بھی قریب جانے کی کوشش کرتا، پہرے پر تعینات سپاہی اپنی بوٹ کو کچھ اس طرح زمین پر مارتا کہ اس سے ٹک ٹک کی کر یہ آواز پیدا ہوتی۔

اس کا چہرہ کسی تاثر سے خالی ہوتا جیسے کوئی میکینکی روبوٹ ہو۔ حالانکہ پولیس کی ٹکڑیاں اکثر اس علاقے میں گھومتی رہتیں کہ انتظامیہ کے دفاتر اور پولیس لائن کا علاقہ یہاں سے قریب تھا اور ہم لوگ بھی کبھی کبھی کھیل کود کے لئے اور کبھی پیرا کی کے لئے ان کے کیمپس میں جا نکتے۔ تب ان کا رویہ عموماً ہم بچوں سے خوش اخلاقی کا ہوتا، لیکن ایمرجنسی نے انہیں بنیادی انسانی جوہر سے بھی محروم کر دیا تھا۔ اس کے بوٹ کی ہر کریہہ ناک کے نیچے ایسا لگتا جیسے میرا دل کچلا جاتا ہو۔ مکتبہ جس سے میرے شب و روز کی یادیں وابستہ تھیں، جو میری مجلس تھی اور میری درس گاہ بھی، جہاں میرے شب و روز مسرت اور بصیرت سے مملو ہوتے، جس کی خاطر میں نے گاؤں کی جشن مسلسل جیسی زندگی کو خیر باد کہہ دیا تھا، اس مکتبہ سے آج ہم لوگ بے دخل کر دیئے گئے تھے۔ میں ان ہی خیالات سے نبرد آزما ایک حسرت بھری نگاہ سے مکتبہ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ مجھے اسکول کا پرانا دوست سمیر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے اسے آواز دی، اس نے ایک لمحہ مڑ کر دیکھا، لیکن نہ جانے کیوں رکنے کے بجائے اس نے اپنے قدم اور تیز کر دیئے۔ میں نے پھر آواز دی، اس کی طرف لپکا لیکن وہ جان چھڑانے پر مصر تھا۔ بولا، ابا نے منع کیا ہے، تمہارے گھر نہیں جانا ہے۔ سمیر میرا پرانا دوست تھا، عبدالقیوم انصاری کا مداح۔ کبھی تقریری مقابلوں میں حصہ لیتا اور کبھی ملٹی مسائل پر پر جوش گفتگو کرتا، آج اچانک اس کے اس طرح آنکھ پھیر لینے پر بڑی حیرت ہوئی، ایسا لگا کہ میری روح اس کی طوطا چشنی کے خنجر سے بری طرح مجروح ہو گئی ہو۔ لیکن سمیر اپنے اس رویے میں تنہا نہیں تھا۔ ایمرجنسی کے نفاذ نے اچانک ہمارے لئے گرد و پیش کی دنیا اجنبی بنا دی تھی۔ لوگ زیر لب ہمدردی کے الفاظ بولتے، کوئی ہمت والا دل کڑا کر کے والد صاحب کی خیریت بھی پوچھ لیتا، لیکن عملی طور پر ان کا کردار تماش بینوں کا تھا۔ وہ ہمارے بدخواہ نہیں تھے، لیکن وہ خیر خواہ بننے کی ہمت سے بھی خالی تھے۔ مجموعی طور پر ہمارا سابقہ تماش بینوں سے تھا، جو اپنے تئیں ہمدردی اور نیک جذبات کے ساتھ آج ہمارا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ گو وہ حق کے مخالف نہیں تھے مگر حق کے ساتھ بھی تو نہیں تھے۔ اب انہیں کون سمجھاتا کہ حق کا ساتھ نہ دینا ہی دراصل اس کی مخالفت ہوتی ہے۔

جیل کی دوسری اور تیسری ملاقات بھی کچھ انہی کیفیات سے مملو رہی۔ احساسِ بے بسی کی شدت میں تو کمی واقع نہ ہوئی البتہ یہ سب کچھ معمول کا حصہ لگنے لگا۔ اسی دوران ایک دن برسات کی جس زدہ گرمی میں جمعہ کی نماز کے بعد ایک صاحب ہمارے گھر تشریف لائے۔ وضع قطع سے کوئی سکہ بند عالم لگتے تھے۔ اس سخت گرمی کے دنوں میں بھی وہ جبہ و دستار سے مرصع تھے۔ ان کی سائیکل مختلف قسم کے سامانوں سے لدی تھی۔ ایک طرف ناشتہ دان بندھا ہے تو دوسری طرف چرمی بیگ، کہیں کپڑوں کا تھیلا لٹک رہا ہے تو پیچھے کیریئر پر کتابوں کا کوئی پیکٹ۔ خضاب زدہ داڑھی پر بھاری فریم کے چشمے سے جھانکتی ہوئی آنکھوں نے ان

کی شخصیت میں ایک دبدبہ پیدا کر رکھا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ جیل میں امام ہیں، شاعر بھی ہیں، راہی تخلص کرتے ہیں اور ابھی ابھی جمعہ کی نماز میں ابا سے مل کر آئے ہیں۔ ہم لوگوں کو ایسا لگا جیسے خدا نے اچانک کوئی فرشتہ بھیج دیا ہو۔ ہم لوگ انہیں گھیر کر بیٹھ گئے۔ ابا کی صحت اور ان کے معمولات کی ایک ایک تفصیل پوچھی۔ بولے، صحت تو اللہ کے فضل سے بہتر ہے، البتہ کثرتِ گریہ سے آنکھوں کی بینائی متاثر ہو گئی ہے۔ شاید موتیابین کا پانی اتر آیا ہے۔ انھوں نے روشن خطوں والا قرآن مجید کا ایک نسخہ طلب کیا ہے۔ اتنی دیر میں بھائی جان شربت کا گلاس لے آئے۔ اب تک وہ ہم لوگوں سے کسی قدر مانوس ہو چکے تھے۔ کہنے لگے، ارے بھئی عجب زمانہ آ گیا ہے، کیسے کیسے شریف الطبع لوگ قید خانوں میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ میں نے اسی موقع کی مناسبت سے ایک نظم کہی ہے، انھوں نے چند اشعار سنائے۔ ہم لوگ شوق و حیرت کا مجسمہ بنے انہیں دیکھتے رہے۔ دل میں سوچا یہ تو اچھے خاصے شاعر لگتے ہیں، ان کا ترنم بھی کمال کا ہے۔ انھوں نے جیل کی زندگی کی کچھ دلچسپ باتیں شاید اس خیال سے بتائیں کہ جیل کے بارے میں ہم لوگوں کی اجنبیت اور وحشت میں کمی آجائے۔ بولے: ارے بھئی میرے اوپر تو ابھی بھی انکو اڑی چل رہی ہے۔ پھر بولے آج کل تو قیدی زیادہ ہیں، باقاعدہ جمعہ کی نماز ہوتی ہے، البتہ عام دنوں میں کبھی کوئی جمعہ پڑھنے والا ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا۔ مجھے ایک ولیمہ میں شرکت کے لئے گاؤں جانا تھا، میں نے جمہرات کو یہی جمعہ کی نماز پڑھا ڈالی، کہاں انتظار کرتا۔ ان کی اس اجتہادی نظرافت کا سن کر ہم لوگ حیران رہ گئے۔ جمہرات کو جمعہ کی نماز؟ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ بولے: ارے بھئی جیل میں جمعہ کیا اور جمعہ کی نماز کیا، یہ تو بس ایک رسمی کارروائی ہے بلکہ واقف کار تو یہ بھی کہتے ہیں کہ جمعہ کا قیام غیر اسلامی حکومتوں میں بالکل بے محل اور بے جوڑ ہے۔

اب جمعہ کو راہی صاحب کا یہ معمول بن گیا کہ وہ جیل سے لوٹتے ہوئے ہمارے گھر ضرور آتے۔ قدرت نے ان کے توسط سے جیل سے ایک روزن عین ہمارے گھر میں کھول دیا تھا۔ ابا کو روشن خطوں والے قرآن کا نیا نسخہ پہنچ جانے سے ان کا انحصار اس حافظی حائل شریف سے ختم ہو گیا تھا، جس نے شاید ان کے فہم قرآن پر بند باندھ رکھا تھا۔ اب فرصت کے لمحات نے انہیں تمام سابقہ فکری چوکھٹوں سے ماورا ایک نئے طرح کے ذوقِ تلاوت اور شوقِ فکر کا سامان فراہم کر دیا تھا۔ ان کے شب و روز خدا کے کلام اور خدا سے کلام جیسے مشاغل سے مملو رہتے۔ شاید ان کی اسی گریہ وزاری کا اثر تھا کہ ان کے غیاب میں بھی ہم لوگوں کو ایسا لگتا جیسے کسی نے ہمیں اپنی حفاظت میں لے رکھا ہو، جیسے خدا کی رحمت ہر لمحہ ہم پر سایہ فگن ہو۔

ایک دن ڈاکیہ ڈھیروں خطوط اور اخبار و رسائل کے پیکٹوں کا ایک انبار لے آیا۔ یہ پچھلے تین چار ہفتوں کی ڈاک تھی۔ ان میں بعض تاجروں کے خطوط اور ان کتابوں کی فہرستیں بھی تھیں جو ٹرانسپورٹ سے

بھیجی گئی تھیں اور وصولی کی منتظر تھیں۔ اس سے پہلے بھی ریلوے مال گودام سے کتابوں کے بندلوں کی اطلاع ملتی رہی تھی۔ خیال ہوا کیوں نہ مکتبہ کے پہلو میں ایک نئے مکتبہ کا تجربہ کیا جائے۔ رہائش گاہ کے باہری حصہ میں دیکھتے دیکھتے کتابوں کی ایک نئی دکان سچ گئی۔ ہم لوگ باری باری سے ڈیوٹی دینے لگے۔ اسکول سے واپسی پر اب ایک نیا مشغلہ گا ہوں سے لین دین کا تھا۔ دکان کھلنے کی دیر تھی کہ فرشتے آنے لگے۔ عجیب بات یہ دیکھی کہ جو کتاب موجود ہوتی اسی کو طلب کرتے ہوئے لوگ آتے، خاص طور پر دو پہر کے بعد، جو ہمارے اسکول سے واپسی کا وقت ہوتا، گا ہوں کا تانتا لگ جاتا۔ ایسا لگتا کہ یہ خود نہیں آتے بلکہ اللہ میاں نے انھیں کام پر لگا رکھا ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس مختصر سی دکان نے نئے مکتبہ کی شکل لے لی۔ دور سے دیکھنے والوں کو ایسا لگتا جیسے امیر جنسی نے ہم لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑا۔ رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آنے لگی۔ اسی دوران اچانک ہماری دھوبن کپڑوں کی کٹھریاں لے کر نازل ہو گئی۔ ارے تو کہاں غائب ہو گئی تھی، والدہ نے ڈانٹ لگائی۔ خفت مٹاتے ہوئے بولی، ہم کیا کرتے، ہم نے تو سنا تھا کہ جو آپ لوگوں سے ملنے جاتا ہے اسے پولیس پکڑ لیتی ہے۔ دھلے دھلائے کپڑوں کی کٹھریاں دیکھ کر والدہ نے سکون کا سانس لیا۔ بولیں، یہ سب اللہ کا انتظام ہے۔ نئے مکتبہ کے تجربہ نے ہمارے اندر ایک نیا اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ اب پھر سے گھر میں تعلیم و تعلم کی باتیں اور اسلام کی سربلندی کی گفتگو اسی ذوق و شوق سے جاری ہو گئیں۔ والدہ نے اپنے حسن انتظام سے انتہائی کم وسائل میں سفید پوشی کا بھرم کچھ اسی طرح قائم کر دیا تھا۔ صبح صبح ان کی تلاوت کی آواز ایک خاص قسم کی مترنم سمفنی میں گونجتی تو ایسا لگتا جیسے پہلے والی معمول کی زندگی واپس آ گئی ہے۔ والد صاحب اس منظر نامہ سے غائب ضرور تھے لیکن اللہ نے ہمارے لئے امام جمعہ کے توسط سے جیل میں جو روزن کھول دیا تھا اس سے بڑی باریک بینی سے ہم انہیں دیکھ سکتے تھے۔

## بے مزہ آزادی

اب تک ہم لوگ ایبرجنسی کے شب و روز کے عادی ہو چکے تھے۔ اب جیل کی سلاخیں اور سنگینوں کے پہرے دلوں میں خوف پیدا نہیں کرتے، بلکہ اس فکر پر آمادہ کرتے کہ اس شب تاریک کا پردہ کیسے چاک کیا جائے۔ اسکول میں چند احباب کے ساتھ مل کر ایک کمیٹی بنائی جس کا کام یہ تھا کہ سوچ سمجھ کر انتہائی رازداری کے ساتھ کوئی عملی قدم اٹھایا جائے۔ یوم آزادی کے موقع پر اسکول میں پرچم کشائی کا ایک رسمی سا پروگرام ہوتا تھا۔ ہم لوگوں نے طے کیا کہ پندرہ اگست کو کچھ سویرے اسکول پہنچ جائیں تاکہ پرچم کشائی سے پہلے ہمیں باہمی گفتگو کے لیے خاطر خواہ وقت میسر آجائے۔ حسب پروگرام اسکول پہنچا، کیا دیکھتا ہوں کہ NCC کے طلباء مشقی پریڈیں کر رہے ہیں اور ہیڈ ماسٹر صاحب چند اساتذہ کے ساتھ اپنے دفتر سے متصل برآمدے میں بیٹھے ہیں۔ ٹیبل پر ایک ٹرانسسٹر رکھا ہے اور لوگ بڑے اشتیاق سے لال قلعہ سے نشر ہونے والی وزیراعظم اندرا گاندھی کی تقریر سماعت فرما رہے ہیں۔ میں نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اشارے سے سلام کیا اور وہیں پڑی ایک تپائی پر ادب سے بیٹھ گیا۔ مسز گاندھی فرما رہی تھیں کہ ہر سال کی طرح اس دفعہ بھی ہم لوگ یہاں یعنی لال قلعہ پر پرچم کشائی کے لیے جمع ہوئے ہیں، لیکن اس دفعہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس پروگرام کو صرف وہی لوگ نہیں دیکھ رہے ہیں جو یہاں موجود ہیں بلکہ ٹیلی ویژن کے ذریعہ پورا ملک اس پروگرام میں شریک ہے۔ انھوں نے قومی پرچم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایک وروڈھی دل کے نینتا نے ایک دفعہ کہا یہ جھنڈا کیا ہے، کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے، یہ کپڑے کا ٹکڑا ضرور ہے لیکن کپڑے کا وہ ٹکڑا ہے جس کے لیے لاکھوں سوتنتر سینا نیوں (مجاہدین آزادی) نے اپنی جانیں دیں، اپنی زندگی برباد کی۔ یہ ٹکڑا بھارت کی طاقت کا پرتیک ہے، اس لیے ہم کپڑے کے اس ٹکڑے کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ اس کپڑے کے ٹکڑے کی شان ہمیں ہمیشہ اونچی رکھنی ہے، یہ جان سے زیادہ پیارا ہے ہم کو۔ انھوں نے مزید کہا کہ آزادی کوئی جادو نہیں کہ اس سے ٹرنٹ غریبی دور ہو جائے۔ آزادی سے کیول ایک دروازہ کھلا، صدیوں کی گھٹن دور ہوئی۔ انھوں نے آزادی کے مناقب بیان کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ

سب من مانی کر سکیں، بلکہ جو اپنا کرتویہ ہے وہ کرنے کا ہمیں موقع ملا ہے۔

ان کی تقریر ابھی جاری ہی تھی کہ میرے ذہن میں ایک کوندسی پیدا ہوئی۔ ارے محترمہ یہ کیا کہہ رہی ہیں، صدیوں کی گھٹن دور ہوئی، کیا مطلب؟ صدیوں سے اس ملک میں کیسی گھٹن تھی۔ انگریز تو صرف نوے سال لال قلعہ پر اپنا جھنڈا لہرا کر چلے گئے، پھر صدیوں کی گھٹن سے ان کا اشارہ کس طرف ہے۔ ابھی چند سال پہلے انھوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کے موقع پر بھی ہزار سالہ مسلم حکمرانی کے انتقام کی بات کی تھی۔ اب یوم آزادی کو صدیوں کی گھٹن کے ازالہ سے تعبیر کر رہی ہیں، کہیں وہ آزاد ہندوستان کو Spanish Reconquestia کے تناظر میں تو نہیں دیکھتیں؟ میرے ذہن میں مسلم اندلس کے اس ناول کے وہ مناظر پھر سے تازہ ہو گئے کہ کس طرح غرناطہ کے سقوط کے بعد ابتداءً تو مسلمانوں کو اس بات کی ضمانت دی گئی کہ انھیں اپنے مذہب پر عمل کی آزادی ہوگی، لیکن چند ہی سالوں میں صورت حال اتنی بدل گئی کہ انھیں ان کی ثقافت اور مذہب سے تہی دست کرنے کا ظالمانہ سرکاری حکم نامہ سامنے آ گیا، اور اس طرح سو سو سال کے اندر اندر اندلس سے مسلمانوں کا مکمل صفایا ہو گیا۔ تب اسپین کی شہزادی ایزابیل اس کام پر مامور تھی، آج پنڈت نہرو کی بیٹی ہندوستان کے مسلم عہد زریں کو صدیوں کی گھٹن کا نام دے رہی ہے۔

اسکول میں پرچم کشائی کے دوران بار بار میرا ذہن اس ناول کی طرف منتقل ہو جاتا اور مجھے مسز گاندھی کے پیکر میں ایزابیل کے تیور صاف دکھائی دیتے۔ میں نے سوچا یہ کیسی عجیب آزادی ہے کہ ابا جیل میں ہیں بلکہ خاندان کے سبھی بڑے بزرگ محبوس زندان ہیں اور ہم پر یہ تبلیغ کی جا رہی ہے کہ اپنا جو کرتویہ ہے بس وہ ہم کرتے رہیں۔ ان کی سمجھ میں آخر یہ بات کیوں نہیں آتی کہ جس آزادی کا اتنا شور ہے وہ بعض لوگوں کے لیے اگر بھارت کی اکھنڈتا کی قیمت پر ملی ہے تو ہمارے لیے تو اس کا زخم کہیں گہرا ہے کہ اس سے ہماری ملی وحدت تین حصوں میں منقسم ہو کر رہ گئی ہے۔ خون میں نہائی اس آزادی کا جشن وہ لوگ کیسے مناسکتے ہیں جن کے عزیز واقارب آج کے دن بھی پابند سلاسل ہوں۔

گزشتہ تقریبات آزادی کے مقابلہ میں اس دفعہ اسکول میں بھیڑ کچھ زیادہ تھی۔ شاید یہ ایمر جنسی کا اثر تھا۔ تقریب کے خاتمہ پر بعض طلباء کرکٹ کے کھیل میں لگ گئے، بعض نے فٹ بال کا پروگرام بنایا، اب بھلا اس بھیڑ بھاڑ میں ہماری خفیہ میٹنگ کیا ہوتی۔ احتیاط کا تقاضہ تھا کہ اسے کسی مناسب موقع کے لیے موخر کر دیا جائے۔ گھر کو لوٹتے ہوئے ابھی راستہ ہی میں تھا کہ معلوم ہوا کہ صدر بنگلہ دیش شیخ مجیب الرحمن پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ اسکول کے راستہ میں ایک چھوٹا سا چرچ تھا جس کے احاطے میں لوگوں کی بھیڑ لگی تھی اور لوگ ریڈیو پر خبریں سن رہے تھے۔ پتہ چلا کہ فوجی بغاوت کے نتیجے میں شیخ مجیب سمیت ان کے پورے خاندان کو تہ تیغ

کر دیا گیا ہے۔ ابھی کل ہی کی بات تھی، محض تین چار سال پہلے شیخ مجیب لندن سے براہِ دہلی ڈھا کہ گئے تھے جہاں انھوں نے آزاد ریاست بنگلہ دیش کی کمان سنبھالی تھی۔ وہ بنگلہ بندھو کہلاتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک اس بہیمانہ طریقہ سے انھیں قتل کیوں کیا گیا اور وہ بھی ٹھیک اس دن جب ہندوستان کی آزادی کی سالگرہ تھی۔

ایک دن یہ خبر آئی کہ ڈی آئی آر کے قیدیوں میں سے بعض کو ہائی کورٹ سے ضمانت مل گئی ہے۔ اپیل تو ہم لوگوں نے بھی دائر کر رکھی تھی، لیکن صرف تاریخ پر تاریخ پڑتی جاتی تھی، یہاں تک کہ رمضان کی ابتدا ہوگئی۔ اب ہائی کورٹ کے اس فیصلے سے یہ امید پیدا ہوئی کہ شاید نچلی عدالتیں اسے نظیر بنا کر جلد ہی کوئی فیصلہ کر سکیں گی۔ اس امید پر رمضان کا بیشتر حصہ نکل گیا۔ رمضان کا آخری روزہ تھا، صبح آٹھ بجے کا عمل ہوگا، کسی نے یہ خبر دی کہ کل رات چاند نکلنے کی تصدیق ہوگئی تھی، اس لیے آج بعض محلوں میں عید کی نمازیں ہو رہی ہیں، کوئی آخری روزہ رکھنے پر مصر تھا۔ میں خبر کی تصدیق کے لیے جامع مسجد کی طرف جا نکلا جو ہمارے گھر سے چند قدم کے فاصلہ پر تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ امام صاحب اپنے حجرہ سے باہر ایک کرسی پر فروکش ہیں، ان کے سامنے ایک ضخیم کتاب کھلی ہے، بظاہر مطالعہ میں غرق۔ آج انھوں نے پان کھا رکھا ہے، جس سے شاید یہ بتانا مقصود ہو کہ مومنین کے لیے آج کا روزہ مناسب نہیں۔ مسجد کے باہر لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ جب آج روزہ نہیں ہے تو پھر عید کی نماز کیوں نہیں پڑھی جا رہی ہے۔ امام صاحب ان کج بحثیوں سے بے نیاز آنے والوں پر ایک فاتحانہ نگاہ ڈالتے اور پھر مطالعہ میں غرق ہو جاتے۔ مجھے دیکھا تو ابا کی بابت دریافت کیا، پھر بولے کہ انھیں کون سمجھائے کہ چاند کی شہادت کے بعد روزہ رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا البتہ نماز کل ہوگی۔ میرے لیے ابا کے بغیر عید کی نماز کا تصور ہی سوہانِ روح تھا۔ اب جو اس باہمی اختلاف نے عید کے جشن کو تحلیل کیا تو ایسا لگا جیسے میری ہی طرح آج ان سبھوں کی عید بھی کھلا گئی ہے۔

مقدمات کی نئی تاریخیں پڑتی رہیں۔ ابتداءً تو ایسا لگتا تھا کہ عنقریب ابا کی رہائی کا فیصلہ آجائے گا، لیکن جب اس عمل میں کئی مہینے گزر گئے تو ہم ان موہوم امیدوں کے عادی ہو گئے۔ کوئی پوچھتا تو بڑی بے دلی سے کہہ دیتے کہ معاملہ زیرِ سماعت ہے، اب دیکھئے کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ پھر اچانک یہ خبر آئی کہ کورٹ نے مکتبہ اور اس سے متصل ہماری رہائش گاہ کے کھولنے کے احکامات جاری کر دیئے ہیں اور عنقریب بعض رسمی کارروائیوں کے بعد ابا کی رہائی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ خدا خدا کر کے مکتبہ کھلا، لیکن اب یہ وہ مکتبہ نہ تھا۔ پچھلے دنوں سیلاب نے جو تباہی مچائی تھی اس نے مکتبہ اور ہماری رہائش گاہ کے ساز و سامان کو پوری طرح

تباہ کر دیا تھا۔ بیرونی دیواریں منہدم ہو چکی تھیں۔ کوئی چیز اپنی جگہ سلامت نہ تھی، مگر پھر بھی حکومت کے کارندوں کا یہ اصرار تھا کہ ہم انہیں سب کچھ محفوظ حالت میں بازیاہ ہونے کی رسید عنایت کر دیں۔ عمومی ظلم کے ماحول میں اس کے علاوہ ہم لوگ اور کربھی کیا سکتے تھے۔ پولس والوں نے اپنی کارروائی مکمل کی اور ہم لوگوں نے ابا کی رہائی پر اپنی مساعی مرکوز کر دی۔

ایک دن اسکول سے گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ابا صحن میں ایک کرسی پر خاموش بیٹھے ہیں۔ انہوں نے اپنی ٹھوڑی دائیں ہاتھ سے سہار رکھی ہے اور نگاہیں آسمانوں میں مرکوز ہیں۔ اچانک انہیں اس طرح گھر میں بیٹھا دیکھ کر میری سمجھ میں نہ آیا کہ ان کا استقبال کیسے کروں۔ میں نے سلام کیا اور وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے خیریت پوچھی، ویسے ہی جیسے جیل میں سلاخوں کے پیچھے سے رسمی طور پر پوچھتے تھے اور پھر خاموش آسمانوں کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگے۔ وہ شاید بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کچھ کہنے سے قاصر تھے۔ کبھی ایسا لگتا کہ شاید حیرت سے اپنے غیاب میں ہونے والی تبدیلیوں کا اندازہ لگا رہے ہوں، کبھی ایسا لگتا کہ وہ اپنے بچوں کی باتیں سن کر حیرت زدہ ہوں کہ زندگی کے بے رحم تجربوں نے انہیں اچانک اتنا حساس اور سنجیدہ کیسے بنا دیا ہے۔ ایسا لگتا کہ ایک نعمتِ خاموشی ان کے لبوں پر جاری ہو جس کے زیر و بم سے گاہے آنکھیں بھیگ جاتی ہوں۔ میں ابا کو اس طرح گم صدم دیکھ کر ان کے قریب آیا کہ انہیں چھو کر دیکھوں، جیل میں یہ سہولت حاصل نہیں تھی۔ مجھے جیل کی وہ ملاقاتیں یاد آئیں، میں نے سوچا جیل کی ان ملاقاتوں کو بھلا کون بھلا پائے گا، جیل تو اب ہماری زندگی کا ناگزیر حوالہ ہے۔ اہل زنداں کے بچوں کو تعذیب بھی تو دراشت میں ملتی ہے، انہیں وہ کچھ نظر آتا ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتا۔ آگہی کا یہ عذاب غیر شعوری طور پر ہماری گفتگو میں اتنا نمایاں ہو چکا تھا کہ ابا اس صورت حال پر حیرت زدہ تھے۔

ابا زنداں سے نکل آئے لیکن زنداں ان کے اندر سے نہ نکل سکا۔ جیل نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا تھا۔ چند دن کی خاموشی کے بعد بالآخر ان کے بیان کی گرہ کھل گئی، انہیں پتہ چل گیا کہ رہائی کے بعد بھی دراصل وہ جیل میں ہیں، مابعد تقسیم کے زنداں میں محبوس۔ اب ان کی شخصیت امت کی صدا بہ صحرا آواز کا تسلسل معلوم ہوتی۔ ان کی گفتگو میں قتل عثمانؓ سے لے کر بغداد کی تاراجی اور سقوطِ استنبول سے لے کر سقوطِ دہلی اور پھر سقوطِ ڈھا کہ تک امت کے انتشار کی کہانی کچھ اس طرح سامنے آتی کہ اسے سننے میں داستان کا سا لطف آتا۔ جب وہ بولتے تو ایسا لگتا جیسے ان کے لفظ لفظ سے تاریخ رس رہی ہو۔ ایک ایسی تاریخ جس کے لفظ لفظ بصیرت سے مملو ہوں۔

ابا کی رہائی کی خبر عام ہوئی تو ملاقاتیوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر کوئی یہ جاننا چاہتا تھا کہ پس دیوار زنداں

ماجر کیا ہے۔ ایک صاحب جو تحریکی حلقہ میں خاصے معروف تھے، لیکن کسی سبب جیل جانے سے بچ گئے تھے، ایک دن تشریف لائے، چھوٹے ہی کہنے لگے: اسوہ یوسفی پر عمل پیرا ہونے کے لیے مبارکباد قبول کیجئے اور ہاں یہ جیل میں جھنڈے کے قضیہ کی حقیقت کیا ہے، سنا ہے کہ بڑا معرکہ برپا رہا۔

مولوی صاحب! ایک بار جیل کی سیر کرائیے، یوں باہر سے کب تک مشاہدہ کرتے رہیں گے، ابا نے ان سے لطف لیتے ہوئے کہا۔ پھر فرمایا: میں تو کہتا ہوں کہ انسان کو کم از کم زندگی میں ایک بار جیل ضرور ہونا چاہئے تاکہ اس کے دل سے جیل کا خوف جاتا رہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جیل میں مختلف الخیال قسم کے لوگ جمع ہو گئے تھے، کوئی کمیونسٹ پارٹی کا رہنما تھا تو کوئی خود کو سوشلسٹ کہتا تھا، کوئی آریس ایس کا جھنڈا بردار تھا تو کوئی جن سنگھ سے وابستہ۔ ابتداءً تو سب اپنی اپنی دنیا میں رہے، لیکن جب جیل کے شب و روز سے ایک طرح کی مانوسیت ہو گئی تو تلقین طبع کے لیے طرح طرح کے پروگرام بنائے جانے لگے۔ ایک بار رات کے کھانے کے بعد یہ طے پایا کہ سب لوگ قومی ترانہ ذوق و شوق سے گائیں۔ میرے معمولات سے وہ لوگ واقف تھے، اب جو اجتماعی پروگرام میں شرکت کا معاملہ سامنے آیا تو ایک ٹسل کی کیفیت پیدا ہو گئی، کچھ لوگ شاید چاہتے بھی یہی تھے اور اس تجویز کے پیچھے بعض متعصبین کی شرارت بھی تھی۔ اب صورت حال یہ ہو گئی کہ پورا وارڈ ایک طرف اور میں اکیلا۔ ان کا کہنا تھا کہ قومی ترانہ کے دوران کھڑے نہ ہو کر میں اس کی بے حرمتی کا مرتکب ہوا ہوں۔ معاملہ جب آگے بڑھا اور ایک جدال کی کیفیت پیدا ہو گئی تو ہمارے بعض مسلم احباب نے بھی یہ مشورہ دیا کہ معاملہ رفع دفع کیجئے، دو منٹ کی بات ہے، چند ثانیے کے لیے پروگرام میں شرکت سے آخر آپ کا کیا بگڑ جائے گا۔ میں نے کہا کہ بات اصول کی ہے، میں اپنی آزادی کو یہاں جیل میں بھی ان لوگوں کے ہاتھوں رہن رکھ دوں تو یہ مناسب نہیں، میں اپنے طریقہ سے رہوں گا خواہ یہ بات کسی کو کتنی ہی ناگوار ہو۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ میں کسی طرح ٹسل سے مس نہیں ہوتا تو سوشلسٹ پارٹی کے ایک رہنما نے یہ کہہ کر معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی کہ مولوی صاحب اپنی عبادت میں مشغول رہتے ہیں، اگر وہ نہیں شریک ہونا چاہتے تو انھیں چھوڑیے، کیوں خواہ مخواہ ٹکراؤ کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ کسی نے کہا، نہیں یہ کیا بات ہوئی، انھیں تو شامل ہونا ہی پڑے گا کہ یہ معاملہ قومی ترانہ کا ہے۔ یہ بات سن کر ایک طویل القامت شخص کو غصہ آ گیا، اس نے کہا کہ میرے خیال میں آپ لوگوں کا یہ رویہ درست نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگ ایک شریف، بچن آدمی کو پریشان کر رہے ہیں۔ اگر وہ قومی ترانہ میں شریک نہیں ہونا چاہتے تو یہ ان کا حق ہے، ہم انھیں کیسے مجبور کر سکتے ہیں، کیا آپ کو پتہ نہیں کہ جے پرکاش جی نے قومی علامتوں کے بارے میں کیا کہا ہے؟ نہرو نے کہا تھا کہ ہمارے دلش کے جھنڈے کی اگر کوئی بے حرمتی کرے

تو اسے گولی مار دینی چاہئے لیکن تب بے پرکاش جی نے کہا تھا کہ جھنڈا تو کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے، ہم ایک دوسرا جھنڈا بنالیں گے، لیکن دلش کے نوجوان کی جان قیمتی ہے اسے ہم نے کھودیا تو ہمیشہ کے لیے کھودیں گے۔ کیا آپ کو پتہ نہیں کہ جب نہرو نے پٹنہ میں نوجوانوں پر ہونے والی پولس فائرنگ کو دلش بھگتی میں چھپانے کی کوشش کی تھی تب بے پرکاش کی باتوں نے نہرو کے اصل ارادوں کو بے نقاب کر دیا تھا۔ ہم لوگ تو بے پرکاش کے آدرش پر چلنے والے لوگ ہیں، ہمیں یہ کب زیب دیتا ہے کہ ہم جیل میں بند اپنے ہی ساتھی کو پریشان کریں؟ اس کی یہ گفتگو بڑی موثر رہی، میری مخالفت کے غبارے سے ہوا نکل گئی اور بھی لوگ حمایت میں سامنے آئے۔ بعضوں نے کہا کہ اس پروگرام کو ہٹائیے جس سے آپس میں اختلاف پیدا ہوتا ہو، قومی علامتیں لوگوں کو آپس میں جوڑنے کے لیے ہوتی ہیں، توڑنے کے لیے نہیں۔ ایک نوجوان جو غالباً کوئی اسٹوڈنٹ لیڈر تھا، کہنے لگا کہ بے پرکاش جی صحیح کہتے ہیں، قومی علامتوں کی سیاست نے دلش کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ بولا: ایک بار بے پی نے کہا تھا کہ حب الوطنی کپڑے کے ایک ٹکڑے میں نہیں ہوتی بلکہ اس کا اظہار ہماری قومی خوبیوں، زندگی کے اقدار اور عوامی زندگی کی اعلیٰ اخلاقیات پر منحصر ہے۔ جب نہرو نے پٹنہ میں پولس فائرنگ کے بعد یہ کہا تھا کہ انھیں اس بات کی پرواہ نہیں کہ دس ہزار یا دس لاکھ لوگ پولس کی گولیوں کا نشانہ بنے، وہ کسی بھی قیمت پر قومی جھنڈے کی بے حرمتی کی اجازت نہیں دیں گے، تب بے پی نے کہا تھا کہ نہرو کا یہ لب و لہجہ ایک آمرانہ لب و لہجہ ہے، جمہوریت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس ملک میں ایسا کوئی قانون نہیں جو کسی شخص کو قومی جھنڈے کی بے حرمتی یا اس کے جلانے پر گولی مارنے کی سزا دیتا ہو۔ انھوں نے کہا تھا کہ اصل بات تو یہ سوچنے کی ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو قومی جھنڈے کی بے حرمتی پر کون مجبور کر رہا ہے، یہ حالات آخر پیدا ہی کیوں ہو رہے ہیں، اگر ہمارے نوجوانوں نے اس سسٹم میں انصاف کی امید کھودی تو ایک عمومی مایوسی اور انارکی جنم لے گی۔ ملک و قوم کے معماروں کو گہرائی میں جا کر صورت حال کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ آپ کون سی آزادی کا بچھن گانا چاہتے ہیں، کیا آپ کو پتہ نہیں کہ بے پرکاش جی سے جب ایک امریکی صحافی نے پوچھا تھا کہ آپ کو یہ آزادی کیسی لگتی ہے؟ تو انھوں نے برملا کہا تھا کہ بالکل بے مزہ، tasteless صرف چند لوگوں کے علاوہ جنھوں نے اس آزادی کو ہائی جیک کر رکھا ہے اس آزادی کی کوئی معنویت نہیں۔ بے پی کا کہنا ہے کہ لوگوں کو خواہ مخواہ ڈرایا جا رہا ہے کہ حیدرآباد خطرے میں ہے، کشمیر خطرے میں ہے، انھیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ دراصل ہماری آزادی خطرے میں ہے۔ اگر ہم آزادی کھودیں تو کشمیر اور حیدرآباد کا کیا کریں گے؟

ایک صاحب جو پرانے کمیونسٹ تھے، کہنے لگے ارے بھئی ہماری لڑائی اندراجی سے ہے، نہرو مہمان

آدمی تھے، ان کو اندرا کے ساتھ مت ملائے۔

’اتنے بھی مہان نہیں جتنا سرکاری پروپیگنڈے نے انھیں بنا رکھا ہے، اس نوجوان نے پھر مداخلت کی، بولا: نہرو کو بجے پرکاش جی کے سامنے رکھ کر دیکھئے تو وہ بہت چھوٹے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ہی تو ہمارے سروں پر اندرا گاندھی کو مسلط کیا ہے، یہ بات آپ کیوں بھولے جاتے ہیں، ہم تو بے پی کے آدرشوں پر چلنے والے لوگ ہیں جنھوں نے کبھی کسی مخالفت کی پرواہ نہیں کی، اپنے لیے کچھ نہیں چاہا، ظلم جہاں بھی نظر آیا اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ذرا یاد کیجئے ناگالینڈ میں ہندوستانی فوج کی زیادتیوں کو کس نے قابو میں کیا، یہ ان ہی کی شخصیت تھی کہ ان کی مداخلت سے دس سال پرانی جنگ پُرامن معاہدے میں بدلی، انھوں نے شیخ عبداللہ کو جیل سے نکالا جو گیارہ سال سے بلاوجہ قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے، انھوں نے مدھیہ پردیش میں ڈکیتوں کے گینگ کو اپنی اخلاقی عظمت سے قابو میں کیا، انھیں اصلاح کی راہ پر ڈالا اور جب ایک بار کسی نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا آپ ان ڈکیتوں کو پارلیامنٹ کا الیکشن لڑنے کا مشورہ دیں گے تو انھوں نے ازراہ مذاق یہ کہا تھا کہ پارلیامنٹ میں انھیں اچھی صحبت نہیں مل پائے گی، اس لیے کہ یہ اصلاح شدہ ڈکیت ہوں گے۔ یہ سن کر قہقہوں کی آواز بلند ہوئی، کسی نے نعرہ لگایا لوک نانک زندہ باد، انقلاب زندہ باد۔ گویا قومی ترانے کے پروگرام کی مجلس جے پرکاش نارائن کے مناقب میں کچھ اس طرح بدلی کہ آئندہ کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ پھر اس قسم کے پروگرام کی سوچے، بلکہ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ اب لوگ ہماری باتوں میں دلچسپی لینے لگے۔ جے پی کے تذکرے نے انھیں رسومِ آزادی سے کہیں آگے بڑھ کر فی نفسہ حقیقی آزادی کی جستجو میں لگا دیا۔

ایک دن یہی کوئی مغرب کے بعد کا عمل ہوگا، شہر کے ایک مشہور تاجر تشریف لائے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، پھر جب انھیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ مکتبہ میں ان کے علاوہ کوئی نہیں تو بڑے ہی رازدارانہ انداز میں والد صاحب سے کہنے لگے کہ حضرت کا کتابچہ شائع ہو گیا ہے، چند کا پیاں بھجی ہیں۔ دوسرے دن والد صاحب کی ایما پر میں ان کے شوروم میں جا پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے، اندرونی حصہ سے کتابچے کی ایک کاپی لے کر آئے اور بہت احتیاط سے یہ کہہ کر میرے حوالے کی کہ خاص امانت ہے، راستہ میں کسی کو اس کی ہوانہ لگے۔ والد صاحب نے کتابچہ پر ایک نگاہ ڈالی، الٹ پلٹ کر دیکھا پھر میرے تجسس کے پیش نظر اسے میرے حوالے کر دیا۔ ابھی میں نے اس کتابچہ کے چند صفحات ہی پڑھے ہوں گے کہ ہمارے گاؤں کے ایک بزرگ لاٹھی ٹیکتے ہوئے مکتبہ میں داخل ہوئے۔ میں ان کے لیے ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آیا اور پھر کتابچہ کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ میرے اس غیر معمولی انہماک کو

دیکھتے ہوئے انھوں نے پوچھا، میاں صاحب زادے کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے بجائے اس کے کہ انھیں کوئی جواب دیتا کتاب کا سرورق ان کی نگاہوں کے سامنے کر دیا۔ بولے، اچھا تو یہ پڑھ رہے ہیں آپ اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی، کس نے لکھی ہے، پھر خود ہی فرمایا، اچھا منت اللہ رحمانی صاحب کا کتابچہ ہے۔ پھر والد صاحب کی طرف رخ کرتے ہوئے بولے، ارے بھی یہ مولانا لوگ، سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرف ہیں۔ یہ اندرا گاندھی کے مخالفین میں ہیں یا حمایتیوں میں۔ اب دیکھئے نا ایک طرف تو خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت میں کتابچہ تحریر کیا ہے اور دوسری طرف ان کے صاحب زادے کا نگرلیس پارٹی کے ایم ایل سی ہیں۔

مگر بیٹے کا حساب آپ باپ سے کیوں لے رہے ہیں؟ والد صاحب نے ان کی سرزنش کی۔

بولے: ارے بھی بیٹے کی الگ سے کوئی حیثیت نہیں، اکتیس سال کے نوجوان کو ایم ایل سی کی نشست اسی لیے تو ملی ہے کہ وہ خانقاہِ رحمانیہ کے چشم و چراغ ہیں، منت اللہ رحمانی کے بڑے صاحب زادے ہیں، مگر تفت ہے اس عقیدت مندی پر کہ مریدوں کے حلقے میں اس کتابچہ کی اشاعت کو جہاد اکبر باور کرایا جا رہا ہے۔

چلے جس کو جتنی توفیق ملے، انھوں نے کچھ تو اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش کی، والد صاحب نے معاملہ کو فرو کرنے کی کوشش کی۔

بولے: نہیں بھئی میں نہیں مانتا، میرے خیال میں تو ان حضرات کی پھپھسی مدافعت سے ہی دین کا یہ حال ہوا ہے۔

ایک صاحب جو خاصی دیر سے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے، ان سے رہا نہ گیا، بولے: ارے بھئی بڑا مقام ہے منت اللہ رحمانی صاحب کا، ہمارے ہاں پورنیہ کے علاقہ میں تو ان کا ایسا سکھ چلتا ہے کہ ایک بار جب وہ وہاں تشریف لے گئے تھے تو حضرت سے پانی پر دم کرانے والوں کا تانتا بندھ گیا، کچھ دیر تو آپ برتنوں اور بوتلوں پر پھونکتے رہے پھر خلقت کا بڑھتا اثر دہام دیکھ کر ایک گلاس پر پھونک ماری اور فرمایا کہ اس گلاس کو ٹیوب ویل میں الٹ دیا جائے۔ اب شام تک لوگ اس نل سے حضرت کا برکت شدہ پانی بھر بھر کر لے جاتے رہے۔ اتنے بڑے اہل دل کے بارے میں بھی اگر آپ شبہات وارد کریں گے تو عام مسلمان رشد و ہدایت کے لیے پھر کس کی طرف دیکھیں گے۔

یہ سن کر بزرگ کو غصہ آ گیا، انھوں نے جلال میں اپنی لاٹھی زمین پر پٹختی، بولے: ارے بھئی بزرگی پانی پھونکنے اور مرید بنانے کا نام نہیں، اصل بزرگی تو یہ ہے کہ آپ ظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا یارا رکھتے ہوں، آپ کے اندر بلا خوف لومۃ لائم کلمۃ حق کہنے کی جرأت ہو، اب دیکھئے نا ملک بھر میں مسلمانوں

کی جبراً نس بندی ہو رہی ہے، انھیں ان کے گھروں سے نکالا جا رہا ہے، پولس جب چاہتی ہے مسلمانوں پر بندوق کے دہانے کھول دیتی ہے، لیکن سیاسی مسلمان ہوں یا کانگریسی علماء، کہیں سے مخالفت میں کوئی آواز نہیں اٹھتی۔ دو بڑی خانقاہیں تو اسی بہار میں ہیں، مجیبہ پٹنہ اور رحمانیہ مونگیر، یہاں سے کوئی آواز نہیں اٹھتی بلکہ مسلمانوں کے بڑے علماء خواہ وہ دیوبند یا ندوہ سے وابستہ ہوں یا جمعیتہ علماء جیسی تنظیموں سے، کسی کی مجال نہیں کہ اندرا گاندھی کے اس صریح ظلم کے خلاف ایک لفظ کہہ سکے۔ میرے خیال میں اصل اصحاب عزیمت تو یہ غریب مسلمان ہیں جو خاندانی منصوبہ بندی کے اس پروگرام کی مخالفت میں سڑکوں پر اترے اور دینی فریضہ کے طور پر اپنی اگلی نسلوں کی حفاظت کے لیے پولس کی گولیاں کھانا قبول کیا، یہاں تک کہ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے، برا مت مانیے گا، یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنی لاٹھی ایک بار پھر زمین پر چٹنی، بولے: یہ جو آپ بڑے بڑے علماء نما لوگ دیکھتے ہیں تو دراصل ان میں سے بیشتر لوگ کانگریس کا ہی کھیل کھیل رہے ہیں، یہ ہمارے نہیں، ان کے آدمی ہیں لیکن اس خیال سے کہ مسلمانوں میں ان کی ہوا بنی رہے وہ گاہے بہ گاہے کوئی ایسا بیان یا ایسی تحریر شائع کر دیتے ہیں تاکہ عامۃ الناس ان کو اپنا ہمدرد و نہی خواہ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔

پڑھو بیٹا پڑھو، تم اپنا کام جاری رکھو، ابھی تو تمہیں علم و معرفت کی بڑی منزلیں سر کرنی ہیں، لیکن ایک بات یاد رکھنا، مطالعہ کبھی عقیدت کی آنکھ سے مت کرنا، اندھے آدمی کو دن کی روشنی سے بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، یہ کہتے ہوئے بزرگ نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور چل دیئے۔

میں سوچتا رہا، بار الہا! یہ کیا ماجرا ہے، جس کتابچہ کو اتنی رازداری سے حاصل کیا گیا ہو، وہ بھی معتبر نہیں اور جس شخصیت کا پھونکا ہوا گلاس پورے یوب ویل کو متبرک کر دیتا ہو وہ بھی شبہات سے ماوراء نہیں، گویا پانی گہرا ہے اور چیزیں جیسی کہ نظر آتی ہیں شاید فی الواقع ویسی ہیں نہیں۔

## کہ سالک بے خبر

ایمر جنسی کی مدت جوں جوں طویل ہوتی جاتی تھی مسلمانوں کے اندر بے بسی اور بچا رنگی کا احساس بڑھتا جاتا تھا۔ ملک کے مختلف حصوں سے جبراً نس بندی کی خبریں آرہی تھیں۔ مسلمان اس مہم کا خاص نشانہ تھے۔ حکومت یہ سمجھتی تھی کہ مسلمانوں نے ضبط تولید کی مخالفت کو مذہبی مسئلہ بنا رکھا ہے۔ یہ قلعہ اگر فتح ہو جائے تو دوسری اقوام کی مخالفت خود بخود دم توڑ دے گی۔ لیکن یہ تو مسئلہ کا ظاہری پہلو تھا۔ دراصل جو لوگ اس مہم کی کمان کر رہے تھے ان کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ تھی کہ مسلمان اس ملک میں پوپولیشن بم کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان کی غربت انھیں افزائش نسل کے سلسلے میں کوئی منصوبہ بندی کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ حکومت بہ جبر انھیں ترقی کی راہ پر گامزن کرنا چاہتی تھی۔ غربی ہٹاؤ کا نعرہ، عملی طور پر، غربت کے خلاف جنگ کے بجائے غریبوں کے خلاف جنگ میں بدل گیا تھا۔ مختلف شہروں سے پولس کے مظالم کی خبریں مسلسل وحشت میں اضافہ کا سبب بن رہی تھیں۔ اخبارات پر سنسر ہونے کی وجہ سے اصل صورت حال کا اندازہ کرنا بھی مشکل تھا۔ ادھر اسکول میں ایمر جنسی کے خلاف مزاحمت کی جو کمیٹی ہم چند طلباء نے تشکیل دی تھی وہ چند خفیہ میٹنگوں کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ جمعرات کو عموماً اسکول آدھے دن کا ہوتا تھا اور کبھی کبھی تو فیس کی وصولی کے بعد فوراً چھٹی ہو جاتی تھی۔ ہماری مزاحمت کمیٹی کے اراکین کلاس ٹیچر کی رہنمائی میں فیس وصولی کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ طے پایا کہ جمعرات کے دن ہم لوگ کچھ دیر اسکول میں رک کر وزیراعظم ہند کے نام ایک محضر نامہ تیار کریں جس میں انھیں مسلمانوں پر ہو رہی زیادتیوں پر متنبہ کیا جائے اور اس سلسلہ میں سنگین اقدامات کی دھمکی دی جائے۔ لیجئے محضر نامہ پر کام شروع ہوا، ہم لوگ کھلے آسمان کے نیچے تالاب کے کنارے درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ کلاس روم میں اس بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کون کب اچانک آدھمکے۔ ان دنوں کسی کے بارے میں یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ حکومت کی طرف سے مخبری پر مامور ہے یا نہیں، سوا ایک کھلی جگہ کا انتخاب ان ہی اندیشوں کے پیش نظر کیا گیا۔ اب ایک صاحب کو چونکارنے کی ذمہ داری دی گئی اور ہم تین لوگ محضر نامہ کی تیاری میں لگ گئے۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کی محنت

شاقہ کے بعد ایک خوشخط تحریر تیار ہوگئی۔ ظفر جو اس پورے مرحلہ میں اب تک خاموش رہا تھا، محضر نامہ کی تکمیل پر بولا، ارے بھئی خط تو بہت عمدہ لکھا ہے البتہ اس میں ایک اور شعر کا اضافہ کر دو تو بہت خوب رہے گا۔ وہ کیا؟ میں نے پوچھا۔ بولا: لکھ دو! گورے رنگ پر نہ اتنا گمان کر، گورارنگ تو دو دن میں ڈھل جائے گا۔ یہ دراصل مسز گاندھی کے نسوانی حسن کی طرف راست اشارہ تھا۔ مجھے اور سجاد کو ظفر کی اس معصومانہ مداخلت پر خوب ہنسی آئی اور بات تہقہوں میں اڑ گئی۔ اگلے دن بڑی احتیاط کے ساتھ لوگوں کی نگاہوں سے بچتے ہوئے بڑے ڈاکخانہ کے مرکزی باکس میں خط کو سپرد ڈاک کر دیا گیا۔ اس خط کا آگے کیا بنا یہ تو نہیں معلوم، البتہ خط کی روانگی کے بعد ہمیں ایسا لگا جیسے ہم نے بھی اپنے حصہ کی کوئی شمع روشن کر دی ہو۔

ان ہی دنوں مولانا منت اللہ رحمانی نے دہلی کی جامعہ رحیمیہ مہندیان میں مسلم قائدین کی کوئی غیر رسمی میٹنگ منعقد کی تھی جس میں نس بندی کو خلاف اسلام بتایا گیا تھا۔ اس موقع پر بعض علماء نے دہلی زبان سے حکومت پر تنقید بھی کی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہاں بھی خوف کا وہی ماحول تھا جو ہماری مزاحمت کمیٹی کو محضر نامہ کی تیاری کے وقت درپیش تھا، یعنی ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب خفیہ پولس والے اچانک حرکت میں آجائیں۔ بقول مولانا مجاہد الاسلام قاسمی جو خود بھی مہندیان کی اس میٹنگ میں شریک تھے، اس وقت ایسی فضا بن گئی تھی کہ ان تمام مسلم اکابرین کو سیدھے جیل جانا پڑ سکتا تھا۔ خط سپرد ڈاک کرنے کے بعد اپنی نوعمری اور معصومیت کے سبب ہم لوگ بھی کچھ اسی احساس سے دوچار تھے کہ گرفتاری کا خطرہ بس ہمارے قریب سے ہو کر گزرا ہے۔

ان دنوں ریڈیو پر اکثر مسز گاندھی کا یہ قول زریں نشر ہوتا رہتا تھا کہ 'نس بندی جبراً نہیں مگر لازمی ہے'۔ ابا کہتے کہ ایک بار تقسیم کے نام پر سینتالیس میں مسلمانوں کو تہ تیغ کیا گیا، ان کی بنیادوں پر تیشہ چلایا گیا، اب دوبارہ ایمر جنسی میں انھیں ایک دوسری نسل کشی کا سامنا ہے۔ اخبارات سے کچھ پتہ نہ چلتا کہ ملک میں واقعی ہو کیا رہا ہے۔ اکثر اخبارات کے کالم سینسر کی کرم فرمائنیوں کے سبب یا تو خالی ہوتے یا ان پر بھدے انداز سے سیاہی پوت دی گئی ہوتی۔ ملک بھر میں علمائے حق کی زبانوں پر تالے پڑے تھے۔

ابا جن دنوں جیل میں تھے اسی دوران ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن منعقد ہوا تھا۔ اس موقع پر شائع ہونے والا مولانا علی میاں کا خطبہ استقبالیہ ایک کتابچہ کی شکل میں ڈاک سے موصول ہوا تھا۔ میں نے بڑے التزام کے ساتھ اس کتابچہ کو اوّل سے آخر تک دیکھ ڈالا۔ مولانا سے ایک خاص عقیدت تھی۔ ان کی درجہ نگہ آمد کے موقع پر بڑے ابا کی معیت میں ان سے مل چکا تھا۔ میں نے بڑی امیدوں کے ساتھ کتابچہ کو پڑھنا شروع کیا، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ پورا خطبہ ایمر جنسی کے ذکر سے یکسر خالی تھا۔ اس کو پڑھ کر

کہیں سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ یہ خطبہ ہمارے ملک میں ایک ایسے نازک وقت میں دیا جا رہا ہے جب مسلمانوں پر ہر طرف ظلم کا بازار گرم ہے۔ خطبے میں ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی شکستہ حالی کا تفصیلی تذکرہ تھا، تحریکِ خلافت کا حوالہ تھا، لیکن منقسم ہندوستان میں مسلمانوں پر کیا ہو رہا ہے اس کے ذکر سے، ایسا لگتا تھا، دانستاً پہلو تہی کی گئی تھی۔

ندوہ کی تقریب میں شرکت کے لیے بہت سے بیرونی مہمانوں کے ساتھ شیخ ازہر بھی تشریف لائے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں ایمر جنسی کا تذکرہ کیا، مسلمانوں کی ایک تنظیم پر حکومتی پابندی کو نامناسب بتایا اور مسلمانوں پر ہونے والی ظلم و زیادتی کے لئے حکومت پر سخت تنقید کی۔ کہتے ہیں کہ علی میاں کی عین موجودگی میں مترجم نے شیخ کی تقریر کے ایمر جنسی والے بیان کو حذف کر دیا۔ البتہ جب سامعین میں بیٹھے کسی شخص نے اس بات پر احتجاج کیا تو بعض باتیں مترجم نے اجمالی طور پر شامل کر لیں۔ دیوبند کے قاری طیب صاحب صرف ادارے کے مہتمم ہی نہیں بلکہ پرسنل لاء بورڈ کے صدر نشین بھی تھے، جس نے بظاہر ملک میں شریعت کا علم بلند کر رکھا تھا۔ ایک دن آل انڈیا ریڈیو سے ان کے بیان کی گونج بھی سنائی دی جس سے صاف لگتا تھا کہ ایمر جنسی کی ایک ہی یلغار نے ہمارے تمام فکری، علمی اور روحانی قلعے ز میں بوس کر دئے ہوں۔ آنے والا ہر دن مسلمانوں پر مزید سخت ہوتا جاتا تھا۔ اسی دوران ترکمان گیٹ کا سانحہ پیش آیا اور پھر خبروں کا یہ سلسلہ کچھ اس طرح جاری رہا گویا ہر شب شب عاشور اور ہر روز ایک نئی قیامت۔

ایک دن یہی کوئی صبح سات آٹھ بجے کا وقت ہوگا مکتبہ کے سامنے ایک رکشہ آ کر رکا۔ ایک صاحب جو میانہ قد، گورے چٹے، شیروانی پر اور کوٹ اور ٹوپی، چشمہ میں ملبوس تھے، ہاتھوں میں ایک چھڑی لیے ہوئے رکشہ سے اترے۔ ارے یہ تو شبیر چچا ہیں، مفلر اور ٹوپی سے چہرہ کچھ اس طرح ڈھکا تھا کہ میں فی الفور پہچان نہ پایا، ابا کے اچھے دوستوں میں تھے، پرانی دلی کے علاقے میں جمال پرنٹنگ پریس کے منیجر تھے، راست دہلی سے تشریف لائے تھے اور اپنے گاؤں ململ جانے سے پہلے حسب معمول ابا سے ملاقات کے لیے رک گئے تھے۔ شبیر چچا کی آمد ہمارے لیے ایک جشن کی حیثیت رکھتی تھی۔ آنا فانا مکتبہ نے ایک ڈرائنگ روم کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہم لوگ چائے ناشتہ کے اہتمام میں لگے اور بزرگوں نے اپنی محفل جمائی۔ خوب خوب تبادلہ خیال ہوا۔ کبھی محفل پر فکر مند چھا جاتی اور کبھی اچانک شبیر چچا کے ظریفانہ جملے اور تہقہے بلند ہوتے۔ کہنے لگے اب سنئے سالک صاحب کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ پولس والوں نے ان کے دفتر کی تلاشی لی، کاغذات اور رجسٹر اپنی تحویل میں لیے، پھر اسے نہ جانے کیا سوچھی کہ سامنے پڑے دیوان حافظ کے نسخہ کو الٹ پلٹ کر کہنے لگا، ذرا پڑھئے اس میں کیا لکھا ہے۔ یہ شعر و شاعری کی کتاب ہے، اس کا آپ کیا کریں

گے؟ صاحب خانہ نے سمجھانے کی کوشش کی، بولا: ارے پڑھے تو لکھا کیا ہے:  
کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا۔

کہنے لگا: میں نہ کہتا تھا سالک صاحب کے بارے میں اس کتاب میں کوئی اہم انفارمیشن ہے۔ یہ کہہ کر شبیر پچانے قہقہہ بلند کیا اور محفل زعفران زار ہو گئی۔ چائے کے دوران کچھ اور عزیز واقارب بھی جمع ہو گئے۔ گفتگو دہلی کے حالات پر چل نکلی۔ ایک صاحب نے پوچھا، کیا اندازہ ہے اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، ظلم و ستم کی یہ آندھی کب تک چلتی رہے گی؟ بولے: جس کروٹ بھی بیٹھے، بیٹھنا تو طے ہے، ولی عہد کو آخر قدرت کب تک چھوٹ دے گی، میرے خیال میں ان کا حشر اچھا نہیں ہوگا، بڑا ظلم کیا ہے ان ماں بیٹے نے۔ نادر شاہ کے حملوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ بلکہ ظلم کے پرانے واقعات کو پڑھ کر کبھی شبہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی انسان اپنے ہی جیسے انسانوں پر اتنا ظلم ڈھا سکتا ہے، لیکن دہلی کے واقعات تو ان گنہگار آنکھوں نے خود دیکھے ہیں، کیا بتائیں بیان سے باہر ہے، یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نم اور آواز گلوگیر ہو گئی۔ بولے، یہ سمجھئے کہ ایک اور تقسیم کا عذاب جھیلا ہے دلی والوں نے، مسلمانوں کی دلی ایک بار ۴۷۷ء میں اجڑی، دوسری بار ۷۶۷ء میں پرانی دلی سے مسلمانوں کے جبری انخلاء کی منصوبہ بند کوشش کی گئی۔ سات لاکھ لوگ جو صدیوں سے دلی کی ان گلیوں میں رہتے آئے تھے، انھیں غیر قانونی طور پر ان کے گھروں سے بے دخل کیا گیا، ان کی املاک کو تباہ کیا گیا، اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ اچانک فقراء و مساکین میں تبدیل کر دیئے گئے، بس یہ سمجھئے کہ مسلمانوں کے لیے دلی کچھ اس انداز سے اجڑی کہ آج واقع نگار اس کی تفصیلات لکھنے سے گریزاں ہیں۔

’کہاں بھیجے گئے یہ لوگ؟ سنا کہ بڑا خون خرابہ ہوا۔‘

کہاں جائیں گے؟ آزاد ہندوستان میں آزادی کا عذاب جھیل رہے ہیں، جنما پار کے بعض غیر آباد علاقے جہاں خاک اڑتی ہے، شہری زندگی کی کوئی سہولت نہیں وہاں انھیں جبراً منتقل کیا گیا ہے۔ کوئی تر لوگ پوری بھیجا گیا ہے تو کسی کو سلیم پور کی پرچی پکڑائی گئی تو کسی کو ویلکم میں جگہ دی گئی۔ صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والے لوگ اس نقل مکانی میں اپنا کاروبار کھو بیٹھے، انھیں چھوٹے چھوٹے پلاٹ بھی دیئے گئے تو نس بندی شرط ٹھہرائی گئی۔

’انہوں نے اس بات کی کوشش نہیں کی کہ سب لوگوں کو ایک ہی جگہ منتقل کیا جائے، کسی ایک ہی کالونی میں جگہ مل جائے۔‘

بولے: ارے بھئی سارا جھگڑا تو اسی بات کا ہے کہ انھیں ہمارے ایک ساتھ رہنے سے چڑ ہے،

مسلمانوں نے بڑی کوشش کی، ان کا ایک وفد ڈی ڈی اے کے وائس چیئرمین جگموہن سے بھی ملا، پتہ ہے اس کمبخت نے کیا کہا۔

کیا؟ ایک صاحب کی زبان سے بے اختیار نکلا اور محفل ہمہ تن گوش ہو گئی۔

بولے: بد بخت کہنے لگا کہ کیا تم ہمیں پاگل سمجھتے ہو کہ ہم ایک پاکستان کو تباہ کر کے دوسری جگہ بھی پھر پاکستان آباد کریں گے؟

آں، یہ کون صاحب ہیں؟ ایک بزرگ نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے پوچھا۔ بڑا زہر ہے اس کی باتوں میں۔

بولے: یہ تو خیر ڈی ڈی اے کے نائب صدر ہیں، البتہ اس پوری کارروائی کے پیچھے اصل ہاتھ تو بنجے گاندھی کا ہے جس کا ذہن مسلمانوں کے سلسلے میں انتہائی پراگندہ ہے، وہ پرانی دلی کی مسلم آبادیوں کو پاکستانی حامیوں کا گڑھ سمجھتا ہے، ترکمان گیٹ کی اس پوری کارروائی کی، سمجھئے اس نے خود ہی کمان کی۔ ایک صاحبہ ہیں رخسانہ سلطانہ، بنجے اکثر ان کے ساتھ اس علاقہ میں چکر لگاتے دیکھے گئے۔

یہ رخسانہ کون ہیں؟ ہم نے تو ان کی منکوحوہ کا کچھ اور نام سنا ہے۔ ایک صاحب نے غالباً کار میں ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھے جانے پر اعتراض وارد کیا۔

بولے: ارے بھئی سیاست میں منکوحوہ ہونے کی شرط نہیں ہوتی اور اس طرح کے لوگ جو ہماری بنیادوں پر تیشہ چلائیں، یہ ہمارے درمیان بڑی آسانی سے مل جاتے ہیں۔

اور ان کا کیا موقف ہے، یہ جو اپنے صدر جمہوریہ ہیں، ایمر جنسی تو ان ہی کی ایما پر لگائی گئی ہے، کیا فخر الدین علی احمد نے اس صریح ظلم پر کوئی احتجاج نہ کیا؟ ایک صاحب نے وضاحت چاہی۔

بولے: ارے بھئی فخر الدین چاہے صدر جمہوریہ ہی کیوں نہ ہوں، ہیں تو اندراجی کے خادم، ان کے ہی مرہون منت، نوکر بھلا احتجاج کرتا ہے؟ شیخ عبداللہ کی طرح وہ بھی ترکمان گیٹ کے حادثہ پر بس دل مسوس کر رہ گئے۔ ان دونوں نے مسز گاندھی سے احتجاج بھی کیا مگر وہی تابع داروں والا، بے دم احتجاج۔ اوروں کو تو چھوڑیے محمد یونس جو نہرو فیملی کے گھر کے آدمی ہیں، جن کی ساری زندگی نہرو اور اندرا کی خدمت میں گزری ہے، وہ بھی کچھ نہ کر سکے۔ بقول شخصے صرف اتنا کہا کہ جگموہن خود کو شاہجہاں سمجھتا ہے، دلی کی تنظیم نو کرنا چاہتا ہے۔ اس سے آگے ان کا بھی بس نہ چل سکا، بنجے کے آگے کسی کی ایک نہ چلی۔ ارے بھئی نوکروں کی چلتی بھی کب ہے۔



برسوں بعد شہیر چچا کی یہ باتیں مجھے اس وقت یاد آئیں جب نرسمہاراؤ کے عہد میں سونیا گاندھی عملی سیاست میں آنے کے لیے بے چین تھیں، ان کی یہ خواہش ان کے فیملی فرینڈ محمد یونس جو نہرو فیملی کی زندگی بھر خدمت کے سبب اب باپ بیٹی کے غیاب میں خود کو تیسری جزییشن کا سرپرست سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے، پر بہت شاق گزری۔ انھوں نے ازراہ شفقت اور وفاداری کے تقاضے سے مجبور ہو کر یہ بیان دے ڈالا کہ راجیو کی بیوہ کے لیے سیاست کی گندگی میں اترنے سے کہیں بہتر ہے کہ وہ کٹورہ لے کر دلی کی گلیوں میں بھیک مانگنے نکل پڑیں۔ محمد یونس کے دل و دماغ پر اندرا اور راجیو کی المناک موت کا زخم تازہ تھا۔ اب خاندان کے ایک بزرگ کی حیثیت سے وہ راجیو کی بیوہ کو سیاست کی پر خار راہوں میں تجل ہوتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ سونیا کو یونس انکل کا یہ تبصرہ بہت گراں گزرا۔ انھوں نے اپنے ایک قریبی مشیر وی جارج کے ذریعہ اس بات کی وضاحت کروادی کہ محمد یونس ان کی نمائندگی نہیں کرتے۔ جب محمد یونس کو سونیا کی اس حرکت کا علم ہوا تو انھیں سخت صدمہ پہنچا، بزرگی کا خمار اتر گیا اور بڑی تلخی کے ساتھ فرمایا: ’نوکر، نوکر ہی رہتا ہے۔‘

مگر یونس تو ان کے گھر کے آدمی ہیں، سنا تھا کہ سنجے گاندھی کی شادی ان ہی کی رہائش گاہ سے انجام پائی تھی، ان کا لڑکا عادل شہریار، راجیو اور سنجے کا بچپن کا دوست ہے، پھر یونس صاحب کے جیتے جی مسلمانوں پر قیامت گزر جائے اور وہ بھی سنجے کے ہاتھوں؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک صاحب، جو نیشن اور بلیٹز کی چٹارے دار خبروں کو پڑھ کر تبصرہ کرنے کے عادی تھے، انھوں نے گفتگو میں ایک تحقیقی زاویہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

بولے: آپ کا اعتراض درست ہے، یہ بات بہتوں کے لیے باعث حیرت ہے کہ اندرا اور اس کے بیٹے میں مسلمانوں کے تین اتنی نفرت کیسے رچ بس گئی۔ جب اندرا نے ’غریبی ہٹاؤ‘ کا نعرہ بلند کیا تھا تو کسی کو اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ وہ دراصل غریب مسلمانوں کو منظر عام سے ہٹانا چاہتی ہیں اور جب ان کے بیٹے سنجے نے دلی کی تزئین کاری کا منصوبہ بنایا تب بھی کسی کے حاشیہ خیال میں یہ بات نہ تھی کہ وہ دراصل دلی کے قلب میں مسلمانوں کے بے ہنگم مکانات اور ان کی گنجان آبادی کو ایک بدنماداغ سمجھیں گے اور انھیں صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہو جائیں گے۔

اندرا اور سنجے کے رویے میں اس اچانک تبدیلی کی آخر وجہ کیا ہے؟

بولے: ارے بھئی تبدیلی و بدیلی کچھ نہیں، برتن میں جو کچھ ہوتا ہے وہی باہر آتا ہے۔ اب تک مسلمان ان لوگوں کو سیکولر سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا رہے، حالانکہ ان لوگوں کے ہاتھوں مولانا آزاد کی جو درگت

بنی وہ ہم سبھوں پر واضح ہے، کتنے بے دست و پا ہو گئے تھے مولانا، اب تو مولانا بھی نہیں رہے کہ مرثیہ آڑے آتی، اب تو صرف خادم رہ گئے ہیں، کسی کو صدارت کی کرسی پر مامور کیا، کسی کو راجیہ سبھا کی رکنیت دی، کسی کو وزارت اور سفارت سے نوازا۔ خواہ اس کی شکل مولویوں والی ہو یا وہ سوٹ ٹائی پہنتا ہو۔ نوکروں کا یہ مقام نہیں کہ وہ ماں بیٹے کا احتساب کر سکیں۔ اب جو کچھ اندر تھا وہ باہر آ رہا ہے۔ یہ کہتے ہوئے شبیر چچا نے ابا کی طرف دیکھا جیسے ان سے اپنے اس خیال کی توثیق چاہتے ہوں۔

جی ہاں درست فرمایا آپ نے، ابھی کچھ پہلے نس بندی کے مسئلہ میں شخصی آزادی کو پس پشت رکھنے کی بات بھی تو کہی تھی اس نے۔

بولے: جی ہاں ڈاکٹروں کے اجلاس کی بات کر رہے ہیں نا آپ؟ ارے بھئی اس عورت نے تو حد کر دی، کہتی ہے کہ ملک کی ترقی کے لیے شخصی حقوق کو پس پشت ڈالنا ضروری ہے کہ بقول اس کے انسانی حقوق سے ملکی حقوق مجروح ہوتے ہیں، ملک کی ترقی کا راستہ رکتا ہے اور چونکہ، اس خیال کے مطابق، ترقی کی راہ میں آبادی رکاوٹ ہے اس لیے حکومت پر لازم ہے کہ وہ جبراً آبادی پر بند باندھ دے اور یہ سارا نزلہ گر کہہ رہا ہے تو مسلمانوں کی طرف، گویا ہماری بڑھتی آبادی سے ہی آپ کی ترقی کا حال پتلا ہے۔

’مگر لطف کی بات تو یہ ہے کہ جس جبری نس بندی پر حکومت کا اس قدر زور ہے وہ دراصل صاحب زادے کے پانچ نکاتی منصوبہ کا حصہ ہے اور صاحب زادے کا حکومت سے کوئی رسمی تعلق بھی نہیں۔ اندرا کے بیس نکاتی پروگرام میں تو اس کا تذکرہ بھی نہیں۔

ہے کیسے نہیں، کرن سنگھ کی آنکھ سے پڑھے تو یہ نکتہ سارے نکات پر بھاری ہے۔

یہ کون صاحب ہیں؟ ایک صاحب نے پوچھا۔

بولے: ارے آپ نہیں جانتے کرن سنگھ کو، کشمیر کے شہزادے ہیں جو ایک مدت سے اپنا کھویا ہوا تخت دہلی میں تلاش رہے ہیں۔ ان چالیسوں نے بیس نکاتی منصوبوں میں بڑے معانی دریافت کیے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کو بیس نکاتی منصوبہ بندی میں شامل نہیں کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ غیر اہم ہے، بلکہ اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ اتنا اہم ہے کہ اسے محض ایک نکتہ کے طور پر درج کر دینا اس کی اہمیت کو کم کر دیتا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر لوگ رضا کارانہ طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے لیے آمادہ نہ ہوں تو حکومت کو چاہئے کہ وہ اس سلسلے میں ضروری قانون بنائے، مگر یہ سب کہنا بھی تکلف ہے جہاں جنگل راج ہو وہاں قانون سازی کے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بہت برا وقت ہے، بس اللہ مسلمانوں پر رحم فرمائے۔ یہ کہتے ہوئے شبیر چچا نے پہلو بدلا، سامعین پر ایک نگاہ ڈالی اور خاموش ہو گئے۔



برسوں بعد جب ایک دن میں M.N.Buch کا مضمون The Dharmic State کا مطالعہ کر رہا تھا تو میری نگاہوں میں مکتبہ کی یہ مجلس اچانک جاگ اُٹھی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے یہ بزرگ تحقیق کے جدید مناہج سے بظاہر بیگانہ نظر آتے ہوں اور ان کے پاس اپنے حق میں دلائل کو مرتب کرنے کی دانشورانہ تربیت کی خواہ بظاہر کمی نظر آتی ہو، واقعہ یہ ہے کہ وہ حالات کی سنگینی پر پوری طرح مطلع تھے۔ مذکورہ مضمون میں فاضل مقالہ نگار نے لکھا تھا: 'مجھے اب تک دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں گزرے ہوئے اپنے وہ ایام یاد ہیں جب ایمرجنسی کے خاتمہ کے بعد جتنا حکومت برسر اقتدار آگئی تھی۔ ہم لوگوں نے جامع مسجد کے علاقے میں مینا بازار اور دربیہ کلاں میں پائیں والے کے علاقہ میں دکانیں تعمیر کی تھیں، تاکہ ایمرجنسی میں اجڑے ہوئے دکانداروں کی بازآباد کاری کی جاسکے۔ سنجے گاندھی نے مجھ سے کہا کہ ایسا کر کے ہم لوگ غلطی کر رہے ہیں۔ ایمرجنسی میں ان دکانوں کے اجڑنے سے دراصل پاکستان حامیوں کا گھونسلاتا ہوا ہے۔ نہرو کے نواسہ کے منہ سے مجھے یہ سب سن کر بڑی وحشت ہوئی۔'

ان ہی دنوں جان دیال اور اے بوس کی ایک کتاب *For Reasons of State: Delhi under the Emergency* میرے ہاتھ لگی، میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ہمارے بزرگوں کا کرب اس بیانہ میں کچھ اسی طرح متشکل ہو گیا تھا گویا آپ مکتبہ کی مجلس میں بیٹھے شبیر چچا کی زبانی ترکمان گیٹ کی تباہی کا آنکھوں دیکھا حال سن رہے ہوں۔ لکھا تھا:

'درگاہ فیض الہی مسجد کے امام حافظ محمد نے ابھی نماز ختم ہی کی تھی کہ پولس آگئی۔ انھوں نے پچھلے پندرہ منٹوں میں بڑی الجاح و زاری کے ساتھ یہ دعا مانگی تھی کہ خدا باہر ہونے والے قتل عام کو روک دے اور اس مسجد کے نمازیوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھ۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ خدا نے فیض الہی مسجد اور اس کے امام کا ساتھ آج چھوڑ دیا تھا۔ مسجد کا صدر دروازہ ازراہ احتیاط پہلے ہی بند کر دیا گیا تھا تاکہ پولس اندر نہ آسکے۔ امام محمد کو اس کی توقع بھی نہ تھی کہ پولس مقدس مقام میں داخل ہو جائے گی۔ جب دروازہ پر زور کی دستک ہوئی تو امام محمد پہلے یہ سمجھے کہ پولس انہیں خوف زدہ کر کے دروازہ کھلوانا چاہتی ہے، لیکن جب دروازہ سے آنے والی آواز بڑھتی گئی تو ان کی یہ غلطی فہمی ختم ہوگئی۔ پولس دراصل دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہی تھی..... مسجد کے اندر لوگوں میں اضطراب تھا، بالآخر دروازہ ٹوٹ ہی گیا اور پولس اندر داخل ہوگئی۔ رک جاوے خدا کا گھر ہے، امام نے چیختے ہوئے کہا۔ ان کے چہرے پر غصہ اور خوف نمایاں تھا، لیکن ان کی آواز ان تین سو

لوگوں کی چیخ پکار میں دب کر رہ گئی جن پر پولس نے اب دھاوا بول دیا تھا۔ مسجد کے اندر اب کسی کو مفر نہ تھا۔ ایک ایک کر کے لوگوں کو گھسیٹ کر نکالا جانے لگا، پولس کے لیے بھی یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ لوگ اپنے بچاؤ کے لیے دیواروں اور کھڑکیوں سے چپکے ہوئے تھے۔ پولس کے حملوں کے باوجود وہ باہر جانے کو تیار نہ تھے، اس لیے کہ باہر کے مقابلہ میں یہ جگہ اب بھی نسبتاً محفوظ تھی، تبھی ایک پولس آفیسر نے کہا: 'ان حرامیوں پر گیس کے گولے داغو'۔ آنسو گیس کے دو گولے عین مسجد کے اندرونی حصے میں آگرے۔ ایک بند جگہ میں گیس کے گولے داغنے کا مطلب تھا قتل۔ لوگ اب مجبور ہو کر مسجد سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے، اسی طرح جیسے چیونٹیاں اپنے بلوں سے نکلنے لگتی ہیں۔ چند منٹ گیس کے اندر رہ جانے کا مطلب تھا کہ موت یقینی ہے۔ اس ہنگامہ میں ننھا عثمان اپنی ماں کو تلاش کر رہا تھا، وہ چونکہ چھوٹا تھا اس لیے اب تک پولس کی لالچی اور گھونسوں سے محفوظ تھا، لیکن اب گیس کا وہ کیا کرتا، اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ مسجد میں ادھر ادھر بھاگنے لگا، لیکن اسے سمجھ میں نہ آیا کہ دروازہ کدھر ہے۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ 'اماں جان تم کدھر ہو، مجھے بچاؤ، لیکن اماں جان تو خود گیس کے زرخے میں تھیں۔ اسی دوران عثمان پر کسی کا پاؤں آ پڑا، وہ اب احساسات سے خالی تھا، گیس نے اس کی جان لے لی تھی۔

اسی سالہ عبدالستار دہشت کے مارے دیوار سے لگا تھا، اسے یاد نہیں کہ وہ کتنے سالوں سے اس مسجد کی صفائی پر مامور تھا، لیکن اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا خلفشار نہیں دیکھا تھا۔ چیخ و پکار، لالچیاں، آنسو گیس اور خون۔ یہ سب دیکھ کر عبدالستار نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اس کی زبان پر اللہ کا نام تھا، لیکن جلد ہی گیس نے اسے بھی آلیا، وہ کھانتے ہوئے دروازہ کی طرف بھاگا لیکن اس سے پہلے کہ دروازہ سے باہر نکلتا ایک کانسٹیبل نے اس کی گردن پکڑ لی۔ میں ابھی آتا ہوں ذرا لیٹرین سے ہولوں، عبدالستار چیخا، تبھی اس کے سر پر ایک شدید ضرب پڑی اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اب تک امام حافظ محمد مسجد کے ایک اندرونی حجرہ میں پناہ لے چکے تھے۔ 'اے اللہ! مومنین کی مدد کر۔ ان کے منہ سے بے اختیار نکلا: 'آخر کب تک یہ قتل عام چلتا رہے گا؟ تبھی پیچھے سے آواز آئی 'کہاں ہے اللہ۔ دو پولس والے پیچھے کھڑے تھے، ان ہی میں سے ایک کی یہ آواز تھی۔ بولا: امام اپنے خدا کو بلاؤ اور دیکھو میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں، آؤ آج دیکھ ہی لیں، اپنے خدا کو سامنے لاؤ، میں اس سے نمٹنا چاہتا ہوں..... اس امام کے کتے کو

ذرا راستہ پر لاؤ، اس کی خدا کی محبت ابھی ہوا ہو جائے گی۔ نہرو بریگیڈ والے آدمی نے کہا۔ امام حافظ محمد خدا کو پکارتے رہے اور ان پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش ہوتی رہی۔ اے خدا! تیری اور تیرے امام کی اس قدر تو بہن، خدا ان کی گرفت کر، ایسی گرفت کہ انہیں یاد رہے کہ مسجد میں اس طرح کرنے والوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ آدھے گھنٹہ کے اندر مسجد ایک مقتل میں بدل چکی تھی۔ ہر طرف خون ہی خون تھا، ہوا میں آنسو گیس کی بدبو اور فضا میں زخمی نمازیوں کی آہوں اور کراہوں کی دلخراش چیخیں.....۔

چند ہی گز کے فاصلہ پر سلیمہ بیگم کسی خونخوار تہی کی طرح ایک کانٹیل سے لڑ رہی تھیں جو ان کے گھر میں گھس آیا تھا۔ وہ اپنے دانت اور ناخن سے وار کر رہی تھیں۔ یہ بڑی خطرناک کتیا ہے، میں اسے اکیلے نہیں جھیل سکتا، ارے کوئی میری مدد کرو۔ کانٹیل نے اپنے دوست کو آواز دی۔ اب ایک عورت کے مقابلہ پر دو کانٹیل تھے، لیکن سلیمہ ہار ماننے والی نہیں تھیں۔ دانت کاٹتے، لات مارتے اور صلواتیں سناتے ہوئے کبھی وہ ان دونوں کو کمرے کے ایک کنارے پر لے جاتیں تو کبھی دوسرے کنارے پر مگر اپنے برقع پر ہاتھ نہیں آنے دیتیں۔ وہ بڑی بے جگری سے مقابلہ کر رہی تھیں۔ اب انہدام کی کارروائی کے بعد ساری توجہ ان گھروں پر تھی جو ترکمان گیٹ میں باقی رہ گئے تھے۔ بظاہر تو فائرنگ بند ہو چکی تھی لیکن پولس والے اب اندر گلیوں میں جن جن کر نشانہ بنا رہے تھے۔

’ساڑھے پانچ بجے شام کر فیو کا اعلان ہوا اور پھر اس کے بعد ایک منصوبہ بند طریقے سے لوٹ مار اور زنا بالجبر کی کارروائی شروع ہو گئی۔ بیشتر مرد یا تو گرفتار ہو چکے تھے یا اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے تھے۔ اب ان گھروں میں بے آسرا عورتوں اور بچوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ رضیہ بیگم اپنے شوہر کا ایک گھنٹہ سے انتظار کر رہی تھیں، لیکن ان کا کوئی پتہ نہ تھا، تبھی دروازہ پر دستک ہوئی، انھوں نے بڑی امید کے ساتھ دروازہ کھولا لیکن وہاں ان کے شوہر نہیں بلکہ ایک پولس کانٹیل تھا۔ اپنے کان کی بالیاں اتار ڈالنے کے مطالبہ کیا۔ رضیہ نے اسے بالیاں دے دیں۔ ’اور زیورات کہاں چھپائے ہیں؟‘ بے چاری رضیہ نے اس صندوقچے کی طرف اشارہ کیا جس میں اس کے زیورات اور برسوں کی جمع پونجی تھی۔ اور اب اپنے کپڑے۔ رضیہ نے بستر کے کنارے رکھے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کپڑے نہیں جو تمہارے سوٹ کیس میں ہیں بلکہ وہ جو تمہارے جسم پر ہیں۔ کانٹیل نے پان والے دانت دکھاتے ہوئے کہا۔ رضیہ کی آنکھوں میں

خوف گھر آیا، اس نے دفعتاً ایک جست لگائی اور کانسٹیبل سے اپنی باہیں چھڑاتے ہوئے باہر بالکنی میں نکل آئی۔ نیچے چالیس فٹ کی گہرائی تھی۔ ارے تم کیا کرنے جا رہی ہو۔ کانسٹیبل کے چیخنے کی آواز آئی۔ رضیہ بیگم نے اپنی آنکھیں بند کیں اور کود گئیں۔ نیچے اس کے گرنے کی زوردار آواز سنائی دی۔

ترکمان گیٹ پر شام گہری ہوتی جاتی تھی۔ شفق پر ڈوبتے سورج کی لالی اب بھی باقی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی، جس میں کبھی آہ و کراہ اور نالوں کی آواز سنائی دے جاتی۔ آج یہاں کسی گھر میں روشنی نہیں تھی۔ بجلی کا کنکشن کاٹا جا چکا تھا، ٹیلیفون اور پانی کا کنکشن بھی منقطع کر دیا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ترکمان گیٹ کو حرف غلط قرار دے دیا گیا ہو۔ تبھی خاموشی میں بے ہنگم مشینوں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی ازلی عنقریب ترکمان گیٹ کی قسمت پر ہنس رہا ہو۔ بلڈوزروں نے اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ دور سے ایسا معلوم پڑتا جیسے ٹینکوں کی کوئی قطار ہو۔ سولہ مہیب سائے رات کی تاریکی میں حرکت میں تھے، ان کے کرہ تھوٹھنے آگے بڑھنے کے لیے حرکت میں تھے، ان کی توبس قسمت کھل گئی تھی، اب ان کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ انیس سالہ سلیمان جو اپنے ادھورے منہدم گھر میں چھپا بیٹھا تھا، اس نے بلڈوزر کی آواز سنی۔ اس نے یہاں پناہ لے رکھی تھی، وہ اپنے بھائی کے بارے میں فکر مند تھا جسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کل وہ اپنے بھائی کی ضمانت کی کوشش کرے گا۔ پہلے پہل تو سلیمان نے بلڈوزروں کی آواز کا کچھ نہ کیا، سوچا شاید یہ پولس کے ٹرکوں کی آواز ہو، آواز قریب سے قریب تر آتی گئی۔ اچانک سلیمان کے ذہن میں یہ بات کوندی کہ شاید یہ ٹرک نہ ہو، ٹرک اس طرح کی آواز نہیں نکالتے، پھر یہ کیسی آواز ہے۔ اس سے پہلے کہ سلیمان کسی نتیجہ پر پہنچتا، آواز اور تیز ہوتی گئی۔ اس کا جی چاہا کہ جھانک کر دیکھے لیکن اس خوف سے کہ کوئی گزرتا ہوا سپاہی اسے یہاں چھپا نہ دیکھ لے، اس نے یہ خیال ترک کر دیا۔ اب آواز اس گھر کے بالکل قریب آگئی تھی جہاں سلیمان چھپا بیٹھا تھا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ ارے یہ تو بلڈوزر ہے، اس نے چیخنا چاہا لیکن اس کی چیخ بلڈوزر کے شور میں دب کر رہ گئی، جس کا بارہ فٹ کا دہانہ گھر کو توڑتا ہوا اب سلیمان کے جسم کو ملبہ میں بدل گیا تھا۔ رات کی تاریکی میں اچانک فلڈ لائٹ روشن ہو گئی اور ترکمان گیٹ ایک خرابے کا منظر پیش کرنے لگا۔ سولہ بلڈوزر اپنا کام کرتے رہے۔ اس رات یہ بلڈوزر مسلسل چلتے رہے بلکہ اگلے دن بھی اور اگلی رات بھی۔ بائیس اپریل تک بلڈوزر شب و روز حرکت میں رہے،

یہاں تک کہ انھوں نے ترکمان گیٹ سے زندگی اور موت کی تمام نشانیاں مٹا ڈالیں۔  
مکتبہ میں گفتگو کا رخ اب ترکمان گیٹ سے ہوتا ہوا ملک کے دوسرے حصوں میں پیش آنے  
والے حوادث کی طرف مڑ گیا تھا۔ ایک صاحب ہریانہ کے ایک گاؤں اٹا اور کا تذکرہ کر رہے تھے، جہاں  
اخباری اطلاعات کے مطابق درجن بھر سے زائد لوگ نس بندی کے آپریشن کی تاب نہ لا کر داغ مفارقت  
دے چکے تھے۔

اٹا اور میں بھی بڑا ظلم ہوا ہے، ہمارے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں، بعض رفقاء خود دیکھ کر آئے ہیں،  
شبیر چچا نے وضاحت کی۔ بولے، اٹا اور میوات اور پول سے لگا ہوا ہریانہ میں مسلم اکثریتی علاقہ ہے۔ وہاں  
تو پولیس گھوڑوں پر آئی، بالکل فاتحین کے انداز میں۔

جی ہاں انھیں تو مسلم آبادی کا ہر علاقہ ایک پاکستان لگتا ہے، ایک صاحب نے لقمہ دیا۔

’یعنی شاہدین کا کہنا ہے کہ صبح تین بجے کا وقت ہوگا جب ہزاروں پولیس والوں نے گاؤں کا محاصرہ  
کر لیا، انھوں نے بلند یوں پر مشین گنیں نصب کر دیں، اعلان ہوا کہ گاؤں کے تمام مرد حضرات سرکاری  
اسکول میں جمع ہوں۔ دریں اثناء پولیس گھر گھر کی تلاشی لیتی رہی، ڈری سہی عورتیں اور معصوم بچے بھلا کیا  
کرتے، کسی کی آبرو محفوظ نہ تھی۔ آٹھ سومردوں میں کوئی ڈھائی سو لوگوں کو بسوں میں بھر کر ہسپتال لے جایا  
گیا، ان میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جن کی ابھی شادیاں بھی نہیں ہوئی تھیں، بعض لوگوں نے فرضی  
طلاق نامے بنوار کھے تھے کہ شاید وہ اس طرح نس بندی کی زد سے بچ جائیں، لیکن یہ سب ترکیبیں دھری کی  
دھری رہ گئیں۔ ہر شخص کو ایک نمبر دیا گیا اپنی باری کا نمبر، اب یہ لوگ انسان نہیں بلکہ ہندسہ تھے۔

شبیر چچا نے ہندسہ کے لفظ پر کچھ اس طرح زور دیا جیسے انسان اپنے جیسے انسانوں سے نہیں بلکہ بے  
جان، بے حس اور بے روح ہندسوں سے برسرِ پیکار ہوں۔

اور مظفر نگر کی حقیقت کیا ہے؟ سنا ہے وہاں بھی بڑے پیمانے پر مسلمانوں کو پولیس کی گولیوں کا نشانہ  
بنایا گیا ہے، ایک صاحب نے خالہ پور میں پولیس فائرنگ کے حوالہ سے پوچھا۔

بولے: ایک صاحب ہیں وڈیہ بھوشن، کانگریس کے لیڈر ہیں، سنجے گاندھی کے مقررین میں سے ہیں،  
ان کی نگاہ التفات خالہ پور کے مسلم علاقے پر پڑ گئی۔ پولیس نے ایک گوشت فروش کو اس کے گاہک سمیت  
نس بندی کے لیے اٹھالیا۔ یہ خبر جیسے ہی عام ہوئی سیکڑوں مسلمان سڑکوں پر احتجاج کے لیے نکل آئے۔ پھر پی  
اے سی کی ٹکڑیوں نے مورچہ سنبھالا اور دیکھتے دیکھتے پینتیس (۳۵) لاشوں سے بازار پٹ گیا، ہر طرف خون  
ہی خون، پھر کر فیولگایا گیا اور جیسا کہ ایسے موقع پر ہوتا ہے۔ بے شمار مسلم نوجوان گھروں سے اٹھالیے گئے اور

انہیں جھوٹے مقدمات میں گرفتار کر لیا گیا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس ظلم کی کہیں کوئی شنوائی نہیں، یہ کہتے ہوئے شبیر بیچا کی آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا، بولے: اللہ ہی ان ظالموں سے سمجھے۔

کہاں آگئے ہم، یہ کیسی عجیب صورت حال ہے، موت اور موت میں سے ہی کسی ایک موت کا انتخاب کرنا ہے، یا تو پولیس کی گولیوں سے مریں یا ڈاکٹر کے نشتر سے اپنی نسل کشی کو قبول کر لیں، اتا نے صورت حال کی سنگینی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

’یہ ہے آزاد جمہوری ہندوستان کا اصل چہرہ، اب کیا کیجئے گا، راستہ تو ان ہی حالات میں بنانا ہے، ظلم کی ہانڈی آخر کب تک چڑھی رہے گی، ماروتی کی ماں بھی ایک دن روئے گی۔ واللہ المستعان، یہ کہتے ہوئے شبیر بیچا اٹھ کھڑے ہوئے۔‘

شبیر بیچا اپنی خوش خلقی اور بذلہ سنجی کے لیے معروف تھے۔ مسکراہٹ ان کے چہرے پر ہمیشہ کھیلتی ہوتی۔ آج بھی وہ چمکتے ہوئے رکشہ سے اترے تھے، لیکن تھوڑی دیر مسائل حاضرہ کی گفتگو میں ان کی آنکھیں بار بار نم ہوتی دیکھی گئیں۔ آج مجھے اس بات کا کسی قدر اندازہ ہوا کہ ہمارے بزرگوں نے اپنی خوش خلقی کے پیچھے کتنے غموں کو چھپا رکھا ہے۔ شبیر بیچا تو چلے گئے لیکن اپنے پیچھے آہوں اور کراہوں کا غبار چھوڑ گئے۔ میں نے سوچا کہ جس ملک میں صرف ایک سال کی مدت میں تراسی (۸۳) لاکھ لوگوں کو جبراً نسل بندی کا نشانہ بنایا جاتا ہو، جہاں صرف ترکمان گیٹ میں بارہ سو بے گناہ مسلمان اپنی جان، مال اور گھر کے تحفظ کے جرم میں پولیس کی گولیوں سے شہید ہو جاتے ہوں، وہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو نہیں کہا جاسکتا۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی کہ جو مسلمان پہلے سے اس دنیا میں موجود ہیں وہ جیتے جی پولیس فائرنگ میں مارے جائیں اور جنہیں دنیا میں ابھی آنا باقی ہے ان کا راستہ بزور بندوق روک دیا جائے۔ پھر خیال آیا کہ ترکمان گیٹ کے شہداء کو بارہ سو کی گنتی میں محصور کرنا بھی تو ظلم ہے۔ یہ صورت حال کی صحیح عکاسی ہرگز نہیں۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ تقسیم کے بعد ایک بار پھر دہلی کی ڈیموگرافی از سر نو مرتب کی گئی، دہلی سے مسلمانوں کا ایک بار پھر جبراً انخلاء عمل میں آیا۔ اتا صحیح کہتے ہیں انسانوں کو ہندسوں کی شکل میں دیکھنے سے جرم کی شاعت پر پردہ پڑ جاتا ہے، لوگ اسے بھلا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ترکمان گیٹ کے واقعہ کو بہت سے لوگوں نے جلیاں والا باغ سے مشابہ قرار دیا، مگر جیسے پچھلے فسادات ہمارے ذہن سے رفتہ رفتہ محو ہو گئے اسی طرح ایمر جنسی کے یہ مظالم بھی ہمارے قومی اور ملٹی شعور سے محو ہو جائیں گے۔ مجھے علی میاں کا وہ مطبوعہ خطبہ بھی یاد آیا جو ایمر جنسی کے دنوں میں ندوہ کی پچاسی ویں (۸۵) یوم تاسیس پر ملکی اور غیر ملکی مہمانوں کی موجودگی میں بڑے ترک و احتشام سے نشر ہوا، اردو اخبارات نے اس کی سرخیاں جمائیں، لیکن ایمر جنسی کے ان نازک حالات میں دیا جانے والا یہ

خطبہ ایمر جنسی کے ذکر سے یکسر خالی رہا۔ جو قوم خود اپنے حال کے تذکرے سے گریزاں ہو اسے تاریخ کی کمک اور اس کی روشنی کیسے مل سکتی ہے؟

ترکمان گیٹ کے سانحہ پر چند ماہ بیت چکے تھے۔ گو کہ اب نس بندی کی مہم میں وہ پہلے سا جوش و خروش نہ تھا، لیکن فضا میں گھٹن اور زباں بندی کا احساس اسی طرح برقرار تھا۔ اس دوران اچانک یہ اعلان ہوا کہ مسلم محلہ میں ایک مشاعرہ منعقد ہونے جا رہا ہے۔ ہمارے پڑوسی جوشہر کے مشہور دندان ساز تھے، صاحب بیاض شعراء میں تھے۔ کہنے لگے کیا خیال ہے مشاعرہ میں چلو گے۔ سردی کی رات تھی۔ یتیم خانہ کے مرکزی لان میں شامیانیے نصب کر دیئے گئے تھے۔ گیس کی روشنی سے مجلس بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ اسٹیج پر کبار شعراء نے اپنی نشستیں سنبھال رکھی تھیں۔ مشاعرہ اپنی تمام آن بان کے ساتھ جاری تھا، البتہ اس کی آن کا اصل امتحان اس وقت ہوا جب صدر مجلس نے ’آن‘ کے عنوان سے اپنی نظم پڑھنی شروع کی۔

ہے زباں بندی کی خاطر تاجداری آن کی

ابھی شاعر نے پہلا مصرعہ ہی پڑھا تھا کہ لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ واہ واہ اور سبحان اللہ کہنے والی زباںیں اچانک محتاط ہو گئیں۔ اگلے چند مصرعے احتیاط و التزام میں گزر گئے، پھر جب شاعر نے یہ شعر پڑھا:

سیکڑوں الزام قید و بند سادہ سا جواب

ماننی پڑتی ہے ہم کو بردباری آن کی

تو سامعین کو اندازہ ہو گیا کہ اشعار خطرناک حد تک سیاسی نوعیت کے ہیں۔ اور جب شاعر نے مقطع

کا شعر پڑھا:

اور بھی کچھ روز محسن کیجئے اس کا انتظار

آج یا کل ایک دن ہونی ہے خواری آن کی

تو لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ ایمر جنسی کے اس ماحول میں اس قسم کی شاعری پر عوامی جلسہ میں احتیاط کے ساتھ کیسے داد دی جائے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ صدر مجلس استاذ الاساتذہ تھے۔ وہ صرف شاعر نہ تھے، ماہر تعلیم بھی تھے۔ عوام و خواص میں ان کا بڑا احترام تھا۔ لوگوں کو اندیشہ ہوا کہ اس کبرسنی میں ان کی یہ حق گوئی انھیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دے۔ حفیظ میرٹھی کے جیل جانے کا واقعہ لوگوں کے ذہنوں میں تازہ تھا جو اپنے بعض اشعار کے سبب مشاعرہ گاہ سے ہی جیل بھیج دیئے گئے تھے۔

آج کچھ ایسا طے پایا ہے حق کے اجارہ داروں میں

جو ہم پر ایمان نہ لائے چنوادو دیواروں میں  
 ہر ظالم سے ٹکر لی ہے سچے فنکاروں نے حفیظ  
 ہم وہ نہیں جو ڈر کر کہہ دیں ہم ہیں تابعداروں میں

مشاعرہ تو ختم ہو گیا، لیکن محسن صاحب کا احتجاج زباں بندی لوگوں کی گفتگو کا موضوع بن گیا۔ ان دنوں امرت نہاتا کی فلم 'قصہ کرسی کا' کا بھی بڑا چرچا تھا، جس میں سنجے اور اندرا کے طرز حکمرانی کا لطیف پیرائے میں مذاق اڑایا گیا تھا۔ حکومت نے چونکہ اس فلم کو لائسنس دینے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی اصل فلم کو بھی غیر قانونی طور پر ضائع کرنے کی مرتکب ہوئی تھی، اس لیے عوامی حلقوں میں یہ فلم موضوع بحث بن گئی تھی۔ فلم میں بتایا گیا تھا کہ ہماری غربت کا اصل سبب دراصل چھوٹے چھوٹے چوہے ہیں جو ہمارے سارے اناج کو موٹے موٹے بلوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ اس لیے غربتی ہٹانے کے لیے لازم ہے کہ ان چوہوں کا صفایا کر دیا جائے۔ ملک گیر سطح پر چوہے مارنے کی اسکیم بنائی گئی۔ لوگوں کو ہر چوہے کے مارنے پر دس روپے دینے کی ترغیب دی گئی۔ یہ تمثیل دراصل جبری نس بندی کی طرف اشارہ تھی۔ چوہے دراصل وہی غریب و غرباء تھے جن میں سرفہرست مسلمانوں کو رکھا گیا تھا۔ ایمر جنسی کے حکمرانوں کا یہ عمومی خیال تھا کہ جب تک غریب مسلمانوں کی پیدائش پر روک نہیں لگائی جاتی، ملک میں خوشحالی نہیں آسکتی۔ آگے چل کر جب مجھے ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ان علامتوں کے معانی کی شدید ہوئی تو پتہ چلا کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کو مارنے سے پہلے انہیں جانوروں کی سطح پر لانا، dehumanize کرنا کیوں ضروری ہوتا ہے۔ مجھے ابا کی مومنانہ فراست پر بھی خوشگوار حیرت ہوئی کہ انہوں نے کس طرح غربتی ہٹاؤ نعرہ کے پیچھے غریبوں کو فنا کر دو کے منصوبہ کا ابتداء میں ہی ادراک کر لیا تھا۔

## روح کا زخم

ایک دن اچانک بیٹھے بٹھائے مسز گاندھی کو نہ جانے کیا سوچھی کہ انھوں نے الیکشن کا اعلان کر ڈالا۔ حالانکہ خبر گرم تھی کہ موجودہ حکمران اپنے عہدے سے دست برداری کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ بعض حلقوں سے نئے دستور ساز اسمبلی کے قیام کی تجویز بھی آرہی تھی اور بعض ریاستوں نے تو باقاعدہ ایک نئی طرز حکمرانی کی حمایت میں تجاویز بھی پاس کر دی تھیں۔ ایسے میں اچانک الیکشن کا بگل غیر متوقع ہی نہیں حیران کن بھی تھا۔ ہم لوگ اب تک الیکشن سے دور رہنے کے عادی تھے۔ ابا کہتے بے ایمانوں میں سے ہی کسی بے ایمان کو ووٹ دینا یا حق حکمرانی سونپنا عقل و فہم کی نفی ہے۔ جب کوئی متبادل ہی نہ ہو تو بھلا ووٹ کسے دیں۔ لیکن اب ایک نئی صورت حال کا سامنا تھا۔ لوگوں کی پھنسی گردنوں کو نکلانے کے لیے سیاسی تبدیلی ناگزیر ہو گئی تھی۔ جماعت کے حلقوں میں بعض بزرگ شش و پنج میں تھے۔ بمبئی کے شمس پیرزادہ اور ناگپور کے عبدالحفیظ خان اس مسئلہ پر خاص طور پر اجتہاد کے طالب تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان بحثوں سے کوئی واضح موقف نکل کر سامنے آتا، ہمارے ارشد بھائی نے اپوزیشن کی حمایت میں سرگرم مہم چلانے کا اجتہاد کر ڈالا اور پوری تندہی سے اس مہم میں لگ گئے۔ ابا نے بھی ان سے کوئی اعتراض نہ کیا اور ہم لوگوں کی ہمدردیاں پوری طرح اپوزیشن کے ساتھ ہو گئیں۔

اسی دوران ایک صبح صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کی موت کی خبر سامنے آئی۔ میں اس دن امتحان ہال میں تھا۔ میٹرک کے امتحان کا آخری پرچہ تھا تبھی اساتذہ کو یہ کہتے سنا کہ فخر الدین علی احمد کا انتقال ہو گیا ہے۔ باہر آیا، واپسی کے لیے رکشے کی تلاش میں تھا کہ گاؤں کے ایک بزرگ پر نظر پڑی جو اپنے چھوٹے بیٹے کو امتحان دلانے کے لیے ساتھ آئے تھے۔ وہ بزرگ مجھے دیکھ کر بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ مجھے باصرار اپنے ساتھ رکشے میں بٹھالیا۔ رکشہ روانہ ہوا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا انھوں نے خود ہی فرمایا: پتہ ہے فخر الدین علی احمد کا انتقال ہو گیا ہے۔

میں نے کہا: جی ہاں، ابھی امتحان ہال میں پتہ چلا۔

بولے: اچھا! بڑے باخبر رہتے ہو، پھر خود ہی کہنے لگے: پتہ نہیں موت کا سبب کیا ہے، بظاہر تو ہارٹ اٹیک بتایا گیا ہے۔

میں نے کہا: کوئی سازش بھی تو ہو سکتی ہے، شبیر چچا بھی تو یہی کہہ رہے تھے کہ وہ ترکمان گیٹ کے سانحہ پر سخت کبیدہ خاطر تھے، پتہ نہیں کس دباؤ میں رہے ہوں گے۔

میری اس تشویش پر وہ بزرگ مسکرائے، بولے: ارے بھئی ہر چیز میں سازش نہیں ہوتی، یہ تو بڑی صاف بات ہے، مسلمان اگر ذرا بھی مسلمان ہو، ایمان کی رمتق اس کے دل میں باقی ہو تو وہ اس سسٹم میں فٹ نہیں بیٹھ پاتا، اس کا ضمیر مسلسل اسے کچوکے لگا تار ہتا ہے، وہ خود کو بے بس محسوس کرتا ہے کہ اہم حکومتی عہدوں پر بیٹھ کر بھی وہ اپنی ہم قوموں کو انصاف دلانا تو درکنار، ان کے حقوق کی پامالی کو نہیں روک سکتا۔ سنا ہے کہ آخری دنوں میں مسز گاندھی سے ان کے مراسم اچھے نہیں رہ گئے تھے۔ پھر انھوں نے کوئی سخت فیصلہ کیوں نہ لیا، وہ تو حکومت کی سب سے اعلیٰ کرسی پر تھے، میں نے پوچھا۔

بولے: ارے بھئی ایک تو صدر جمہوریہ کے اختیارات محدود ہوتے ہیں دوسرے مسلمان صدر ان محدود اختیارات کا استعمال اس لیے بھی نہیں کر پاتا کہ وہ جس خدمت اور وفاداری کے مرحلے سے گزرتا ہوا ان مناصب تک پہنچتا ہے وہاں اس کے اندر آزادانہ فیصلوں کا کس بل نہیں رہ جاتا۔ اب دیکھو نا، ذاکر حسین صاحب کی ملٹی خدمات سے تو سب لوگ واقف ہیں۔ انھوں نے جامعہ کونازک وقت میں سہارا دیا، آزادی کے بعد علی گڑھ کو جس غیر یقینی مستقبل کا سامنا تھا، اس سے نکالا، اردو کے حق میں لاکھوں دستخطوں کی زوردار مہم چلائی لیکن جب خود صدارت کی کرسی پر متمکن ہوئے تو خاموشی اختیار کر لی۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟ میں نے پوچھا۔

بولے: ارے بھئی جن لوگوں نے انھیں صدر جمہوریہ بنوایا تھا۔ وہ اس بات سے واقف تھے کہ ذاکر صاحب کی مسلم شبیہ ہمارے سیکولرازم کے لیے اسٹریٹجک اہمیت کی حامل ہے، مسلمان کو صدر بنانا جب سیکولرازم کے استحکام کا باعث سمجھا جاتا ہو تو کسی مسلم صدر کے لئے اس کرسی پر رہتے ہوئے اردو زبان یا مسلمانوں کے دوسرے ملٹی امور میں دلچسپی لینے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے؟



برسوں بعد جب مجھے شاہ کمیشن کی رپورٹ اور اس کے متعلقات دیکھنے کا موقع ملا تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ہمارے یہ بزرگ صورت حال کا کس قدر حقیقی ادراک رکھتے تھے، حالانکہ اقتدار کے گلیاروں میں انھیں چلت پھرت کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ مرحوم فخر الدین علی احمد کے حوالہ سے سُبھدرا جوشی نے، جو اس

وقت پرانی دلی سے کانگریس کی ایم پی تھیں، شاہ کمیشن کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ مرحوم صدر نے انھیں بتایا تھا: 'یہ لڑکا (بچے گاندھی) بد معاش ہے، پاگل ہے، اسے عام انسانوں کو، خاص طور پر مسلمانوں کو، تکلیف پہنچانے میں خوشی ہوتی ہے۔ ہم نے مسز گاندھی سے بھی اس کی شکایت کی۔ عجیب بات یہ ہے کہ جو شخص اس کی شکایت کرتا ہے یہ اسے گرفتار کروا دیتا ہے۔' مرحوم صدر نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ 'دہلی میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا انھیں بہت افسوس ہے، لیکن وہ کربھی کیا سکتے ہیں، ان کی کوئی نہیں سنتا اور بچے نے تو ان پر فرقہ پرست ہونے کی پھبتی بھی کسی ہے۔' میں نے سوچا جب ملک کے سب سے اونچے منصب پر متمکن مسلمان خود کو اتنا بے بس محسوس کرتا ہو تو عام مسلمانوں پر کیا گزرتی ہوگی جنھیں چوہا سمجھ کر نشانہ بنایا جا رہا ہو۔

اس سیاق میں مجھے امریکہ کا ایک سفر بے اختیار یاد آ رہا ہے۔ ۱۹۹۶ء کی بات ہے۔ دسمبر کے آخری ایام تھے۔ کرمس کی چھٹیوں کے سبب ہیتھر و ایئر پورٹ پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ بورڈنگ کے لیے جب میں ورجن اٹلانٹک کی لابی میں داخل ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مسافروں کی اغلب اکثریت سیاہ کوٹ پتلون اور ہیٹ میں ملبوس مذہبی یہودیوں کی ہے۔ پہلے تو ایک طرح کے لباس میں اتنے سارے یہودیوں کو دیکھ کر وحشت ہوئی، پھر خیال آیا سات گھنٹے کی اس طویل پرواز میں کیا پتہ اپنے ان ہم سفرؤں سے افہام و تفہیم کی کوئی گرہ ہی کھل جائے۔ قدرت کو بھی شاید کچھ یہی منظور تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں اخبارات و رسائل الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ میری نظر ایک مضمون پر اٹک گئی، عنوان تھا 'The Jews in Hitler's Military'۔ اب تک گوکہ میں نے اہل یہود کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا، لیکن میرے لیے یہ معلومات چونکانے والی تھی۔ مضمون نگار نے ایک محقق Bryar Rigg کے حوالے سے لکھا تھا کہ جنگ عظیم دوم میں جب جرمن فوجیوں کے ہاتھوں اہل یہود پر قیامت گزر رہی تھی، عین ان ہی ایام میں اہل یہود کے خانوادے سے بہت سے لوگ ہٹلر کی فوج میں باضابطہ اس جرم میں اپنے ہی ہم قوموں کے خلاف برسر پیکار تھے۔ بقول Rigg ہٹلر کی فوج میں ڈیڑھ لاکھ سے زائد ایسے افراد موجود تھے جن کے تانے بانے اہل یہود سے جاملتے تھے۔ ان میں دس جنرل اور دو فیلڈ مارشل بھی تھے جن کے پاس ایک لاکھ فوجیوں کی کمان تھی۔ ان میں سے کم از کم بیس لوگ ایسے تھے جنھیں اعلیٰ فوجی خدمات کے صلہ میں جرمنی کے سب سے اعلیٰ فوجی اعزاز نائٹس کراس (Knight's Cross) سے بھی نوازا گیا تھا۔ ان میں سے بیشتر (Mischlinge-Germans) مشلینگے جرمنس تھے، یعنی آدھے جرمن اور آدھے یہودی۔ Rigg نے کوئی بارہ سو سابق جرمن فوجیوں سے انٹرویو کی بنیاد پر، جن میں سے زیادہ تر کی عمریں اب ستر، اسی سال سے اوپر تھیں، یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ یہ لوگ زندگی کے بقیہ ایام شکستہ دلی اور احساس جرم کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ گزار

رہے تھے۔ برسہا برس گزر گئے، انہوں نے اپنے ضمیر پر پڑے ہوئے اس بوجھ کو کریدنے کی کوشش نہیں کی، کسی سے تذکرہ کرنا مناسب نہ جانا، اب جو رگ (Rigg) نے ان سے ان ایام کی بابت سوال کیا تو جانئے بس ان کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ بہت سے لوگ بے اختیار رو پڑے جیسے وہ مدت سے رونے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ ہٹلر کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ اس کی فوج میں یہود نژاد فوجی شامل ہیں اور بعض تو اہم عہدوں پر بھی تعینات ہیں، لیکن اسے تجربہ کار کمانڈروں کی ضرورت تھی خواہ وہ اہل یہود کے خانوادوں سے ہی کیوں نہ ملے۔ ایسے یہودی اس کے لیے بڑے کام کے تھے جو محض اپنی جان بچانے کے لیے یا چھوٹے سے مادی فائدے کے لیے اپنی قوم کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے لیے تیار ہوں۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان میں سے بیشتر فوجیوں کو ان مجرمانہ خدمات کے عوض بھی زندگی کی ضمانت نہ مل سکی۔ جب وقت آیا تو یہ بھی تعذیب گاہوں کو جانے والی ٹرینوں میں بٹھادیئے گئے۔ بعض لوگ تو فوجی یونیفارم اور اعزازی میڈل کے ساتھ گیس چیمبر میں داخل کیے گئے۔ ایک فوجی یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس کا نسلی تعلق اہل یہود سے نہیں ہے، ایک تعذیب گاہ میں قید اپنی ماں کے پاس جا پہنچا، اب ماں کا بھی جگر دیکھئے کہ اس نے اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے اپنے اوپر یہ تہمت قبول کر لی کہ اس کا یہ بیٹا اپنے یہودی باپ کے بجائے ایک جرمن کیتھولک کے نطفہ سے ہے۔ میں نے اخبار کو موڑ کر سامنے لگی میز پر رکھا اور سوچنے لگا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ اپنی ہی قوم، خاندان بلکہ گھر والوں کو موت کے منہ میں ڈھکیل کر کوئی شخص اپنی زندگی کا سودا کر سکتا ہے؟ اور ماں، یہ ماں کیا چیز ہوتی ہے جو اپنے بیٹے کی جاں بخشی کے لیے اپنی عصمت پر ایک تہمت گھڑنے کو بھی کچھ عار نہیں سمجھتی۔ لیکن تف تو اس بیٹے پر ہے جو صرف اپنی زندگی کی خاطر تعذیب گاہ میں بھی اپنی ماں کو ایک نئے ذہنی اور روحانی عذاب میں مبتلا کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے نوجوان یہودی مسافر کی طرف دیکھا جو اب تک بڑی خاموشی کے ساتھ میرے مطالعے کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ لندن کے جوش کالج سے وابستہ تھا اور غالباً اس اخباری مضمون میں میری سنجیدگی کو بھانپ چکا تھا۔ بولا، کیسا لگا آپ کو یہ مضمون؟ ہے نا عجیب، حیرت انگیز! Rigg سے میں ملا ہوں وہ میرے کالج بھی آئے تھے۔ بڑے پرجوش محقق ہیں، یورپ اور امریکہ میں نہ جانے کتنے معمر یہودیوں سے انٹرویو کرتے پھر رہے ہیں۔

تمہارا کیا خیال ہے، میں نے اس کا تاثر جاننے کی کوشش کی۔

بولا: رگ (Rigg) نے ہماری دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ ہم دوسروں کو کیا الزام دیں اگر ہمارے اندر سے انھیں آلہ کار نہیں ملتے تو چھ ملیں یہودیوں کو فنا کے گھاٹ اتارنا ان کے لیے ہرگز ممکن نہیں ہوتا۔ یہ کہتے ہوئے نوجوان نے میری طرف دیکھا، پھر انکشت شہادت سے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: ہالوکاسٹ کی جڑیں ہمارے اندرون میں موجود تھیں، دشمن تو انھیں بس باہر لانے کا محرک بنا۔

رگ (Rigg) نے جن واقعات کے بارے میں ذکر کیا ہے، کیا واقعی ان میں صداقت ہے؟ بولا: غیر متوقع کچھ بھی نہیں۔ یورپ میں تو ایک مدت سے یہودی اپنی شناخت پر پردہ ڈالنے کے عادی رہے ہیں۔ آج بھی بہت سے لوگ جو بظاہر عیسائی شناخت کے حامل نظر آتے ہیں، انہیں اندر سے کریدئے تو ان کی جڑیں اہل یہود کے خاندانوں سے جا ملیں گی۔ مگر اصل مسئلہ شناخت کی تبدیلی کا نہیں بلکہ ایسے لوگوں کی موجودگی کا ہے جو اپنے چھوٹے سے فائدے کے لیے اپنی قوم پر ذلت کا عذاب مسلط کرنے سے باز نہیں آتے، حالانکہ ملتا انھیں بھی کچھ نہیں ہے۔

اس طرح کے واقعات کو یہودی دانشور کس طرح دیکھتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

بولا: ایک بحث چل نکلی ہے، اپنے اندرون میں جھانکنے کی بحث۔ اچھی بات یہ ہے کہ جو لوگ پچاس سال سے جرم کا بوجھ لیے جیتے تھے ان کی زبانیں کھل گئی ہیں، وہ شرمندہ ہیں اور اپنے جرم کا برملا اقرار کر رہے ہیں۔ لوگوں میں یہ احساس بھی عام ہو رہا ہے کہ اپنی قوم سے بے وفائی کے صلہ میں اگر اپنی جان بچا بھی لی جائے تو وہ بچتی نہیں، یہ زخم ساری زندگی مسلسل رستار ہتا ہے۔

چائے ختم ہو چکی تھی۔ میں نے مضمون کا تراشہ بیگ میں رکھا، اپنی نشست کو بستر میں تبدیل کرنے کی کوشش کی اور اس خیال سے کہ سفر طویل ہے، نیند کی ایک چھپکی لے لی جائے، قدرے دراز ہو گیا۔ لیکن نیند کیا آتی اخبار کا مضمون اب بھی ذہن پر حاوی تھا، میں نے سوچا، رگ (Rigg) کی اس تحقیق نے اہل یہود کے فکر مند حلقوں میں ایک بے چینی کو جنم دیا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی روح پہ لگے زخم کو اپنے آنسوؤں سے دھونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے ایمر جنسی کا وہ منظر نامہ یاد آیا جب ترکمان گیٹ کے مسلمانوں پر قیامت صغریٰ ٹوٹ پڑی تھی۔ ہر طرف معصوم بچوں اور بے بس عورتوں کی آہ و بکا، پولیس کی گولیاں اور جبری انخلاء اور سب سے بڑھ کر ان کی نسل کشی کے لیے نس بندی کے پختہ انتظامات اور اس پورے تماشے میں ایک مسلمان صدر جمہوریہ کا چہرہ بار بار میری نگاہوں میں تازہ ہو جاتا۔ گو کہ وہ اس صورت حال سے خوش نہ تھے لیکن ایمر جنسی نافذ تو ان ہی کے دستخط سے ہوئی تھی۔ مجھے محمد یونس بھی یاد آئے جو اس وقت وزیر اعظم اندرا گاندھی کے خصوصی نمائندے کہے جاتے تھے جو ایک طرف اگر جگمگوہن کی پالیسی کے ناقد تھے تو دوسری طرف

ان کا کہنا تھا، جیسا کہ مسلم کلیئرنس (Slum Clearance, demolition etc) کے وقائع نگار نے لکھا ہے: 'ان کا جی چاہتا ہے کہ جو لوگ امام جامع مسجد کی حمایت کرتے ہیں انہیں اس علاقہ سے کھد پڑ کر نکال دیا جائے اور شہر کے باہر پھینک دیا جائے۔ مسز گاندھی بھی تو یہی چاہتی تھیں، جیسا کہ سرانچ پراچہ کے حوالہ سے وقائع نگار نے لکھا کہ جب تک جامع مسجد کے علاقہ سے مسلمانوں کی اکثریت تحلیل نہیں ہوتی یہ علاقہ مسلسل ان کے لیے دردِ بنار ہے گا۔ مجھے شہنواز خان بھی یاد آئے جو نہرو فیملی سے قربت کے سبب مختلف وزارتوں پر متمکن رہے اور جو ایمر جنسی کے دوران بھی اہم عہدوں پر فائز تھے۔ مظفر حسین برنی جنہوں نے وقف بورڈ کے چیئر مین کی حیثیت سے عبداللہ بخاری سے ٹکری تھی اور سب سے بڑھ کر مولانا اسعد مدنی، جنہیں ۱۹۶۸ء میں پہلی بار مسز گاندھی نے راجیہ سبھا کی رکنیت سے نوازا تھا۔ ایم ایف حسین بھی یاد آئے جو ایمر جنسی کے پر جوش حامیوں میں تھے جنہیں بعد میں ملک چھوڑنا پڑا اور شفیع محمد قریشی جو اس وقت نائب وزیر ریلوے تھے اور شیخ محمد عبداللہ جو چشم خود ترکمان گیٹ کی تباہی ملاحظہ کر آئے تھے۔ یہ سب کے سب اس وقت کیسا محسوس کرتے ہوں گے جب مسلمانوں کی آہ و فغاں سے پرانی دلی اور ملک کے دوسرے مسلم اکثریتی علاقے لرزہ بر اندام تھے۔ میری نگاہوں میں سنجے گاندھی کا وہ قافلہ بھی جاگ اٹھا جو انہدام کے دنوں میں مسلسل پرانی دلی کے چکر لگاتا رہا تھا۔ اس قافلہ میں ان کی مشیر خاص رخسانہ سلطانہ کی تصویر بھی ابھرنے لگی جنہوں نے پرانی دلی میں انہدام اور انس بندی کے لیے بنیادی خدمات انجام دی تھی، وہ مسلم عورتوں سے، ان دنوں کہتی پھرتی تھیں کہ پردہ ترک کرو، میری طرح رہو کہ آخر میں بھی تو مسلمان ہوں۔ جی ہاں وہی رخسانہ سلطانہ جن کی بیٹی امرتا سنگھ نے آگے چل کر فلمی دنیا میں بڑا نام کمایا۔ مجھے لطیف فاطمہ بھی یاد آئیں جو سنجے گاندھی کے قافلہ کا حصہ ہوتیں جو شہنواز خان کی منتہی بیٹی تھیں اور جن کے بیٹے شاہ رخ خان آج کل فلمی دنیا کے بادشاہ کہے جاتے ہیں۔ تو کیا کانگریس کی مسلم دشمن مہم میں اسے بھی مسلم جرنیلوں، رضا کاروں اور مسلم علماء کی معاونت حاصل تھی؟ آج جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ یہ لوگ کہاں گئے اور ان کا کیا بنا۔ محمد یونس تو یہ کہتے سنے گئے کہ ساری زندگی نہرو خاندان کی خدمت کے باوجود انہیں عزت کے دو بول نہ مل سکے، وہ اس احساس کے ساتھ دنیا سے گئے کہ 'نوکر، نوکر ہی ہوتا ہے'؛ ذاکر حسین سے لے کر فخر الدین علی احمد تک اور شہنواز خاں سے لے کر برنی، مدنی اور ان جیسے دسیوں خادمین پر کیا گزری، انہیں اپنے آنسوؤں سے روح پر لگے زخم کو دھونے کا موقع ملا بھی یا نہیں۔

## ترکمان گیٹ

ایک دن مکتبہ میں امام جامع مسجد عبداللہ بخاری کا ذکر چل نکلا۔ وہ ان دنوں اپنی ایکشن اپیل کے سبب شہ سرخیوں میں تھے۔ بڑے دنوں بعد مسلمانوں کا کوئی امام سیاسی منظر نامہ پر اپنا وزن محسوس کر رہا تھا۔ دہلی کی شاہجہانی مسجد سے شوکت اسلام کی جو یادیں وابستہ تھیں، ایسا لگتا تھا، کسی نے اس میں پھر سے جان ڈال دی ہو۔ غالباً بمبئی کے کسی جلسہ کی رپورٹ تھی جس میں عبداللہ بخاری نے ایمر جنسی کی زیادتیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ کانگریس کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے جتنا پارٹی کو اپنا ووٹ دیں۔ جگ جیون رام کے کانگریس چھوڑ دینے کے بعد عبداللہ بخاری کا اعلان جنگ کانگریس کے خلاف ایک بڑا اسٹریٹیجک وار سمجھا جا رہا تھا۔ شاہجہانی مسجد کے منبر سے اٹھنے والی اس علامتی اپیل نے مسلمانوں میں ایک غلغلہ کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

ایک صاحب کہنے لگے: اب کانگریس کی خیر نہیں۔ بمبئی کے ضیاء الدین بخاری، جو اب تک جمعیت العلماء اور کانگریس کے خیمے میں تھے، انھوں نے بھی جتنا پارٹی کے حق میں مہم شروع کر دی ہے اور عبداللہ بخاری کے کھل کر میدان میں آجانے سے وہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے جس کو کہتے ہیں نا، شیر آیا شیر آیا۔ واٹ نانسنس، خالم خول! خالم خول! آپ لوگ چیزوں کی حقیقت سمجھتے نہیں، فوراً جوش میں آجاتے ہیں، پروفیسر نے تنبیہا کہا۔ بولے: ابھی زیادہ دن نہیں گزرے جب شیر کشمیر شیخ عبداللہ کا بڑا چرچا تھا، لیکن اب کانگریس نے انھیں کچھ اس انداز سے اپنے دام میں لیا ہے کہ اب وہ میمنہ بن کر رہ گئے ہیں۔ آپ لوگ عبداللہ بخاری سے نہیں واقف، ابھی چند سال پہلے ہی کی تو بات ہے جب انھوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں بیانات دیئے تھے، ان کی اپیلیں ان کی تصویروں کے ساتھ مسلم علاقوں میں آویزاں کی جاتیں، تب وہ حکومت کے منظور نظر تھے، حکومت نے انھیں ماسکو بھیجا اور وہ خلیجی ممالک کے دورے پر بھی گئے۔ انھوں نے سوچا تھا کہ شاید اس طرح ان کی امامت کے عہدے پر وقف بورڈ کی طرف سے جو قضیہ چل رہا ہے اس کا حل نکل آئے، لیکن جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے اس موقف سے عوام میں ان کی ساکھ

گرتی جا رہی ہے تو انھوں نے اپنی اسٹریٹیجی تبدیل کر لی۔

اچھا! مجھے اس کا قطعی اندازہ نہ تھا، وہ صاحب اخبار بند کرتے ہوئے کسی قدر متحیر آنکھوں سے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ہاں آپ دو تین سال پہلے کے اخبارات دیکھ لیجئے، آپ کو خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں عبداللہ بخاری کی اپیلیں مل جائیں گی۔

پھر ان کے موقف میں یہ انقلابی تبدیلی کیسے آئی؟ انھوں نے پوچھا۔

بولے: دیکھئے ۱۹۷۳ء میں ان کے والد حامد بخاری صاحب نے عبداللہ بخاری کے حق میں امامت کا عہدہ خالی کر دیا جو اس وقت نائب امام تھے۔ وقف بورڈ کے ذمہ داروں کو اس طرز تقریر پر اعتراض تھا۔ وہ امام جامع مسجد کو وقف بورڈ کا ایک ملازم سمجھتے تھے اور انھیں ان کی یہ حیثیت یاد دلانا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقف بورڈ اور عبداللہ بخاری کے مابین ایک کشمکش کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ادھر خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت کے سبب ان کی عوامی مقبولیت میں بھی مسلسل کمی آرہی تھی، لوگ انھیں سرکاری امام کہتے اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے کتراتے۔ تب عبداللہ بخاری نے اپنے موقف میں بنیادی تبدیلی پیدا کی۔ ان ہی دنوں اجمیر کے زائرین پر حملہ ہوا تھا اور صدر بازار میں مسلمانوں پر زیادتی کے واقعات پیش آئے تھے۔ عبداللہ بخاری نے مسلمانوں پر ہونے والی ان زیادتیوں کو اپنے خطبوں کا موضوع بنایا اور دیکھتے دیکھتے جامع مسجد میں مصلیوں کی بھیڑ اٹھ آئی جو ذوق و شوق سے امام کا خطبہ سننے کے لیے کھینچے چلے آئے تھے۔

چلئے وہ صحیح راستے پر لوٹ تو آئے، اب دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ اچھا پھر یہ امامت کا مسئلہ کیسے حل ہوا، انھوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

بولے: پھر ہوا یہ کہ ایک دن وقف بورڈ کی ایک اہم میٹنگ مرکزی وزیر شہنواز خان کی صدارت میں ’بچوں کے گھر‘ میں منعقد ہو رہی تھی۔ امام کو جیسے ہی خبر ملی، انھوں نے اپنے حامیوں کو ساتھ لیا اور میٹنگ کو بھنگ کرنے کے لیے جانپنچے۔ ہلڑکی کیفیت پیدا ہو گئی۔ امام اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ادھر جامع مسجد کے علاقہ میں کسی نے یہ افواہ اڑادی کہ امام کو گولی مار دی گئی ہے۔ بس کیا تھا لوگ غم و غصہ میں سڑکوں پر اتر آئے۔ پولیس سے ٹکراؤ ہوا، سات آٹھ لوگ مارے گئے، علاقے میں کئی دنوں تک کرفیو لگا رہا۔ کوئی دو ہفتے بعد امام کو رہا کیا گیا اور ثاشی کے لیے نائب وزیر ریل شفیق قریشی کو بیچ میں ڈالا گیا، تب جا کر امامت کا قضیہ حل ہوا۔

اچھا! مجھے ان باتوں کی خبر نہ تھی، مگر ایک بات تو پھر بھی ماننی پڑے گی کہ عبداللہ بخاری نے حکومت کی خوشامد کے بجائے عوامی طاقت کے بل بوتے پر اپنا مسئلہ حل کیا، انھوں نے اپنی قوت کے سرچشمہ کو پہچانا،

جس جی تو وہ آج اس پوزیشن میں ہیں کہ ایک مستحکم حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے بلا خوف لومۃ لائم میدان میں آنکے ہیں۔

بالکل مجھے اس بات سے اختلاف نہیں کہ وہ آج پہلے کے مقابلہ میں زیادہ مستحکم بنیادوں پر کھڑے ہیں، مجھے تو اس دن سے خوف آتا ہے کہ وہ کسی مرحلہ میں کانگریس کے دام تزیور میں نہ آجائیں جو پہلے بھی اپنی ترکیبوں سے بڑے بڑے شیروں کو میمنہ بنا چکی ہے۔

افسوس کہ پروفیسر کا یہ اندیشہ ۱۹۸۰ء کے الیکشن میں درست ثابت ہوا جب عبداللہ بخاری نے کانگریس کی حمایت میں اپیل جاری کر دی۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ان کی باتوں میں گھن گرج تو باقی رہی لیکن اخلاقی اور روحانی وزن سے خالی، حالانکہ سیاسی طور پر تو وہ وی پی سنگھ کے زمانہ تک موثر رہے، لیکن شاہجہانی امام کی عظمت و جلالت کا جو طلسم ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں قائم ہوا تھا، یہ صورت حال پھر قائم نہ ہو سکی۔

الیکشن میں مسز گاندھی کو شکست فاش ہوئی، ایمر جنسی کا خاتمہ ہوا اور ملک میں ایک نئی سیاسی تبدیلی کی ہوا چلنے لگی۔ نئی حکومت نے شاہ کمیشن کے قیام کا اعلان کیا جسے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ ایمر جنسی کے دوران ہونے والی زیادتیوں کی جانچ اور اس کے ممکنہ ازالے کی کوشش کرے۔ تحقیقاتی کمیشن تو پہلے بھی بٹھائے جاتے تھے لیکن بالعموم ان کا مقصد مسائل کو ٹالنا یا کم از کم ان کو وقت کی دیز گرد میں دفن کرنا ہوتا تھا۔ اس دفعہ شاہ کمیشن نے ازالہ کی بات کی تھی اور متاثرین کو دعوت دی تھی کہ وہ اپنے نقصانات کی تلافی کے لیے ہر جانہ طلب کریں۔ بعض لوگ ایمر جنسی کے خاتمہ اور جنتا پارٹی کی کامیابی کو ایک نئی آزادی سے تعبیر کر رہے تھے۔ بعض لوگوں کو یہ بھی امید تھی کہ جس طرح ۱۹۴۷ء کے مجاہدین آزادی کو حکومت مراعات سے نوازتی ہے۔ شاید اسی نہج پر ایمر جنسی کے دوران قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والوں کے لیے بھی کوئی نئی اسکیم بنائی جائے گی۔ گویا نئی حکومت سے بہت سے انقلابی اقدامات کی توقع تھی۔ اس پس منظر میں شاہ کمیشن کی یہ دعوت کہ لوگ تلافی مافات کے لیے اپنے اپنے خساروں کا تخمینہ جلد از جلد کمیشن کے دفتر کو ارسال کریں، ایک امید افزا بات معلوم ہوتی تھی۔

بھائی جان نے نقصانات کا تخمینہ لگانا شروع کیا۔ سرکاری مقفلی کے دوران مکتبہ پوری طرح تباہ ہو چکا تھی، حتیٰ کہ عمارت کی بیرونی دیواریں بھی سیلاب کی نذر ہو گئی تھیں، گویا ایک چلتے پھرتے مرفہ الحال کاروبار کی ازسرنو ترتیب و تنظیم کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ کیا عجب کہ شاہ کمیشن سے ہمیں انصاف مل جائے۔ ابا کو جب کمیشن کے قیام اور اس کے مقاصد کا علم ہوا تو انھوں نے حیرت سے تفصیلات سنیں، فارم کو اولٹ

پلٹ کر دیکھا، زیر لب مسکرائے، بولے: ان باتوں سے کچھ ہونے کو نہیں۔ جب ہم لوگوں نے بتایا کہ حکومت تو ایمر جنسی کے اسیران کے لیے مجاہدین آزادی کے طرز پر ماہانہ الاؤنس کی بات بھی کر رہی ہے تو کہنے لگے کہ دوسری آزادی سے ہم کیا توقع رکھیں، ہم مسلمان تو پہلی آزادی کے ثمرات کو نہیں جھیل پارہے ہیں، ان سے انصاف کی توقع عبث ہے۔ وہ تو چلے کہ ایمر جنسی کے ظالمانہ شب و روز سے نجات ملی، یہی اس کا اصل ثمرہ ہے، یہ مختلف الخیال لوگوں کی حکومت ہے، دیکھئے کب تک چل پاتی ہے۔ بہت کچھ رڈ وکد کے بعد انھوں نے بھائی جان کو شاہ کمیشن میں ہر جانے کے کاغذات داخل کرنے کی اجازت تو دے دی لیکن اس طرح کہ ان کی گفتگو سے ہماری خوش کن توقعات کا محل پہلے ہی زمیں بوس ہو گیا۔ ایک دن کہنے لگے کہ کمیشن تو ویسے بھی سیاسی مقاصد کے تحت بنائے جاتے ہیں، یہ نقصانات کی تلافی کیا کریں گے، مال و دولت، گھر زمین کے نقصانات کا اندراج تو ہو سکتا ہے اور مالی نقصانات کا تخمینہ بھی لگایا جاسکتا ہے، لیکن دلوں پر جو زخم لگے ہیں اور روہیں جس طرح مجروح ہوئی ہیں، ان کی تلافی بھلا کون کر سکتا ہے اور بعض نفسیاتی زخم تو ایسے ہیں جن کے مندل ہونے میں برسوں لگ جائیں یا شاید کبھی مندل نہ ہوں۔ اس وقت بھی ابا کی باتوں میں صداقت لگتی تھی، یہ تو لگتا تھا کہ ہمارے ساتھ کچھ گڑ بڑ ہوا ہے، ہمارے اندرون میں کوئی چیز مجروح ہوئی ہے لیکن یہ سب ہے کیا اس کا اندازہ بہت سالوں بعد ہو سکا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ملک میں جشن آزادی کی پچاسویں سالگرہ منائی جا رہی تھی، مجھے پرانی دلی کے ایک گنجان مسلم علاقہ میں ایک سماجی تقریب میں حاضری کا موقع ملا۔ تقریب تو ولیمہ کی تھی لیکن اس موقع پر چند دردمند اور متحرک نوجوان جو مجھ سے تعلق خاطر رکھتے تھے، جمع ہو گئے تھے۔ ایک نوجوان، جس کی عمر تیس بتیس سال کی ہوگی میرے پاس آئے، کہنے لگے کہ مجھے بھی پرانی دلی کا ہی سمجھئے، میرا نام ناصر ہے، ویسے رہتا تو مایاپوری میں ہوں لیکن میرا بچپن ترکمان گیٹ کی گلیوں میں گزرا ہے۔ ترکمان گیٹ کا نام سن کر میں چونکا۔ میں نے پوچھا ایمر جنسی کے ایام میں آپ کہاں تھے؟

بولے: اس وقت میری عمر یہی کوئی دس بارہ سال کی رہی ہوگی، میں نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا ہے، میں اسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ آج بھی جب مجھے کوئی بلڈوزر کہیں دکھائی دے جاتا ہے تو مجھ پر ایک وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ میرے وجود کو اپنے آہنی شکنجوں سے دبوچ لے گا۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس بلڈوزر کا ایمر جنسی کے بلڈوزروں سے کوئی تعلق نہیں لیکن میرے لاشعور میں نہ جانے کیوں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ بلڈوزر مسلم مخالف ہوتے ہیں، ان کی ایجاد ہی دراصل مسلمانوں کو اجاڑنے کے لیے ہوئی ہے۔ میں لاکھ عقلی تجزیہ کرتا ہوں مگر بلڈوزر کے خوف سے پیچھا نہیں چھوٹتا۔

میں نے دیکھا یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، وہ ایک لمحہ کے لیے رکے، پھر بولے، کیا بتاؤں ان بلڈوزروں نے میرے ایک خالہ زاد بھائی کی جان لی ہے، قاتل ہیں یہ قاتل۔

میں لمحہ بھر کچھ سمجھ نہ سکا کہ اچھا خاصا پڑھا لکھا، خوش خلق نوجوان، جو پیشے سے سو فٹ ویز انجینئر ہے اور جس کے ہونٹوں پر ابھی مسکراہٹ کھیلتی تھی، اچانک تشنج کی کیفیت میں کیسے چلا گیا۔ پھر خیال آیا کہ ڈپریشن کے مریضوں کے ساتھ یہی تو ہوتا ہے، ان کے مجروح اندرون کب پرانے محور پر لوٹ جائیں، انھیں خود اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ میں نے انھیں اس صورت حال سے نکالنے کے لیے باتوں کا رخ موڑنے کی کوشش کی، لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔ کہنے لگے آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ ہم ترکمان گیٹ والے جو اب مایا پوری، نندگمری، ترلوک پوری اور شہر کے دوسرے مضافات میں رہتے ہیں۔ ہم اب تک ترکمان گیٹ کے سانچے سے نہیں نکل پائے ہیں، کیسے بھولیں گے آپ اس منظر کو وہ تو آنکھوں میں ایسا بسا ہے کہ اب نکلتا نہیں۔ پرانی دہلی میں ہماری رشتے داریاں ہیں، ہم جب بھی اس علاقے میں آتے ہیں ہمارا احساس محرومی دوچند ہو جاتا ہے۔ پھر ہمارے بچے ان واقعات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں، ہم کس گلی میں رہتے تھے، ہماری دکان کہاں تھی، کاروبار کہاں تھا، پڑوسی کون تھا، وہ اب کہاں رہتا ہے، اس پر کیا گزری؟ گویا تعذیب گاہ کی پوری تفصیل تمام جزویات کے ساتھ اگلی نسل کے دل و دماغ میں جا بیٹھی ہے، ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ باتیں بچوں کو بتائی جانی چاہئیں یا نہیں، لیکن حقیقت کو چھپایا بھی تو نہیں جاسکتا۔ پھر بولے میری ایک چچا زاد بہن ہے، پی ایچ ڈی ہے، ماشاء اللہ بڑی باصلاحیت ہے، سماجی کاموں میں متحرک رہتی ہے، شادی پر آمادہ نہیں ہوتی تھی، خاندان والے پریشان تھے، جب گھر والوں نے بہت گھیرا تو رونے لگی، لوگ سمجھے کہ شاید عشق و عاشقی کا کوئی مسئلہ ہو، یونیورسٹی میں پڑھی ہے، شاید کسی ناکام محبت کا زخم دل پر لگا ہو، لیکن شادی سے کترانے کی اس نے جو وجہ بتائی اسے سن کر تو ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ پتہ چلا کہ اسے بھی ترکمان گیٹ کا زخم لگا ہے۔ کہتی ہے میں جب بھی شادی کا سوچتی ہوں اور مجھے بچوں سے بہت پیار ہے تو میری نگاہوں میں میری سہیلی ندا کا چہرہ گھوم جاتا ہے، یہی کوئی نو دس سال کی عمر رہی ہوگی جب نس بندی کی تلاشی کے دوران پولیس والے اس کے گھر میں گھس آئے، اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور وہ دس سال کی معصوم بچی جان سے ہار گئی۔ میں جب بھی شادی کا سوچتی ہوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ندا جیسی پیاری بچی سے نوازے گا، کتنی شوخ اور چنچل تھی وہ اور مجھ سے تو ٹوٹ کر پیار کرتی تھی، لیکن نابابا نا، ندا کے لیے یہ دنیا خطرات سے پُر ہے، ہر طرف وحشی درندے دندنارہے ہیں، میرا دل کانپ جاتا ہے۔ بس وہ اسی طرح کی باتیں کرنے لگتی ہے، یہ کہتے ہوئے ناصر پھر آبدیدہ ہو گئے، بولے: لوگوں کو کیا پتہ کہ ہمارے دلوں

پر کیا گزرتی ہے، ہمارے اندرون میں کون سا محشر بپا ہے، بظاہر ہم چلتے پھرتے، ہنستے مسکراتے اپنے اپنے کاموں میں مگن دکھائی دیتے ہیں، لیکن انھیں کیا معلوم کہ ہمارے دل اندر سے کتنے مجروح ہیں۔

آج جب میں یہ سطر لکھ رہا ہوں، میری نگاہوں میں خالہ پور کے چند سن رسیدہ چہرے پھر سے جاگ اٹھے ہیں، جن کی زخمی روئیں آج بھی انھیں کسی کل چین نہیں لینے دیتیں۔ مجھے انڈین ایکسپریس میں شائع ہونے والی شریف کونین کی وہ رپورٹ یاد آ رہی ہے جو ان متاثرین کے انٹرویو پر مشتمل ایمر جنسی کے چالیس سال بعد شائع ہوئی تھی۔ شبیرن جس کی عمر اس وقت ستر سال سے متجاوز تھی، اس نے اپنا درد کچھ اس طرح سنایا تھا:

’میں نے اپنے اٹھارہ سالہ نوجوان بیٹے کو شکر لانے کے لیے بھیجا تھا، جب اسے دیر ہوئی تو میں نے چھوٹے بیٹے سلام الدین کو بھیجا کہ پتہ لگائے کہ وہ کہاں رہ گیا، کچھ ہی دیر بعد سلام الدین روتا پیٹتا گھر واپس آیا۔ بولا: ’بھیا کونھوں نے مار دیا، امی!‘۔ شبیرن کہتی ہے کہ میں سڑک کی طرف بھاگی جہاں نظام الدین خون میں لتھڑا پڑا تھا، اس کے سینے سے بری طرح خون بہہ رہا تھا، اس نے آنکھیں کھولیں لیکن کچھ بول نہ سکا۔ میں نے کہا، بیٹا کیوں سو رہا ہے گھر چل۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، لیکن پھر چند ہی لمحے بعد اس کی گردن ڈھلک گئی، پولیس والے اس کی لاش لے کر چلے گئے۔ میں بہت چیخی چلائی مگر کسی نے میری ایک نہ سنی، جب دو گھنٹہ بعد میرے شوہر آئے اور انھوں نے بیٹے کا خون اس طرح سڑک پر بہتا دیکھا تو وہ اسے دھونے لگے اور پھر وہ گھنٹوں خون کا داغ ہی دھوتے رہے، وہ قبرستان سے جب واپس آئے تو انھیں چپ سی لگ گئی۔ اس حادثہ کے بعد وہ نہ رہے، جو تھے، کچھ دنوں بعد ان کا ایک سڑک حادثہ میں انتقال ہو گیا۔ شبیرن نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ تم پوچھتے ہو کہ مجھے اپنا بیٹا اب بھی یاد آتا ہے تو سنو، میں اسے ہر روز یاد کرتی ہوں، ایسا لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہا ہو، مجھے کیوں مارا؟ امی۔ کیا کسی کے پاس اس سوال کا جواب ہے؟

انہتر سالہ محمد عمر کی یادوں میں رمضان کا وہ دن آج بھی تازہ ہے جب وہ اپنا کچوری اسٹال لگانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ میں دودھ لے کر واپس گھر آ رہا تھا کہ پولیس کی گولی میرے بازو میں آگئی، انھوں نے مجھے جانوروں کی طرح ہاسپٹل میں ڈال دیا، وہ میرا ہاتھ کاٹنا چاہتے تھے۔

خواجہ مجیب، جن کی عمر تیرانوے سال کی ہو گئی تھی، ویسے تو نسیان کا شکار رہتے ہیں لیکن

ان سے جب خالہ پور کے واقعات کا تذکرہ کیجئے تو وہ اپنے بیٹے کی شہادت کی تمام جزئیات کا بڑی تفصیل کے ساتھ نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ سلیم ان کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جسے پولیس نے نس بندی کے لیے بس اسٹینڈ سے اٹھایا، انھیں ایک دن تک اپنے بیٹے کی موت کا پتہ نہ چل سکا۔ بولے: جب وہ ایک دن تک نہیں ملا تو ہم نے سوچا کہ کہیں زندہ چھپا بیٹھا ہوگا، لیکن جب ہم نے قبرستان کا چکر لگایا تو پتہ چلا کہ اس کی لاش تو شہداء کے ساتھ رکھی ہے۔

ساٹھ سالہ حسینہ بیگم کا غم ایک الگ دلخراش داستان سناتا ہے۔ ایک چھوٹی سی تاریک کٹیا میں ایک سلائی مشین ان کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ کہتی ہیں کہ اپنے شوہر کی شہادت کے بعد وہ اپنے تین بچوں کی پرورش کے لیے اس مشین کے سہارے زندہ ہیں۔ جس وقت وہ شہید ہوئے ان کی عمر تیس سال تھی، جب لاش گھر لائی گئی تو ہم نے دیکھا کہ ان کے چہرے میں سوراخ تھا، گولی ان کے جڑے سے داخل ہو کر گردن سے نکل گئی تھی، شوہر کی موت کے بعد کچھ دنوں تک تو میں نے چار پائی بننے کا کام کیا، پھر سلائی بنائی کے کام میں لگی، مجھے اپنے تین بچوں کی پرورش کرنی تھی، میرے شوہر جب زندہ تھے وہ بچوں کو خود اسکول چھوڑ کر آتے تھے، اب میرا ایک بیٹا بڑھی ہے، حکومت نے میرے بچوں سے تعلیم چھین لی، میں چاہتی ہوں کہ اب وہ اپنے بچوں کی تعلیم کا خیال رکھے۔

شاہ کمیشن نے انصاف کی جو امید جگائی تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ اس سے پہلے کہ کمیشن حتمی اقدام کی طرف بڑھتا، جنتا پارٹی کی حکومت کو زوال آ گیا۔ کہتے ہیں کہ بے پرکاش نارائن کو بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ قیام انصاف کی لڑائی کے لیے انھوں نے جن لوگوں پر انحصار کیا تھا وہ اس عظیم کام کے اہل نہ تھے۔ مرارجی خود کانگریس کلچر کے پروردہ تھے، ان کا واحد ہدف وزارتِ عظمیٰ کا حصول تھا جو اس سے پہلے دو بار ان کے ہاتھ بس آتے آتے رہ گیا تھا۔ ایک بار لال بہادر شاستری ان کی راہ میں آگئے تھے اور دوسری بار اندرا گاندھی کے سیاسی داؤ پیچ کے آگے ان کی ایک نہ چلی تھی۔ بے پرکاش اس صورت حال پر کبیدہ خاطر تھے۔ ان کی صحت جواب دے چکی تھی۔ بمبئی کے جسلوک اسپتال میں جہاں وہ زیر علاج تھے، انھوں نے ایک بار صاف لفظوں میں یہ بات کہی تھی کہ اگر میری صحت بہتر ہوتی تو میں انھیں پریشان کر دیتا۔

بے پرکاش بذاتِ خود صاف ذہن، بے لوث اور وسیع القلب آدمی تھے، لیکن اندرا کو اکھاڑ پھینکنے میں شاید نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے یہ غلطی ہو گئی کہ انھوں نے جن سنگھ کو اپنی مزاحمتی تحریک میں جگہ دے دی، جس سے حاشیہ پر پڑی ہوئی ایک فرقہ پرست تحریک کے لیے قومی دھارے میں شامل ہونے کی راہ نکل

آئی۔ ایمر جنسی کے دوران آرائس ایس نے مسز گاندھی سے بھی رابطہ بنانے کی کوشش کی۔ بالا صاحب دیورس نے انھیں خطوط لکھے جس میں کانگریس کے بعض پروگرام کی تحسین کی، مفاہمت کا عندیہ دیا اور اٹل بہاری واجپئی تو ایمر جنسی کے بیشتر اوقات پیرول پریل سے باہر ہی رہے۔ لیکن بچے پر کاش کرتے بھی کیا۔ ان کی صحت اس بات کی متحمل نہ تھی اور نہ ہی ان کی درویشی اس بات کی اجازت دیتی تھی کہ وہ خود اس مہم کی کمان سنبھالیں۔

ایمر جنسی کے بطن سے ایک امید افزا تجربہ ہندو مسلم تعلقات کے سلسلے میں سامنے آیا۔ بہت سے ہندوؤں، خاص طور پر آرائس ایس والوں کے لیے جماعت اسلامی کے لوگوں کے ساتھ رہنے کا تجربہ بڑا چشم کشا ثابت ہوا۔ اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں، آپس میں احترام و محبت کی فضا پیدا ہو گئی۔ بعض لوگ تو اپنی شخصی حیثیت میں جماعت والوں کے معتقد بھی بن گئے۔ یہ ایک بڑی خوش کن پیش رفت تھی۔ ابتداءً جماعت کے حلقے میں اس رابطے کو مزید بڑھانے اور اس تجربے کو غیر مسلموں میں عمومی دعوت کے لیے استعمال کرنے کے سلسلے میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اس طرح ایک اہم اور نادر موقع ہاتھوں سے نکل گیا۔ شاہ کمیشن بھی اگر کوئی قابل ذکر پیش قدمی کے بغیر مرجھا گیا تو اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ خود کمیشن کے قائم کرنے والوں کا ذہن اس کے اہداف کے سلسلے میں صاف نہ تھا۔ شروع سے یہ بات کہی گئی کہ کمیشن ایمر جنسی میں ہونے والی زیادتیوں کی جانچ کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اب جو لوگ مسلمانوں کی منظم نسل کشی کو محض زیادتی سے تعبیر کرتے ہوں، ان سے انصاف کی کیا توقع کی جاسکتی تھی؟ بالآخر تین حصوں میں کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی، لیکن وہ بھی غیر سرکاری طور پر۔ ورنہ نئی حکومت نے اس بات کی پوری کوشش کی تھی کہ رپورٹ کا قصہ ہی تمام کر دیا جائے۔ رپورٹ کا ایک حصہ ترکمان گیٹ کے مظالم سے متعلق تھا۔ سابقہ تحقیقاتی رپورٹوں کی طرح آج بھی یہ رپورٹ مسلمانوں کے خلاف ہونے والے ریاستی جرائم سے پردہ اٹھا رہی ہے، لیکن کوئی نہیں جو ان مظلومین کی دادی کر سکے جو مروایام کے سبب یا تو زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے ہیں۔ اور بہت سے تو انصاف کی امید لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ البتہ پولیس کے رویے اور ریاستی جبر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ جب مجرمین اسی طرح دندناتے پھر رہے ہوں تو مسلمانوں کو غیر شعوری طور پر ایسا لگتا ہے کہ ان کے ارد گرد آج بھی ہر طرف ایک ترکمان گیٹ پاپا ہے۔ آپ اسی وقت تک محفوظ ہیں جب تک پولیس کی گولی آپ کے قریب سے مگر آپ کو مس کیے بغیر گزری ہو۔

## ایک عظیم الشان اجلاس

جتنا حکومت کے قیام سے سیاسی افق پر کوئی بنیادی تبدیلی تو واقع نہ ہوئی البتہ قید و بند کے نفسیاتی حصار کے ٹوٹنے کا ایک خوشگوار احساس ضرور عام ہوا۔ ملک میں جلسے جلوس، گفت و شنید اور بحث و مباحثے کی سرگرمیاں پھر سے چل نکلیں۔ خیال ہوا کیوں نہ باقاعدہ کسی عوامی جلسے کا انعقاد کیا جائے۔ اس دوران اسکول کے احباب پر مشتمل ایمر جنسی کی مزاحمت کے لیے جو گروپ بنایا گیا تھا وہ بھی اپنی طبعی عمر پوری کر چکا تھا، لہذا کچھ پرانے اور نئے دوستوں پر مشتمل ایک گروہ ادبیات اسلامی کی ملک گیر تحریک کو منظم کرنے کے لیے وجود میں لے آیا گیا۔ تھوڑی سی محنت سے ایک نئی تنظیم کا ڈھانچہ کھڑا ہو گیا۔ کسی عوامی جلسے کے لیے بہت بڑے انتظام کی ضرورت نہ تھی۔ اسٹیج کے لیے ایک بڑا بینر جس پر جلسہ کا عظیم الشان ہونا لکھا ہو اور کچھ ایسے الفاظ جس سے اس کی نوعیت مقامی کے بجائے کم از کم ملک گیر قرار پاتی ہو۔ سفید چادریں جس سے اسٹیج کی میزیں ڈھک سکیں تو یہ گھر میں دستیاب تھیں۔ ایک مائیک اور ایک فوٹو گرافر جو جلسہ کی یادگار تصاویر کو محفوظ کر سکے۔ مسلم اسکول کی جغرافیائی اہمیت کے سبب جلسہ گاہ کے لیے اس کے وسیع میدان کا انتخاب کیا گیا اور شاید اس لیے بھی کہ ہمارے بعض رفقاء ابھی سال ڈیڑھ سال پہلے ہی اس اسکول سے فارغ ہوئے تھے۔ جلسہ مغرب کے بعد ہونا طے پایا تھا۔ صبح سے دونوں جوانوں کو رکشہ میں بٹھا کر لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کے لیے شہر میں روانہ کر دیا گیا۔ ایک صاحب کہیں سے قنات لے آئے تاکہ اسٹیج کی تزئین کاری میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ لیجئے دیکھتے دیکھتے ادبیات اسلامی کے قومی اجلاس کا منظر نامہ تیار ہو گیا۔ دن بھر مختلف قسم کے انتظام و انصرام کے ساتھ ساتھ اس ادھیڑ بُن میں رہا کہ خطبہ استقبالیہ میں کن باتوں کا تذکرہ کیا جائے۔ اب تک اکابرین کے جو استقبالیہ خطبے پڑھے تھے، اس کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ اپنی کم مائیگی اور بے سروسامانی کو حاصلات کے طور پر پیش کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ دنیا کے بڑے بڑے انقلابات ہم جیسے تہی دستوں کے ہاتھوں ہی برپا ہوتے آئے ہیں۔ کبھی خیال آتا کہ یہ تو خالص روایتی طریقہ ہے، پھر ہمارے اس اجلاس کی خاص بات کیا ہوئی۔ رکشہ پر جو احباب اعلان کے لیے نکلے تھے انہیں بھی صبح یہ مسئلہ درپیش تھا کہ قابل ذکر

مقررین میں کس کے نام کا اعلان کریں کہ خلقت اب تک کسی پیران پیر، دامت برکاتہم، شاعر باکمال یا قائد بے مثال کے نام پر جمع ہوتی آئی تھی۔

ہم لوگ جب جلسہ گاہ میں پہنچے تو وہاں بڑی بے سروسامانی کا عالم تھا۔ اسکول والوں نے بنیادی انتظامات سے بھی پہلو تہی کی تھی، لیکن جلد ہی صورت حال پر قابو پالیا گیا۔ دیکھتے دیکھتے اسٹیج بھی سج گیا اور سامعین کے لیے سبزہ زار پر بچوں کی صفیں آویزاں ہو گئیں۔ وقت مقررہ پر سامعین کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ سامعین میں موجود سید شاہ اسد اللہ مرحوم اپنی شرعی وضع قطع اور بارعب نورانی حلیے کے سبب صدارت کے مستحق قرار پائے۔ نظامت کے لیے برادر اعجاز کا انتخاب عمل میں آیا، جنھیں ہم نوجوانوں میں مرصع گفتگو کا خاص سلیقہ تھا اور جو آگے چل کر جامعہ ملیہ میں سوشل سائنسز کے ڈین بھی ہوئے۔ چند دنوں بعد اخبارات میں اس اجلاس عام کی بڑی بڑی رپورٹیں شائع ہوئیں۔ دہلی کے بعض ہفت روزہ اخبارات نے تصاویر بھی چھاپیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اجلاس کا ہر مقرر ان رپورٹوں کے مطابق یا تو دانشور تھا یا ادیب یا کم از کم اسے مفکر اسلام کی حیثیت تو ضرور حاصل تھی۔ اخبارات کے علاوہ اس اجلاس کی تفصیلی رپورٹ مسلم قائدین اور تنظیموں کو بھی ارسال کی گئی تھی۔ ’سنگم‘ نے اپنی ایک رپورٹ میں مجھے اردو کا مشہور ادیب قرار دیا تھا اور لطف تو یہ ہے کہ غالباً اس رپورٹ سے متاثر ہو کر علی میاں صاحب نے ایک دعوت نامہ بھی ارسال کر دیا تھا جو ان دنوں ندوہ میں اسلامی ادب پر کوئی پروگرام منعقد کر رہے تھے، جس کے بطن سے آگے چل کر ایک بڑی ادبی تحریک کا ظہور ہوا۔ لوگ حیران تھے کہ میں اچانک راتوں رات اردو کا مشہور ادیب کیسے بن گیا۔ گو کہ اس دوران اخبارات و رسائل میں میرے مضامین شائع ہوتے رہے تھے، لیکن یہ چند مضامین مشہور ادیب جیسے لاحقہ کی کفایت تو ہرگز نہ کرتے تھے۔ مولانا آزاد کے بارے میں یہ بات کہیں پڑھی تھی کہ جب وہ چھوٹے تھے تو کسی بکس پر کھڑے ہو جاتے اور اپنے ہم عمر بچے بچیوں کو یہ باور کراتے کہ وہ دلی کے بڑے مولانا کی حیثیت سے اسٹیج پر کھڑے ہیں اور یہاں لاکھوں کا مجمع ہے۔ جب بچے کہتے کہ یہاں تو کوئی نہیں، بس ہم دو چار لوگ ہیں تو کہتے کہ کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ لوگوں کے آگے پیچھے جو القاب لگے ہوتے ہیں وہ کوئی انھیں دیتا نہیں بلکہ خود لگانا پڑتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد نے خود کو امام الہند کے لقب سے متعارف کرایا اور پھر امام الہند کہلانے لگے۔ اب جو مشہور ادیب والا فارمولہ اپنایا تو تیرٹھیک نشانہ پر جا لگا۔ طالب علم سے ایک مشہور ادیب اور مفکر بننے کا یہ سفر اتنا مختصر ہو سکتا ہے، یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اب جب بھی کسی شخص کو پیر طریقت، قاضی شریعت، فقیہ امت اور امیر شریعت جیسے القاب سے ملقب دیکھتا تو مرعوب ہونے کے بجائے بس یہ سمجھتا کہ میری طرح ان حضرات نے بھی محض بچپن کے شوق

میں ان القاب کو اختیار کر رکھا ہے۔

مشہور ادیب اور مفکر بن جانے کی شہرت جب شہر کے مختلف حلقوں میں پہنچی تو ایک دن طلباء کی ایک انجمن کے دو ذمہ داران مجھ سے ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے مجھے اپنے ہفت روزہ جلسہ میں شرکت کی دعوت دی۔ جلسہ میں قرآن و سنت کے دروس اور غلبہ دین کے موضوع پر تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ ایک دن گفتگو کا قریعہ میرے نام نکل آیا۔ ان دنوں ایرانی انقلاب کا ہر طرف چرچا تھا۔ دینی حلقوں میں جہاں اس انقلاب نے ایک طرف جوش و خروش کو جنم دیا تھا وہیں طبقہ علماء کی طرف سے شیعہ سنی کی اختلافی بحثیں بھی اٹھائی جا رہی تھیں۔ بہت سے لوگ جیس جیس میں تھے۔ میں نے سوچا کیوں نہ انقلاب ایران کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا جائے۔ میری نگاہوں میں تہران میں خمینی کی واپسی اور ان کے والہانہ استقبال کا وہ منظر اب بھی تازہ تھا، جہاں لاکھوں لوگ ان کی ایک جنبش ابرو پر انقلاب کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے آمادہ دکھائی دیتے تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ انقلاب کے سلسلے میں معاندین اور مخالفین کا پروپیگنڈہ اتنا سخت تھا کہ اصل صورت حال کا پتہ لگانا مشکل ہو گیا تھا۔ اردو اخبارات کی بے خبری کا یہ حال تھا کہ وہ بنی صدر کی تصویر کے نیچے آیت اللہ خمینی کا نام لکھ دیتے۔ کبھی انقلابیوں کے مظالم کی خبریں آتیں اور کبھی شیعہ سنی کی اعتقادی بحثوں میں قاری کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ حق واقعی کس کے ساتھ ہے۔ ایرانی سفارت خانے سے چند ایک بار کچھ لفلیٹ ملتبہ میں ضرور آئے، مگر ان کی حیثیت بھی یکطرفہ پروپیگنڈے کی تھی۔ اسی دوران پتہ چلا کہ جامعہ سلفیہ کے ایک استاد مولانا ابوالکارم صاحب کے پاس ایرانی سفارت خانے سے افادہ عام کے لیے کچھ دستاویزات آئی ہیں، ان میں ایک تو آیت اللہ خمینی کی تقریر کا متن تھا، کچھ کتابچے رہبر انقلاب کی مدح میں تھے اور کچھ عمومی پروپیگنڈے کی قبیل سے تعلق والی چیزیں تھیں۔ میں نے تقریر کے بعض جملوں کو نشان زد کیا اور وحدت امت کے پس منظر میں ایک مختصر گفتگو کا تانا بانا تیار کر لیا۔ ہفت روزہ جلسہ میں بالعموم تیس پینتیس نوجوانوں کی شرکت ہوتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بھولا بھلا حلقہ بزرگاں سے بھی شریک ہو جاتا تھا۔ میری تقریر تو حلقہ طلباء کے لیے تھی، لیکن اس دن جلسہ میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی بھی بیٹھے تھے۔ انھوں نے میری تقریر کے خاتمہ پر غیر معمولی جوش و خروش کے ساتھ داد و تحسین کے کلمات بلند کیے، بولے: واللہ آپ نے حق کہا، بڑی جرأت سے کام لیا ہے آپ نے۔

ان جلسوں میں پیش کی جانے والی تقریریں مشتی تقریر کی قبیل سے ہوتی تھیں۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ واقعی انھیں میری بات پسند آئی ہے یا یہ بھی سرزنش کا ایک انداز ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں علماء کے تحفظات کے حوالہ سے یہ کہا تھا کہ ایران کے انقلاب نے امکانات کی ایک نئی دنیا پیدا کی ہے، اگر ہم

انقلاب فرانس اور امریکی اعلان آزادی کی حمایت صرف اس لیے کر سکتے ہیں کہ ان میں اکرام آدمیت اور حریت فکری کے عناصر پائے جاتے ہیں تو ایرانی انقلاب، جس نے خود کو وحدت امت کے نقیب کے طور پر پیش کیا ہے اور جو دراصل مستکبرین کے مقابلے میں مستضعفین کا اعلان جنگ ہے، ہماری نیک تمناؤں کا مستحق کیوں نہیں ہو سکتا؟ نظام جبر سے نکلنے کی ہر اسکیم ہماری حمایت کی مستحق ہے، امریکی اعلان آزادی کو بھی تو ہم اسی لیے پسند کرتے ہیں کہ اس نے فرد کو اس کی زندگی، حریت فکری اور زندگی کی جملہ مسرتوں کے تحفظ کی ضمانت دی ہے۔ امریکی انقلاب کے ظن سے انقلاب فرانس طلوع ہوا اور سچ تو یہ ہے کہ تمام نظام جبر کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز ابن الحکم الا للہ کی صدا کے طور پر دیکھی جانی چاہئے۔

عام ہفت روزہ تقریروں کی طرح یہ تقریر بھی مسجد کی چہار دیواریوں تک ہی محدود رہتی، لیکن ہوا یہ کہ ادھیڑ عمر کے ان صاحب نے شہر میں اس تقریر کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ ایک دن وہ مکتبہ میں بھی تشریف لائے اور اس تقریر کے حوالے سے کچھ اس طرح رطب اللسان ہوئے کہ میں اپنی تعریف سن کر شرمندہ سا ہونے لگا۔ ایک دن مغرب کی نماز سے لوٹ رہا تھا، راستہ میں ان ہی صاحب سے آشنا سامنا ہو گیا، بڑی گرم جوشی سے ملے، کہنے لگے: 'آپ کی تقریر ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے، کلمہ حق کہا آپ نے کلمہ حق، مولانا علیؑ کہتے ہیں کہ میں نے حق کہا اور تمہارا گیا۔ ہماری یہ گفتگو مسجد سے نکلنے والے ایک پڑوسی بھی سن رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد قدرے متوحش انداز میں مجھ سے بولے، خیریت ہے! کن کن لوگوں کے چکروں میں پڑے رہتے ہو، ارے پتہ بھی ہے یہ صاحب کون ہیں، غالی درجہ کے شیعہ ہیں، یہ لوگ آج کل بہت اچھل کود کر رہے ہیں، ایرانی انقلاب نے ان کے درجہ حرارت میں اضافہ کر دیا ہے۔

بات جب آگے چلی اور انہیں ایرانی انقلاب کے سلسلے میں میرے موقف سے آگہی ہوئی تو میرے یہ پڑوسی سخت کبیدہ خاطر ہوئے، مجھے باصرار اپنے ساتھ بیٹھکے میں لے کر آئے اور اہل تشیع کے سیاہ کارنامے، ان کی صحابہ دشمنی اور اسلام کے خلاف ان کی تاریخی سازشوں کا وہ طومار باندھا کہ دل دہل سا گیا۔ نہ صرف یہ کہ اپنی صلابت فکری سے میرا اعتماد متزلزل ہو گیا بلکہ یہ خوف بھی دامن گیر ہو گیا کہ اپنی عقل اور مطالعہ پر حد سے زیادہ بھروسہ کر کے میں نے کہیں اپنی عاقبت کا سودا تو نہیں کر لیا ہے۔ وہ رات مجھ پر بہت سخت گزری، کبھی لاشیعہ و لاشنیہ کے پرکشش نعرے مجھے اپنی طرف کھینچتے اور کبھی سبائی سازشوں کا شکار ہو کر میں خود کو جہنم کے اسفل ترین درجہ میں پاتا۔ رخصت کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی کہا کہ جو لوگ سوادِ اعظم کے ساتھ نہیں رہتے، اپنا الگ راستہ بناتے ہیں انہیں ان کی قوم مسترد کر دیتی ہے، بڑی بڑی صلاحیتوں والے لوگ راندہ درگاہ ہو گئے، آدمی کو ایسی کوئی بات نہیں کہنی چاہئے جو سوادِ اعظم کے جذبات و احساسات

سے مغائر ہو۔



ایرانی انقلاب کو یہی کوئی پانچ چھ سال کا عرصہ ہوا ہوگا۔ ایک دن میں اپنے استاد مکرم جعفر ذکی صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ جعفر ذکی صاحب ویسے تو انگریزی کے پروفیسر تھے لیکن اسلامی تاریخ و آثار پر ان کی گہری نظر تھی۔ شرق و غرب سے واقف، غایت دین سے آگاہ، آسانی اور مشکل ہر دو حال میں نگاہیں آسمانوں پر تگی، جب بھی دیکھئے، ایسا لگتا کسی نور کے ہالے میں گھرے ہوں۔ تعلق اہل تشیع کے طائفے سے تھا لیکن فکر و عمل میں فرقہ بندی کے کسی ادنیٰ شائبہ سے بھی خالی۔ ایک دن ایرانی انقلاب کے حوالے سے مشہور فرانسیسی فلسفی میشل فوکو کا تذکرہ چھڑ گیا، جن کی ابھی چند مہینے پہلے ہی وفات ہوئی تھی۔ ابھی گفتگو ابتدائی مرحلہ میں ہی تھی کہ میرے ایک اور استاد رفیق احمد نقوی صاحب تشریف لے آئے۔

ادب کے طالب علم کی حیثیت سے میں فوکو کی تحریروں سے تو واقف تھا، لیکن مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ فوکو انقلاب ایران کے پر جوش حامیوں میں بھی رہے ہیں۔ میں نے اس امر پر جب حیرت کا اظہار کیا تو نقوی صاحب نے اپنے مخصوص ظریفانہ لہجہ میں کہا: 'ارے تم فوکو کو نہیں جانتے وہ بھی کسی شیعہ سے کم نہیں تھے، تصویر دیکھی ہے ان کی؟ بالکل شیعہ لگتے ہیں، بالکل ویسے ہی چہرے پر نحوست برستی ہے۔'

'ارے ارے نقوی صاحب! جعفر ذکی صاحب نے اپنے بے تکلف دوست کو لگام دینے کی کوشش کی۔ شاید میرے سامنے وہ اس بے تکلفی کے اظہار کو مناسب نہ سمجھتے تھے۔ لیکن نقوی صاحب کہاں رکنے والے تھے۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی تھی۔ کچھ تو چہرے کی ساخت ایسی اور کچھ ان کے جملوں کی کاٹ، کہنے لگے جب میں لکھنؤ میں تھا تو میرے ایک سنی دوست میرے نام میں نقوی کے لاحقہ کے سبب مجھے شیعہ سمجھتے رہے۔ ایک دن جب انھیں پتہ چلا کہ میں سنی ہوں تو کہنے لگے کہ ارے بھئی ایک تو نام سے غلط فہمی ہوئی اور پھر آپ کے چہرے پر بھی..... یہ کہہ کر انھوں نے تہقہہ بلند کیا، پھر بولے، فوکو کو تو راندہ درگاہ کر دیا مغربی دانشوروں نے، وہ تو کہتے کہ ان کا کام اتنا واقع ہے کہ اس کی بازگشت دیر تک سنی جائے گی۔ ورنہ انقلاب ایران کے حامی کی حیثیت سے ان کا نام کہاں آتا ہے۔ لوگ ان مضامین کا تذکرہ بھی نہیں کرتے جو فوکو نے انقلاب ایران کی حمایت میں لکھے ہیں۔'

فوکو کی ایران کے انقلاب میں دلچسپی کیسے پیدا ہوئی، آخر اس کا سبب کیا تھا، میں نے استاد مکرم سے

جاننا چاہا۔

بولے: راشد میاں! سوچنے والا ذہن دنیا کو شرق و غرب کے خانے میں نہیں دیکھتا، طالب حق کے

لیے یہ کافی ہوتا ہے کہ اسے کلمہ حق کی گونج سنائی دے۔ یہ آواز کہاں سے آتی ہے اور کس کی زبان سے نکلتی ہے، اسے اس بات سے غرض نہیں ہوتی۔ فو کو ایرانی انقلاب کے مشاہدے کے لیے خود دو بار ایران گئے اور وہاں سے اصل صورت حال پر اپنا تجزیہ فرانسسیسی اور اطالوی اخبارات کو ارسال کرتے رہے۔ پہلی بار جب وہ ایران پہنچے ہیں تو اس سے دو دن پہلے ہی بلیک فرائڈے کا سانحہ پیش آیا تھا، جمعہ کے مظاہرے پر پولیس کی بلا در بلغ فائرنگ سے سیکڑوں لوگ شہید ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مظاہرے اسی شدت سے جاری تھے۔ انھیں اس بات پر سخت حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے پیمانے پر ہلاکتوں کے باوجود لوگوں کے دل خوف سے خالی اور حوصلوں سے معمور ہیں۔ فو کو نے اپنی زندگی میں اہل ایمان کا کوئی ایسا گروہ نہیں دیکھا تھا جسے خوف چھو کر نہ گیا ہو۔ یہ کون لوگ ہیں، آخر وہ کون سا خیال ہے جس نے پوری قوم میں تبدیلی کے لیے ایک collective will کو جنم دیا، کہیں کوئی نہ کوئی چیز تو ہے جو ایرانی انقلاب کو دنیا کے دوسرے انقلابی ہنگاموں سے ممتاز کرتی ہے۔

مگر یہ باتیں تو دوسرے مغربی مفکرین اور صحافیوں پر بھی عیاں تھیں۔

بولے: فو کو پہلے سے ہی کھلے ذہن کے آدمی تھے، وہ اسلام کو مغرب مخالف یا جدید اقدار کا مخالف سمجھنے کے بجائے اسے خود اس کے تناظر میں سمجھنے کے اہل تھے۔ جو بات ان کے لیے سب سے زیادہ کشش کا باعث تھی وہ اس انقلاب کا روحانی پہلو تھا، انھوں نے دیکھا کہ اس سیاسی تبدیلی کے پیچھے مذہبی داعیہ کار فرما ہے، لوگ اس انقلاب کو ایک فریضہ دینی کے طور پر برت رہے ہیں۔ مغرب کا فرانسسیسی انقلاب روحانیت سے خالی ایک طرح کی سیکولیر بیٹی لیے ہوئے تھا۔ اس کے برعکس ایرانی انقلاب میں انھیں روحانیت اور مذہبیت کی جلوہ سامانی نظر آئی اور چونکہ اس انقلاب کا آبتشار لوگوں کے اندرون سے بہتا ہے، ان کی اپنی ثقافت و حضارت سے جنم لیتا ہے، اس لیے انھیں شاہ ایران کی طرح باہر سے برآمد کردہ موڈرنائزیشن کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ فو کو نے انقلاب کو موسٹ ماڈرن اور most insane بتایا، جس نے پہلی بار مغربی نظام زندگی پر سوالیہ نشان قائم کر دیا تھا۔ فو کو نے سب سے اہم بات یہ کہی کہ جو لوگ مذہب کو انقلاب مخالف سمجھتے ہیں یا جو سمجھتے ہیں کہ مذہب انقلاب کو اچک لیتا ہے یا ہائی جیک کر لیتا ہے تو انھیں جاننا چاہئے کہ ایرانی انقلاب میں مذہب نے بنیادی محرک کا کام کیا ہے۔ فو کو نے یہ بھی کہا کہ میں نے ایران میں مذہب کو عقائد کے جامع مجموعے کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ یہاں مذہب عام سماجی زندگی میں جلوہ گر ہے۔

فو کو انقلاب کی اتنی گہرائی تک کیسے پہنچ گئے اور وہ بھی اس حد تک کہ اس کے پر زور وکیل بن جائیں؟ میرے اس سوال پر استاد مکرم مسکرائے، بولے: شریعتی کو تو پڑھا ہے نا آپ نے، کتنی روشنی ہے ان

کی تحریروں میں۔ بہت سے مغربیوں کے لیے ان کی تحریروں میں ایک چونک کا سامان ہے، کوند ہے، ججلی ہے، مشرق کا یہ تناظر انھیں مہوت کیے دیتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ ایک لمحہ کور کے جیسے کوئی بات اچانک یاد آگئی ہو۔ پھر بولے: اہل تشیع کے ہاں ایک نقطہ نظر تو یہ ہے کہ جس طرح امام حسینؑ نے خود کو، اسمعیل کی طرح، رضائے الہی کے سپرد کر دیا تو اب ان کے ماننے والوں کو چاہئے کہ وہ تقیہ پر گامزن رہ کر امام غائب کے ظہور کا انتظار کریں۔ لیکن زیدی شیعیت امام حسینؑ کے عمل کی ایک اور ہی تشریح کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حسینؑ نے آخری وقت تک جدوجہد کی۔ ہمیں بھی تقیہ کے راستے قیام کی منزل کو سر کرنا چاہئے۔ شریعتی نے ان بحثوں کو علوی شیعیت اور صفوی شیعیت کی اصطلاحوں میں سمجھانے کی کوشش۔ انھوں نے کہا کہ شیعیت کی اصل روح سترہویں صدی میں متشکل ہونے والے شیعہ اداروں میں نہیں بلکہ امام علی کے ان خطبات میں ہے جس میں انھوں نے اپنے متبعین کو قیام انصاف کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی ہے۔

فوکو کو اس بات میں بڑی کشش محسوس ہوئی کہ قیام انصاف کا نعرہ روحانیت سے اس قدر مملو ہو کہ وہ اپنے ماننے والوں کے لیے مذہبی فریضہ بن جائے اور اسے اخروی کامیابی کی ضمانت کے طور پر دیکھا جانے لگے اور ہاں راشد میاں! فوکو نے ایک بات بڑی زبردست کہی، یہ کہتے ہوئے وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ مجھے یاد نہیں کہ کہاں لکھا ہے، کبھی گھر آئیے گا تو حوالہ بتاؤں گا۔ انھوں نے خاص طور پر یہ بات کہی کہ لوگ اکثر مارکس کے حوالہ سے مذہب کو ایفون کہنے والی تحریر کا حوالہ دیتے ہیں، لیکن ٹھیک اس جملہ سے پہلے جو انھوں نے لکھا ہے اسے لوگ عام طور پر گول کر جاتے ہیں۔ مارکس نے لکھا ہے کہ مذہب ایک ایسی دنیا کی روح ہے جو بے روح ہوگئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بس اسی طرح یہ سمجھ لیجئے کہ ۱۹۷۸ء کے انقلابی ایام میں ہمیں جس اسلام سے سابقہ پیش آیا ہے اس کی حیثیت ایفون کی نہیں بلکہ روحانیت سے خالی اس دنیا کے لیے ایک روح کی ہے۔

تو پھر اس کے تشیع میں شبہ کہاں رہا۔ نقوی صاحب جو اب تک خاموشی سے ساری گفتگو سن رہے تھے، ان کی رگِ ظرافت پھر پھڑک اٹھی۔

استاد مکرم مسکرائے، بولے کہ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ فوکو کا ذہن اسلام کے بارے میں اتنا صاف تھا۔ وہ اسلامی حکومت کے قیام اور عہد رسولؐ میں واپسی کو مستحسن قدر سمجھتا تھا۔ لیکن فوکو کی ان تحریروں کی نہ تو مشرق میں قدر ہوئی، نہ مغرب میں۔

مشرق میں تو ان کتابوں کا چلن ہے، ”دو متضاد تصویریں“ اور ”ایرانی انقلاب، امام خمینی اور

شیعیت،‘ نقوی صاحب نے پھر مداخلت کی۔

علی میاں صاحب کی بات کر رہے ہیں؟

جی ہاں! اور ایک صاحب اور ہیں، منظور نعمانی۔ ان دونوں کی کتابیں دھڑا دھڑا بٹ رہی ہیں، نقوی

صاحب نے کہا۔

بڑے افسوس کی بات ہے ان علمائے کرام کی عقل پر حیرت ہوتی ہے، امریکی استعمار کے خلاف اٹھنے والی قوم کے حق میں اگر یہ کلمہ خیر نہیں کہہ سکتے تھے تو کم از کم خاموش ہی رہتے۔

کیسے رہتے، قوم بھی تو پوچھ رہی تھی کہ ایرانی انقلاب کا ہم کیا کریں، شاید انہیں خطرہ ہو کہ کلمہ حق کہنے میں سببیت کا دامن ہاتھ سے نہ نکل جائے، کلمہ حق کہنا آسان نہیں ہوتا ہے بھائی، کبھی آسان نہیں رہا، یہ کہتے ہوئے نقوی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجلس اختتام کو پہنچی۔

میں نے سوچا، نقوی صاحب شاید صحیح کہتے ہیں، کلمہ حق کہنا آسان نہیں، وہ ظرافت کے پردے میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ باتیں بھی جو اگر راست کہی جائیں تو خود کہنے والے کے لیے پشیمانی کا باعث ہوں۔ جب تک توفیق الہی شامل حال نہ ہو کلمہ حق حلق میں گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ فو کو نے ایرانی انقلاب پر اپنے احساسات کو بلا کم و کاست بیان کیا اور اپنے ہم قوموں میں معتوب قرار پائے، اس کے برعکس ہمارے سنی علماء نے تحقیق و تجزیے کے بجائے نزاعی بحثوں کو زندہ کیا اور ان کی قوم نے انہیں سروں پر بٹھائے رکھا۔ میں جتنا سوچتا نہ جانے کیوں مجھے بڑے بڑے مذہبیوں کے مقابلے میں فو کو اپنی تمام تر لغزشوں کے باوجود ایک روحانی آدمی معلوم ہوتا، راندہ درگاہ ہو جانے کے خوف سے خالی۔



اگلی صبح میں نے ابا سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ میں نے پوچھا کیا واقعی ایرانی انقلاب کی حمایت میں زبان کھولنا، سواد اعظم سے دور جا پڑنا ہے۔ میری اس تشویش پر وہ مسکرائے، بولے، مولوی سمیع تمہیں کہاں مل گئے، یہ سب مولویوں کے جھگڑے ہیں، تمہارا تو بس فریضہ یہ ہے کہ عقل کو کام پر لگائے رکھو، حق کی تلاش میں سرگرداں رہو اور طلب اگر صادق ہو تو خدا نامراد نہیں کرتا۔ ویسے تمہاری دلچسپی کے لیے کل کے اخبار میں ایک اچھا معلوماتی مضمون شائع ہوا ہے، دیکھو یہیں کہیں رکھا ہے، اٹھا لاؤ۔ پھر خود ہی بولے: ایک بات جو بڑی امید افزا ہے وہ یہ ہے کہ خمینی کی تحریروں میں مسلسل ایک ارتقا دکھائی دیتا ہے۔ کشف الاسرار جو ان کی ابتدائی تصنیف ہے اس میں وہ شہنشاہیت کے لیے گنجائش پیدا کرتے ہیں، لیکن اسلامی حکومت میں جو انقلاب سے چند سال پہلے کی تصنیف ہے وہ ولایت فقیہ کا تصور پیش کرتے ہیں اور شہنشاہیت کو یکسر مسترد

کردیتے ہیں۔ آگے چل کر مستضعفین کی اصطلاح ان کے ہاں انقلاب کا حوالہ اور جواز بن جاتی ہے۔ ان باتوں سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ عام روایتی شیعہ علماء کے برعکس مسلسل راستے کی تلاش میں ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ امام غائب کے ظہور میں محض انتظار کرنے کے بجائے انھوں نے پوری شیعہ قوم کو تنظیم و تطہیر کی دعوت دی ہے تاکہ اس عقیدے کے مطابق جب امام آئیں تو اپنے تابعین کو بہتر اور منظم شکل میں پائیں۔

ابا کی گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ میں نے اخبار کا وہ مرکزی صفحہ ڈھونڈ نکالا، پورے صفحہ پر پھیلا ہوا ایک طویل مضمون تھا۔ بعض جگہ مضمون نگار نے خمینی کے ایک تازہ انٹرویو کے اقتباسات نقل کیے تھے، انھوں نے La Monde اخبار کے رپورٹر کے اس سوال کے جواب میں کہ وہ ایران کو کس قسم کی ریاست بنانا چاہتے ہیں، کہا تھا اسلامی عوامی ریاست۔ پھر نمائندے نے جب یہ وضاحت چاہی کہ کیا اسلامی جمہوری ریاست نہیں؟ تو انھوں نے صاف کہا کہ صرف اور صرف اسلامی ریپبلک۔ نہ اس سے کم اور نہ زیادہ۔ یہ پوچھے جانے پر کہ اسلامی ریپبلک سے ان کی کیا مراد ہے؟ انھوں نے کہا تھا کہ ریپبلک سے ان کی مراد وہی ہے جو بالعموم سمجھا جاتا ہے، لیکن اسلامی ریپبلک اس لیے کہ ہمارے نظام کی جڑیں اسلام میں پیوست ہیں، البتہ یہ فیصلہ لوگوں کو کرنا ہے کہ اس کی شکل و صورت کیا ہوگی۔ میں نے اخبار بند کیا، ابا کی گفتگو جاری تھی، بولے: دلوں کا حال تو خدا ہی جانتا ہے، مستقبل سے بھی صرف وہی واقف ہے، ایک طالب علم کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنی جستجو جاری رکھے۔ حق بڑا غیرت مند واقع ہوا ہے، طلب صادق کے بغیر نہیں ملتا اور اگر اس کی قدر نہ کی جائے تو قریب آ کر بھی ہاتھوں سے پھسل جاتا ہے۔

مولوی سمیع اپنے پیچیدہ فقہی چیتاں سے مخاطب کو مہوت کر دینے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کے پاس ایسے لائیکل مسائل کی ایک طویل فہرست تھی جس سے دراصل سامع پر علم کی دھاک بٹھانا مقصود ہوتا، مثلاً ایک دن کہنے لگے کہ ایک قافلہ مو سفر تھا، راستہ میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا، حملہ میں دو مرد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، ان کی بیویاں بھی قافلہ کے ساتھ تھیں، ان کی آہ و بکا سن کر ایک صاحبِ کرامت بزرگ برآمد ہوئے، انھوں نے دونوں مردوں کی کٹی ہوئی گردنوں کو جو الگ پڑی تھیں انھیں شانوں پر رکھا، بارگاہِ ایزدی میں دعا گو ہوئے اور خدا کے فضل و کرم سے گردنیں جڑ گئیں۔ دونوں حضرات پھر سے جوانِ رعنا کی طرح اٹھ بیٹھے۔ یہاں تک تو چلے قصہ میں حلیۃ الاولیاء اور سیر الاولیاء کی کہانیوں کا لطف آتا تھا، لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ ایک مرد کا سر دوسرے کے تن سے جڑ گیا، اب عورتیں حیران و پریشان کہ ان کا شوہر دراصل کون ہے۔ سر سے اگر شناخت کی جائے تو اجنبی تن کا کیا کریں؟ فیصلہ کیسے ہو، یہ قضیہ اس وقت بھی سمجھ میں نہ آیا اور آج بھی مولوی سمیع کی جلالت علمی اس سوال کے سہارے اسی طرح قائم ہے۔ ایک دن کہنے لگے، اچھا یہ بتاؤ کہ اگر

خدا قادرِ مطلق ہے تو کیا وہ کوئی ایسا بھاری پتھر بنا سکتا ہے جسے وہ خود اٹھانہ سکے۔ اسی طرح کبھی معراج کی جسمانی اور روحانی نوعیت کا قضیہ اٹھاتے، کبھی مسیح کی آمد ثانی کی تفصیلات کا اس باریک بینی سے تذکرہ کرتے، جیسے مستقبل کو چشمِ خود برپا ہوتا ہوا دیکھ رہے ہوں۔ کبھی ابوطالب کی مغفرت پر سوالیہ نشان قائم کرتے اور کبھی حیات النبی بعد وصال النبی کی باتیں کچھ اس طرح کرتے جیسے ابھی ابھی خدمت اقدس میں حاضری دے کر آئے ہوں۔ اُن دنوں پندرہویں صدی کی آمد آمد تھی۔ مولوی سمیع کچھ تو ظہورِ مہدی کی روایتوں سے اور کچھ اپنے تخیل کی مہمیز سے کچھ اس طرح روشنی ڈالتے کہ ایک روشن صبح کا امکان دلوں پر دستک دینے لگتا۔ ایک دن مسجد سے نکلنے ہوئے تقریباً راستہ روک کر کھڑے ہو گئے، کہنے لگے، کچھ خبر بھی ہے، میں نہ کہتا تھا کہ یہ سبائی نہیں مانیں گے دیکھو وہی ہوا جس کا ڈر تھا، حرمِ مکی دشمنوں کے محاصرے میں ہے، تفصیلات تو ابھی کہیں سے نہیں آرہی ہیں، البتہ یہ اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ یہ سب ایرانیوں کی شرارت ہے۔ یہ کہہ کر مولوی سمیع نے اپنی راہ لی۔ میں نے گھر آ کر تفصیلات جاننے کی کوشش کی۔ مغربی اور خاص طور پر امریکی ذرائعِ ابلاغ اس واقعے کے لئے ایرانیوں کو الزام دے رہے تھے جبکہ آیت اللہ خمینی نے اس حادثہ کے لیے امریکیوں کو مورد الزام ٹھہرایا تھا۔ امریکی خبر تو پیچھے رہ گئی، البتہ خمینی کے بیان کا اثر یہ ہوا کہ مسلم اکثریتی ممالک میں امریکی سفارت خانوں کے سامنے عوامی غیض و غضب نے تشدد کی شکل اختیار کر لی۔ چودہ دنوں تک حرمِ مکی کا محاصرہ جاری رہا۔ اس دوران مختلف قسم کی قیاس آرائیوں کا بازار گرم رہا۔ دہلی سے نکلنے والے 'دعوت' اخبار نے ایک با تصویر شمارہ بھی شائع کیا جس میں ان انقلابیوں کی تصویریں شائع کی گئی تھیں، جو حرمِ پر فوجی کارروائی کے دوران مارے گئے تھے۔ ان تصویروں کے نیچے لکھا تھا کہ دنیا میں ان کے ساتھ جو ہوا یہ کم عبرت انگیز نہیں، آخرت میں جو ان کے ساتھ ہوگا اس کے تصور سے ہی ہم لرزہ براندام ہوئے جاتے ہیں۔ بعد میں جب اس کارروائی سے پردہ اٹھا تو پتہ چلا کہ نہ تو یہ سبائی سازش تھی اور نہ ہی امریکیوں کا اس میں عمل دخل تھا، بلکہ خود سعودی عرب کی سلفی تحریک کے اندر سے اٹھنے والی ایک صدائے احتجاج تھی۔

مولوی سمیع کی خبروں کا تو میں نے کسی طرح پردہ چاک کر لیا، لیکن ان کے پیچیدہ فقہی مفروضے اور الہیاتی مخمصے کے حل کی جب کوئی معقول شکل نہ نکل سکی تو میں نے ان کے ہمالیائی علم کا تذکرہ والد صاحب سے کیا، خاص طور پر حیاتِ مسیح اور ظہورِ مہدی کے سلسلے میں ان سے رہنمائی کا طالب ہوا۔ اس سے پہلے مکتبہ میں کئی بار غلام احمد قادیانی کے حوالے سے غلطی اور بروزی نبی کی طویل بحثیں بھی سن چکا تھا۔ مجھے ان کتابوں سے بھی کسی قدر آگہی تھی جو ان بحثوں کے دوران حوالے کے لیے نکالی جاتی تھیں، خاص طور پر تفہیم القرآن

کی چوتھی جلد، جہاں اس قبیل کی بیشتر روایتیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ مجھے توقع تھی کہ والد صاحب اس مسئلہ پر کسی شافی جواب سے نوازیں گے، لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ میرے معصوم منہ پر مسکرائے، ایک لمحہ توقف کیا، پھر بولے، ارمغان حجاز دیکھی ہے، لے کر آؤ۔ میں ارمغان حجاز لے آیا، انہوں نے چند صفحات اٹھے پھر فرمایا اسے پڑھو، نظم تھی؟ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ میں جب ان اشعار پر پہنچا:

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات  
 ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات  
 ابن مریم مرگیا یا زندہ جاوید ہے  
 ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عین ذات؟  
 کیا مسلمان کے لیے کافی نہیں اس دور میں  
 یہ الہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

تو کسی قدر بات سمجھ میں آچکی تھی۔ آگے چل کر یہ بھی پتہ چلا کہ کلامی مباحث کی یہ فہرست جسے اقبال ابلیس کے مشیروں سے اُچک لینے میں کامیاب ہو گئے تھے، دراصل پرانی فہرست تھی، اقبال بھی یہاں دھوکہ کھا گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ ابا مستقبل بنی کے سلسلے میں کوئی بنا بنایا عقیدہ عطا کرنے کے بجائے اس مسئلہ کو ہماری فکر و تحقیق کے لیے کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔

حرمِ مکی میں نئی صدی کے دعویدار مجدد کی موت سے اسلامی بیداری کی امیدوں پر اوس پڑ گیا تھا۔ اس واقعہ پر ابھی چند ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ افغانستان میں روسی دراندازی نے امت کے لیے ایک نئی مشکل پیدا کر دی۔ پندرہویں صدی کی پہلی صبح جب جہیمان العتیبہ اپنے چار سو رفقاء کے ساتھ حرمِ مکی کے محاصرے کے خیال سے داخل ہوئے تھے، انھیں شاید توقع تھی کہ وہ نئی صدی کی پہلی نماز میں شاہ خالد کو آلیں گے اور ان کا یہ اقدامی عمل امت میں ایک نئی صبح کا آغاز بن جائے گا۔ لیکن افسوس کہ نئی صبح کی یہ امید ایک بھیانک خون خرابے کی نذر ہو گئی۔ میں نے سوچا آگے پیہ نہیں کیا ہو؟ صحوۃ اسلامیہ کی یہ بیل منڈھے چڑھے گی بھی یا نہیں۔ میں نے مستقبل کے درپچوں میں جھانکنے کی بہت کوشش کی، مگر اپنا علم خام تھا اور سوالات گہرے تھے۔ خیال آیا خدا کی دنیا تو بڑی وسیع ہے، کیوں نہ آگے قصد کیا جائے۔

## ملا شدن چہ آسان

ابا آج پھر مضطرب دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھ میں حمائل شریف کا وہی نسخہ تھا، انگلیاں درمیانی صفحہ میں دبی تھیں جیسے تلاوت کرتے ہوئے اچانک رک گئے ہوں۔ ایسا لگا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر نہ جانے کیوں خاموش رہے۔ کبھی دور خلا میں گھورتے اور کبھی میری طرف دیکھتے۔ میں منتظر رہا کہ شاید وہ کسی کتاب کو نکال لانے کا حکم دیں یا کسی تفسیری حواشی کو پڑھوا کر سنیں، لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے آج وہ کچھ کہنے کے بجائے مجھ سے بہت کچھ سننے کے طالب ہوں۔ میں نے ہمت جٹائی لیکن اس سے پہلے کہ کوئی لفظ زبان سے نکالتا، میری آنکھ کھل گئی۔ یہ میری علی گڑھ کی پہلی صبح تھی۔ ابھی سفر کی تکان باقی تھی، دل اٹھنے کو نہ چاہتا تھا مگر اس خواب نے میری نیند غائب کر دی۔ مجھے مکتبہ کی مجلس یاد آئیں۔ خیالات کے ہجوم سے گھبرا کر میں اٹھ بیٹھا۔ ایسا لگا، جیسے قدرت نے مجھے کسی مشن پر بھیجا ہو، جیسے بہت سے مضطرب سوالوں کے حل کے لیے میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہو۔

ان دنوں ہر طرف پندرہویں صدی ہجری تقریبات کا غلغلہ تھا۔ علی گڑھ میں بھی طلباء کی اسلامی تحریک کی طرف سے مختلف تقریبات منعقد ہو رہی تھیں۔ سیمینار، مذاکرات، جلسے، جلوس، تقریری تحریری مقابلوں، مشاعروں اور مختلف ثقافتی پروگراموں کی گویا بہار آئی ہوئی تھی۔ ان دنوں تحریک کا قومی دفتر بدر باغ میں واقع تھا۔ تحریری مقابلہ میں اپنا مضمون جمع کرانے کے لیے جب میں وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صدر تحریک کے کمرے میں گرما گرم مناقشوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک صاحب بڑے پر جوش انداز سے کہہ رہے تھے کہ فی زمانہ اسلامی تحریک کا مستند قالب ایرانی انقلاب میں جلوہ گر ہوا ہے، اس کے برعکس سعودی عرب میں دعوت اسلامی کے نام پر جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کی حیثیت کفر محض کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ دونوں طرف کہنے اور سننے والوں کے پاس اپنے اپنے دلائل تھے، البتہ یہ بات صاف طور پر پتہ چلتی تھی کہ ایرانی انقلاب نے دعوت دین کا کام کرنے والوں کے مابین ایک ایسی نزاعی بحث کو جنم دیا ہے جس سے دونوں طرف کم از کم نظری طور پر تلواریں کھینچ گئی ہیں۔ ان دنوں یونیورسٹی کیمپس میں بھی جہاں بڑی تعداد میں ایرانی طلباء

موجود تھے، ان کے باہمی ٹکراؤ کے مناظر عام تھے۔ کبھی کبھی یہ ٹکراؤ کشت و خون تک جا پہنچتے تھے۔ ایرانی طلباء سے جب بھی ملتا تو ایسا لگتا کہ جیسے ان کا وجود ان سے سنبھالا نہ جاتا ہو۔ چند ماہ پہلے ناگپور کے ایک اجلاس میں ایرانی طلباء کا جو وفد اسٹیج پر خطاب کے لیے آیا تھا اس کے لیے بھی سیدھی اور سپاٹ زبان میں اپنی بات رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ دراصل ایرانی قوم ایک ایسے انقلابی عمل سے گزری تھی جس نے اس کے اندرون کی کاپیلاٹ دی تھی۔ اس تقلیبِ فکر و نظر کو بیان کرنے کی بھلا ان میں تاب نہ ہوتی۔ لہذا جب یہ نوجوان کچھ کہنا چاہتے تو ان کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہوتا کہ کہاں سے شروع کریں اور کہاں ختم۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ دوچار جملوں کے بعد ہی ان کی تقریر نعروں میں بدل جاتی۔ ناگپور کے اسی اجلاس میں علی میاں کے ایک نوجوان عزیز جب ان کے نمائندہ کے طور پر اسٹیج پر آئے تو انھوں نے ایرانی انقلاب کے حوالے سے اپنی گفتگو کا آغاز اس مصرعے سے کیا 'میں زہر ہلا ہل کو کبھی کہہ نہ سکا تھا' جس پر جلسہ میں شور شرابے اور بد مزگی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اب علی گڑھ کے اسلامی حلقوں میں بھی اس تنازع نے شدت اختیار کر لی تھی کہ ایران کا انقلاب اسلامی ہے یا نہیں۔ دوسری طرف ایرانی انقلاب کے حمایتی سعودی عرب سے وابستہ سنی علماء کو کفر و شرک اور امریکہ کا ایجنٹ قرار دیتے۔ بس یہ سمجھئے کہ اسلام پسند حلقوں میں شیعہ سنی کے بہانے سعودی ایرانی سیاست کی خلیج مسلسل بڑھ رہی تھی۔ ایک دن میں نے بہزاد سے پوچھا کہ باہمی کشت و خون کا یہ سلسلہ آخر کب رکے گا؟ بہزاد عمرانیات کا طالب علم تھا۔ دوسرے ایرانی طلباء کے مقابلے میں اس کے جوش میں ایک طرح کا ٹھہراؤ اور گفتگو میں متانت تھی۔ وہ اپنی گفتگو میں فیصلے تو ضرور سنا تا مگر فریق مخالف کے لیے مکالمے کی گنجائش بھی چھوڑ دیتا۔ وہ ہاسٹل میں میرا ہمسایہ بھی تھا اور اچھا ہمسایہ۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی۔ اسے درخت کے نیچے سبزہ زار پر چائے پینے میں شاید خاص لطف آتا۔ ایک دن خود ہی ایرانی طلباء کی باہمی رزم خیزیوں پر اظہارِ افسوس کرنے لگا، بولا: کل تک جو لوگ شاہ کو الٹ پھینکنے میں مشترکہ رول ادا کر رہے تھے وہ آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ کسی قدر مطمئن بھی تھا کہ امام خمینی مسئلے کا کوئی حل ٹھونڈ ہی نکالیں گے۔ ایک دن میں نے بہزاد سے پوچھا: امام کے لیے اس قدر غیر معمولی عقیدت کا آخر سبب کیا ہے؟ اور یہ کہ تم لوگ انھیں امام کیوں کہتے ہو؟ امام وقت کا ظہور تو ابھی باقی ہے نا؟ میرے اس سوال پر بہزاد مسکرایا، بولا: تمہارا اعتراض درست ہے، اتنی باریکی تک تم کیسے پہنچ گئے، ان کی رسمی حیثیت تو نائب امام کی ہے لیکن عوامی جوش و خروش کے سبب نائب کا لفظ ساقط کر دیا گیا ہے۔ ہم انھیں امام غائب کا بدل ہرگز نہیں سمجھتے، وہ تو بس ان کے نائب ہیں، خادم ہیں جو امام کے ظہور سے پہلے ان کے لیے میدان ہموار کر رہے ہیں۔ ان کی زیادہ سے زیادہ حیثیت ولی فقیہ کی ہو سکتی ہے اور خمینی اسی حیثیت سے امور

ریاست کی نگہبانی کا کام انجام دے رہے ہیں اور شیعہ دائرہ فکر میں یہ بات ایسی کچھ اجنبی بھی نہیں۔ صفوی عہد میں صفوی حکمرانوں کو امام کے نائب کی حیثیت سے ہی حکمرانی کا جواز فراہم کیا تھا۔ پھر مخالفین ان کی اس مذہبی حیثیت کو کیوں نہیں مانتے؟

بولا: اصل بات یہ ہے کہ کیونسٹ اور سیکولرسٹ اس بات سے وحشت زدہ ہیں کہ ایران میں ملاؤں کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ جیسے تمہارے ہاں ہندوستان میں مولویوں کو امور سیاست اور حکمرانی کے لیے اہل نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح ہمارے ہاں ایران میں کہا جاتا ہے کہ ملا شدن چہ آسان، آدم شدن چہ مشکل۔ یعنی ملا بننا بڑا آسان ہے، لیکن آدمی بننا بڑا مشکل ہے۔ بعض لوگوں کے لیے یہ قبول کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ امام خمینی کوئی عام مولوی نہیں بلکہ عبقری اور ہمالیائی بصیرت کے حامل قائد ہیں اور انہوں نے اپنے شاگردوں کی ایک ایسی کھیپ تیار کر لی ہے جس کی روایتی حوضہ علم سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے ہاں شیعہ فکر میں تو علماء کے کلیدی رول کی ایک روایت چلی آتی ہے۔ تم نے واحد بہ بہانی (متوفی ۱۷۹۳ء) کا نام تو سنا ہوگا، اچھا باقر مجلسی کو تو جانتے ہو گے؟

میں نے تائید میں سر ہلایا، بحار الانوار والے مجلسی؟

بولا: ہاں مجلسی تو خیر شیخ الاسلام رہے ان پر تو شیعیت کی تقلید فکری کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے شیعیت کو رسوم میں قید کر دیا اور بقول علی شریعتی اس طرح شیعیت، شہادت کے بجائے ماتم کا دین بن گیا۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ علامہ مجلسی کے پوتے واحد بہ بہانی نے اصولی مکتبہ فکر کی بنیاد رکھی۔ علماء کو اس بات کا اختیار ملا کہ وہ کتاب و سنت اور اجماع و عقل کی بنیاد پر عام لوگوں کے لیے رشد و ہدایت کا سامان فراہم کریں۔ آگے چل کر، فجر عہد حکومت میں، ملا احمد رزاقی نے غیبت امام میں علماء کی حکمرانی کے جواز پر دلائل فراہم کیے۔ شیعہ ایران میں روضہ کی مجلسیں ہمیشہ سے اس بات کا احساس دلاتی رہی ہیں کہ علماء نے امام کے غیاب میں کارامات کو کسی حد تک سنبھال رکھا ہے یا کم از کم اس کی یاد دہانی پر مامور ہیں۔ کل تک حسین بنام یزید کے رمز سے جو مجلسیں قائم تھیں، آج ایک زندہ انقلاب نے اسے خمینی بنام شاہ کا قالب عطا کر دیا ہے۔ ایک طرف نائب امام کی حیثیت سے خمینی نے ولایت فقیہ کا منصب سنبھال رکھا ہے تو دوسری طرف جنت و طاعت پر مبنی مغربی قوتوں کے آلہ کار شاہ ایران کو دیس نکالا دے دیا گیا ہے، ہمارے لیے اب اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں کہ کفر و اسلام کی اس فیصلہ کن جنگ میں امام خمینی کی غیر مشروط حمایت جاری رکھیں۔

بہزاد گہرا آدمی نکلا۔ ٹھہری ٹھہری متانت والے اس شخص سے مجھے اتنی سنجیدہ اور متوازن گفتگو کی توقع

نہ تھی۔ ایرانی طلباء کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ انھیں پڑھنے لکھنے سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں ہوتا۔ اکثر انگریزی زبان میں اظہار خیال سے محروم ہوتے۔ میرے کلاس میں چراغ نام کا ایک ایرانی طالب علم تھا جو اکثر کلاس سے غائب رہتا۔ ایک دن استاد نے سرزنش کی تو بولا: 'سوری سر، آئی گو ڈلہی، نوٹ ہیئر'۔ استاد کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آئی، مصنوعی کرخنگی کے ساتھ بولے: 'ناؤ نو ڈلہی، ہیئر ہیئر اونٹی'۔ ایک طرف جہاں بیرونی طلباء کے ساتھ اس طرح کے لطائف پیش آتے رہتے تھے وہاں بہزاد کے فکر و خیال کی پختگی سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی اور دنیا کا آدمی ہے۔

ایک دن ایرانی طلباء کی انجمن نے ایک نمائش کا اہتمام کیا۔ خوبصورت ایرانی پوسٹروں کی گویا ایک باڑھ سی آگئی تھی۔ کہیں آیات قرآنی، کہیں امام خمینی کے اقوال اور کہیں بیک گراؤنڈ میں انقلاب ایران کے تصویری مناظر۔ طلباء کے کمرے جو اب تک فلمی اداکاروں کی تصویروں یا مغربی دانشوروں کے اقوال سے مزین ہوتے تھے، اب دیکھتے دیکھتے ان کی جگہ ایرانی پوسٹروں نے لے لی تھیں۔ اس نمائش میں بہزاد کی بڑی قدر و منزلت دیکھی۔ اس موقع پر ایک تقریر بھی ہوئی تھی جس میں دہلی سے آنے والے مقرر نے اس بات کو واضح گف کیا تھا کہ ایرانی انقلاب امت کا مشترکہ سرمایہ ہے، اسے سنی شیعہ کے خانوں میں نہیں دیکھنا چاہئے۔ اقبال لاہوری کی احمائی شاعری اور سید قطب کی انقلابی تحریروں کے بغیر یہ انقلاب شاید ممکن نہ ہوتا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ خمینی کے خاص شاگرد خامنہ ای، جو آگے چل کر آیت اللہ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے، خود ان کے قلم سے سید قطب کی دو کتابوں کے فارسی تراجم شائع ہوئے ہیں۔ مقرر نے یہ بھی بتایا کہ فدائین اسلام کے بانی نواب صفوی نے ۱۹۵۴ء میں خاص طور پر سید قطب سے ملاقات کے لیے مصر کا سفر بھی کیا تھا۔ ان دونوں عبقریوں کے ہاں حاکمیت اللہ اور جدید جاہلیت کے تصورات میں بڑی حد تک یکانگت اور ہم آہنگی ہے، دونوں ہی اس بات کے قائل ہیں کہ مغربیت کے مقابلے کے لیے مشترکہ شیعہ سنی جدوجہد کی بنا ڈالی جائے۔ خمینی کے منظر عام پر آنے سے پہلے سنی انقلابی فکر نے ایرانیوں کے دل و دماغ میں اپنی جگہ بنالی تھی، اس لیے ایرانی انقلاب کو صرف شیعہ فکر کے ثمرے کے طور پر دیکھنا اس سے ناانصافی ہوگی۔ انقلاب سے بہت پہلے خمینی کے خاص نمائندہ ابراہیم یزدی مغربی ممالک میں اخوانی قائدین کے رابطے میں تھے۔ پھر علی شریعتی کی کوششوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جنھوں نے انقلاب کو سرخ ملا عطا کیے۔ ان گوناگوں فکری مداخلتوں کے نتیجے میں انقلاب کا خمیر تیار ہوا۔

نمائش سے لوٹتے ہوئے میرے ذہن پر یہی سوال حاوی رہا کہ جس انقلاب کی بنا میں سنی مفکرین کی تحریریں کام میں آئی ہوں اسے مشترکہ ثمرے کے طور پر قبول کرنے میں آخر کون سی چیز مانع ہے۔ خلیج کی

مسلم ریاستیں ایرانی انقلاب سے اس قدر خائف کیوں ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ سنی علماء، جو عرب ممالک میں صحوۃ اسلامیہ کے نقیب کے طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایرانی انقلاب سے مغائرت کو آخر کیوں روارکھا ہوا ہے۔

ایک دن ہاسٹل کو لوٹتے ہوئے بہراد سے ملاقات ہو گئی، بڑی گرمجوشی سے ملا، چائے کی دعوت دی جو میں نے فوراً قبول کر لی۔ الماری سے ایک مختصر سا کتابچہ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے کہ یہ ایک چھوٹا سا ہدیہ ہے استاد مرحوم کی تحریروں کا، اسے غور سے پڑھنا۔ اس کے لفظ لفظ میں انقلاب بند ہے، میں کیا بتاؤں، تم خود پڑھ کر دیکھنا۔ میں نے کتابچہ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ علی شریعتی کے نام سے تو میں واقف تھا، لیکن اب تک ان کی تحریروں کے بالاستیعاب مطالعہ کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔

شریعتی اور استاد مرحوم، کیا مطلب؟ میں چونکا۔ میں نے پوچھا، شریعتی سے تمہارا کیا رشتہ، کیا تم ان سے کبھی ملے ہو؟ میرے اس سوال پر فخر و انبساط کی ایک لہر اس کے چہرے پر آئی اور پھر چند ثانیے کے لیے خاموش ہو گیا، ایسا لگا جیسے کچھ یاد کر رہا ہو۔ پھر بولا، استاد کی مجلسیں میری خوشگوار یادوں کا بہترین سرمایہ ہیں، انہیں میں کبھی نہ بھلا پاؤں گا، اسے تو میں سجا سجا کر اپنی یادوں کے آئینہ خانے میں رکھتا ہوں، کتنے مبارک تھے وہ لمحات جب استاد بولتے اور ہم جیسے نو واردوں کو ایسا لگتا کہ دل و دماغ کے غبار دھلتے جا رہے ہوں، ان کی ہر مجلس ہمیں ایک نئے اعتماد سے سرشار کرتی۔ ایسا لگتا جیسے آنکھیں دیکھنے لگی ہوں، جیسے تاریکی چھٹتی جا رہی ہو۔ یہ کہتے ہوئے بہراد آبدیدہ ہو گیا۔ میں نے سوچا میرا اندازہ صحیح تھا۔ بہراد تو واقعی گہرا آدمی نکلا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ماضی میں کھو گیا ہو۔ بولا: میں استاد کی مجلسوں کا کیا ذکر کروں۔ حسینہ ارشاد میں جب ان کا خطبہ ہوتا تو نوجوانوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ جو بھی ان کی مجلس میں ایک بار بیٹھ جاتا اس کی فکر و نظر کی دنیا بدل جاتی۔

اب مجھے اندازہ ہوا کہ بہراد روایتی حوضہ علمیہ کے پروردہ ہیں۔ میں نے پوچھا: شریعتی کی شاگردی میں آپ کو کتنا عرصہ گزارنے کا موقع ملا۔ بولے: ویسے تو میری ابتدائی تعلیم قم میں ہوئی لیکن حسینہ ارشاد میں شریعتی کے ساتھ گزرنے والے چند ماہ ان سب پر بھاری ہیں۔ منج تنقید کیا ہوتا ہے، مطالعہ کیسے کیا جاتا ہے۔ یہ سب ہمیں ان کی صحبت سے ملا۔ لیکن افسوس کہ ان کی باتیں اب بھلائی جا رہی ہیں، انہیں مغربی فلسفہ اور مارکسزم کے اسیر کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ انھوں نے فرز فینن اور سارتر سے ہمیں متعارف ضرور کرایا لیکن وہ مغرب کے وکیل ہرگز نہیں تھے۔ وہ تو مغربی مفکرین کی تحریروں کو نقد و تجزیے کے منج کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے مغربی فکر و فلسفے کو fallacy سے تعبیر کیا اور اس کا ستم واضح کرنے کی کوشش

کرتے رہے۔ ہم جیسے لوگ جن کی چلت پھرت صرف روایتی دانش گاہوں تک محدود تھی، ان کی مجلسوں کے طفیل ہم اس لائق ہوئے کہ اجنبی فکر و فلسفے کا تنقیدی مطالعہ کریں اور بغیر کسی تحفظ فکری کے اپنے دل و دماغ کے دروازے کچھ اس طرح کھلے رکھیں کہ روشنی ہر سمت اور ہر جہت سے داخل ہو سکے۔

بہزاد کی باتوں سے صاف لگتا تھا کہ وہ اہل ایران کے ہاتھوں شریعتی کی ناقدری سے سخت نالاں ہیں۔ میں نے پوچھا: آخر کیا وجہ ہے کہ شریعتی انقلاب کے بعد سرکاری سرپرستی سے محروم ہیں، انھیں انقلاب کے فکری مؤسس کے طور پر کم ہی دیکھا جاتا ہے۔ میرے اس سوال پر وہ سنبھل کر بیٹھ گئے، ایسا لگتا تھا جیسے میں نے دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہو۔ بولے: سیاست کی اپنی مصلحت ہوتی ہے۔ شریعتی روایتی علماء کے خاندان سے ضرور تھے، لیکن ان کی اعلیٰ تعلیم فرانس میں ہوئی تھی، وہیں ان کی ملاقات فرانسیسی مفکر سارتر سے ہوئی اور اسی دوران انھوں نے فینن کی تحریروں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ سب باتیں شریعتی کے لیے مابعد انقلاب ایران میں منفی حوالہ بن گئیں۔ امام خمینی نے ان کی تحریروں کو مغربی حوالوں کے سبب، Westoxification سے تعبیر کیا۔ گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ آنے والے دنوں میں شریعتی کو انقلاب ایران کے فکری مؤسس کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔

تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ نا انصافی ہوئی؟

میرے اس سوال پر وہ کسی قدر چونکے پھر سنبھلا لیا۔ بولے: شاید امام سے شریعتی کو سمجھنے میں غلطی ہوئی اور شاید اس لیے بھی کہ انھوں نے مروجہ صفوی شیعیت کی بساط ہی پلیٹ دی تھی جو ان کے خیال میں ماتم کا دین بن گیا تھا، جبکہ علوی شیعیت شہادت کا دین ہے جو بلا خوف لومۃ لائم سنگین ترین حالات میں بھی ہمیں کلمہ حق کہنے پر ابھارتا ہے۔ کیا پتہ ہم اصطلاحات کی باریک بینی میں کچھ اس طرح الجھے کہ اصل حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔

بولے: انقلاب کے بعد عوامی ریفرنڈم کے وقت یہ تجویز آئی تھی کہ ایران کو (Islamic Democratic Republic) بنایا جائے۔ ڈیموکریسی کے لفظ پر امام کو سخت اعتراض تھا۔ اس وقت امام خمینی نے اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام کسی لاحقہ کا محتاج نہیں۔ اسلام کا لفظ ہی ہمارے لیے کفایت کرتا ہے۔ ایران صرف اسلامی ریپبلک ہوگا، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ اصولی طور پر تو یہ بات بالکل درست تھی لیکن شریعتی کو اس نقطہ نظر سے دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مغرب کے سخت ناقد کے بجائے مغربی اصطلاحوں کے شارح اور اس سے اثر پذیر نظر آئے۔ خالص اسلامی مفکر کے لیے طبقہ علماء سے باہر

کسی شخص کو استناد ملنا مشکل ہو گیا۔ حالانکہ طبقہ علماء میں آج جو لوگ بھی تمہیں انسان نظر آتے ہیں ان کی بنیاد میں استاد مرحوم کی تقریروں اور تحریروں کا بڑا دخل ہے۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو، شریعتی اپنی تحریروں کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انہیں کسی ریاست کی بیساکھی کی ضرورت نہیں۔ بہزاد کے لہجے میں اب کسی قدر احتجاج اُبھر آیا تھا۔ مجھے اپنے استاد کے تئیں ان کی بے لوث محبت اور وفاداری پر بے پناہ پیار آیا، میں نے کتابچہ اٹھایا اور اگلی ملاقات تک کے لیے رخصت لی۔

## خونریز ہنگامے

ایرانی انقلاب کی نمائش نے کیمپس میں ایک نئے تنازع کو جنم دیا۔ عرب طلباء کی انجمنوں نے جو بنیادی طور پر فلسطینی، عراقی اور یمنی طلباء پر مشتمل تھیں، نے ایرانی انقلاب کے بڑھتے اثرات کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ اب عرب انجمنوں کی طرف سے بھی ایسے چھوٹے بڑے پروگرام ہونے لگے جس میں ایران پر عراق جنگ کو عرب و عجم اور شیعہ سنی کے پیراڈائم میں دیکھا جانے لگا۔ گوکہ صدام حسین نے جب ایران پر چڑھائی کی تھی اس وقت انھوں نے خود کو عجم کے مقابلہ میں عرب تہذیب کے نمائندے کے طور پر پیش کیا تھا، لیکن عرب سنی ریاستوں کی صدام کی حمایت کے سبب رفتہ رفتہ اس جنگ کو شیعہ سنی تنازعے کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ ابتداً عراقی شیعوں نے صدام کی بھرپور حمایت کی، لیکن جب جنگ شیعہ سنی کے تناظر میں دیکھی جانے لگی تو عراقی شیعوں کے جوش و خروش میں کمی واقع ہوگئی۔ ادھر شام کی حکومت، جو اسلامی ایران کی حمایتی تھی، اس نے حما میں شامی اخوان المسلمین کے خلاف عسکری کارروائی میں بیس ہزار سے زیادہ اخوانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اخوانی نظری طور پر ایرانی انقلاب کے حامی تھے، لیکن ایران کی حمایت یافتہ اسد حکومت کے ہاتھوں انھیں یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ صورت حال خاصی پیچیدہ تھی۔ شیعہ سنی، عرب عجم، اسلام اور کفر یا محض حصول اقتدار؟ آخر ان خونریز ہنگاموں کے پیچھے اصل محرک ہے کیا؟

ایک دن جب میں بہراد کے کمرے میں بیٹھا تھا، وہیں سامنے سے محمود کا گزر ہوا۔ محمود عرب یونین کا سکریٹری تھا، کسی قدر آزاد خیال، جس مزاج سے بھرپور۔ وہ اکثر مجھے فجر میں بیدار کرنے کے لیے دروازہ پر دستک دیتا، لیکن کبھی خود مسجد میں نظر نہ آتا۔ ایک دن میں نے نمازوں میں مسلسل اس کی غیر حاضری کا سبب پوچھا تو کہنے لگا کہ میں تم لوگوں کو نماز کے لیے اٹھا کر ثواب حاصل کر لیتا ہوں اور یہ فی نفسہ کم اہم کام بھی نہیں۔ محمود ابھی تازہ تازہ وطن سے لوٹے تھے، سفر کی صعوبتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہنے لگے، ڈائریکٹ فلائٹ نہ ہونے کے سبب بڑی پریشانیوں کا سامنا رہتا ہے، پھر ساری کلفتوں پر یہ کہہ کر پانی پھیر دیا کہ نوابی شان کے ساتھ سفر کے الگ ہی مزے ہیں۔ رائل جوڑ ڈنن ایئر لائنز، نام سے ہی نوابی ٹھاٹ باٹ ٹپکتی ہے

اور ہاں سنو، میرا خیال یہ ہے کہ عرب نوابوں کے دن ابھی اور خراب ہونے والے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ہم ایک بڑی خوفناک جنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

جی ہاں! آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ جس طرح خلیج کی عرب ریاستوں نے صدام کی پشت پناہی کر رکھی ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ برادر کشی کی یہ جنگ ابھی لمبی کھنچے گی، بہزاد نے فکر مندی کا اظہار کیا۔

بولے: نہیں میں ایران عراق جنگ کی بات نہیں کر رہا، میرا اشارہ تو اس خانہ جنگی کی طرف ہے جس کا خمیر اس وقت پورے عالم اسلام میں تیار ہو رہا ہے، ایسا لگتا ہے کہ ہم اہل یورپ کی طرح تیس سالہ مذہبی جنگ کا ایندھن بننے جا رہے ہیں، اگر ایک باریہ شعلہ بھڑک اٹھا تو اسے بجھانا بہت مشکل ہوگا۔

’اجنبی طاقتیں یہی چاہتی ہیں کہ ایرانی انقلاب سے جو زبردست اقدامی انرجی پیدا ہوئی ہے اسے شیعہ سنی کی خانہ جنگی میں الجھا دیا جائے۔‘ بہزاد نے انقلاب کی مدافعت کی کوشش کی۔

’قصور تو دونوں ہی کا ہے، ہم صرف عرب حکومتوں کو الزام نہیں دے سکتے۔ ایران سے اٹھنے والی ہر آواز، خواہ وہ خود کو متحدہ امت کے قالب میں کیوں نہ پیش کرے، اسے اس بات کا بھرپور احساس ہے کہ مختلف عرب ملکوں کی شیعہ آبادی ان کے لیے ہراول دستے کا کام کرے گی۔ وہ عرب شیعہ آبادی کو منظم کرنے کے لیے مسلسل اقدامات بھی کر رہے ہیں۔ پھر یہ کیسے سمجھا جائے کہ ان کی دعوت مسلکی آلودگی سے پاک متحدہ قالب کی امین ہے۔‘

مگر امام نے تو مستضعفین کو متحد کرنے کی بات کہی ہے، بہزاد نے لقمہ دیا۔

عملاً کیا ہو رہا ہے اسے بھی تو دیکھو۔ انقلاب ایران کے بعد اہل تشیع کے خیمے میں غیر معمولی ہلچل ہے۔ افغانستان، عراق، بحرین، کویت اور سعودی عرب ہر جگہ شیعہ آبادی کو منظم کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ عراق میں پچپن فیصد شیعہ آبادی ہے، بحرین میں بھی اہل تشیع کی اکثریت ہے، کویتی شیعوں کے ایک وفد سے ابھی حال ہی میں امام خمینی نے ملاقات کے بعد انھیں یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ مستضعفین کی ایک ایسی پارٹی بنائیں جو انھیں بین الاقوامی طور پر منظم کر سکے۔ سنی ریاستوں کو اب یہ فکر دامن گیر ہے کہ اپنے ہاں بسنے والی شیعہ آبادی کو کیسے قابو میں کیا جائے۔ ابھی پچھلے دنوں لندن کے ایک رسالہ الدستور کے حوالہ سے یہ خبر آئی ہے کہ الاحساء جو سعودی عرب کے مشرق میں شیعہ آبادی کا علاقہ ہے وہاں بھی ایک زیر زمین انجمن وجود میں آگئی ہے۔ ادھر بیروت میں حزب اللہ کے نام سے جو لوگ منظم ہو رہے ہیں ان کی مسلکی شناخت بھی سب پر عیاں ہے۔ پھر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ایرانی انقلاب شیعیت کا نہیں بلکہ اسلام کی احیاء کا پروگرام ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کے پیش نظر عالم اسلام کی سطوت کی بحالی کا منصوبہ ہو، لیکن عملی طور پر آپ یہ

کام اپنے شیعہ ہم قوموں کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں جہاں شیعہ آبادی ہے اسے آپ انقلابی چھاؤنیوں کے طور پر دیکھتے ہیں اور اس کی تنظیم نو کے لیے ریاستی وسائل کام پر لگا رہے ہیں۔ اس طریقہ کار سے سنی دنیا کا متوحش ہونا فطری ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اس طرح ایرانی حکومت نے عرب ریاستوں کو خود ہی یہ موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ شیعہ جارحیت کے مقابلے میں سنی اسلام کے چمپئن کی حیثیت سے سامنے آئیں۔

’مگر ایک بات اور بھی ہے جو ہمارے لئے حیران کن بھی ہے اور تشویشناک بھی۔‘

’وہ کیا؟‘ محمود نے پوچھا۔

عرب دنیا کی وہ اسلام پسند تنظیمیں جنہیں ہم صحوۃ اسلامیہ کا حصہ مانتے ہیں اور وہ حضرات جو فکری اسلامی کے عالی مقام قائدین کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں وہ اس مسلکی جنگ میں کیسے خوشی خوشی شامل ہو گئے؟ اب عالم یہ ہے کہ صحوۃ قائدین سنی اسلام کا ڈھنڈھورا پیٹ رہے ہیں۔ عالم اسلام سیاسی اور فکری طور پر دو خیموں میں بٹ گیا ہے۔ شیعہ اسلام کی قیادت انقلابی ایران کے ہاتھوں میں ہے اور سنی اسلام کی قیادت سعودی عرب کر رہا ہے جسے سلفی / اخوانی اسلام پسندوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ دونوں طرف اسلام کے نام لیوا اپنے اپنے سیاسی آقاؤں کے مفادات کے لئے سرگرم ہیں۔ اس ہنگامے میں اسلام تو اب کہیں نظر نہیں آتا۔ میں نے وضاحت کی۔

’تمہاری بات کسی حد تک درست ہے۔ بہرہ داد نے تائید کی۔ بولا: اس دھماکہ خیز صورت حال کے لئے صحوۃ اسلامیہ کے قائدین بھی برابر کے ذمہ دار ہیں۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ انھوں نے مجرمانہ طور پر اصل حقائق سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ دوسروں کے مقابلے میں انھیں اس بات کا کہیں بہتر اندازہ ہے کہ ایران کا انقلاب عالم اسلام کے لئے کس قدر زندگی بخش پیغام لے کر آیا ہے۔ ایران سے امریکی استعمار کی رخصتی پورے خطے کے لئے فال نیک ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے اسلام اور مسلمانوں کی سر بلندی کے علمبردار عین فیصلہ کن لمحات میں انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے اپنا وزن مخالف خیمے میں ڈال دیں۔‘

’ہاں یہ بات حیران کن تو ہے بلکہ کسی قدر پریشان کن بھی۔ تمہارا کیا خیال ہے، سنی اسلام پسندوں کے لیے امام خمینی کی قیادت کے مقابلے میں امریکی سرپرستی والی ملوکیت کو قبول کرنے کی آخر کیا وجہ ہے؟ کیا صحوۃ کے قائدین کی آنکھوں پر طبع دنیا نے پٹیاں باندھ دی ہیں یا اس کی وجہ کچھ اور ہے؟‘ میں نے محمود کی رائے جاننا چاہی۔

بولا، میں یہ تو نہیں کہتا کہ سنی علماء اور دینی تحریکوں نے آخرت کا سودا کر لیا ہے، یہ کہنا بہت بڑی

جسارت ہوگی۔ ہاں مجھے یہ ضرور لگتا ہے کہ یہ لوگ واقعات و حوادث کا صحیح تجزیہ کرنے میں ناکام رہے اور بالآخر کچھ تو اپنی سادہ لوحی کے سبب اور کچھ ان کی سہل پسندی نے انھیں رخصت کی راہ پر گامزن کر دیا۔ اصل میں ہوا یہ، اب میں تمہیں کیسے بتاؤں، اس بات کو سمجھنے کے لیے جہیمان العتیبہ کی تحریک کے پس منظر کو بھی سمجھنا ہوگا۔ جہیمان کے بارے میں عوامی سطح پر بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ ابھی حال ہی میں کویت سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے سورہ فی رحاب مکہ۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جہیمان سعودی اخوان کی دوسری تیسری نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ وہی اخوان جنہوں نے سعودی ریاست کے قیام میں عبدالعزیز ابن سعود کی مدد کی تھی۔ اخوان سلفی اسلام کی خالص بدویانہ تحریک ہے، اسے اخوان المسلمین کے ساتھ خلط ملط مت کرنا۔ اب ہوا یہ کہ جہیمان نے سعودی عرب کو جب مغرب زدگی کی راہ پر دیکھا تو اس نے اس عمل پر سخت احتجاج کیا۔ پولیس نے اسے اس کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا۔ پھر شیخ بن باز کی مداخلت کے سبب اسے رہائی مل گئی۔ اسے شیخ بن باز کی شاگردی کا بھی شرف حاصل تھا۔ البتہ جب اس نے پندرہویں صدی کے آغاز کے موقع پر حرم مکی کا محاصرہ کر لیا اور عبداللہ قحطانی کو نئی صدی کے مجدد کے طور پر پیش کیا تو شیخ بن باز کے لیے بھی یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اس کی دادرسی کو آتے۔ اس واقعہ نے عالم اسلام کو سخت ہيجانی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ سعودی حکومت کے سامنے بھی حرم مکی کو بزور بازو خالی کرانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ جہیمان تو مارے گئے لیکن سعودی حکومت کی مغرب نواز پالیسی پر ان کی تنقید زندہ رہی۔ اُدھر ایران اسلام کے حوالہ سے قیادت کا دعویدار تھا، اب سعودی حکومت کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ بچا کہ وہ خدمت اسلامی کی مہم میں ایک ایسی پالیسی اپنائے جو نہ صرف یہ کہ ایران سے کہیں بڑھ کر ہو بلکہ جہیمان کے اعتراضات کو بھی باطل کر دیتی ہو۔ لہذا ریاست نے سلفی علماء، جو مصری اخوان کے زیر اثر صحوة اسلامیہ کے امین اور نقیب سمجھے جاتے تھے، ان کی بھرپور سرپرستی کا ارادہ کر لیا۔ سعودی اور ایرانی ریاست کے مابین خدمت اسلامی کے حوالے سے مسابقتی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اگر ایک طرف امام خمینی کو نائب امام کی حیثیت سے ولی فقیہ کے منصب کی دعویداری تھی تو دوسری طرف شاہ فہد نے خود کو جلالت الملک کے بجائے خادم الحرمین کہنے میں عافیت جانی۔ اسی دوران افغانستان میں روسی دراندازی کا واقعہ پیش آگیا۔ امریکہ نے جہاد افغانستان کی سرپرستی کا عزم کیا جس میں سعودی عرب اور پاکستان کو کلیدی رول ادا کرنا تھا۔

اب دیکھئے بات کہاں سے کہاں جا پہنچی، یہ کہتے ہوئے محمود ایک لمحہ کوڑے کے پھر اپنے ہاتھوں کے اشاروں سے دو متبادل خیموں کی نشان دہی کرتے ہوئے بولے: اب انقلاب اسلامی ایران اور اس کی دعوت وحدت و انقلاب کے مقابلہ میں سعودی عرب کے پاس صحوة کے قائدین تھے، اسلامی تحریکیں تھیں اور

افغانستان میں کمیونسٹ روس کے خلاف امریکہ کی سرپرستی میں اسلامی جہاد کا عظیم الشان منصوبہ تھا۔ شیعہ ایران کے مقابلے میں سنی جہاد کے اس متبادل بیانیے میں، جہاں مقابلہ خدا بیزار روس سے تھا، یقیناً کشش زیادہ تھی۔ یہ نیا بیانیہ کچھ اس سرعت سے مرتب ہوا اور آگے بڑھا کہ صحوۃ کے قائدین اس تبدیلی کا کماحقہ ادراک نہ کر سکے، وہ محض اس بات پر خوش تھے کہ حکومت نے حرم مکی کے محاصرے سے سبق لیتے ہوئے ملک میں اسلام نوازی کے کاروبار کو اپنانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ قربانی تو جہیمان اور اس کے رفقاء نے دی تھی، البتہ اس سے پیدا ہونے والی زبردست تخلیقی انرجی کے سہارے صحوۃ کے قائدین ساری دنیا میں جلسوں اور کانفرنسوں کے حوالے سے جہازوں میں اڑتے پھرے۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ وہ جہاد و دعوت کے نام پر اب امریکی خارجہ پالیسی کا حصہ بن چکے ہیں۔

مجھے محمود کے اس تجزیہ پر بڑی حیرت ہوئی، اسلامی حلقوں میں اب تک میں نے جتنی باتیں سنی تھیں اس سے ایک طرح کی بے چینی کا اظہار تو ضرور ہوتا تھا لیکن محمود نے، ایسا لگتا تھا، جیسے سارے منتشر اجزاء کو باہم مربوط کر دیا ہو، جیسے صورت حال کی ایک واضح تصویر سامنے آگئی ہو۔



چند سال بعد جاڑے کی ایک سرد شام کا قصہ ہے۔ میں چند احباب کے ساتھ پشاور کے ایک ریستوراں میں بیٹھا تھا، گفتگو جہاد افغانستان پر چل رہی تھی بھی ایک صاحب نے یہ کہہ کر مجھے چونکا دیا کہ روسی اثرات کے علاقوں میں امریکی خفیہ ایجنسی قرآن مجید کی ترسیل و اشاعت میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہے۔ پہلے تو یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہ آئی، لیکن جب ان صاحب نے مزید تفصیل بتائی کہ ازبک زبان میں قرآن مجید کے تراجم بڑے پیمانے پر چھاپے جا رہے ہیں۔ امریکی ماہرین جنگ کا خیال ہے کہ اس طرح سوویت یونین کے اندرونی علاقوں میں وہ جہاد کی منتقلی میں کامیاب ہو جائیں گے۔

’ایسا تو نہیں کہ وہ ہمارے جذبہ جہاد کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں؟‘

بولے: استعمال تو دراصل ہم انہیں کر رہے ہیں۔ اب تم دیکھنا! پیسہ ان کا، جنگی ساز و سامان ان کا، ٹیکنالوجی ان کی اور وہ اس بات پر مجبور ہیں کہ روسیوں کے مقابلے میں ہماری مدد کریں۔ انھیں اندازہ ہے کہ سرخ فوج کا راستہ ہم ہی روک سکتے ہیں۔ وہ قرآن مجید کا مقامی ازبک ترجمہ خوشی خوشی بانٹ رہے ہیں تاکہ جہاد کی یہ آگ سوویت یونین کے اندرون تک پہنچ جائے۔

یہ سب سن کر میری تشویش میں اور بھی اضافہ ہوا، میں نے پوچھا: کہیں ایسا تو نہیں کہ اسلامی تحریک جو مدت سے ایک آزاد ریاست کا خواب دیکھ رہی ہے اور جو اس مقصد کے لیے بڑی سے بڑی قربانیوں کے

لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرتی رہی ہے، وہ امریکی استعمار کے ہاتھوں نفسیاتی اور جذباتی طور پر ہائی جیک ہو رہی ہے اور ہمیں جوشِ جہاد میں اس بات کا اندازہ نہیں ہو رہا ہے، ورنہ امریکیوں کو بھلا قرآن مجید کی اشاعت میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

بولے: ارے بھئی خدا جس سے کام لے اور جسے چاہے اپنی کتاب کی تکمیل کا شرف بخشے۔  
بجا فرمایا مگر یہاں معاملہ تکمیل کا نہیں۔ یہ بات آپ کیوں بھولے جاتے ہیں کہ امریکیوں نے کتاب کو قبول نہیں کیا ہے، وہ تو اپنے سرمایہ دارانہ ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے ہمارے جذبہ جہاد کا استعمال، بلکہ کہہ لیجئے کہ استحصال کر رہے ہیں۔ انھیں اندازہ ہے کہ مسلمان شوقِ شہادت میں جان دے سکتا ہے، انھیں قرآنی آیاتِ شہادت پر مہینز کرتی ہیں اس لیے ازبکستان کے اسٹریٹیجک علاقوں میں جہاں عرصہ سے مسلمانوں پر خوابیدگی طاری ہے وہ قرآن مجید کے تراجم کے ذریعہ زندگی کی روح پھونکنا چاہتے ہیں۔ مگر ان سب کے پیچھے اصل مقصد کسی نظامِ انصاف کا قیام نہیں بلکہ امریکی استعمار کے تفوق اور اس کی فتح کا داعیہ ہے۔

بولے: یہ بات تو وقت بتائے گا کہ کس نے کس کو استعمال کیا، ہمارے پاس سر دست اس کے علاوہ اور چارہ ہی کیا ہے کہ امریکیوں کی اس فیاضانہ مدد کو پوری خوش دلی اور جذبہ تشکر کے ساتھ قبول کریں۔

## شیخ علی گڑھ کی مجلس میں

علی گڑھ میں میری آمد کے چند ہی ہفتوں بعد میری رسائی شیخ علی گڑھ احمد سورتی صاحب کی مجلسوں تک ہو گئی۔ سورتی صاحب جنرل ایجوکیشن کے ایک موقر استاد تھے۔ فرسٹ ایئر کے طالب علموں کو سائنس اور سوسائٹی کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ جنرل ایجوکیشن کا تصور یہ تھا کہ علوم کے مختلف شعبوں میں اختصاص کے سبب طلباء کے اندر مجموعی سرمایے سے نا آگہی کا جو احساس پایا جاتا ہے اس کا کسی قدر ازالہ ہو جائے، لہذا آرٹس کے طلباء کو سائنس اور اس کی سماجیات اور سائنسی اکتشافات کے نتیجے میں بدلتے معاشرے پر پڑنے والے اثرات جیسے عناوین اس کورس کا حصہ تھے۔

ایک دن کلاس میں بحث اقدار (values) پر چل نکلی۔ شرکیا ہے، خیر کیا ہے، حق اور ناحق کیا ہے، یہ سب اضافی قدریں ہیں یا حتمی یا ان دونوں کے مابین اقدار کا پینڈولم مسلسل گردش میں رہتا ہے۔ بنے بنائے مسلمات کو وہ تحلیل و تجزیے کی میز پر کچھ اس شان سے لاتے کہ ان کی حتمیت کا اعتبار جاتا رہتا۔ ایک دن لیکچر کے دوران ڈرامائی سرعت کے ساتھ کچھلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک طالب علم کے قریب پہنچے اور اس سے پوچھا کہ کیوں بھئی، اگر تمہیں عزت اور دولت دو چیزوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا پڑے تو کس چیز کو ترجیح دو گے؟ پھر زور کا ایک تہقہہ بلند کیا، بولے: لو بھئی ایک اور سادہ لوح کا سراغ ملا، انھیں بھی عزت چاہئے۔ ارے بھئی خالی خولی عزت لے کر کیا کرو گے، دولت تو اپنے ساتھ خود عزت لاتی ہے، انسانوں کے معائب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ طالب علم بیچارہ حیران، ایک نئے لمحے سے دوچار۔

اقدار کے اضافی ہونے کی بحث کچھ اسی شان سے الگ الگ جہتوں سے چلتی رہتی۔ کچھ دنوں بعد ہمیں اندازہ ہونے لگا کہ آئیڈلزم اور پریگمٹزم کے مابین سیاہ و سفید کے علاوہ ایک بڑا علاقہ ان دونوں رنگوں کے سرمی امتزاج کا بھی ہے جسے ہم اپنی عقل و فہم کے مطابق پورے اخلاص اور شرح صدر کے ساتھ اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ اسٹریٹیجک فیصلہ زمان و مکان اور حالات و حوادث کے تابع ہوتا ہے اور اسے ہی شخصی اجتہاد کہتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو انسان محض مسلمات کا آٹومیشن بن کر رہ جائے۔

ایک دن لائبریری سے نکلتے ہوئے استاد محترم سے آمناسامنا ہو گیا۔ میں نے بڑھ کر سلام کیا۔ پوچھا: کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا: آج کل ویلیوز کے اسنس کی تلاش میں ہوں۔ یہ سن کر مسکرائے، بولے: ارے بھئی تم تو کام کے آدمی لگتے ہو۔ پھر پوچھا: ان دونوں باتوں میں فرق سمجھتے ہو، کام کا آدمی ہونا اور کام سے لگ جانا۔ بڑی بڑی صلاحیتیں کام سے لگ کر ضائع ہو جاتی ہیں، کوئی گورنر بنا، کوئی وزارت کے منصب پر پہنچا، کسی کو سفارت ملی اور کوئی نائن ٹو فائیو کے اوقات کا اسیر ہو گیا۔ دنیا نے کچھ اس طرح کام سے لگایا کہ اعلیٰ خیالات کی آبیاری یا ایک نئی دنیا بنانے کا خواب نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

سورتی صاحب سے یہ ملاقات میرے لیے ان کی مجلسوں میں حاضری کا اجازت نامہ بن گئی۔ اب جب بھی موقع ملتا ان کی مجلس میں جا بیٹھتا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر ہو اید ہوتی، صدیق میاں چائے کی ٹرے لیے آتے۔ گرین لیبل کو ایک خاص وقت تک دم دینا اور پیالیوں کو ایک خاص درجہ حرارت تک جوش دینے کا انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ہمیشہ اسی التزام کے ساتھ چائے آتی جس کے پینے کے بعد کہیں اور چائے پینے کا جی نہ چاہتا۔ سورتی صاحب کی مجلس میں طرح طرح کے لوگ ہوتے۔ پائپ پینے والے دانشوروں سے لے کر جبہ و دستار کے حامل اہل علم تک، ہر کوئی یہاں اپنی حاضری کو سعادت جانتا۔ خاص بات یہ تھی کہ بزرگ اساتذہ اور نامی گرامی پروفیسران کی اس مجلس میں ہم جیسے طلباء کو بھی برابر کا شراکت دار سمجھا جاتا۔ ایک دن جب میں وہاں پہنچا تو پروفیسر خورشید الاسلام کو پہلے سے موجود پایا۔ انھوں نے ایک ہاتھ میں پائپ سنبھال رکھا تھا جس سے وقفہ وقفہ سے دھواں اڑاتے جاتے اور درمیان میں جو موقع ملتا اسے اپنے فرمودات سے پُر کر دیتے۔ بات ابوالاعلیٰ مودودی کے اس خطبے کی ہو رہی تھی جو انھوں نے ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کی دعوت پر دیا تھا اور جسے بعد میں اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے کے نام سے شائع بھی کیا گیا۔ خورشید الاسلام غالباً خود اس جلسہ میں شریک تھے، فرما رہے تھے: بھلا بتائیے ان کا مارکسزم کا کیا مطالعہ، پھر تخصیص کے ساتھ، تحقیق کے ساتھ اور معین طور پر انھوں نے کوئی علمی تنقید بھی تو نہیں کی، بس سرسری طور پر مسترد کر دیا۔ سوئینگ اسٹیٹمنٹ دینا تو بڑا آسان ہوتا ہے، یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنا رخ کھڑکی کی طرف کیا اور دھویں کے مرغولے بنانے میں مصروف ہو گئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ابوالاعلیٰ مودودی جیسے عبقری کو جنھوں نے بیسویں صدی کی مسلم فکر کو متاثر کیا ہے، ان حضرات نے کس طرح دھویں کے چند مرغولوں میں نپٹا دیا۔ جی چاہا کہ ان سے اسٹریچی ہال کے اس جلسہ کا آنکھوں دیکھا حال پوچھوں، لیکن ادب مانع رہا۔ کسی پائپ کش دانشور سے یہ میرا پہلا سابقہ تھا، البتہ چند ثانیے بعد انھوں نے کمال انکسار سے جب یہ بات کہی کہ بھئی میں تو ایک ادنیٰ مارکسسٹ ہوں

تو مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ یہ صاحب بھی حضرت مارکس کی عقیدت میں لت پت ہیں۔ عقیدت خواہ پیر صاحب کی ہو یا اپنے ممدوح اسکالر کی، یہ انسان کو صحیح تحلیل و تجزیے کے لائق نہیں چھوڑتی۔

ایک دن اقبال انصاری صاحب، جو خیر سے ہمارے انگریزی کے استاد بھی تھے اور جن کے پاس شیکسپیر تنقید کا پرچہ تھا، سورتی صاحب کی مجلس میں مسئلہ خیر و شر پر گفتگو فرما رہے تھے۔ شر کیا ہے، اس کا اصل منبع کہاں واقع ہے، انسانی رزمیہ میں اس کی کار فرمائی اور پھر حضرت انسان سے اس کا محاسبہ اور اس طرح کے دسیوں اعتراضات جو مختلف فلسفیوں نے بیان کیے ہیں اور جس پر کوئی حتمی گفتگو، نہ اب تک ہوئی ہے اور شاید نہ کبھی ہو سکے گی۔ یہ سوالات اقبال صاحب کے اسلوب خاص میں کچھ اس طرح الجھے جیسے خیالات کی جلیبی بن گئی ہو۔ کچھ تو ان کے اظہار خیال کا یہ طریقہ کہ جملے کبھی مکمل نہیں ہوتے۔ ابھی ایک جملہ یا کوئی بات مکمل بھی نہ ہوتی کہ دوسرے جملے اور دوسرے خیال کو آلیتے۔ بیچ میں سائل کے لیے کوئی وقفہ نہ ہوتا، خود ہی فرماتے کہ نہیں نہیں آپ نہیں سمجھے اور پھر فرمودات کا اٹوٹ سلسلہ جاری رہتا۔ اتفاق سے خیر و شر کے یہی مسائل شیکسپیر کے رزمیہ کو پڑھاتے ہوئے بھی سامنے آ گئے۔ میں نے استاد محترم کے ان ہی لائینل سوالوں کو کلاس میں طالب علمانہ شان سے ان کے سامنے مرصع کر دیا۔ بات پا گئے لیکن غضبناک ہونے کے بجائے سکوت میں عافیت جانی۔ چند دنوں بعد ایک علمی مجلس میں آنے کی دعوت دی۔ گفتگو اس بات پر مرکوز تھی کہ کافر کون ہے؟ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ اساتذہ کی اس مجلس میں انہوں نے مجھ جیسے طالب علم کو بھی اظہار خیال کے لئے نامزد کر رکھا تھا۔ طالب علم کو اس کی پوری شخصیت کے ساتھ تسلیم کرنا، اس کے انفرادی خیالات کو اہمیت دینا اور اسے یہ حق دینا کہ اپنے محدود علم و تجربے کے باوجود وہ بھی ایک رائے رکھنے کا اہل ہے۔ شاید کسی ایسی ہی تربیت گاہ کا نام یونیورسٹی یا اکیڈمی ہوتا ہے۔ یہ محض ہم جیسے طلباء کی خوش قسمتی تھی کہ ہمیں یونیورسٹی کے اندر چل رہی اس یونیورسٹی تک رسائی حاصل ہو گئی تھی، جس کی قیادت شیخ علی گڑھ احمد سورتی صاحب کے ہاتھوں میں تھی۔

ایک دن سورتی صاحب اپنے کمرے میں اداس بیٹھے تھے۔ میں نے اس سے پہلے انہیں کبھی اس طرح بجا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ بولے: ارے بھئی تمہیں نہیں معلوم اریک فرام کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ کون ہے؟ میں نے پوچھا۔ پھر کسی قدر حیرت سے بولے: تم اریک فرام کو نہیں جانتے، ارے بھئی بڑا وقیع کام ہے ان کا، یہ کہتے ہوئے انہوں نے الماری سے ایک کتاب نکالی اور میرے سپرد کرتے ہوئے بولے: یہ آپ کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ سوچا، دیکھوں تو سہی ہمارے سورتی صاحب کو ان کی موت کا اس قدر صدمہ کیوں ہے۔ پہلا ہی باب disobedience یعنی انکار سے متعلق تھا۔ مصنف کا کہنا تھا کہ اگر انکار نہ ہوتا تو انسانی رزمیہ

میں رنگ کیسے بھرا جاتا۔

’قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو‘

لیکن بات ابلیس کے انکار پر ختم نہیں ہوگئی، انکار ایک مثبت قدر بھی ہے۔ دنیا میں نظامِ جبر کے خلاف جن لوگوں نے بھی آواز اٹھائی ہے اور جو لوگ بھی طاغوت کے انکاری رہے ہیں، جنہیں ہم انقلابی صفات کا حامل سمجھتے ہیں اور جن کے دم سے انسانی تہذیب کی تابانی قائم ہے، یہ سب لوگ بنیادی طور پر نظامِ وقت کی نافرمانی کے مجرم ہیں۔ چلئے یہ بات تو ہوئی کفر باطاغوت کی۔ صفحات پلٹے تو ایک جملہ پر جا کر نگاہ اٹک گئی۔

’ہماری معیشت کے صحت مند ہونے کے لیے لازم ہے کہ ہمارے انسان نا صحت مند ہوں۔‘

کیا مطلب؟ مصنف کا کہنا تھا کہ ہم جسے معیشت کی نمونہ کہتے ہیں خاص طور پر سرمایہ دارانہ معاشرے میں جہاں دولت کی ریل پیل اور معیارِ زندگی کے بلند ہوتے ہوئے مظاہر دیکھنے کو مل رہے ہیں تو اس کے پیچھے دراصل ان بے شمار انسانوں کی محرومی ہے جو اس دولت کو پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، لیکن انھیں اس کے ثمرات سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ جدید سرمایہ دارانہ معاشرے کا یہ تضاد اس کے مستقبل کے لیے کچھ اچھا شگون نہیں ہے۔ مصنف کا کہنا تھا کہ ۱۹۵۸ء کا امریکہ انسانی تاریخ کے بہترین ایام میں شمار کیا جائے گا کہ صرف الحالی کی یہ دنیا اس سے پہلے وجود میں نہیں آئی، لیکن خود اس کا وجود میں آنا ہی خطرے کی گھنٹی ہے کہ اس کو برقرار رکھنے اور اسے آگے لے جانے میں انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو محرومی کی بھیٹ چڑھانا ہوگا۔

ایک بات جو ذرا دل کو چھوتی ہوئی معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ ہر شخص پیدا تو کسی نہ کسی طائفے میں ہوتا ہے، البتہ اسے چاہئے کہ وہ اس طائفے کا اسیر رہنے کے بجائے اس سے باہر آنے اور اپنے خود مختار وجود کی تشکیل میں سرگرداں رہے، اسی کو fully born ہونا کہتے ہیں۔ بہت سے لوگ دنیا میں پوری طرح پیدا ہوئے بغیر ہی انتقال کر جاتے ہیں۔ اپنے خول سے باہر آنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ incest کی تعریف بھی بڑی دلچسپ معلوم ہوئی: یعنی ماں کے وجود میں حفاظتی حصار کے تلاش کی کوشش۔ بقول مصنف یہ کام بڑا مشکل ہے کہ آپ اپنے وجود کو پوری طرح خود مختار حیثیت عطا کریں، ورنہ ماں ہو یا خاندان یا طائفہ یا وہ نظری گروہ یا قوم جس کا آپ خود کو نقیب سمجھتے ہیں، اس کی شناخت کو اپنی شناخت جانتے ہیں تو اس میں بڑی عافیت کا سامان ہے۔ لیکن اگر آپ اسی نظری گروہ کا حصہ بنے رہے تو پھر آپ کی علیحدہ پیدائش ہوئی کہاں؟ یہ اور اس قسم کی دسیوں باتیں جو مختلف انداز سے کہی گئی تھیں اس میں ایک طرح کی چونک تھی۔ فرائیڈ کے بعض مسلمات کا مصنف نے سخت ابطال کیا تھا جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ علمی دنیا میں بڑے بڑے اساطین فن کے منارے بھی زمیں بوس کیے جاسکتے ہیں۔

دوسرے دن سورتی صاحب کو کتاب واپس کرتے ہوئے میں نے پوچھا کہ ویسے تو ان صاحب کے ہاں fully born ہونے پر اتنا اصرار ہے کہ اگر آپ بنے بنائے فکری سانچے سے باہر نہ نکلے تو گویا دنیا میں آپ کا وجود میں آنا ہی محل نظر ہے، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ خود یہ اپنے بارے میں یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ میں دراصل ایک سوشلسٹ ڈیموکریٹ ہوں۔ میرے اس اعتراض پر سورتی صاحب مسکرائے، بولے: گو کہ آپ کی بات میں وزن ہے، لیکن نتائج پر اتنی جلدی نہیں پہنچنا چاہئے۔ پہلا مرحلہ شبہ کا ہے اور پھر جب آپ شبہ کے بارے میں شبہ کرنے لگیں تو سمجھئے کہ یقین کی سمت میں آپ کا مزن ہو گئے ہیں۔

جنرل ایجوکیشن سینٹر جہاں سورتی صاحب کا دفتر واقع تھا، مختلف قسم کی غیر نصابی سرگرمیوں کی آماجگاہ تھا۔ کسی گوشہ سے موسیقی کے طلباء و طالبات کے ریاض کی آوازیں آتیں تو کہیں تھیٹر کے شائقین اگلے ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف نظر آتے اور کہیں فلم کلب کے شائقین اگلی ڈاکومینٹری کی نمائش کا پروگرام بناتے دکھائی دیتے۔ رائٹس فورم کے سکریٹری کی حیثیت سے میرے ذمے ادب و ثقافت اور فلسفہ و سیاست جیسے موضوعات پر مجالس کے انعقاد کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی۔ ہفتے عشرے میں شام ڈھلے جلسوں کا انعقاد ہوتا۔ درختوں کے نیچے سبزہ زاروں پر قطار اندر قطار کرسیاں بچھادی جاتیں، اساتذہ آرام دہ صوفوں پر فرورش ہوتے۔ ذائقہ کام و دہن کے لیے چائے اور نمک پاروں کا اہتمام ہوتا۔ کبھی شعر و ادب کی محفل سجتی تو کبھی دوسرے علمی موضوعات پر مقالے پڑھے جاتے۔

ایک بار سویڈن سے روحانیوں کا ایک طائفہ آیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ روحانی ارتکاز کے ذریعہ ہمارے دلوں کی دنیا کو روشن کر سکتا ہے، بلکہ اگر اسے سالکین کا طلب صادق حاصل ہو جائے تو عجب نہیں کہ چند دنوں میں ہماری لطیف روہیں اپنے جسم کے ساتھ فضا میں یوں معلق ہو جائیں جیسے روئی کے گالے۔ انہوں نے ہمیں مختلف قسم کے رنگین تعارفی کتابچے بھی دکھائے جس میں کچھ لوگ فضا میں معلق اور مائل بہ پرواز دکھائے گئے تھے۔ خیال دلچسپ تھا، کچھ اساتذہ اور کچھ طلباء اس روحانی تجربہ کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اب لیجئے ایک نئی مشق شروع ہوئی۔ سالکین کی آنکھیں بند ہیں اور وہ اس بات کی عمدہ کوشش کر رہے ہیں کہ کوئی خیال انہیں چھو نہ جائے۔ پہلے مرحلے میں دل و دماغ کو تمام تر خیالات اور تمام تر وساوس سے پاک کرنا تھا تا کہ دوسرے مرحلے میں اعلیٰ و ارفع خیالات کا داخلہ ممکن ہو سکے۔ چند دنوں تک صبح و شام یہ مجلسیں آباد ہوتی رہیں، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ روحانیوں کا یہ طائفہ اچانک کوچ کر گیا اور فضا میں معلق پھرنے کی حسرتیں ہمارے دلوں میں ہی گھٹ کر رہ گئیں۔

## عقوبت گاہ کا 'مسلمان'

طالب علمانہ زندگی کی یہ تمام مسرتیں جو ایک ناقابل بیان حظ سے معمور تھیں، افسوس کہ عین عید کے دن اسی روایتی حادثے کا شکار ہو گئیں جن سے منقسم ہندوستان میں ہندوستانی مسلمان روزِ اوّل سے نبرد آزما ہیں۔ مراد آباد میں عید کے مجمع پر پولیس کے بے دریغ اور ظالمانہ فائرنگ کی خبریں تھیں۔ سیکڑوں لوگ پولیس کی گولیوں سے مرے اور سیکڑوں کی بھگدڑ میں جان گئی، جن میں ایک بڑی تعداد معصوم بچوں کی تھی۔ سیکولر ہندوستان میں مسلمانوں کو عید کا یہ سرکاری تحفہ تھا مسز گاندھی کی وزارتِ عظمیٰ اور وزیر بہادر سنگھ کی وزارتِ علیا میں عطا ہوا تھا۔ دوسرے دن اخبارات میں جو تصویریں شائع ہوئیں ان میں ایک تصویر جو توں کے ڈھیر کی تھی۔ یہ وہ جوتے تھے جن کے پہننے والے اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ فوٹو گرافر نے شاید اس خیال سے یہ تصویر چھاپی تھی کہ یہ جوتے ناظرین سے بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان جوتوں سے بھی درد و کرب کی متعدد کہانیاں باہر آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، لیکن یہ مرتے، دم توڑتے انسانوں کے آہ و کرب میں ڈوبے آخری لمحات کی کفایت تو نہیں کر سکتے تھے۔ چھوٹے سائز کے طفلانہ جوتوں کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا کہ ان معصوموں نے عید گاہ سے لوٹتے ہوئے عیدی کے پیسوں سے نہ جانے کیا کچھ خریدنے کا پروگرام بنایا ہوگا۔ ماؤں نے کس پیار و محبت سے بچوں کو سجا بنا کر روانہ کیا ہوگا۔ نہ جانے اب یہ معصوم کہاں ہوں۔ جوتوں کے ڈھیر تو محض اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ یہاں سے موت کا کوئی قافلہ گزرا ہے، لیکن اس موت کے پیچھے حقیقی انسانوں کی آہ و بکا تک ہماری رسائی نہیں کرتے۔ میری نگاہوں میں یہ تصویر کچھ اس طرح بسی کہ ایک مدت تک نمازیوں کے یہ جوتے، ایسا لگتا جیسے باہم کلام کرنے لگے ہوں۔ برسوں بعد جب میری رسائی ہالوکاسٹ میوزیم تک ہوئی اور میں نے وہاں جوتوں کے ڈھیر اور انسانی بالوں کے ذخیرے کمال احتیاط کے ساتھ سچے دیکھے تو مجھے اندازہ ہوا کہ آثار و تذکار خواہ پوری بات نہ کہہ پاتے ہوں، ایک لمحہ کے لیے ناظر کے وجود میں جھر جھری کی کیفیت پیدا تو کر ہی دیتے ہیں، جیسے سراسیمگی کی ایک رو اس کے سر سے پیر تک گزر گئی ہو۔ البتہ اس وقت نمازیوں کے جوتوں کی اس تصویر کو میں پوری طرح (decipher) نہ کر سکا۔

دن گزرتے گئے، تفصیلات چھن چھن کر آتی رہیں بلکہ یہ کہنے کہ قومی پولیس اور حکومتی مشنری مسلمانوں کے اس قتل عام پر پردہ ڈالنے کی منصوبہ بند کوشش کرتی رہی۔ پہلے تو اس قتل عام کو ہندو مسلم فساد باور کرانے کی کوشش کی گئی اور پھر یہ کہہ کر سارا الزام مسلمانوں کے سر ڈال دیا گیا کہ ابتداً مسلمانوں کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔ انھوں نے پولیس پر سنگباری کی جس کے نتیجے میں پولیس کو گولی چلانی پڑی۔ سرکاری طور پر مرنے والوں کی تعداد ڈھائی تین سو بتائی گئی جبکہ آزاد ذرائع ڈھائی تین ہزار جانوں کے اتلاف کی خبر دے رہے تھے۔ ایم جے اکبر جو ان دنوں نوجوان صحافی کی حیثیت سے ابھر رہے تھے، انھوں نے مراد آباد سے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ پی اے سی نے چالیس ہزار مسلمانوں کے مجمع پر جو عید کی نماز کے لیے جمع ہوئے تھے، بلا درلغ گولیاں چلائیں۔ کتنے لوگ مرے یہ کہنا تو مشکل ہے، ہاں یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مراد آباد میں جو کچھ ہوا وہ ہندو مسلم فساد نہیں تھا بلکہ پولیس کے ذریعہ مسلمانوں کا قتل عام تھا، جسے فساد کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی گئی۔ ٹائمز آف انڈیا نے اس قتل عام کی ذمہ داری مسلمانوں کے فرقہ وارانہ رویے پہ ڈالی اور اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اس کے پیچھے خلیجی ممالک سے آنے والے پیسوں کا بھی ہاتھ ہے، حتیٰ کہ اکنومک اینڈ پولیٹیکل ویکلی (EPW) جیسے جریدے نے بھی، جسے غیر جانبدار حلقوں میں اعتبار حاصل تھا، اس قتل عام کی ذمہ داری مسلمانوں کے ”فرقہ پرست رہنماؤں“ اور مسلم لیگ جیسی تنظیموں کے سر ڈال دی۔ عید گاہ میں فی الواقع مسلمانوں پر کیا گزری، بدنام زمانہ پی اے سی نے نہتے مسلمانوں اور معصوم بچوں کو کس طرح تہ تیغ کیا، یہ کہانی ذرائع ابلاغ کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

ہمارے ایک کلاس فیلو تھے حلیم احمد صدیقی۔ یہ صاحب عمر میں ہم لوگوں سے خاصے بڑے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں بی اے کے خیال سے علی گڑھ آئے تھے، لیکن اپنے بعض گھریلو حالات کی وجہ سے تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے تھے۔ اب سات سالوں کے بعد اپنی غربت کے باوجود دوبارہ پڑھنے کی ہمت جٹائی تھی۔ ان کے جملوں میں ایک خاص قسم کی کاٹ ہوتی اور جب یہ بیان پر آتے تو الفاظ کا ایک طلسم بن دیتے۔ لطائف و حکایات کا ان کے پاس انبار تھا جسے وہ اپنے مخصوص قسم کے حس مزاح کے ساتھ دو آتشہ بنا دیتے۔ کبھی کبھی ان کی بلوغ بیانی اہل مجلس کو شرمسار بھی کر جاتی۔ ایک دن قرۃ العین حیدر سے مل کر آئے۔ جو ان دنوں یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے مقیم تھیں۔ اور ان کے خدو خال پر یہ تبصرہ کر ڈالا کہ کھنڈرات بتاتے ہیں کہ محل اچھا رہا ہوگا۔ حلیم صاحب کو افسانہ نویس کا شوق تھا اور شاعری کو بھی ان سے امان نہیں تھا۔ جب بھی ملتے کچھ نہ کچھ سنانے کی تاک میں رہتے، البتہ ان کی تحریر سے کہیں زیادہ لوگ ان کی دلچسپ گفتگو سننے کے مشتاق رہتے۔ عید کی چھٹیوں کے بعد جب کلاسیں شروع ہوئیں تو حلیم بھائی بہت دنوں

تک غائب رہے، پھر اچانک ایک دن دبے پاؤں کلاس میں کچھ اس طرح داخل ہوئے جیسے ان کے قالب میں کوئی اور آ بسا ہو۔ ہم لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ حلیم بھائی اس طرح بجھے بجھے، خاموش، زندگی سے خالی، حسرت و یاس کی تصویر کیسے ہو سکتے ہیں۔ کلاس کے بعد لڑکوں نے انھیں گھیر لیا، صورت حال جاننا چاہی۔ حلیم بھائی کے دل پر بوجھ تھا، وہ آنسوؤں کی شکل میں باہر آ گیا۔ کہنے لگے: میں پتہ نہیں کیوں زندہ بچ گیا، مجھے بچنا نہیں چاہئے تھا۔ میرے بھائی نے آخر کیا قصور کیا تھا، اسے کیوں مارا گیا۔ اسی نے تو گھر کا سارا بوجھ سنبھال رکھا تھا۔ میں علی گڑھ آ تو گیا ہوں لیکن نہ آتا تو کیا کرتا۔ وہاں پولیس والے تاک میں ہیں، ہر لمحہ گرفتاری کا ڈر۔ ایک تو گھر اجڑا، خاندان تباہ ہوا اور اب جھوٹے مقدمات کا سلسلہ۔ یہ سب کہتے ہوئے حلیم بھائی بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔ ہم لوگوں نے انھیں تسلی دی، ہمت بندھانے کی کوشش کی، لیکن ہم بھی جانتے تھے کہ اس بے بسی کا مداوا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس ملک میں مسلمان ہونے کا مطلب ہے کہ آدمی مسلسل خوف میں جیتا رہے تا آنکہ ظالم کی گولی خوف سے اسے رہائی دلا دے۔

دو چار دن بعد جب حلیم بھائی کے حواس بحال ہوئے تو انھوں نے مربوط گفتگو شروع کی۔ بولے: میں رہنے والا تو امر ہے کا ہوں لیکن عید کے موقع پر ہم لوگ ناہیال میں تھے۔ میرے بھائی نے میری آنکھوں کے سامنے دم توڑا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ مجھے اب بھی اس کی آنکھوں میں منجند خوف کی وہ کیفیت پوری طرح یاد ہے۔ ظالموں نے اسے طبی سہولت بھی نہ ملنے دی۔ کیا پتہ کسی دم جی اٹھتا، اس بات کا شاید مجھے زندگی بھر قلق رہے۔

حلیم بھائی عید گاہ سانحہ کا جب بھی تذکرہ کرتے چند جملوں سے آگے نہ چل پاتے، ایسا لگتا جیسے الفاظ ان کا ساتھ چھوڑ جاتے ہوں۔ ایک دن بہتر موڈ میں تھے، خود ہی کہنے لگے جانتے ہو میں خون کے اس دریا سے باہر کیسے آیا۔ کبھی کبھی مجھے اپنی ہمت پر حیرت ہوتی ہے بلکہ بزدلی کہہ لو۔ دراصل ہوا یہ کہ پولیس فائرنگ کے بعد جو بھگدڑ مچی تو اس میں کسی کو پتہ نہ چلا کہ کون کہاں گیا۔ بھائی کے مرنے کا تو مجھے معلوم تھا، لیکن نانا اور ماموں بھی گھر نہیں لوٹے تھے۔ میں کئی دنوں تک قبرستان کے چکر لگاتا رہا۔ پولیس کی ٹرکوں میں جولائشیں پڑی تھیں انھیں پہچاننے کی کوشش کی۔ اسپتال میں مجروحین کے درمیان اپنوں کو تلاش کیا لیکن نہ کہیں ماموں کا پتہ تھا اور نہ نانا کہیں نظر آئے۔ جب اس واقعہ کو چھ سات دن گزر گئے اور ساری امیدیں دم توڑ گئیں تو ایک دن ماموں چھپتے چھپاتے گھر واپس آئے۔ آدھی رات کو دروازے پر دستک ہوئی، ہم لوگوں کا خوف سے برا حال۔ یا خدا! اب کون سی نئی مصیبت آئی ہے۔ بہت پس و پیش کے بعد دروازہ کھولا۔ ماموں کو دیکھ کر حیرت ہوئی، جان میں جان آئی۔ آپ اچانک اس طرح پراسرار انداز سے کہاں سے وارد ہو گئے ہیں؟ میں نے

پوچھا۔ بولے: کیا بتاؤں یقین نہیں آتا مگر جب زندگی پر بن آتی ہے تو انسان کیا کچھ نہیں کر لیتا۔ پولیس فائرنگ کے بعد کچھ دیر تک تو مسلمانوں نے پولیس والوں کا بڑی ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن جب پولیس کی کمک آگئی اور انھوں نے جانوروں کی طرح ہمارا شکار کھیلنا شروع کیا تو جان بچانے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ رہا۔ میں نے قریبی قبرستان میں پناہ لی اور جب وہاں بھی پولیس کی چلت پھرت کا اندازہ ہوا تو ایک ٹوٹی بوسیدہ قبر میں اندر گھس کر بیٹھ گیا۔ تین دنوں تک بھوکے پیاسے وہیں پڑا رہا۔ خطرہ کم ہوا تو ایک قریبی عزیز کے ہاں پہنچا۔ شہر کے مسلم علاقوں میں اب بھی پولیس کے درندے مسلمان مردوں کی تلاش میں تھے۔ اب سوچو کہ عید گاہ سے انھیں گھر واپس پہنچنے میں ایک ہفتہ لگ گیا۔

اور نانا کا کیا بنا؟ میں نے پوچھا۔

بولے: نانا تو گھر سے گرفتار کر کے لے جائے گئے تھے، ان کی طبیعت ناساز تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ پولیس وین سے اسیران میں سے جب کوئی باہر نکلتا تو پولیس کے وحشی درندے لٹھی ڈنڈوں سے اس پر ٹوٹ پڑتے۔ نانا کو سر پر چوٹ لگی، سونخون کا نوارہ نکل آیا، ان کی سفید داڑھی سرخ ہوگئی۔ لیکن پولیس والوں کو اس پر بھی رحم نہ آیا۔ کسی نے انھیں ٹھوکر ماری، وہ زمین پر گرے اور پھر زندہ نہ اٹھ سکے۔ یہ کہتے ہوئے حلیم بھائی کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگ گئیں۔ بولے: ماموں بھی بس یہ سمجھو کہ بس زندہ ہیں مگر زندگی کی کوئی خوبو ان میں اب باقی نہیں ہے۔ زندہ لاشہ کہہ لو۔ قبرستان کی پناہ گزینی نے شاید ان سے زندگی کی ساری رمت چھین لی ہے۔ ان کی بے بسی دیکھ کر نانا کی موت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ کم از کم وہ مردوں کی سی شان سے اپنی قبر میں تو جاسوئے۔ مصیبت تو ہم زندہ رہنے والوں کی ہے، جنھیں زندگی بھی مردوں کے انداز سے بسر کرنی پڑ رہی ہے۔ یہ کہتے ہوئے حلیم بھائی پھر آبدیدہ ہو گئے۔ وہ شاید کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن میں نے اسی پر اکتفا کرنا مناسب جانا، مبادا ان کے ضبط کا بندھ ٹوٹ جائے۔

جنرل ایجوکیشن سینٹر میں سورتی صاحب نے گریٹ بک کلب بھی بنا رکھا تھا جو گاہے بہ گاہے اہم اور شہرہ آفاق کتابوں پر مذاکرے منعقد کرتا۔ اس کے سکریٹری عبدالمجید شمسی ہمارے ہی ہوسٹل میں رہتے تھے۔ شمسی یوں تو انجینئرنگ کے طالب علم تھے، لیکن ادب و فلسفہ میں ان کی خاصی دلچسپی تھی۔ کبھی کبھی اشعار بھی موزوں کر لیا کرتے۔ انھیں نادر کتابوں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس سلسلے میں وہ دو چار ہفتوں پر دہلی میں منعقد ہونے والے سنڈے بازار کا چکر بھی لگا لیا کرتے تھے۔ شمسی کے کمرے میں تلے اوپر کتابیں ہوتیں، اکثر تازہ مگر پرانی کتابیں۔ ایک دن ان کے ہاں پرائیویٹی کی دو کتابیں دکھائی دیں۔ ایک کا نام تھا *Periodic Table* جسے میں پہلی نظر میں کیمسٹری کی کوئی کتاب سمجھا۔ دوسری کتاب کا نام تھا *If this is a*

(Man) جو خودنوشت سوانح قسم کی چیز معلوم ہوتی تھی۔ پتہ چلا کہ مصنف کا تعلق اہل یہود کے طائفے سے ہے اور یہ داستان ان ایام کی ہے جب انھیں دس ماہ تک نازی جرمنی کی عقوبت گاہ میں گزارنے پڑے تھے۔ میرے لیے کسی یہودی مصنف کی آپ بیتی پڑھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میں نے شوق تجسس میں اسے پڑھنا شروع کیا۔ جیسے آگے بڑھتا گیا میرے انہماک میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ تجربہ کچھ جانا پہچانا سا ہو۔ آدھی کتاب کسی قدر عجلت میں ختم ہو گئی، حالانکہ ہر صفحہ پر رک کر سوچنے کو جی چاہتا تھا، لیکن یہ جاننے کی بھی جلدی تھی کہ ان عقوبت گاہوں میں انسانوں کے ہاتھوں انسانوں پر کیا گزری، یہاں تک کہ کتاب کے اس باب میں آپہنچا جس کا عنوان تھا The Drowned and the Saved یعنی بارے میں ان لوگوں کے جو ڈوبے اور جو بچا لیے گئے۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ جرمنی کی ان عقوبت گاہوں میں سب سے نچلے درجے کے قیدیوں کو جن کے اندر زندگی کی کوئی رمت باقی نہ رہ گئی ہو، عرف عام میں مسلمان کہا کرتے تھے۔ مسلمان کا مطلب تھا ایک ایسا قیدی جس کی صحت مسلسل رو بہ زوال ہو، جس کی افادیت جبری مزدوری یا کسی جسمانی کام کے لیے ختم ہو کر رہ گئی ہو اور اب اس کا اگلا ٹھکانہ گیس چیمبر کے علاوہ کوئی اور جگہ نہ ہو۔ ایسے قیدی کو نہ کوئی دوستی کے لائق سمجھتا نہ اس کی مدد کی جاتی تھی کہ اس کا ذکر زبان پر لانے میں بھی لوگ تکلف سے کام لیتے۔ ایک ایسا شخص جس کی افادیت صفر ہو کر رہ گئی ہو اپنے ساتھیوں کی ہمدردی کا مستحق نہیں سمجھا جاتا کہ عقوبت گاہ کا یہی اصول تھا۔

*To he that has, will be given; he that has not, will be taken away.*

ایک ایسی عقوبت گاہ میں جہاں ہر شخص ہمدردی کا مستحق تھا 'مسلمان' کے لیے ہمدردی کا اظہار بھی ایک غیر ضروری شئی سمجھی جاتی تھی کہ ہمدردی کے چند بول کی بھی قیمت ہوتی ہے، اسے ایسے شخص پر کیوں ضائع کیا جائے جس کا کوئی مستقبل نہ ہو، جس کے لیے گیس چیمبر کے دروازے بس وا ہونے ہی کو ہوں۔ قیدیوں میں اگر کسی کی اہمیت تھی تو وہ ان کی افادیت کے سبب تھی۔ ڈاکٹر، درزی، موچی، گلوکار، باورچی یا پھر خوب روٹ کے عقوبت گاہ کے جرمن اہلکاروں سے رابطہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے۔ انھیں کام کا آدمی سمجھا جاتا یا پھر عام قیدیوں میں وہ لوگ جو نازی اہلکاروں کو عقوبت گاہ کے انتظام و انصرام میں امداد بہم پہنچاتے، اپنے ہی ہم قوموں کو قابو میں رکھنے کی ترکیبیں بتاتے۔ یہ لوگ عرف عام میں کا پو کہے جاتے۔ جرمن آفیسروں کی تعداد تو بہت تھوڑی ہوتی، عقوبت گاہوں کا سارا انتظام و انصرام کا پو ہی انجام دیتے جو اپنے ہم قوموں کی نفسیات سے واقف تھے اور انھیں قابو میں رکھنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ یہ یہودی کا پو بسا اوقات جرمن نازیوں سے بھی کہیں زیادہ سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے۔ انھیں خوف تھا کہ اگر انھوں نے

انتظام والنصرام میں کوئی نرمی برتی تو ان کی جگہ کسی دوسرے کو یہ خدمت تفویض کر دی جائے گی اور انہیں اس عہدے کے سبب جو رعایات و عنایات حاصل ہیں وہ جاتی رہیں گی۔ یہ کا پو اپنے عہدے کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے ہم قوموں پر ہر قسم کا ظلم روا رکھتے۔ ان کے پاس کوئی دوسرا متبادل بھی نہ تھا۔ یا تو کا پو بنیں اور اس منصب کو برقرار رکھنے کے لیے تمام اخلاقی حدوں کو پار کر جائیں یا پھر سیدھے سادے بے وقعت قیدی بن کر ’مسلمان‘ بننے کی راہ پر گامزن ہو جائیں۔ لیوی کو اس بات پر حیرت تھی کہ بے حوصلہ، زندگی سے خالی، اپنے مصائب کے شعور سے عاری، اپنی آہ و کراہ کی آوازوں کو سننے سے قاصر لوگوں کی موت کو موت کیسے کہا جائے۔ جو زندگی ہی میں مر چکا ہو بھلا اسے موت کیا آئے گی۔ حسرت و یاس کی اس تصویر کو ’مسلمان‘ کا نام دیا گیا تھا، یعنی ایک ایسا شخص جس کی عزت، غیرت اور حمیت اس سے جدا ہو گئی ہو، اکرامِ آدمیت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ اوشوٹز کی عقوبت گاہ میں اسی چلتے پھرتے لاشے کو ’مسلمان‘ کہتے تھے۔

اہل یہود کے ایک دانشور کی زبانی مسلمان کی یہ تعریف سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ Auschwitz تو ایک تجربہ گاہ تھی جہاں چلتے پھرتے یہودیوں کو تعذیب کے ایسے مراحل سے گزارا گیا کہ وہ آنے والے دنوں میں ’مسلمان‘ کی تصویر بن جائیں۔ لاکھوں یہودیوں کو ’مسلمان‘ بنانے کے لیے، ان کی غیرت و حمیت سلب کرنے کے لیے اور انہیں زندہ لاشوں میں تبدیل کرنے کے لیے ہٹلر کو بڑے پیمانے پر عقوبت گاہیں بنانی پڑیں۔ نازیوں کے ہاتھوں انسانوں کا یہ حشر دیکھ کر دنیا چیخ اٹھی، اتحادیوں کے بمبار طیارے حرکت میں آ گئے، لیکن منقسم ہندوستان میں تیس بتیس سال سے مسلمانوں کو حکومت کے ہاتھوں جس منظم خونخوری مزاحمت کا سامنا ہے اور جس کے سبب بیس کروڑ ہندوستانی مسلمان، اوشوٹز جیسے ’مسلمان‘ بننے کی راہ پر گامزن ہیں۔ اس عقوبت گاہ سے ابھرنے والی مسلمان کی نئی تعریف یہی تو ہے کہ ایک ایسا شخص جس سے اس کے انسانی خواص سلب کر لیے گئے ہوں۔ ان سطور کو پڑھتے ہوئے مجھے حلیم بھائی کے ماموں بہت یاد آئے جو چند دنوں کی قبرگزینی کے سبب اب زندگی کی رفق سے خالی کچھ اس انداز سے زندگی کے دن جی رہے تھے جیسے حقیقی زندگی کے ایام وہ پہلے ہی پورے کر چکے ہوں اور اب آگے جو کچھ ہے وہ اسی ادھ مری زندگی کا بے معنی تسلسل ہے۔ مجھے بار بار حلیم بھائی کی ڈبڈباتی آنکھیں یاد آتیں۔ مراد آباد کا قتل عام اس ملک میں کوئی نیا عمل نہیں تھا۔ مجھے خود اپنی صلابت فکری پر شبہ ہونے لگا۔ میں بھی تو آخر اس تجربہ گاہ کا ایک کردار ہوں۔ بار الہا! مجھے ’مسلمان‘ بننے سے بچا۔

## مولوی کا پو

لیوی کو پڑھتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہوا کہ نازی عقوبت گاہوں میں اہل یہود پر جو گزری اس میں دشمنوں کے مقابلے میں خود ان کے ہم قوموں کا حصہ بھی کم نہ تھا۔ جرمن آفیسروں کی تعداد تو بہت تھوڑی ہوا کرتی تھی۔ چند آفیسر بھلا ہزاروں قیدیوں پر کیسے قابو پاسکتے تھے۔ سو اس کی ترکیب انھوں نے یہ نکالی کہ خود ان ہی قیدیوں میں سے بعض کو کا پو جیسے انتظامی عہدے پر مامور کر دیا اور انہیں اس بات کا اختیار بھی دیا کہ وہ ان ہی قیدیوں میں سے ایک جتھا تشکیل دے لیں جو عام قیدیوں سے کمپ کے اصول و ضوابط کی پابندی کروا سکے۔ ان لوگوں کو کمانڈو کہا جاتا۔ اب شکل یہ بنتی کہ چند جرمن ایس ایس آفیسروں کی تحویل میں ہزاروں قیدیوں پر مشتمل ایک کمپ ہے جسے انھوں نے مختلف کا پوؤں کی نگرانی میں دے رکھا ہے۔ ہر کا پو کے پاس زور آوروں کا ایک جتھا ہے جس کی مدد سے اس نے قیدیوں کو جبری مزدوری پر لگا رکھا ہے۔ کیا مجال کہ کوئی اُف بھی کر سکے، خواہ کسی کی طبیعت خراب ہو یا کم خوابی اور مناسب غذا کی کمی کے سبب صحت گرتی جاتی ہو، کا پوؤں کو اس سے کچھ غرض نہ ہوتی۔ لیوی نے لکھا تھا کہ ایک بار ایک کا پو نے جو اس کے قریب سے گزرا، اپنے گندے ہاتھ کو اس کے کپڑے پر مل کر اس طرح صاف کیا جیسے وہ کوئی آدمی نہیں بلکہ شئی ہو اور اسے اس معاملہ پر ذرہ برابر بھی تاسف نہ تھا۔ کا پوؤں کے ہاتھ میں زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے۔ ویسے تو یہ خود قیدی تھے اور ان کا تعلق بھی اہل یہود سے تھا، لیکن انتظامی امور کو کمال و فاداری سے بجالانے اور نازیوں کی معاونت یا مصاحبت اختیار کر لینے کے سبب انھیں غیر معمولی اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ البتہ انھیں ہر وقت اس بات کا دھڑکا لگا رہتا کہ اگر انھوں نے اپنے ہم قوموں کی طرف نرمی کا رویہ اختیار کیا تو ایسا نہ ہو کہ ان کے ہاتھوں سے یہ پرکشش عہدہ جاتا رہے۔ کا پو، جرمن آفیسروں اور قیدیوں کے درمیان پل کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ہم قوموں پر غلامی مسلط کرنے کی ذمہ داری خوشی خوشی سنبھال رکھی تھی اور اس سبب وہ مختلف مراعات کے مستحق ٹھہرے تھے۔ انھیں جبری مزدوری سے چھٹی مل گئی تھی۔ ان کا کام اپنے ہم قوموں کو مشقت پر لگائے رکھنا تھا۔ انھیں عام قیدیوں کے مقابلے میں راشن زیادہ ملتا، رہنے کے لیے علیحدہ کمرے

ملنے اور عوامی ٹوائٹ کے عذاب سے، جس کے تصور سے ہی اوسان خطا ہوتے تھے، انھیں نجات ملی ہوتی۔ خاص خاص موقعوں پر انھیں سگریٹ اور شراب کی بوتلیں بھی مل جاتیں۔ ان مراعات کے بدلے انھیں صرف ایک کام کرنا تھا وہ یہ کہ کمپ میں حالات معمول پر رہیں۔ بعض اوقات بعض نیک دل کا پو اپنے اس انتظامی منصب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ہم قوموں کی مدد بھی کرتے۔ البتہ ایک بات پر اچھے برے تمام کا پوؤں کا اتفاق تھا کہ موجودہ صورت حال (status quo) برقرار رہے، تبدیلی کی کوئی آواز کہیں سے نہ اُٹھے۔

لیوی نے کمپ کی زندگی کے حوالے سے لکھا تھا کہ جب انسان ایک ایسی صورت حال میں پھنس جاتا ہے جہاں دور دور تک امید کی کرن دکھائی نہیں دیتی تو غلامی کی اس زندگی کا خاصہ ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنی قوم سے بے وفائی کے عوض کوئی عہدہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ اسے قبول کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا تو کوئی اور اس خدمت کو انجام دینے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ مصیبت میں قوم متحد ہو جاتی ہے، لیکن کمپ کی زندگی میں اس قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہاں تو مصیبت سے نکلنے کی ترکیب ہی یہ ہے کہ آپ دوسروں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں۔ آپ کے زندہ رہنے کی کوشش آپ ہی جیسے کسی انسان سے زندگی چھین لیتی ہے۔ اب دیکھئے جو لوگ گیس چیمبر اور آتشی بھٹی، جہاں اہل یہود کی لاشوں کو ٹھکانے لگایا جاتا تھا، کا انتظام و انصرام سنبھالے ہوئے تھے ان کا تعلق بھی تو اہل یہود کے طائفے سے ہی تھا، وہ سوئڈر کمانڈوز کہلاتے تھے۔ انھیں یہ خدمت بھی تفویض کی گئی تھی کہ لاشوں کو جلانے سے پہلے ان میں سے اگر کسی کے سونے کے مصنوعی دانت ہوں تو اسے نکال لیا کریں۔ اس طلسم خانہ ظلم و ستم کی کلید دیکھا جائے تو بڑی حد تک ان ہی کا پوؤں کے ہاتھ میں تھی ورنہ چند جرمن آفیسر لاکھوں یہودیوں پر بھلا کہاں قابو پاسکتے تھے۔

میں نے ابوالکلام آزاد کی تحریر میں ایک جملہ پڑھا تھا۔ مولانا نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ یاد رکھو ہمیں ہمارے علاوہ کوئی اور زین نہیں کر سکتا۔ اب جو میں نے کا پوؤں کی اس کارکردگی کے تناظر میں ہندوستانی مسلمانوں کے حالات پر نظر ڈالی تو مجھ پر ایک نئی حقیقت واشگاف ہونے لگی۔ منقسم ہندوستان کا یہ سیکولر طلسم خانہ بھی کیا ان ہی کا پوؤں کے دم سے قائم ہے؟ احمد آباد کے ۱۹۶۹ء کے فساد سے لے کر مراد آباد کے ۱۹۸۰ء کے قتل عام تک مسلمانوں کی ہمتیں پست کرنے کا جو سلسلہ ہے اس گرداب شر کو لگام دینے کے لیے کہیں سے کوئی مؤثر آواز نہیں اُٹھتی۔ مسلمانوں کے وہ ارباب حل و عقد جو حکمراں کانگریس اور مسلم عوام کے مابین رابطے کا کام انجام دے رہے ہیں وہ بس یہ چاہتے ہیں کہ موجودہ صورت حال برقرار رہے، تبدیلی کی کوئی آواز کہیں سے نہ اُٹھے۔ کانگریسی مولوی ہوں یا سیاسی مسلمان ان کے اندر سخت سے سخت

حالات میں بھی نظامِ وقت کے خلاف اُف کہنے کا یارا نہیں۔ یہ جبہ و دستار والے علماء جن کی زبانیں بظاہر قال اللہ و قال الرسول سے مملو نظر آتی ہیں ہر ایکشن کے موقع پر ہندو احواء پرستی کا عفریت دکھا کر مسلمانوں سے کانگریس کے حق میں ووٹ طلب کرتے ہیں۔ یہ مراعات یافتہ علماء اور سیاسی قائدین بھی کیا یہودی کا پوؤں کی طرح سگریٹ کے چند ڈبوں اور شراب کی چند بوتلوں کے عوض اپنی قوم پر دائمی خوابیدگی اور ابدی عذاب مسلط کیے رکھنے کا سودا کر چکے ہیں؟ لیوی کی یہ کتاب میرے لیے بڑی جان لیوا ثابت ہوئی۔ بارالہا! حقیقت کیا ہے اور نظر کیا آتی ہے، میں چیخ اٹھا اللہم ارنی الأشياء كما هي۔ بارالہا! مجھے اس صورت حال کی اصل حقیقت پر مطلع کر۔



ادھر حلیم بھائی کئی دنوں سے کلاس سے غائب تھے۔ سوچا پتہ نہیں کس حال میں ہوں، ان کی خبر گیری کرنی چاہئے۔ ہم لوگ شام میں ان کے کمرے پہنچے۔ انھیں بستر میں لیٹے دیکھ کر تشویش ہوئی۔ خیر تو ہے؟ میں نے پوچھا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر انھوں نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن پھر نفاہت کے مارے اُٹھ نہ سکے، بستر سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔ بولے: دو تین دن پہلے کچھ حرارت محسوس ہوئی تھی اب بخار تو نہیں ہے مگر کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا، سب کچھ بے معنی سا لگتا ہے۔ مراد آباد کے حالات بھی ابھی تک تشویشناک ہیں۔ کوئی دن نہیں جاتا جب تشدد کا کوئی واقعہ نہ پیش آتا ہو۔ جن لوگوں کے گھر اجڑے، جن کا خاندان تباہ ہوا اب ان ہی لوگوں کو اُلٹا جھوٹے مقدمات میں پھنسا یا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے اس امت کا کوئی پرسان حال نہیں۔ آنکھ لگتی ہے تو عید گاہ کا منظر نگاہوں میں پھر نے لگتا ہے۔ میں نے انھیں اس طرح متفکر اور پریشان دیکھ کر دلجوئی کی خاطر ان سے کہا: آپ اس مسئلہ پر کچھ لکھتے کیوں نہیں، آپ کی تو کہانی کے فن پر بڑی گرفت ہے، اس درد کو لوگوں تک منتقل کیجئے۔ بولے: پہلے میں بھی یہ سمجھتا تھا کہ میں کہانیاں اچھی لکھ لیتا ہوں لیکن اب تو میں خود کہانی بن گیا ہوں، خدا ہماری کہانی میں کوئی پپی اینڈنگ (happy ending) پیدا کر دے۔

مراد آباد کا تذکرہ جب آگے بڑھا تو پتہ چلا کہ مسلم قیادت اس قتل عام پر کسی اقدامی عمل سے مجرمانہ حد تک غفلت برت رہی ہے۔ ابھی چند دنوں پہلے مشاورت کے جلسے کی خبر تو آئی تھی، میں نے انھیں یاد دلانے کی کوشش کی۔ بولے: گیارہ ستمبر کو بچوں کے گھر میں جو جلسہ منعقد ہوا تھا اس میں، میں خود شریک ہوا تھا۔ علی گڑھ کے کچھ اور طلباء بھی تھے۔ ہم لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے قتل عام کے بعد بھی مشاورت کی مجلس عاملہ نے نشستند گفتند برخاستند کے علاوہ کوئی عملی پروگرام نہیں بنایا۔

پھر میٹنگ میں بات کیا طے پائی؟

بولے: کچھ نہیں، ایسا لگتا تھا جیسے انھوں نے رسم ادا کر دی ہو۔ حسب سابق قرارداد پاس ہوئی کہ یہ جلسہ سخت تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ ہم لوگوں کو اس بات پر سخت غصہ آیا، ہمارا اصرار تھا کہ اگر کچھ اور نہ کر سکیں تو کم از کم مشاورت کا ایک وفد فی الفور مراد آباد جائے۔ جب دیکھا کہ لوگ اس کے لیے بھی آمادہ نہیں ہیں تو ہم لوگوں نے سخت احتجاج کیا۔ جلسہ میں بدمزگی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ طلباء نے نعرے لگانے شروع کیے کہ یا تو آپ لوگ کل مراد آباد جائیں یا اپنی قبروں میں جاسوئیں، ایسی ناکارہ اور بے حس قیادت کی ہمیں ضرورت نہیں۔

کون لوگ تھے جلسہ میں؟ میں نے پوچھا۔

وہ تمام لوگ جنہیں ہم بدمزگی سے اپنا ہمدرد و غم گسار سمجھتے ہیں۔ مختلف مسلم جماعتوں کے سربراہان، علمائے عظام اور ملی قائدین سبھی موجود تھے، لیکن ایسا لگتا تھا جیسے کچھ کرنے سے گریزاں ہوں، کسی نے ان کی زبانوں پر تالے ڈال رکھے ہوں۔ اظہار تشویش کے علاوہ ان کی زبان سے کچھ اور نہیں نکل سکا۔

پھر کیا ہوا مراد آباد جانے کا کوئی پروگرام بنا؟

بولے: مراد آباد تو یہ حضرات چند دن بعد گئے البتہ اس سے پہلے انھوں نے وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملاقات کی۔ جیسے اس سفر کے لیے بھی اذن چاہتے ہوں اور پھر ان کی ایماء سے جب یہ وفد مراد آباد پہنچا تو مراد آباد کے کمشنر نے گیٹ ہاؤس میں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا۔ مقامی لوگوں سے ملاقاتیں کروائیں اور چند گھنٹوں کی گفت و شنید کے بعد اس خدشے سے یہ حضرات شہر سے نکل آئے کہ ان کا مزید قیام خطرات کو دعوت دینے کا سبب ہو سکتا ہے۔

’جب یہ حضرات وزیر اعظم کی ایماء پر گئے تھے اور کمشنر مراد آباد نے سرکاری طور پر ان کے قیام کا انتظام بھی کیا تھا تو پھر انہیں کس بات کا خطرہ تھا؟‘

بولے: یہی بات تو سمجھ میں نہیں آتی کہ انہیں مراد آباد سے جانے کی اتنی جلدی کیا تھی۔ انہیں تو چاہئے تھا کہ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے محلوں میں جاتے، ان کا درد دل سنتے، ان میں سے جو لوگ اب تک جیلوں میں ہیں ان کی رہائی کا پروگرام بناتے، جھوٹے مقدموں سے انہیں نکالنے کے لیے وکلاء کا انتظام کرتے اور جو بے گناہ پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے ہیں انہیں انصاف دلانے کے لیے ہر جانوں کے مقدمے دائر کرتے، چشم دید گواہوں کے بیانات قلمبند کرواتے تاکہ دنیا کو اصل صورت حال کا اندازہ ہو سکے۔ اس وفد میں بعض اصحاب قلم اور مصنفین بھی تھے، انہیں یہ بات کیوں نہ سوجھی کہ اس سانحہ پر ایک مفصل رپورٹ مرتب کرنے کا اہتمام کروائیں تاکہ مسلمانوں کے قتل عام کا اس طرح کا واقعہ پھر کبھی پیش نہ آئے۔

’جو لوگ اس وفد میں شامل تھے ان میں بیشتر مسلمانوں کی قابل احترام شخصیتیں ہیں، ہمیں نہیں لگتا

کہ انہوں نے اپنی طرف سے کوئی کمی چھوڑی ہوگی۔

یہ سن کر حلیم بھائی پھر سے گئے، بولے: کمال کرتے ہیں اسی عقیدت مندانہ طرز فکر نے تو ہمارا بیڑا غرق کیا ہے۔ لوگوں کو ان کے القاب و آداب اور جبہ و دستار سے مت پہچاننے، یہ دیکھنے کہ ان کی کارگزاری امت کے تئیں مفید ہے یا مضر۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ امت کے اوپر گزرنے والی ہر قیامت ہمارے قائدین کو وزیراعظم سے ملنے کا ایک موقع فراہم کرتی ہے۔ عاملہ کی ایک میٹنگ، محضر نامہ کی تیاری، پریس میں تشویش کا اظہار، یا تقریب تصویر کشی (photo-opportunity) اور پھر اپنے اپنے گھروں کو واپسی۔ یہ کہتے ہوئے حلیم بھائی اظہار جوش میں اٹھ بیٹھے، بولے: میں تو کہتا ہوں کہ یہ لوگ شاید انتظار میں ہوتے ہیں کہ کہیں فساد ہو تو انھیں وزیراعظم سے ملاقات کا موقع ملے۔

حلیم بھائی کے دل کا درد جو باہر آیا تو طبیعت بحال ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے رخصت کی اجازت لی۔ لوٹتے ہوئے بار بار خیال آتا حلیم بھائی شاید سچ کہتے ہیں۔ اتنے بڑے قتل عام کے بعد مراد آباد کے مسلمانوں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے بجائے اگر کچھ نہیں تو کم از کم ایک وائٹ پیپر تیار کیا جاتا اور خاٹی پولیس آفیسروں اور حکمرانوں کے خلاف مناسب قانونی کارروائی کی منظم کوشش کی جاتی تو کم از کم اس تاثر کو تو ختم کیا ہی جاسکتا تھا کہ اس امت کا کوئی پرسان حال نہیں۔ یہ تو مسئلہ کا صرف ایک پہلو ہے۔ ہمارے علماء و قائدین، خاص طور پر وہ حضرات جنہوں نے مذہب اور روحانیت کے حوالے سے اپنے ارد گرد تقدس کا ایک ہالہ قائم کر رکھا ہے، جن کی ایک آواز پر ملک بھر میں تحفظ شریعت کے جلسے ہونے لگتے ہیں، ندوہ کے پچاسی سالہ جشن میں دور دراز سے ہزاروں لوگ جمع ہو جاتے ہیں، دیوبند کے جشن صد سالہ میں لاکھوں کا مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ حضرات اصلاح احوال کے لئے باقاعدہ اٹھ کھڑے ہوں تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ حضرات کسی عملی اقدام کے بجائے محض وزیراعظم کی طفل تسلیوں پر کیوں اکتفا کرتے ہیں۔ وہ موجودہ صورت حال کو بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ وہ مدت سے فساد، میٹنگ اور پھر وزیراعظم سے ملاقات کے گھسے پٹے فارمولے پر کیوں عامل ہیں؟ ایسا لگا جیسے کوئی میرے دل میں وسوسے ڈال رہا ہو کہ ان کا وقار و احترام بھی تو وزیراعظم سے ملاقات کے سبب ہے۔ وزیراعظم کو بھی ایسے ہی قائدین کی ضرورت ہے جو ہر حادثے اور قتل عام کے بعد وزیراعظم سے ہی دادرسی کا طلبگار ہو۔ وزیراعظم اور ان کی پارٹی کے لیے کوئی کلمہ بغاوت اس کی زبان پر نہ آئے۔ ایک لمحہ کے لیے تو مجھے ایسا لگا جیسے منقسم ہندوستان کے اس طلسم خانے میں ہمارے محترم علماء و قائدین جانے انجانے کا پوؤں کا فریضہ انجام دے رہے ہوں، لیکن پھر یہ سوچ کر اس خیال کو جھٹک دیا کہ مقدس اور روحانی لوگوں کے بارے میں اس طرح کے خیالات شیطان کے وساوس بھی تو ہو سکتے ہیں۔

## دستوری تحفظات

نئے تعلیمی سال کی ابتداء ہو چکی تھی۔ ہماری گفتگو اب بھی مراد آباد کے سانحے سے مملو ہوتی۔ یہ احساس اب بھی عام تھا کہ اس بے آسرا امت کا کوئی خدا نہیں۔ ملٹی اور سیاسی قیادت نے منقسم ہندوستان کے اس سب سے بڑے قتل عام کو روزمرہ کا فساد قرار دے کر نئے معمول (new normal) کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ کہنے کو تو زندگی اپنے راستے پر چل نکلی تھی، مگر ہر پل یہ اندیشہ ستاتا تھا کہ جن سیاسی اور سماجی عوامل نے مراد آباد کے قتل عام کو جنم دیا ہے وہ تو اسی طرح باقی ہیں۔ نہ تو حکومت کے طرز فکر میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے نہ محکمہ پولیس کو لگام دینے کی کوئی کوشش کی گئی اور نہ ہی ارباب اقتدار کی طرف سے اس واقعے پر کسی شرمندگی اور اسے آئندہ روکنے کے لیے کوئی قدم اٹھایا گیا۔ جب سیاسی مشنری حسب سابق مسلم دشمنی کی اسی راہ پر گامزن ہو تو پھر کسی بھی لمحہ کوئی نیا مراد آباد سامنے آسکتا ہے۔ طلباء کی مجلسوں میں ایک نئے راستے کی تلاش کے سلسلے میں پر جوش گفتگو ہوتی مگر راستہ کوئی دکھائی دیتا نہ تھا۔ اسی دوران سورتی صاحب کا حکم ہوا کہ مسلم مسئلہ پر گفتگو کے لیے نوجوانوں میں سے کسی کو دعوت دی جائے اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے جاوید حبیب کا نام بھی طے کر دیا۔ جاوید حبیب، سورتی صاحب کے خاص شاگردوں میں تھے۔ طالب علم لیڈر کی حیثیت سے انھوں نے یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی مہم میں اہم رول ادا کیا تھا۔ مسلم یوتھ کنونشن کے حوالے سے بھی انھیں شہرت مل چکی تھی۔ شعلہ بیان مقرر تھے اور دہلی سے ہفت روزہ ہجوم کے نام سے ایک اخبار نکالتے تھے اور شاید ایک نئی سیاسی راہ کی تلاش میں سرگرداں بھی تھے۔ سورتی صاحب انھیں آدھا قلندر کہتے۔ آدھا اس لیے کہ وہ سیاست کے ایوان میں اسی قلندرانہ شان کے ساتھ اپنی چلت پھرت بنائے رکھتے۔ جاوید صاحب کی آمد کے ساتھ ہی نہ صرف یہ کہ سورتی صاحب کا پرانا بوم کلب پھر سے جی اٹھا بلکہ مسلم مسئلہ بھی پوری طرح مناقشہ کی میز پر آ گیا۔ اب پروگرام کی ترتیب یہ رہتی کہ فورم کے سکریٹری کی حیثیت سے میں موضوع پر کچھ تعارفی کلمات کہتا اور پھر ڈانس فاضل مقرر کے حوالے کر دیتا۔ اس خیال سے کہ گفتگو نتیجہ خیز اور اثر آور ہو کچھ طلباء کو موضوع سے متعلق ضروری معلومات اور اعداد و شمار کے گوشوارے پیش کرنے پر بھی مامور کیا گیا تھا۔

مثلاً سیاسی، ثقافتی اور معاشی صورت حال پر تین الگ الگ خطبات سے پہلے مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کا گوشوارہ، مسلم ثقافتی اداروں کا اجمالی جائزہ اور معاشی زندگی میں ان کی شمولیت پر وائٹ پیپر تیار کیے گئے تھے تاکہ گفتگو صحیح رخ پر اور صحیح تناظر میں چلتی رہے۔ جاوید صاحب عوامی مقرر تھے، انھیں خطابت کا جادو جگانے کا فن خوب آتا تھا۔ اعداد و شمار کے گوشواروں سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ تک انھوں نے طلباء کو اپنے تحریر کلام میں لیے رکھا مگر یہ سوال کہ مسلمان جائیں تو جائیں کدھر، ان کے سیاسی امپارمنٹ کا کام کیسے شروع ہو، یہ سوال ہنوز حل طلب رہا۔

ان دنوں جاوید حبیب صاحب جگ جیون رام کے زیر اثر دلت مسلم سیاسی اتحاد کا تانا بانا بننے میں مصروف تھے۔ دوسرے دن ان کی گفتگو سے پہلے میں نے اس طرز سیاست کی سختی سے نکیر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ اسلامی ایجنڈے سے سراسر انحراف پر مبنی ہے۔ مسلمان خیر امت کی حیثیت سے اس ملک میں جس نظام کے داعی اور نقیب ہیں، اس مشن کی قیادت یہ دلت رہنما نہیں کر سکتے خواہ ان کی نیتیں کتنی ہی صاف کیوں نہ ہوں۔ میں نے یہ بات اتنی شدت سے کہی تھی کہ اس سے فاضل مقرر کی گفتگو کی پوری طرح نفی ہو جاتی تھی۔ جاوید صاحب نے میری باتوں کو خندہ پیشانی سے سنا البتہ سورتی صاحب سے میری اس زیادتی کی شکایت کی کہ میزبان کی حیثیت سے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ کہنے لگے کہ تحریر کی ادب اور سیاسی اسلام کے مفکرین کو پڑھنے کے بعد ہمارے نوجوانوں کا کچھ اسی قسم کا ذہن بنتا ہے۔ سورتی صاحب نے معاملہ کو یہ کہہ کر رفع دفع کر دیا کہ ارے بھائی کسی شخص میں دین کی غیرت و حمیت ہو، اس کے ہاتھ مولانا مودودی کا لٹریچر لگ جائے اور پھر وہ جماعت اسلامی سے متاثر نہ ہو یا اس کا رکن نہ بنے تو اس کے ایمان پر شبہ کرنا چاہئے۔ لیکن اگر کوئی شخص نوجوانی میں مودودی صاحب کی تحریروں کے سحر میں گرفتار ہو کر جماعت میں داخل ہو جائے اور پھر زندگی بھر وہیں اٹکا رہے تو اس کی عقل پر ماتم کرنا چاہئے اور یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کا ذہنی ارتقاء رک گیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے سورتی صاحب نے قہقہہ لگایا اور مجلس میں باہمی لطف و کرم کی فضا بحال ہو گئی۔ سورتی صاحب ایک زمانے تک جماعت کے سرگرم رکن رہے تھے اور اب بقول خود جماعت سے آگے ان کا علمی اور فکری سفر جاری تھا۔

پروگرام کے خاتمہ کے بعد ایک دن ہم لوگ جنرل ایجوکیشن سینٹر میں مولسری کے درخت کے نیچے چائے کا لطف لے رہے تھے۔ اسی دوران حلیم بھائی بھی ادھر آئے۔ حلیم بھائی جاوید صاحب کے خطبوں میں شریک تو رہے تھے مگر کچھ گم صم سے۔ آج وہ عادل کے ہاتھ میں دستور ہند کا جیبی نسخہ دیکھ کر پھر جزبہ سے ہوئے، بولے: شاید تم اسے حفظ کر کے ہی دم لو گے۔ بھئی دستور سے واقفیت تو ہونی چاہئے نانا کہ یہ پتہ چلے

کہ آپ جس ملک کے شہری ہیں وہاں دستوری طور پر آپ کو کیا تحفظات حاصل ہیں، ہم میں سے اکثر لوگوں کو تو اپنے دستوری حقوق کا پتہ بھی نہیں ہوتا، عادل نے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ عادل کے پاس سیاسیات کا ایک اضافی پرچہ تھا اور شاید اسی حوالے سے دستور میں ان کی اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ دستور کا ایک جیبی نسخہ ہر وقت ساتھ لیے پھرتے۔ وہ اس بات پر اکثر حیرت کا اظہار کرتے کہ جب دستور مسلمانوں کو ایک شہری کی حیثیت سے اور خاص طور پر اقلیتی شہری کی حیثیت سے ایسی مستحکم ضمانتیں دیتا ہے تو پھر اس ملک میں مسلمانوں کا حال اتنا پتلا کیوں ہے۔ اس سلسلے میں عباس سے اس کی اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی۔

حلیم بھائی مراد آباد کے سانچے کے بعد کچھ دنوں تک تو بجھے بجھے سے رہے پھر سراپا احتجاج بن گئے۔ ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ وہ کب کون سا رخ اختیار کریں گے۔ کچھ دیر تو مجلس سے غیر متعلق چائے نوشی میں مصروف رہے پھر کرسی کھینچ کر مرکز میں آ بیٹھے، بولے: ارے بھائی ان باتوں سے کچھ بھی حاصل نہیں۔ مراد آباد کے بعد جو لوگ محبت کے دیپ جلانے کی باتیں کرتے ہیں، وہ دراصل ہمارے کرب سے آگاہ ہی نہیں۔ انھیں کیا پتہ کہ ہم پر کیا گزری ہے اور آج بھی ہمارے اندرون کا زخم کس طرح مسلسل رِس رہا ہے۔ پیام انسانیت کی طفل تسلیوں سے جو لوگ ہمارے کرب کو چھپانا چاہتے ہیں وہ دراصل مجرم ہیں۔ وہ ہمارے ہی خواہ نہیں ہو سکتے۔ کاش کہ وہ اس عذاب سے خود گزرے ہوتے تو انھیں پتہ ہوتا کہ دوسروں کے درد کو ہلکے میں لینا اور اسے زور و خطابت میں اڑا دینا مجروح دلوں کے لیے کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔

حلیم بھائی آپ کی بات درست ہے مگر ہمیں آگے تو بڑھنا ہو گا نا! نئی ترکیبیں دریافت کرنی ہوں گی، ہم آخر کب تک مراد آباد کا ماتم کرتے رہیں گے۔

ماتم؟ بہت خوب! یہ کہتے ہوئے حلیم بھائی نے اپنی کرسی کا رخ پھیر لیا اور مجلس کی طرف اس طرح پیٹھ پھیر کر بیٹھ گئے جیسے احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے ہوں۔

دیکھئے بھئی میری تو یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ ابھی ہم نے دستوری اور قانونی مراعات کو سرے سے استعمال ہی نہیں کیا ہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں ایک قانونی اور دستوری لڑائی کے لیے خود کو تیار کرنا ہو گا۔ تم کس دستور کی بات کرتے ہو، میرا تو خیال یہ ہے کہ اس کی خوشنما دفعات کا غد پر ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ عملی زندگی میں اس کی صورت گری کمزوروں کے بجائے زور آوروں کو تقویت پہنچاتی ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس کی بنا میں ہی کچھ ایسی باتیں رکھی گئی ہیں جو ہندو اکثریت کی بالادستی کو یقینی بناتی ہیں، عباس نے کہا۔

وہ کیسے؟ عادل نے اعتراض وارد کیا۔

بولے: باتیں تو بہت سی ہیں، میں چند ایک مثالیں پیش کیے دیتا ہوں، یہ کہتے ہوئے عباس نے دستور کے ابتدائی صفحات پلٹے، بولا دیکھو یہ دستور کی پہلی دفعہ کیا کہتی ہے:

India, that is Bharat, shall be a union of states.

یہ بھارت کیا ہے، وہی اسطوری ہندوستان جہاں اونچی ذات کے ہندوؤں کو بقول ان کے غلبہ و تفوق حاصل تھا۔ کہتے ہیں کہ جب دستور ساز اسمبلی نئے ہندوستان کا نظری خاکہ تیار کر رہی تھی اس وقت ہندو زعماء کی طرف سے آزاد ہندوستان کو اسطوری بھارت کے احیاء کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ بعض سادھو سنت تو اس مطالبہ کے لیے مرن ورت پر بیٹھ گئے اور ایک خاتون سنیا نے تو باقاعدہ اس بات کی دھمکی دے دی کہ جب تک انھیں اس بات کی یقین دہانی نہیں کرائی جائے گی کہ نئے ہندوستان کا نام بھارت ہوگا اور اس کی قومی زبان ہندی ہوگی وہ اپنا ورت نہیں توڑیں گی۔ نہر و اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا۔ دستور کی دفعہ اول میں بھارت کا لفظ اس بات کا غماض ہے کہ نئے ملک پر اب وہ لوگ حکمراں ہیں جن کی جڑیں قدیم بھارت کی ہندو تہذیب سے جا ملتی ہیں۔

اچھا! میں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا، عادل کے لہجے سے حیرت و استعجاب ظاہر تھا۔

اتنا ہی نہیں، میں تمہیں ایک اور دلچسپ بات بتاتا ہوں، یہ جو تم دستور کی دفعہ اول میں بھارت کو یونین بنانے پر اتنا زور دیکھتے ہو تو اس کے پیچھے بھی ایک تاریخ ہے۔ ہندوستان تو ہمیشہ سے مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا ایک وفاق رہا ہے۔ مغلوں کے دور میں بھی مختلف راجے مہاراجے اپنے طور پر نسبتاً خود مختاری کے ساتھ حکومت کرتے رہے ہیں۔ کچھ یہی صورت حال انگریزوں کے عہد میں بھی قائم رہی۔ اس اعتبار سے تو اس ملک کو ایک فیڈریشن یعنی وفاق ہونا چاہئے تھا، لیکن جن لوگوں نے اسے یونین بنانے کی تحریک چلائی اور سارے اختیارات مرکز کو سونپنے کی کوشش کی، ان کی دلیل یہ تھی کہ ماضی میں ایک مضبوط مرکزی حکومت نہ ہونے کے سبب بیرونی حملہ آوروں کے لیے اس ملک میں قدم جمانا آسان ہو گیا۔ جگت نارائن لال اور کپور جیسے لوگوں کی تقریریں سنئے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ مستقبل کے ہندوستان کو ماضی کے مسلم حملہ آوروں سے بچانے کے لیے مضبوط مرکز کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

عجیب! یہ نکتے آپ کہاں سے لے کر آتے ہیں، عادل نے پھر حیرت کا اظہار کیا۔

بولے: ارے بھئی ایک دو بات ہو تو بتاؤں یہاں تو ایک لمبی فہرست ہے۔ اب اسی ہندو کوڈ بل کو لو جو ۱۹۵۵ء میں نہرو کے دور میں پاس ہوا۔ اس دفعہ نے لفظ ہندو کی ایک ایسی تعبیر کی جس کے مطابق مسلم، عیسائی، یہودی اور پارسی کے علاوہ ہر شخص کو ہندو قرار دے ڈالا گیا۔ حالانکہ بودھ، جین اور سکھ خود کو اس

دائرے میں کھینچ لانے پر مسلسل احتجاج کرتے رہے۔ ان باتوں سے آپ کو یہ نہیں لگتا کہ دستور ہندو اکثریت کو یا کہہ لیجئے کہ برہمن ذہن کو ملک کے مرکزی اسٹیج پر رکھتا ہے جبکہ دوسرے مذہبی فرقے اس تعریف کے سبب حاشیے پر چلے جاتے ہیں۔ اور اگر اب بھی آپ ہماری بات کے قائل نہ ہوں تو آپ آٹھ اگست ۱۹۴۸ اٹھا کر دیکھئے جو زراعت اور مال برداری کے جانوروں سے متعلق ہے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ ریاست کو اس کام پر لگا دیا جائے کہ وہ گائے بچھڑے کے تحفظ کے لیے اقدامات کرے۔ یہ تو اونچی ذات کے ہندوؤں کا ایجنڈا ہے ورنہ ہندوؤں کے بہت سے طبقے گائے کو مقدس نہیں مانتے۔ خاص طور پر جنوب کے ہندو، دولت، عیسائی اور مسلمان اس دفعہ کو ایک ریاستی جبر کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہ کیسا سیکولرزم ہے کہ آپ ایک فرقہ کی روحانیت کو ریاستی مشنری کے ذریعہ دوسرے فرقے پر تھوپنا چاہتے ہیں۔

بات تو صحیح ہے مگر اور بھی تو بہت سی مثبت باتیں ہیں۔ دفعہ ۱۴ کو لیجئے، ۱۸ کو لیجئے، ۳۰ کو لیجئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دستور کے ابتدائیہ کی اٹھان دیکھئے۔ آزادی، مساوات، حریت اور مواخات انسانی پر مبنی ایک معاشرے کے قیام کی خواہش۔ ان باتوں کو آپ کیسے مسترد کر سکتے ہیں؟ ایسا لگا کہ عادل نے اپنے دستور کی تحفظات کے ترکش سے اچانک بہت سے تیر چھوڑ دیئے ہوں۔ بولے، میں ان باتوں کی نکیر نہیں کرتا، میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تنگ نظروں نے اس خوشنما دستاویز کے اندر بھی ایسی ترکیبیں ڈال دی ہیں کہ اس ملک کا رخ مستقبل کی جدید دنیا کے بجائے ہندو تہذیب کے احیاء کی طرف چل پڑا ہے۔ اور یہ کام صرف متعصبین نے نہیں کیا بلکہ ان لوگوں نے کیا ہے جنہیں آپ سیکولر اور روشن خیال ہندو سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اب اسی قومی زبان کے مسئلہ کو لیجئے۔ نہرو اور گاندھی کے ابتدائی بیانات سے بہت سے لوگوں کو یہ لگتا ہے کہ وہ شاید اردو زبان کو اس ملک سے مٹا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ گاندھی نے قومی زبان کے تنازع کو یہ کہہ کر سلجھانے کی کوشش کی تھی کہ ہماری قومی زبان ہندوستانی ہوگی جو دیوناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں لکھی جاسکے گی، لیکن عملاً ہوا کیا۔ دیوناگری رسم الخط والی ہندی ملک کی قومی زبان بنی اور دفعہ 351 میں ریاست کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ ہندی زبان کے ذخیرہ الفاظ کے اضافے میں بنیادی طور پر سنسکرت سے مدد لی جائے۔ اب جو لوگ سنسکرت کو خداؤں اور دیوتاؤں کی زبان سمجھتے ہوں انہیں سنسکرت زدہ ہندی کا فروغ ایک مذہبی فریضہ کی انجام دہی معلوم ہو تو اس میں ان کا کیا قصور؟

حلیم بھائی جو اب تک ہمارے طرز فکر سے نالاں ہماری طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے، اچانک ہماری طرف مڑے اور بولے: عباس! تمہاری باتوں میں وزن ہے البتہ میری طرف سے ایک اور نکتہ کا اضافہ کر لو، وہ یہ کہ دستور لکھنے والوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بات کی بھی گنجائش رکھی ہے کہ تمام خوشنما وعدے

اور تحفظات کی یقین دہانیاں محض وعدے ہی بنے رہیں گے اور یہ سب کچھ بین السطور میں لکھا ہے۔ ورنہ تیس سال بعد بھی انسانوں کی وہ مواخات کیوں نہ قائم ہو سکی۔ آزادی، مساوات اور حریت کی ضمانتیں آج بھی ایک خواب کیوں ہیں۔ تم صحیح کہتے ہو ہمارے دستوری انجینئروں نے گاڑی تو اچھی بنائی، لیکن اس میں بڑی خاموشی سے الٹے گیئر کی ترکیبیں ڈال دیں ورنہ ریاست پر یہ ذمہ داری کیوں ڈالی جاتی کہ وہ آنے والے دنوں میں یکساں سول کوڈ، عدم گاوکشی اور ویدک ہندی کے فروغ کے ذریعہ ہمیں قدیم بھارت کی طرف لے جانے کی کوشش کرے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ریاستی اور قانونی جبر پر روشن خیالی، سیکولرزم اور قانون کی حکمرانی کا پردہ پڑا ہے۔

میرے خیال میں آپ لوگ دو چیزوں کو خلط ملط کر رہے ہیں، ایک دستور کی نظری پوزیشن اور دوسرا عملی اطلاق کے مسائل۔ مگر حلیم بھائی اب کسی کی کہاں سننے والے تھے۔ بولے، عملی اور اطلاقی بات تو بس یہی ہے کہ ان کے علاوہ اب اس ملک میں اور کوئی زندہ نہ بچے۔ وہ ہمیں زندہ دیکھنا نہیں چاہتے اور یہ جو آپ لوگ ہمیں زندہ سمجھے بیٹھے ہیں تو یہ آپ کی بھول ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ سیکولرزم کے اس طلسم خانے میں کوئی بھی اہل ایمان اب زندہ نہیں بچا۔ اپنے اندرون میں ہم دم توڑ چکے ہیں۔ مراد آباد کے قتل عام کے بعد اب زندگی کہاں اور جو لوگ خود کو زندہ سمجھتے ہیں وہ روز روز کی موت دیکھ کر اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ ان کی عقلمیں گنگ، حواس منجمد گویا وہ انسان نہیں، زومی ہوں۔

حلیم بھائی کو یاس و ناامیدی کی دنیا میں واپس جاتے ہوئے دیکھ کر عادل نے انہیں سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ بولا: حلیم بھائی آپ بھی کمال کرتے ہیں، شاعر مشرق تو کہہ گئے ہیں کہ کچھ بات ہے کہ ہستی مٹی نہیں ہماری، من حیث القوم، ہم بڑے بڑے حوادث سے گزر رہے ہیں۔ ہمیں مراد آباد سے بھی کامران گزرنا ہے۔ آگے کا راستہ نکالنا ہے۔

بولے: اجی وہ شاعری ہے اور یہ حقیقت۔ ہمارے سیکولر دوست جو ہمیں مراد آباد کے حادثے کو بھلا کر آگے بڑھ جانے کی تلقین کرتے ہیں وہ ہمیں زندہ ضرور رکھنا چاہتے ہیں مگر bare minimum کی سطح پر۔ انہیں ہمارا بیالوجیکل وجود برداشت ہے شعوری اور نظری شخصیت نہیں۔ اور ہاں تم کہتے ہو کہ مراد آباد سے آگے بڑھیں، دستوری تحفظات کو کام پر لگائیں تو بھئی آگے تو دستوری اور قانونی حیلوں نے ہی راستہ بند کر رکھا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ملک میں مسلم اکثریت کی کوئی اڑتالیس پارلیمانی نشستیں ایسی موجود ہیں جہاں سے ہر حال میں مسلمان کو ہی منتخب ہو کر آنا تھا، اب ان میں بھی چوبیس نشستیں ایس سی ایس ٹی کے لیے محفوظ کر دی گئی ہیں۔ اب بیچارہ مسلمان جائے تو کدھر جائے۔ ہر طرف مزاحمتیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔

آپ کی بات درست ہے، عادل نے انھیں نرم کرنے کی کوشش کی۔ بولا، حالات کی سنگینی سے کسے انکار ہے۔ پہلے تو ملک میں معمول کی زندگی واپس لانی ہوگی۔ فسادات کی روک تھام کے لیے دونوں فرقوں کے مابین افہام و تفہیم اور مکالمے کی راہ اپنانی ہوگی۔

بولے: فسادات کہاں ہوتے ہیں بھائی، انھیں فساد نہ کہو، یہ تو منظم قتل عام ہیں جنہیں حکمراں اپنے سیاسی مصالح کے لیے انجام دیتے ہیں۔

’پھر ان حکمرانوں سے مکالمہ ہونا چاہئے۔‘

مگر مکالمہ تو برابر کی سطح پر ہوتا ہے، یہ تو ہمیں محض اپنے اقتدار کا مہرہ سمجھتے ہیں۔

آپ کی بات سو فیصد درست، میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ میں نے کہا: کیوں نہ حکمرانوں کے دلوں پر دستک دی جائے، کیا پتہ دل کا کوئی دروازہ کھل ہی جائے۔

بولے: یہ ممکن تو ہے مگر اس کے لیے کم سے کم پیسہ ہی چاہئے۔

میں نے کہا: ہیں نا ہم لوگ پیسہ، کار پیسہ پر مامور۔

کون لوگ؟ ایسا لگا جیسے حلیم بھائی کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر ایک زور کا قہقہہ لگایا، بولے: خیر امت! تم کہتے ہو ہم لوگ خیر امت ہیں، بھی لطفہ کہنے میں تمہارا بھی جواب نہیں۔ پھر کسی قدر چیختے ہوئے بولے کہ اگر ہم لوگ واقعی خیر امت ہوتے تو ہمارا یہ حشر کیوں ہوتا۔ اگر ہمارا بھی کوئی خدا ہوتا تو وہ ہمیں بے آسرا کیوں چھوڑ دیتا۔ ہم گنہگاروں کو جانے دیجئے، سات سو بچے مرے ہیں جناب! ہے کسی کے پاس اس کا جواب۔ وہ معصوم بچے اپنے خدا کے آگے سجدہ ریز ہونے کے لیے ہی تو گئے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے خدا کو آخر ہوا کیا ہے۔ کیا وہ بھی پاکستان ہجرت کر گیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز میں ارتعاش نمایاں ہو گیا، آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ رندھی ہوئی آواز میں بولے: کیسا خدا، کس کی عبادت اور کون سی کار پیسہ؟ مجھے ملے تو میں پوچھوں کہ تیرا نام لے کر ہم نے کون سا جرم کیا ہے جو تو نے ہم سے زندگی تو زندگی چھینی، موت سے بھی ہمیں محروم کر دیا۔

حلیم بھائی کو سانحہ مراد آباد کے گرداب میں ڈوبتا دیکھ کر ہم نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔ وہ حرف شکایت کی جس منزل پر جا پہنچے تھے اس کے بعد کسی مناقشے کی گنجائش ہی کب رہ جاتی ہے۔

## سہ ماہی تجدید

لکھنے لکھانے میں حلیم بھائی کی دلچسپی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ ہم لوگوں نے فورم کی طرف سے جب ایک ادبی رسالے کے اجراء کا پروگرام بنایا تو انھوں نے اس میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ سورتی صاحب جوان کی اس ذہنی کیفیت سے شاید کسی قدر واقف تھے، نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ بولے: ارے بھئی لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ اپنے لیے لکھو، اپنے کرب کے مداوے کے لیے لکھو، اہل فکر کے لیے تو لکھنا بھی ایک قسم کی تھیراپی ہے ورنہ وہ اس دور وحشت میں اپنا توازن کھو بیٹھیں۔ مجھے دیکھو! نثری نظم کا ایک قالب مل گیا ہے، میں اس میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں۔ نہ لکھوں تو survival مشکل ہو جائے۔ سورتی صاحب کی یہ باتیں سن کر مجھے اپنے بچپن کے وہ پروفیسر یاد آئے اور ان کا مسلسل خالم خول، خالم خول لکھتے رہنا یاد آیا۔ پھر خیال آیا کہ کیا عجب کہ وہ بھی survival کی ایک اسٹریٹیجی رہی ہو۔

سہ ماہی تجدید کا منصوبہ لے کر ہم لوگ شیخ الجامعہ سید حامد صاحب کے دفتر پہنچے۔ ان دنوں وائس چانسلر کا دفتر وکٹوریہ گیٹ پر ہوا کرتا تھا۔ سید صاحب بڑی ہی خندہ پیشانی سے ملے۔ مسرت کا اظہار فرمایا اور اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ سید صاحب سے میری اس سے پہلے بھی کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ ان کی رہائش گاہ پر منعقد ہونے والی شعری نشستوں میں، میں نے اپنے منظوم ترجمے بھی سنائے تھے۔ اب تو اکثر ایسا ہوتا کہ جب بھی جی چاہتا یا موقع ملتا ہم لوگ، جن میں اکثر عادل، شاہد، عباس اور آل علی شامل ہوتے، سید صاحب سے ملاقات کے لیے جا پہنچتے۔ وہ خود بھی اچھے شاعر تھے اور ان کا ایک شعر تو اہل ذوق کے حلقوں میں زبان زد عام تھا:

ایک دو زخم نہیں جسم ہے سارا چھلانی

درد بے چارہ پریشاں ہے کہاں سے اُٹھے

سچ پوچھتے تو ہماری علمی اور ادبی دلچسپیوں نے سید صاحب کا دل جیت لیا تھا۔ میں نے انھیں بڑا کریم انفس پایا۔ وہ شائستگی کے ایک ایسے سانچے میں ڈھلے تھے جو علی گڑھ کا خاص طرہ امتیاز تھا۔ میں سیکنڈ ایئر کا

طالب علم اور کہاں وہ شیخ الجامعہ۔ جب بھی ملتے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ ایک بار غیر نصابی سرگرمیوں کے حوالے سے کلب کے ذمہ دار طلباء کو عشائیہ پر مدعو کیا اور خود میزبان کی حیثیت سے رکابیاں اٹھا اٹھا کر ہمیں تھمانے لگے۔ سید صاحب کی طرف سے مالی اخراجات کی یقین دہانی مل جانے کے بعد ہم لوگ پورے زور و شور سے رسالے کی تیاری میں لگ گئے۔ طلباء کو نوٹس کے ذریعہ مطلع کیا گیا اور علی گڑھ کے مقامی ادباء، شعراء اور مفکرین سے ملاقاتوں کا پروگرام بنایا گیا۔ اس سلسلہ کا پہلا پڑاؤ اختر انصاری کی رہائش گاہ ٹھہری۔ انصاری صاحب کچھ عرصہ پہلے یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ میری گزارشات سن کر بولے، آپ کو میرے بارے میں کس نے بتایا۔ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ میں مرچکا ہوں، اب کہاں کوئی میرا نام لیتا ہے۔ وہ شعر سنا ہے آپ نے:

یاد ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

کسی کو کیا پتہ کہ اس شعر کا خالق اب بھی زندہ ہے۔ کچھ دیر اسی طرح دنیا کے ہاتھوں اپنی ناقدری کا شکوہ کرتے رہے۔ علی گڑھ کے ایک سابق پروفیسر اور کہنہ مشق شاعر کو اس ذہنی کیفیت میں دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے سوچا شاعر خواہ یہ کتنے ہی اچھے ہوں اور ان کے افسانوں میں خواہ کتنی ہی فنی خوبیاں ہوں، ہیں تو یہ ایک زوال پذیر زبان کے شاعر۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے اردو زبان کو اس ملک سے ہجرت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک ایسی زبان کے شاعر و ادیب کے لیے، جس کی زبان اس ملک سے ہجرت کر گئی ہو، اس ملک میں اب بچا ہی کیا ہے۔ تقسیم ہند نے ان سے ان کی زبان چھین لی۔ گویا زندگی کا تلچھٹ رہ گیا، زندگی اور اس کی مسرتیں غائب ہو گئیں۔ میں نے سوچا کہ یہ صاحب تو اچھے خاصے اشتراکی تھے۔ ترقی پسند تحریک کے اساطین میں ان کا نام لیا جاتا ہے۔ سیکولرزم کا یہ طلسم خانہ بھی کیا خوب ہے! اچھے بھلے اشتراکیوں کو بھی 'مسلمان' بنا دیتا ہے، او شوٹز کا 'مسلمان'۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آیا ہے، ان دنوں قرۃ العین حیدر وزیننگ پروفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ میں مقیم تھیں۔ آرٹس فیکلٹی میں آتے جاتے اکثر ان پر نظر پڑتی۔ ایک دن ہمت کر کے ان کے چیمبر میں جا پہنچا۔ 'تجدید' کے لیے مضمون کی فرمائش کی۔ انھوں نے ٹکا سا جواب دیا۔ بولیں، ارے بھئی میں فرمائش پر نہیں لکھتی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس صورت حال کا سامنا کیسے کیا جائے۔ میں نے کہا: تو پھر بغیر فرمائش کے ہی لکھ دیجئے۔ یہ سن کر انھوں نے میری طرف بغور دیکھا جیسے میری جسارت پر کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن نہ جانے کیوں توقف اختیار فرمایا پھر بولیں: سنڈے کو گھر آئیے گا اپنی فائل میں دیکھوں گی، اگر آپ کے لائق کوئی چیز ہوئی تو دے دوں گی۔ اتوار کو میں ثریا آپا کے گھر پہنچا جو شعبہ اردو کی صدر تھیں اور ان ہی کے ہاں عینی آپا

کا قیام تھا۔ اس دن وہ بڑی خندہ پیشانی سے ملیں۔ مسلم اندلس کی شعری روایت سے متعلق ایک مضمون میرے حوالے کیا جس کا عنوان تھا 'آبِ روانِ کبیر'۔

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

وہ مسلم اندلس کہاں کھویا گیا جہاں بقول جسٹس امیر علی جیسا کہ عینی آپا نے نقل کیا تھا 'عورتوں اور مردوں کے مخلوط معاشرے نے ایک ایسے شائستہ اور نستعلیق طرز زندگی و اخلاق و آداب کو جنم دیا تھا جس کا تصور آج کے ہندی مسلمان کر ہی نہیں سکتے۔ وہ اندلس جس کی عورتیں اتنی باعزت اور آزاد تھیں، تعلیم عام تھی، شاعر ابوالحسین کی بیٹی حسانہ التمیہ اور امّ العلیٰ اور الشریفہ امۃ العزیز، حفصہ الرکینہ، حفصہ بنت حمدون، زینب المروریہ، مریم بنت ابویعقوب انصاری، اسماء العماریہ اور امّ الحنا بنت قاضی ابو محمد عبدالحق ابن عطیہ اپنے اپنے زمانہ کی جیدہ کالرز، استاد، شاعرات اور مقررہ تھیں۔ امّ الحنا ماہر قانون بھی تھیں۔ اشبیلیہ کے آخری حکمراں معتمد کی ملکہ اور اس کی بیٹی دونوں اپنے علم و فضل کے لیے مشہور تھیں۔ مسلم اندلس زندگی کی جملہ مسرتوں سے معمور تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ 'اشبیلیہ میں شام کے وقت لوگ باگ دریا کے کنارے جاتے، کشتیوں میں سیر کرتے، سنترے کے باغوں میں گھومتے، شفق کی روشنی میں غزل گانے والے مطرب اپنے اپنے ستار سنبھالے شہر کی سڑکوں پر نکل آتے۔ ان کے گیت سننے کے لیے عورتیں اپنے گھروں کے جالی دار درپچوں میں جمع ہو جاتیں'۔

اندلس کی یہ جنت ارضی تاریخ کے پردوں میں کھو گئی، لیکن عینی آپا نے تو خود اپنے ملک میں ایک پوری تہذیب کا قتل دیکھا تھا۔ وہ آگ کے دریا کو عبور کر کے سرحد کے پار پہنچیں لیکن جب وہاں بھی انھیں قرار نہ ملا تو وہ ہندوستان لوٹ آئیں۔ اندلس تو محض ایک حوالہ تھا ورنہ اس مصنفہ پر کیا کچھ نہ گزرتی ہوگی جس کی زبان خود اس کی نگاہوں کے سامنے اجنبی بن کر رہ گئی ہو۔ ایک تناور تہذیب کے زوال کو انھوں نے جس طرح محسوس کیا اور اسے اپنے تخلیقی تجربہ کا حصہ بنایا تو اس کے بعد ان کے پاس اس کے علاوہ اور چارہ کیا تھا کہ وہ دیوا شریف کے پیر کے چرنوں میں پناہ لیں۔

معین احسن جذبی بڑے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی رہائش گاہ بھی کیمپس سے قریب ہی تھی۔ علیک سلیک کے بعد مدعا پا گئے۔ دراز سے قلم نکالا اور اپنے حافظہ کی مدد سے فی الفور ایک غزل لکھ کر حوالے کر دی:

وہ تیرگی ہے کہ اکثر خیال آتا ہے  
مرے فلک پہ کوئی آفتاب ہے کہ نہیں

اور ان کا یہ شعر تو میرے حافظہ پر اس طرح چپکا کہ آج بھی کبھی کبھی یاد آجاتا ہے:  
یہ زندگی جو بسر ہو رہی ہے اے جذبی  
خدا ملے تو یہ پوچھوں عذاب ہے کہ نہیں

لطف تو یہ ہے کہ سید حامد صاحب جو اپنے انتظامی فیصلوں اور حوصلہ مند منصوبوں کے سبب ہمیں عزائم کی چٹان دکھائی دیتے تھے، جب ان کے پاس میں رسالے کے لیے کسی تازہ غزل کی فرمائش لے کر گیا تو انھوں نے بھی اپنی غزل کی ابتدا کچھ اسی رنگ کے شعر سے کی:

کیوں فنا سے ڈریں بقا کیا ہے؟  
بجھ گیا دل ہی جب، رہا کیا ہے؟

اور مقطع کا یہ شعر:

گوشہ میں ان حسین آنکھوں کے یہ بتا دیجئے چھپا کیا ہے؟  
خورشید الاسلام جن کے ادنیٰ مارکسٹ ہونے کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، ان کے اشعار سے بھی یہی  
لگتا تھا کہ بظاہر کجیم شمیم اور توانا دکھائی دینے والے اس طرب سنج کے اندرون میں بھی حسرت و یاس نے  
ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔

دل دھڑکتا ہے تو رونے کی صدا آتی ہے  
ایک ہنگامہ سا رہتا تھا مکاں میں پہلے  
اب جو ہے گرمی بازار تو ہم اس میں نہیں  
ہم ہی تھے گرمی بازار جہاں میں پہلے

اور بے چارے شہریار جو فلم 'امراؤ جان ادا' میں اپنے نغموں کے لیے مشہور ہوئے، ان پر تو اس اجڑتی  
تہذیب نے کچھ الگ ہی انداز سے حملہ کیا تھا:

ہر بار پلٹتے ہوئے گھر کو، یہی سوچا  
اے کاش کسی لمبے سفر کو گئے ہوتے  
ہم خوش ہیں ہمیں دھوپ وراشت میں ملی ہے  
اجداد کہیں پیڑ بھی کچھ بو گئے ہوتے

اب یہ بات تو بحث طلب تھی کہ تہذیب کے اجڑنے میں خطا اجداد سے سرزد ہوئی البتہ اس بات کا ہر  
کسی کو اندازہ تھا کہ ہم بحیثیت ملی ایک بے کیف زندگی کے عذاب سے دوچار ہیں۔

تجدید کی اشاعت سے علی گڑھ کے ادبی حلقوں میں ایک ہلچل کی کیفیت پیدا ہوگئی یا کم از کم ہم لوگوں کو کچھ اسی قسم کی مسرت کا احساس ہوا۔ شاید اس کا سبب یہ بھی ہو کہ میں نے اپنے ادارہ میں جس بلند آہنگی کا مظاہرہ کیا تھا اور جس پایہ بلند سے اپنے قارئین کو خطاب کا مستحق سمجھا تھا، تو چلتے پھرتے لوگوں کے چند توصیفی جملوں سے اس احساس عالی کا پیدا ہونا فطری تھا۔ مگر یہ حلقے بھی کیا تھے چند اساتذہ کے ڈرائنگ روم، شعبوں میں تعلیم و تعلم کی کچھ مجلسیں اور شمشاد مارکیٹ یا کیفے ڈی پھوس پر طالب علم ادیبوں اور شاعروں کی مختلف بیٹھکیں جہاں گفتگو کے لیے ہر روز کوئی موضوع اور گپ شپ کے لیے کسی جواز کی تلاش ہوتی۔ ان بیٹھکوں کے شائقین کو اپنے نابغہ عصر ہونے کا بھرپور احساس ہوتا اور ان میں سے ہر کوئی اپنے آپ کو کم از کم بین الاقوامی سطح کی شخصیت ضرور سمجھتا تھا۔ پھر اہل تجدید اس احساس میں کسی سے پیچھے کیوں ہوتے کہ وہ اس رسالے کی اشاعت کے ذریعہ علم و ادب کی ایک نئی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

کچھ اسی اعتماد سے سرشار میں ایک دن پروفیسر نذیر احمد صاحب سے ملاقات کے لیے جا پہنچا۔ نذیر صاحب فارسی کے بڑے اہل علم میں شمار ہوتے تھے۔ یونیورسٹی سے تو ریٹائر ہو چکے تھے، لیکن دہلی میں واقع غالب انسٹیٹیوٹ کے صدر نشین تھے۔ جاڑے کے دن تھے، وہ مجھے اپنے گھر کے باہر سبزہ زار پر چائے سے شغف کرتے ہوئے مل گئے۔ ان کے ساتھ وارث کرمانی صاحب بھی موجود تھے، جن کا مضمون 'یہ دہشت جنوں دیوانوں کا' میں نے تجدید میں شائع کیا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے علی گڑھ کے ایک منچلے صاحب زادے کے حوالے سے لکھا تھا کہ انھوں نے کس طرح امیر منزل کی ایک شعری مجلس میں، جس میں جگر صاحب، سیما صاحب اور سجاد حیدر یلدرم جیسے اہل قلم موجود تھے، اپنی ایک نظم 'گرلس کالج کا تانگہ' پڑھ کر سنائی تھی۔ نظم اس شعر سے شروع ہوتی تھی۔

گرلس کالج کا تانگہ چلا جا رہا تھا میں تانگہ کے بوم میں جتا جا رہا تھا

بزرگوں کی طبیعت پر اس نظم نے کچھ اچھا اثر نہ چھوڑا، لیکن آداب مجلس کے سبب خاموش رہے۔ ان کے بعد جب کرمانی صاحب کی باری آئی تو ایک بزرگ نے ان کی طرف تہر آلودنگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا کہ میاں صاحب زادے! آپ اپنی نظم میں گرلس کالج کے کس پہلو پر روشنی ڈالنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ کرمانی صاحب نے لکھا تھا کہ وہ منچلے صاحب زادے جو اب بھی علی گڑھ میں موجود ہیں اب بزرگوں میں ان کا شمار ہے اور انھوں نے اپنی سن رسیدہ پارسائی کا واسطہ دے کر بڑی خوشامد سے مجھے منع کیا ہے، ورنہ میں ان کا نام لکھ دیتا۔ آج ایک ایسے ہی سفید ریش بزرگ کے ساتھ انھیں چائے پیتا دیکھ کر مجھے نہ جانے کیا سوچھی کہ جب انھوں نے علیک سلیک کے بعد مجھ سے پوچھا کہ میاں کہاں ٹہل رہے ہیں تو میں نے کہا،

بزرگ کی تلاش میں ہوں جن کی پارسائی کا آپ نے واسطہ دے رکھا ہے۔ پتہ نہیں وہ کیا سمجھے، استاد کی مجلس تھی خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔

ان ہی دنوں غالب انسٹیٹیوٹ کا دہلی میں سالانہ بین الاقوامی سمینار ہونے والا تھا اور غالباً یہ حضرات بھی کچھ اسی مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ میری باتیں سن کر نذیر صاحب ایک دعوت نامہ اٹھالائے اور مجھے ازراہ ہمت افزائی رائٹس فورم کے سکریٹری کی حیثیت سے دہلی کے پروگرام میں شرکت کی دعوت دی۔ اب تک یونیورسٹی کی طرف سے میں نے مختلف شہروں میں تقریری مقابلوں میں حصہ لیا تھا۔ ابھی حال ہی میں اپنے ایک عزیز دوست اعجاز مقبول کے ساتھ سیفیہ کالج بھوپال میں شرکت سے لوٹا تھا جہاں عبدالقوی دسنوی اور شہر کے دوسرے اہل علم کی شفقتوں کا سزا اور ٹھہرا۔ البتہ دہلی کا پروگرام اس اعتبار سے مختلف تھا کہ یہاں میرا مقابلہ اپنے ہم عمر طلباء کی ٹیموں سے نہیں، بلکہ سند یافتہ ناقدین اور دانشوروں سے تھا۔ مقالہ کوئی لکھنا نہیں تھا۔ میری حیثیت ایک ناظر اور سامع کی تھی۔ سوچا کیوں نہ بیٹھے، بٹھائے اپنے سر ایک عالمی سمینار میں شرکت کی تہمت بھی لے لی جائے۔

تاریخ مقررہ پر میں غالب انسٹیٹیوٹ پہنچا۔ صبح کا وقت تھا، مقالہ خوانی کی مجلس چل رہی تھی اور مقالہ نگار تھے پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ دو چار منٹ تو صورت حال کو سمجھنے میں لگے، پھر اندازہ ہوا کہ غالب کی شاعری کا کوئی لسانی پہلو زیر بحث ہے۔ غنائی آوازوں کے زیر و بم پر گفتگو چل رہی ہے، البتہ اس کی بعض لسانی تعبیروں اور اصطلاحوں کے تعین میں فاضل مقالہ نگار التباسات کا شکار ہیں۔ میں نے جلدی جلدی ان تسامحات کو نوٹ کیا۔ لسانیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے یہ اسباق تازہ اور ازبر تھے۔ مقالہ سماعی کے بعد جب سوال و جواب کی مجلس شروع ہوئی تو میں نے کچھ کہنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن میری طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ جب دو تین لوگ کلام کر چکے اور میرا بار بار ہاتھ اٹھانا جاری رہا تو بادل ناخواستہ مجھے بھی اجازت مل گئی۔ میں نے کہا کہ اس مقالہ پر میرے کچھ سوالات ہیں اور کچھ ملاحظیات بھی۔ لسانیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ فاضل مقالہ نگار سے فاش غلطیوں کا صدور ہوا ہے۔ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ آل احمد سرور صاحب نے، جو صدر مجلس تھے، میری بات کاٹتے ہوئے کہا، میاں آگے آئیے، پہلے اپنا تعارف کرائیے، آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، پھر اپنا سوال رکھیے۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے پہلے تو اس بات کی صراحت کی کہ میں علی گڑھ میں بی اے کا طالب علم ہوں اور پروفیسر مسعود حسین خاں کا شاگرد، جنہیں اردو لسانیات کے ماہر کی حیثیت سے اتھارٹی کی حیثیت حاصل تھی۔ پھر میں نے سلسلہ وار اپنے اعتراضات رکھے۔ نارنگ صاحب نے اپنی جوابی گفتگو میں سوالات کا راست جواب دینے

کے بجائے بین بین کا راستہ اختیار کیا، آپ کی یہ بات درست ہے لیکن یوں بھی ہوتا ہے۔ ان گول مول بیانات سے اہل مجلس کو اس بات کا تو اندازہ ہو ہی گیا کہ غالباً پھسل جانے یا حافظے میں بعض اصطلاحوں کے خلط ملط ہو جانے والا معاملہ ہے۔ ایک طرف بی اے کا طالب علم اور دوسری طرف مشہور زمانہ پروفیسر جس کے علم و فضل کا ڈنک بج رہا تھا۔ خیر تسامحات تو کسی سے بھی ہو سکتے ہیں، لیکن برسرِ مجلس اس کے اعتراف کا یارا اکثر لوگوں میں نہیں ہوتا۔ مجلس کے خاتمے پر جب چائے کا وقفہ ہوا تو بہت سے بڑے بوڑھوں نے میری پیٹھ تھپتھپائی۔ بعضے اس بات پر خوش تھے کہ ان کی برسرِ مجلس گرفت ہوئی۔ بعض اس خیال سے دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے تھے کہ اگلی مجلس کے مقالہ نگاروں میں ان کا نام بھی شامل تھا۔ مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ان ادبی جلسوں میں دھڑے بندیوں کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ برسرِ مجلس نارنگ کی ٹوپی اچھال کر میں انجانے میں اردو والوں کی سیاست میں جا پھنسا تھا۔

## چوہے، دیمک اور مسلمان

دہلی کے اس سفر میں مجھے کئی دنوں تک جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں قیام کا موقع ملا۔ ان دنوں پرانے کیمپس میں روسی سفارتخانے کی طرف سے کمیونسٹ پارٹی کے لٹریچر پر مشتمل کثرت سے کتابوں کی نمائش لگا کرتی۔ خوبصورت مجلدات میں مارکس، اینگلس، لینن اور اس قبیل کے دیگر مفکرین و مصنفین کی کتابیں کوڑی کے بھاؤ ملا کرتیں۔ طلباء ان کتابوں کو پڑھنے کے خیال سے کم اور آرائش حجرہ کے خیال سے کہیں زیادہ، اٹھالاتے۔ ان ہی نمائشوں کے طفیل پرانی کتابوں کے تاجران بھی وہاں پہنچ جاتے۔ بسا اوقات کام کی چیزیں انتہائی کم داموں میں مل جاتیں۔ پرانی کتابوں کے اس ڈھیر سے میں نے چند کتابیں چنیں جن میں ایک فریڈرک فا کا مشہور زمانہ کتاب *The Metamorphosis* تھی۔ کتاب مختصر تھی، شروع کی تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ بیچ بیچ میں رک کر سوچتا۔ خود کو حیرت و استعجاب کی ایک نئی دنیا میں پاتا۔ پھر اپنی شخصی اور ملی کیفیت پر غور کرتا۔ ایسا لگتا جیسے یہ کہانی رمز و علامت کی سطح پر ہم سے بہت کچھ کہہ رہی ہو۔ بس یہ سمجھنے کہ ایک پیراڈاؤم شفیٹ کی کیفیت تھی۔

کہانی کچھ اس طرح شروع ہوتی تھی کہ ایک دن گرگر سمساجب صبح بیدار ہوا تو اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت و کوفت ہوئی کہ اس کا انسانی وجود ایک بڑے سے کیڑے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ یہ کوئی خواب نہ تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن اب وہ انسان نہیں بلکہ ایک کیڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں مختصر اور منحنی تھیں۔ اس نے سخت بے بسی محسوس کی۔ ارے یہ مجھے کیا ہوا۔ یہ اس کے کام پر جانے کا وقت تھا اور وہ اپنے خاندان کا تنہا کفیل تھا۔ اس کے ماں باپ اور اس کی چھوٹی بہن اس کی اس بدلی ہوئی ہیئت پر ترس کھاتے، لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اب جو اس کی ہیئت بدلی تو ضروریات بھی بدل گئیں۔ ایک کیڑا سڑی گلی چیزیں ہی کھا سکتا تھا۔ اسے بستر اور فرنیچر کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی ماں نے اس خیال سے فرنیچر ہٹا لیا کہ اسے ریگنے کے لیے وافر جگہ مل جائے۔ جب اس کے کمرے سے اس کی محبوب چیزیں ہٹائی جانے لگیں تو سمساکو، جو اب ایک بڑے سائز کا کیڑا تھا، سخت تکلیف ہوئی۔ یہاں تک کہ جب اس

نے اپنی پسندیدہ پیٹنگ کو ہٹتے دیکھا تو اس کے ایک کونے کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دنوں تک تو سمسا کی بہن اس کے کھانے پینے کا انتظام کرتی رہی لیکن ایک کیڑے کی آخر کب تک مدارات ہوتی۔ سمسا کا وجود اہل خانہ کے لیے بھی بوجھ بن گیا۔ گھر میں آمدنی کے ذرائع نہ تھے سو پہلے تو سمسا کے کمرے میں غیر ضروری چیزیں رکھ دی گئیں اور بیرونی حصہ کو کرایے پر اٹھا دیا گیا۔ ایک دن سمسا کو نہ جانے کیا سوچھی، موسم خوشگوار تھا، وہ بڑی مشکل سے دروازہ سر کا کر باہر نکل آیا۔ کرایے دار اسے دیکھ کر بدک گئے۔ جہاں اتنے بڑے بڑے کیڑے ہوں وہاں بھلا کون رہتا۔ گھر والوں کے لیے سمسا کا وجود ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے اہل خانہ کے اس رویے سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔

کوئی انسان اگر اپنے آپ کو اچانک ایک کیڑے کی شکل میں پائے تو ذرا سوچئے کہ وہ خود کو کتنا بے بس محسوس کرے گا۔ کہاں اکرامِ آدمیت کا کلیدی منصب اور کہاں حشرات الارض جیسی بے توقیری کہ جب جو چاہے اسے بلا تکلف مسل دے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی مسلمانوں پر کچھ ایسی ہی قیامت گزری۔ انھوں نے اپنے آپ کو ایک نئی صورت حال میں پایا۔ جس ملک کو صدیوں سے انھوں نے اپنے خون پسینے سے سینچا تھا اور جس کے چپے چپے پر ان کے تفوق کی تاریخی علامتیں مثبت تھیں، اسی ملک میں وہ ملیچھ بمعنی اجنبی کی حیثیت سے دیکھے جانے لگے تھے۔ ان کی جسمانی ساخت کے فرضی نقص کو 'کٹوا' کہہ کر ابھارا گیا۔ انھیں غربت اور کثرت عیالی کے سبب ملک کی معاشی بد حالی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ ان کی آبادی پر لگام کسنے کے لیے ایمر جنسی میں جبری نس بندی کا راستہ اختیار کیا گیا۔ فلم 'قصہ کرسی کا'، جس کا تذکرہ ہم پچھلے صفحات میں کر آئے ہیں، میں انہیں چوہوں کی شکل میں پیش کیا گیا جو ملک کے وسائل کا بڑا حصہ چٹ کر جاتے ہیں اور جس کے سبب اس ملک کی ترقی کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ گو کہ اس وقت امت شاہ کا ظہور نہیں ہوا تھا جنھوں نے برسرا عام انتخابی جلسوں میں ہندوستانی مسلمانوں کو گھس پٹھیا اور دیمک (termite) قرار دیا۔ لیکن اس بات کا تو اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے ہم وطنوں کی نظر میں اکرامِ آدمیت کے شرف سے محروم ہو چکے ہیں۔ کتاب پڑھتے ہوئے مجھے ابا کا وہ جملہ بار بار یاد آیا کہ آزادی کے نام پر ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ جو مکر و فریب ہوا اور تقسیم وطن کے نام پر جو عذاب ان کے مقدر میں لکھ دیا گیا اس حادثہ فاجعہ کے مال و ماعلیہ کو سمجھنے میں ایک نسل گزر جائے گی۔ اب جو میں اس تناظر میں اپنی ملی تاریخ پر نظر ڈالتا تو ایسا لگتا تھا جیسے تلخ اور کرہیہ حقائق سے پردہ اٹھ گیا ہو۔ میں نے سوچا کہ جب تک امت اپنے اصل نظری استوانہ پر دوبارہ نہ لوٹے اس کی بے بسی کا مداوا کیسے ہو سکتا ہے۔ جب تک اس ملک کے حکمرانوں اور برادران وطن کی نظروں میں ہماری حیثیت حشرات الارض کی رہے گی، وہ ہم سے برابری کی سطح پر عزت و

توقیر کا معاملہ کیسے کر سکتے ہیں۔



گنگا ہوٹل سے نشیب کی طرف جہاں درختوں کے نیچے پتھروں کی منڈیروں پر چائے پینے اور گپ شپ کرنے والے طلباء و طالبات کے دم سے شام ڈھلے رونق رہتی تھی وہاں آج ہاسٹل اُتسو کی مناسبت سے ثقافتی پروگراموں کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ٹونک سے چہار بیت گانے والوں کا کوئی طائفہ آیا تھا جس نے دف کی تھاپ پر عشوہ واد کی سحر انگیزی کا تذکرہ چھیڑ رکھا تھا۔ نگاہوں کے تیردلوں کو زخمی کرتے، کبھی دل کے غیاب کا شکوہ ہوتا اور کبھی سنگدلی کا طعنہ دیا جاتا۔ دفعتاً سازندوں کے ہاتھ فضا میں بلند ہوتے دف پر ایک زور کی تھاپ پڑتی اور سب کورس میں ایک ساتھ کہتے دیکھو نہ مجھ کو، ترچھی نظر سے۔ اسی دوران ایک شخص ان کے درمیان سے اٹھا اور اہل مجلس سے یوں گویا ہوا: بھائیو! چہار بیت کی یہ عوامی شاعری کوئی چار سو سالوں سے لوگوں کے دلوں کو گرماتی رہی ہے۔ ٹونک، رامپور، بھوپال جیسی ریاستوں نے اس کی سرپرستی کی، لیکن بد قسمتی سے اب یہ ہندوستانی ثقافت کے حاشیہ پر ہے۔ اگر اس کی سرپرستی نہ کی گئی تو شعر و موسیقی کے اس خوبصورت سلسلہ سے ہم لوگ محروم ہو جائیں گے۔ یہ شاید باضابطہ مجلس کے آغاز کا اشارہ تھا۔ ڈھلتی رات کے منظر نامے میں درختوں کے نیچے طلباء و طالبات کے جھوم اور گاہے گاہے تخبستہ ہواؤں کے تھپڑے ایسا لگتا تھا جیسے صحرا نوردوں کا کوئی قافلہ فطرت کی وادی میں خیمہ زن ہو گیا ہو۔ البتہ جب اشعار کی مشکل زبان سامعین کی ذہنی سطح سے بلند ہونے لگی اور داد و تحسین کا سلسلہ سازندوں پر روپے نچھاور کرنے تک آپہنچا تو ساری توجہ اس امر پر مرکوز ہو گئی کہ طلباء و طالبات اس مجلس کو شعر و موسیقی سے کہیں بڑھ کر باہمی مواخات اور دوستی کے قیام میں استعمال کرنے کا فن کس قدر جانتے ہیں۔ ویسے بھی یہ ایک ثقافتی جشن تھا، یہاں ایک ایسی زبان اور ایسی ثقافت کا نوحہ سننے کی کسے فرصت تھی، جو بقول ان سازندوں کے ہر پل فنا کی طرف بڑھ رہی تھی۔

میں نے اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک نوجوان سے پوچھا، کیا آپ نے پہلے بھی کبھی اس طائفہ کو سنا ہے؟ بولے: میں تو حیران ہوں کہ صرف دف کی مدد سے حکایتوں اور داستانوں کا یہ منظوم سلسلہ گھنٹوں ناظرین کو مسحور رکھ سکتا ہے اور کتنا درد ہے اس بیانیے میں۔

جی ہاں ایک مٹی قوم کا مٹانے ہے، جاتے جاتے بھی تو لطف دے جائے گا، جیسے چراغ بجھنے سے پہلے تیز بھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے۔ پاس میں بیٹھے ہوئے ایک مولوی نما نوجوان نے لقمہ دیا۔

اچھا! میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ شاید میں ان کے اس تبصرہ کے لیے تیار نہ تھا۔ ویسے آپ

یہاں کیا کر رہے ہیں؟ میں نے پوچھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے پہلے نوجوان نے بات اُچک لی، بولا: یہ میرے دوست حیدر ہیں، بیرونی زبانوں کے مرکز میں ایم اے کر رہے ہیں اور مجھے کہتے ہیں احمد صیہونی۔

جی کیا کہا؟ صیہونی کا لفظ سن کر میں چونکا۔

بولے: ماسونی کہہ لیجئے۔ کیا مطلب یہ کہہ لیجئے یا کہتے ہیں کا کیا قصہ ہے؟ آپ جو ہیں وہ کیوں نہیں

بتاتے؟

بولے: یہ کہانی پھر کبھی، ویسے مجھے کامریڈ احمد بھی کہتے ہیں۔ مجھے احمد کی گفتگو میں لطف کا ایک خاص پہلو نظر آیا۔ سوچا ایک شخص کی ذات کے اتنے پہلو۔ اتنی پھسلتی گھومتی اور تغیر پذیر شناخت کا آخر سبب کیا ہے۔ میں نے پوچھا، یہ صیہونی ہونے کا کیا قصہ ہے؟ اور پھر اس مقام سے گرے تو ماسونی بن گئے۔ کیا ان میں سے کوئی آپ کا تخلص ہے؟

بولے: نہیں یہ بات نہیں۔ جب ایک بار آدمی اپنے کھونٹے سے ہٹ جائے تو پھر کسی اور کھونٹے پر فٹ نہیں بیٹھ پاتا۔ مگر کیا کریں مجبوری ہے۔

کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔

بولے: آپ لوگوں کو اس کسک کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ علی گڑھ کے چھوٹے سے جزیرے میں رہتے ہیں، وہاں کوئی بات مزاج کے خلاف ہو جائے تو اسلام خطرے میں آجاتا ہے۔ ہم لوگ بھی جب تک دارالعلوم دیوبند میں تھے ہماری اپنی دنیا تھی۔ حیدر تو اسی سال یہاں آئے ہیں۔ میں چار سالوں سے یہاں کی سیاست کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس شوق میں کبھی کامریڈ بنا اور کبھی دو قدم آگے بڑھ کر اپنے انقلابی ہونے کا ثبوت دینے کے لئے خود کو احمد صیہونی کہلوانے لگا۔ پھر ایسا لگا کہ شاید ماسونی زیادہ مانوس اور قابل قبول لفظ ہو، مگر ان سب باتوں کے پیچھے دراصل ایک ہی دھن تھی کہ جے این یو کے اس ماحول میں جہاں خالص مسلم شناخت کے ساتھ جہد و عمل کی گنجائش کم تھی، اپنے لیے ایک وسیع میدان تلاش کیا جائے۔

پھر کیا ہوا؟ اس کام کے لیے تو آپ کا کامریڈ بننا ہی کافی تھا۔

بولے: ظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے اور میں پہلے ہی جھٹکے میں کامریڈ بن بھی گیا، کمیونزم کی امہات الکتب کے کئی کئی ایڈیشن آج بھی میرے کمرے میں رکھے ہیں۔ روسی مصنفین کی کتابوں سے الماریاں پٹی ہیں۔ بورژوا اور پروتاری کی گردان کرتے اور لوگوں کو طبقاتی کشمکش کا درس دیتے بھی بڑا وقت گزرا۔ کامریڈوں کا یہ جھولا دیکھو آج بھی میرے کندھے سے لٹکا ہے، لیکن ان سب کے باوجود شاید اپنی مسلم شناخت کے سبب

میں اب تک اس مشن کے حاشیہ پر ہی رہا۔ مرکز میں میرے لیے کوئی رول مختص نہ ہو سکا۔  
آخر ایسا کیوں؟ انھیں تو ایسے لوگوں کی تلاش ہوتی ہے۔

بولے: اس کا ایک سبب تو تعصب ہے جو مسلمان کامریڈوں کے لیے ہندو کامریڈوں کے دلوں میں  
پایا جاتا ہے اور دوسرا سبب ان کا ہم سے یہ توقع کرنا ہے کہ ہم پارٹی ممبر بننے کے بعد اپنی مسلمانیت سے پوری  
طرح دست بردار ہو جائیں۔

مگر جب آپ صیہونی اور ماسونی ہو سکتے ہیں تو پھر شکایت کی کہاں گنجائش ہو سکتی ہے؟  
بولے: یہ تو ایک رد عمل ہے۔ میں نے کئی سال اے آئی ایس ایف (AISF) کے ساتھ کام کیا۔  
بہت سے مسلمان طلباء میری وجہ سے بائیں بازو کی سیاسی مہم کا حصہ بنے۔ اسی دوران ایک دن مجھے پتہ چلا کہ  
پرانے کیمپس کے قریب ایک ویران مسجد کی باز آباد کاری کا مسئلہ ہے۔ اس علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی کم  
ہے۔ جے این یو کے طلباء نے جمعہ کی نماز کے لیے ایک مہم کے تحت اس مسجد میں پہنچنے کا پروگرام بنا لیا۔ میں  
بھی اس گروپ کا حصہ تھا بلکہ کہہ لیجئے کہ اس بہانے بہت دنوں بعد مجھے جمعہ کی نماز پڑھنے کی تحریک ملی تھی۔  
میری اس سرگرمی کو پارٹی کے اندر غیر مستحسن نگاہوں سے دیکھا گیا۔ دوستوں نے مجھ پر رجعت پسند ہونے کی  
پھبتی کسی۔ پارٹی سے میری وفاداری شک کے دائرے میں آگئی۔ میں نے سوچا عجیب لوگ ہیں، خود تو مندر  
میں درشن کریں، ہندو تہواروں میں جوش و خروش سے شریک ہوں تو ان کے مارکزم پہ آنچ نہیں آتا۔ لیکن ہم  
مسلمانوں سے مطالبہ ہے کہ ہم اپنے مذہبی ظواہر اور ملی شناخت کو پوری طرح تاج دیں اور لطف تو یہ ہے کہ ان  
سب کے باوجود ہمیں حاشیہ پر ہی رہنا ہے، مرکز میں ہمارے لیے کوئی رول نہیں ہو سکتا۔

’تو کیا اب آپ نے پارٹی کو خیر باد کہہ دیا ہے؟‘

بولے: عملاً تو ایسا ہی ہے البتہ وہ لوگ اب بھی مجھے اپنے حلقہ میں ہی شمار کرتے ہیں۔

’پھر آپ کمیونسٹوں پر تین حرف کیوں نہیں بھیجتے؟‘

بولے: یہ جے این یو ہے، یہاں survival کے لیے کمیونسٹوں سے بہتر کوئی گروپ نہیں۔ اساتذہ میں  
ان ہی کا دبدبہ ہے، ان ہی کے سہارے تقرریاں ہوتی ہیں، بس یہ سمجھئے کہ آپ جے این یو میں داخل ہوئے  
اور کمیونسٹوں کے حلقے میں شامل ہوئے بغیر ٹھنڈے ٹھنڈے جے این یو سے پڑھ کر نکل آئے تو آپ نے  
یہاں کی برکات سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ خالص مسلم شناخت کے ساتھ تو یہاں کیا کہیں بھی آپ کے لیے کوئی  
گنجائش نہیں۔ البتہ گفتگو میں بورژوا، پروتاری کی تکرار اور زندگی کی مارکسی تعبیر اور منہج پر اصرار آپ کو کسی قدر  
قابل قبول بنا دیتا ہے۔ اس کیمپس میں آپ جو دوچار مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو وہ اسی راستہ سے یہاں تک

پہنچے ہیں۔ خیر چلئے ہم لوگوں کو یہ لڑائی لڑنے دیجئے۔ آپ علی گڑھ والے اسلام خطرے میں ہے، کا آوازہ بلند رکھئے۔ آپ کا کام نسبتاً آسان ہے، بلکہ بہت آسان۔ یہ کہتے ہوئے احمد نے میری طرف الوداعی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ سازندوں کی دھمال میں اب ہاؤ ہو کا انداز غالب تھا۔ لوگ ایک عالم وارفتگی میں تھے۔ میں نے ان حضرات سے اجازت لی، آج کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

جے این یو میں جہاں میرا قیام تھا وہاں سے پروفیسر مظفر عالم کی رہائش گاہ زیادہ دور نہ تھی۔ اتوار کی صبح بھائی جان کے ساتھ ان کے ہاں جانے کی تقریب نکل آئی۔ مشیر الحسن، جو بعد میں جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر ہوئے، وہاں پہلے سے موجود تھے۔ گفتگو کا رخ مسلمانوں کے مسائل سے ہوتا ہوا علی گڑھ کی موجودہ صورت حال تک جا پہنچا۔ مظفر عالم اس بات پر مسلسل زور دیتے رہے کہ امت کے ایک فرد کی حیثیت سے ان پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، وہ اس سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ انھیں اس قرض کو بہر طور ادا کرنا ہے۔ امت کے تین ان حضرات کی فکر مندی دیکھ کر یہ اندازہ تو ضرور ہوا کہ ان حضرات نے ایک مخالف ماحول میں اپنی چلت پھرت بنائے رکھنے کے لیے خواہ روشن خیالی یا مارکسی طرز فکر کی جیسی بھی شناخت اختیار کر رکھی ہو، ان کے اندرون اسلام اور مسلمانوں کی فکر مندی سے یکسر خالی نہیں۔ پھر یہ خیال آتا کہ کیا روشن خیالوں میں خود کو قابل قبول بنانے کے لیے اپنی اصل شناخت سے دست بردار ہونا ایک لازمی امر ہے؟ احمد صہیونی کی باتیں یاد آتیں جو دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں، لیکن ایک نئی کمیونسٹ شناخت کے بغیر جے این یو میں اپنا کوئی مستقبل نہیں دیکھتے۔ پھر خیال آتا کہ یہ تو بہت بڑی قیمت ہے۔ خیر یہ تو ایک مخالف ماحول کی بات ہوئی البتہ یہ بات سمجھ میں نہ آتی کہ علی گڑھ میں جن لوگوں نے روشن خیالی کا علم اٹھا رکھا ہے اور جو خود کو ادنیٰ مارکسٹ کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں انھیں ایک مسلم اکثریتی ماحول میں امت کے علی الرغم ایک نئی شناخت کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔

جب میں علی گڑھ سے چلا تھا اس وقت یونیورسٹی میں اسلامیوں اور کمیونسٹوں کے مابین سخت معرکہ آرائی جاری تھی۔ اسلامی نقطہ نظر کی ترجمانی طلباء کر رہے تھے جن کا مقابلہ روشن خیالی کے علمبردار پروفیسر عرفان حبیب اور ان کی کمیونسٹ پارٹی سے تھا، جن کے حامیوں کی ایک وافر تعداد تدریسی اور غیر تدریسی عملے میں کچھ اس طرح داخل ہو گئی تھی کہ عرفان صاحب جب چاہتے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر اصرار کے لیے یونیورسٹی میں بھوک ہڑتال، دھرنے اور مظاہروں کے ذریعہ انتظامیہ کو مفلوج کر دیتے۔ طلباء میں یہ شور تھا کہ وہ بہت قابل پروفیسر ہیں، ان کی کتابیں آکسفورڈ میں چلتی ہیں، اس جیسا کوئی دوسرا اسکالر یونیورسٹی میں نہیں۔ اُدھر تدریسی حلقے میں بھی وہ ایسے مریدوں کو داخل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جو ان کی بات پر

تالی بجانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ سید حامد صاحب جب وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ آئے تو انہوں نے ابتداً عرفان صاحب کو لگام دینے کی کوشش، لیکن پھر شاید ان کی ٹریڈ یونینزم کے خوف سے ان کی طرف نرم رویہ اختیار کر لیا۔ ادھر طلباء وائس چانسلر کو محوِ شر باور کرانے میں جٹ گئے۔ اسلامی حلقے کے ایک جو شیلے طالب علم جو بعد میں علم الادویات کے پروفیسر ہوئے، مجھے اب بھی یاد ہے کس طرح حبیب ہال سے نکلنے والے طلباء کے ایک جلوس کو سید حامد کے خلاف برسرِ پیکار ہونے پر ابھار رہے تھے: 'ان کے پاس اگر بندوق کی گولیاں ہیں تو ہمیں اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، ہم ناخنوں اور دانتوں سے اس کا مقابلہ کریں گے اور اپنے ایمان کے بل بوتے پر انہیں شکست فاش دیں گے۔ اس طرح کی جو شیلی تقریروں میں طلباء یونین کے لیڈران بھی پیچھے نہیں تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اسلام بنام سیکولرزم اور دقیانوسیت بنام روشن خیالی کی فرضی جنگ نے پوری یونیورسٹی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

ایک دن جے این یو کی مرکزی لائبریری میں اخبارات و رسائل کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ میری نظر *Economic and Political Weekly* میں شائع شدہ ایک مراسلہ پر ٹانگ کر رہ گئی۔ عنوان تھا 'اے ایم یو اور عرفان حبیب' اور مراسلہ نگار تھے نئی دہلی کے ایم وائی قاضی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ کمیونسٹوں کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ اپنے منتخب آدمی کی حمایت پر آتے ہیں تو اسے اتنا بڑا بناتے ہیں کہ اس کی ذات کے آگے کسی پارٹی یا علمی ادارے کی حیثیت بھی بے وقعت ہو جاتی ہے۔ عرفان حبیب علی گڑھ کی پیداوار ہیں اور مشکل وقتوں میں علی گڑھ ہمیشہ ان کی مدد کے لیے آگے آیا ہے۔ جب کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ان پر وارنٹ جاری ہوا تھا اس وقت علی گڑھ نے نہرو سے کہہ کر ان کی گرفتاری رکوائی تھی۔ گو کہ وہ علی گڑھ میں ایک استاد تھے، لیکن انہوں نے اس منصب کا خیال رکھے بغیر ٹریڈ یونین ازم اور تصادم کی راہ اختیار کی۔ اس کے باوجود انہیں اوائل عمری میں پروفیسر کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ ان کے مخالفین کہتے ہیں کہ شاید اسی لیے ان کا دماغ خراب ہو گیا۔ مراسلہ نگار نے اس بات کی شکایت کی تھی کہ ان کے طرزِ عمل سے ایسا لگتا ہے کہ وہ یونیورسٹی کے محض ایک ملازم ہوں، یہی خواہ نہیں۔ انہوں نے فریقِ مخالف سے صلح صفائی کی ساری پیشکش ٹھکرادی اور جب معاملہ کی جانچ ایک ہائی کورٹ کے جج سے کرانے کی تجویز سامنے آئی تو اسے یہ کہہ کر ٹھکرادیا کہ ان کے لیے ایک مسلم جج قابل قبول نہیں۔ خیر سے اب ایک سکھ جج کا تقرر ہوا ہے، لیکن اصل سوال یہ ہے، مراسلہ نگار نے پوچھا تھا، کہ کیا مارکسسٹ کسی اخلاقی اصولوں کے تابع نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہے تو پھر مارکس سچائی، ضمیر اور آزادانہ سائنسی جستجو کی بات کیوں کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ کیا ہندوستانی کمیونسٹ واقعی ہندوستان میں سوشلزم کے قیام میں مخلص ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان حضرات نے علی گڑھ کے

قضیے پر ہندو فرقہ پرستوں کے ساتھ مل کر مشترکہ محاذ کیسے بنا رکھا ہے۔ مراسلے میں اور بھی اسی طرح کی بہت سی باتیں تھیں جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ علی گڑھ کے اس شہرہ آفاق پروفیسر کی قوت کا اصل سرچشمہ علمی جلالت کے بجائے دراصل کمیونسٹ پارٹی کی پشت پناہی ہے۔ خیال ہوا کہ جب مراسلے کے کالم میں اس قسم کے خطوط چھپ رہے ہیں تو ذرا اگلے پچھلے شماروں کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا جائے۔ اب جو پچھلے شماروں کی ورق گردانی کی تو ایسے خطوط کی بھرمار تھی جو اس شہرہ آفاق پروفیسر کی جلالت علمی، حق گوئی، انصاف پسندی کی حمایت میں رطب اللسان تھے۔ حیدرآباد، تریوندرم، کلکتہ، بمبئی جیسی جگہوں سے عرفان صاحب کی حمایت میں انفرادی خطوط ہی نہیں بلکہ قراردادیں پاس ہوئی تھیں، جن میں کہا گیا تھا کہ عرفان صاحب پر حملہ دراصل علمی آزادی پر حملہ ہے۔ کہاں ملک گیر سطح کی ایک پارٹی جس کے افراد علمی اور سیاسی اداروں میں موجود ہوں اور کہاں علی گڑھ کے وہ معصوم اور جو شیعے طلباء جو اپنے ناخنوں اور دانتوں سے باطل کا مقابلہ کرنا چاہتے ہوں۔ مقابلہ انتہائی غیر متوازن تھا، اور عرفان صاحب کے پاس ایسے نامہوار مقابلوں میں کامیابی حاصل کرنے کا خاصا تجربہ تھا۔

برسوں بعد جب یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے میری واپسی ہوئی تو مجھے عرفانی ٹولے کی سازشوں کا براہ راست سامنا کرنا پڑا۔ یونیورسٹی میں تو خیر عرفان صاحب کے حامیوں اور ناصروں کی ایک فوج تھی جنہوں نے میری آمد کو یونیورسٹی کے نظری قالب میں ایک بڑی تبدیلی اور بڑے خطرے کے طور پر دیکھا۔ خود عرفان صاحب نے یو جی سی کے اس وقت کے چیئرمین وید پرکاش صاحب کو خط لکھ کر اس بات سے آگاہ کیا کہ مجھ جیسے غیر علمی، پیپفلٹیئر اور غلبہ اسلام کے مصنف کے یونیورسٹی میں پروفیسر کی کرسی پر متمکن ہو جانے سے کس طرح اس دانش گاہ کی سیکولر روایات کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ انہوں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے یہ دلیل بھی دی کہ گاندھی کے سلسلے میں بھی میرے خیالات اچھے نہیں ہیں۔ پہلے تو میں نے ان کی کبر سنی کا خیال رکھتے ہوئے ان سے اعراض برتنے کو ہی مناسب جانا، لیکن جب ان کی سرگرمیوں کا شور تھمتا نظر نہ آیا تو میں نے بادل ناخواستہ ایک اخباری بیان کے ذریعہ موصوف کی اس دانشورانہ غنڈہ گردی کا سخت نوٹس لیا:

علی گڑھ، ۲۲ نومبر ۲۰۱۳ء: علی گڑھ ہسٹورینس سوسائٹی اور یونیورسٹی انتظامیہ کے مابین پیدا ہونے والے حالیہ تنازع کو بعض اخبارات نے اکادمی بنام ملٹری چیپٹلش کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں بائیں بازو کے اس واویلے کو مسلم یونیورسٹی پر ان کے ٹوٹے شکنجے کے طور پر دیکھا جانا چاہئے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر راشد شاز نے برج کورس میں 'المدرسہ سوسائٹی'

کے ہفت روزہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کیا جہاں وہ آج ’علی گڑھ کو نئی حریت فکری کی ضرورت‘ کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹیاں اور دانش گاہیں ایک ایسے ماحول میں اپنے اہداف حاصل نہیں کر سکتیں جہاں کسی ایک گروہ یا شخص نے متبادل نقطہ نظر کے لئے تمام دروازے بند کر دیے ہوں۔ گزشتہ تیس چالیس برسوں سے پروفیسر عرفان حبیب اور ان کے ٹولے نے حریت فکری اور یونیورسٹی کے تکثیری علمی ماحول کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ نوبت بایں جا رسید کہ جنرل شاہ کے دور اقتدار سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ اہم علمی عہدوں پر تقرریوں اور ترقیوں کے لئے بائیں بازو سے راہ و رسم اور ان کی اتباع لازم ہے۔ نام نہاد مارکسسٹوں نے پروفیسر عرفان حبیب کے خیالی بت کا اتنا بڑا ہیولی تراشا کہ عام لوگ مہبوت سے ہو کر رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پس پردہ فیصلوں اور آراء کو یونیورسٹی کے معاملات میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتی گئی۔ اس صورت حال کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ شعبہ تاریخ ہی نہیں بلکہ دوسرے متعلقہ اداروں میں بھی اہل علم کے بجائے عرفان صاحب کے کارناموں پر تالی بجانے والوں کی فوج داخل ہو گئی۔ کسی نے اس خیالی اسطورے کی حقیقت معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی کہ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ دنیا کی کتنی یونیورسٹیوں میں تخصیصی مطالعہ کا موضوع ہے؟ آپ کا مقابلہ اگر ہے تو علی گڑھ سے باہر ملک کی چند جامعات سے اور پاکستان اور بنگلہ دیش کے چند کالجز سے۔ یہ ہے ہمارے مورخ کے انٹرنیشنل فیکٹی ہونے کی حقیقت۔

پروفیسر شاز نے کہا کہ یونیورسٹی کی چہل پہل اور انبساط انگیز علمی زندگی کے لیے لازم ہے کہ یہاں مختلف نقاط نظر کو پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع فراہم کیے جائیں۔ طلباء کو اختلاف فکر و نظر کو انگیز کرنے اور اس کے بیچ اپنا علمی سفر جاری رکھنے کا موقع ملے۔ انھیں یہ بتایا جائے کہ تمہارے اساتذہ نے جو علمی کارنامے انجام دیئے ہیں، جو کتابیں لکھی ہیں تم ان پر اضافہ کر سکتے ہو۔ شرط یہ ہے کہ تم اپنے اساتذہ کو محقق اور جو یائے حق کی حیثیت سے دیکھو، ان کا بت نہ بناؤ، ان کی پرستش نہ کرو اور نہ ہی علمی طور پر ان کو حرف آخر سمجھو۔ پروفیسر شاز نے اس بات پر بھی حیرت کا اظہار کیا کہ یونیورسٹی برادری نے اب تک عرفانی ٹولے کے بے بنیاد علمی پروپیگنڈے کا محاکمہ کرنے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی۔ حالانکہ ان کے سب سے اہم علمی کارنامے *Atlas of the Mughal Empire* کا حال یہ ہے کہ مشہور خریطہ نویس جوزف شوآرٹس برگ اس کاوش کو *Amateurish* یعنی نوکھیپاں پر محمول کرتے ہیں۔ جن کے بقول محض تین معروف نقوش پر تکیہ

کرنے کے سبب مصنف کوئی الگ راہ بنانے اور اپنی تصنیف کو ایک بڑے علمی تجزیاتی مطالعے اور تعلیمی وثیقے میں بدلنے میں ناکام رہے ہیں۔

پروفیسر شاز نے مزید کہا کہ عرفان حبیب صاحب مغل خریطہ نویسوں میں صرف صادق اصفہانی کا نام لیتے ہیں، جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس میدان میں دوسرے اہل فن ناپید تھے۔ مسلم علماء کے یہاں خریطہ نویسی کی ایک شاندار تاریخ رہی ہے۔ عرب اور فارس کو چھوڑیے، مغل ہندوستان میں اہل علم کے ذاتی کلکیشن میں مختلف انداز کے نقشے پائے جاتے تھے۔ مہاراجہ جے پور کے کلکیشن سے مقامی اور عالمی سطح کے چار چار میٹر لمبے خریطے کی بازیافت بھی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ عرفانی اٹلس اس سلسلہ کی پہلی کاوش نہیں ہے، گو کہ یہ بہت سے سابقہ ماخذ کا دانستاً تذکرہ نہیں کرتا۔

یہ پوچھے جانے پر کہ ان کی اصل تصنیف *The Agrarian System of Mughal India* کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ پروفیسر شاز نے کہا کہ اہل علم اسے ایک اچھی کاوش کے طور پر ضرور دیکھتے ہیں، لیکن نظری اعتبار سے ان کے دعاوی محل نظر ہیں۔ پروفیسر عرفان حبیب کا یہ دعویٰ کہ مغل اشرافیہ نے کسانوں کا اس قدر استحصال کیا کہ وہ تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق حکومت کے خلاف ہو گئے، صداقت کی میزان پر پورا نہیں اترتا۔ گزشتہ برسوں میں فرینک پرلن، ڈیوڈ واش بروک اور سنجے سہرا نیم جیسے حضرات نے عرفان حبیب اور شیریں موسوی کے ان بے بنیاد دعاوی سے ہوا نکال دی ہے کہ اتنے بڑے تناسب میں لگان وصول کی جاتی تھی کہ نجلی سطح پر معیشت کے نمو کا کوئی راستہ نہیں بچ پاتا تھا۔ فرینک ایلس نے حساب و کتاب کے گوشوارے سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عرفان حبیب اور شیریں موسوی کے دعاوی اپنے داخلی تضادات کے سبب زمیں بوس ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عرفان صاحب اپنے معتقدین کے نزدیک Polymath (شیخ الکل) ہیں۔ ان جیسا بڑا اسکالر علی گڑھ کی سرزمین نے اب تک نہیں دیکھا۔ وجہ یہ ہے کہ عرفان حبیب اپنے علمی مد مقابل یا خود سے برتر اہل علم سے ان کی زندگی میں نہیں ٹکراتے۔ ایڈورڈ سعید پر حملے کے لیے انھیں سعید کی موت تک انتظار کرنا پڑا۔ ان کا علمی قد و کاٹھ اس لیے ناقابل تسخیر ہے کہ وہ زندہ لوگوں سے مکالمہ نہیں کرتے۔ گزشتہ دنوں یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے سلسلے میں جب ان کا بیان آیا تھا اس وقت میں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ یہ تاریخ کا مسئلہ نہیں بلکہ عمومی ملٹی مسئلہ ہے، لہذا عرفان صاحب کو چاہئے کہ وہ ایک کھلے مباحثہ

میں اپنے دلائل رکھیں۔ لیکن جو لوگ فریق مخالف سے مرنے کے بعد دو دو ہاتھ کرنا مناسب سمجھتے ہوں، جو پر ماتما سرن کے سرقہ شدہ مسودے پر اپنے شاگردوں کو Ph.D بخشواتے ہوں اور جو انتہائی بے حیائی سے اس کی اشاعت پر پیش لفظ میں یہ لکھتے ہوں کہ تاریخ قندھاری کے انگریزی ترجمہ میں بڑی محنت شاقہ کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور شاگرد یہ لکھتا ہو کہ اس کام میں اسے ہر قدم پر عرفان حبیب کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی حاصل رہی ہے، ایسے لوگوں کے طلسماتی علمی قلعوں کی بنیاد میں نہ جانے کتنے پر ماتما سرن دن ہیں۔ کاش کہ کوئی تحقیق کا جو یا اس راز کی نقاب کشائی کر سکے۔

اس بیان کے شائع ہوتے ہی ان کے خیمہ میں خاموشی چھا گئی۔



ایک دن گنگا ڈھا بے پر کامریڈ احمد کے ساتھ چائے پی رہا تھا کہ صغیر بھائی پر نظر پڑی۔ ان کے ساتھ دو صاحبان اور بھی تھے جن سے میں واقف نہ تھا۔ میں نے گرجوشی سے ان کا استقبال کیا۔ پتہ چلا کہ وہ طلباء کے ایک وفد کے ساتھ دہلی میں ملی قائدین سے ملاقات کی غرض سے آئے ہیں۔ کچھ لوگوں کا قیام جامعہ ملیہ میں ہے اور یہ لوگ آج ہی سید شہاب الدین اور سید امین الحسن رضوی سے مل کر آئے ہیں۔ صغیر بھائی علی گڑھ میں شعبہ قانون کے سینئر طالب علم تھے۔ میں نے پوچھا کیا اندازہ ہے، یونیورسٹی کب تک کھل پائے گی؟ بولے، کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہر طرف پولیس کا پہرہ ہے۔ وائس چانسلر سید حامد اپنی ضد پر قائم ہیں، وہ طلباء کے آگے جھکنے کو تیار نہیں۔

طلباء آخر چاہتے کیا ہیں؟ کامریڈ احمد نے مسئلہ کی تہہ میں جھانکنے کی کوشش کی۔

بولے: اب تو بہت سی باتیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئی ہیں۔ کوئی ایک مطالبہ نہیں، پہلے تو طلباء صرف عرفان حبیب کے استعفیٰ کا مطالبہ کر رہے تھے، اب آفتاب کی شہادت نے معاملہ کو پیچیدہ کر دیا ہے۔ رضوی صاحب نے تو سید حامد سے مصافحہ کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا، ایک صاحب جوان کے ساتھ ہی آئے تھے انھوں نے بتایا۔ بولے: انھوں نے وائس چانسلر سے برملا کہا تھا کہ آپ کے ہاتھ معصوم طالب علم کے خون میں رنگے ہیں۔

اچھا واقعی! میں نے ان سے تصدیق کی کوشش کی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ صاحب کچھ بولتے، صغیر بھائی نے ایک تہقہہ بلند کیا۔ بولے، ارے بھی اس قسم کی روایتیں تو ایسے موقعوں پر اپنا راستہ بنا لیتی ہیں۔ یہ بھی اسی قبیل کی بات ہے جیسے کمیونسٹ حلقوں میں اس بات پر تالی بیٹی جاتی ہے کہ عرفان صاحب کی کتابیں

آکسفورڈ اور کیمبرج میں چلتی ہیں۔ ہر حلقہ کو پروپیگنڈہ کے لیے کچھ نہ کچھ مسالہ تو چاہیے ہوتا ہے۔ سنا تھا کہ کوئی انکوآزری بیٹھی تھی، اس کا کیا ہوا؟ کامریڈ احمد نے پوچھا۔

بولے: ارے بھئی یہ کوئی سنجیدہ فکری نزاع نہیں جسے مصالحت یا مفاہمت سے سلجھایا جاسکے۔ یہ تو اقتدار کی لڑائی ہے۔ کمیونسٹوں نے برسہا برس سے یونیورسٹی کو ریغمال بنا رکھا ہے، وہ آسانی سے اپنے اختیارات سے دست بردار ہونے والے نہیں۔

وائس چانسلر تو معقول آدمی ہیں، پھر وہ کمیونسٹوں کی اس چال کو کیوں نہ سمجھ پائے؟ میں نے صغیر بھائی سے جاننا چاہا۔ بولے: ذاتی طور پر سید حامد میں جتنی بھی خوبیاں ہوں، وہ ایک روایتی بیرو کریٹ ہیں اور بیرو کریٹ ہمیشہ منظم گرد ہوں اور یونین بازوں کے آگے جھک جاتا ہے۔ سید حامد شاید ذاتی طور پر یہ چاہتے ہوں کہ ان کے عہد میں یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی سے جو نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں اس کا فائدہ اٹھایا جائے۔ مسلم اقلیت کے لیے کچھ ٹھوس منصوبہ بندی کی جائے لیکن جو لوگ پہلے سے اس یونیورسٹی پر قابض ہیں وہ اقلیتی کردار کو اپنے لیے ایک خطرہ محسوس کرتے ہیں۔

’آخر ایسا کیوں، یہ تو ہماری اجتماعی فلاح و بہبود کا معاملہ ہے۔‘ میری اس معصومیت پر صغیر بھائی مسکرائے۔ بولے: کمیونسٹ لابی جو اب تک یونیورسٹی پر قابض تھی اسے اندیشہ ہے کہ اقلیتی کردار کی بحالی کے بعد یونیورسٹی کورٹ پر جسے یونیورسٹی پر مقتدر اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے، مسلم مجلس مشاورت، جماعت اسلامی اور اے ایم پوائیکشن کمیٹی جیسی تنظیموں کا قبضہ ہو جائے گا۔ انھیں اقلیتی کردار کی بحالی میں اپنا اقتدار تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اچھا! مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا، کامریڈ احمد نے حیرت کا اظہار کیا۔ میں تو اسے رجعت پرستی بنام روشن خیالی کی جنگ سمجھتا تھا۔

جی ہاں کمیونسٹ حضرات تو اپنے خوشنما بیانات سے کچھ ایسا ہی تاثر دیتے رہے ہیں، اب یہ بات کسے معلوم کہ صرف پچھلے تین سالوں کے دوران عرفان حبیب صاحب نے درجہ تین اور درجہ چار کے ملازموں کی دوسو سے زائد ہڑتالوں کو منظم کیا ہے۔ انھوں نے یونیورسٹی کی مختلف یونینوں کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔ وہ درجہ چار کے ملازمین کے لیے بھوک ہڑتال بھی کر چکے ہیں اور ان ہتھکنڈوں سے وہ رفتہ رفتہ ایک ناقابل تسخیر قوت بن کر ابھرے ہیں۔ اب اقلیتی کردار کی بحالی نے ان کے عزائم پر پانی پھیر دیا ہے۔

مگر باہر تو یہی تاثر ہے کہ وہ یونیورسٹی کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ رجعت پسند اور فرقہ پرست طاقتوں کو لگام دینا چاہتے ہیں۔ احمد کے اس تاثر پر صغیر بھائی کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ

طلوع ہوئی۔ بولے: یہ حضرات تو دوسروں کو رجعت پرستی کا طعنہ دیتے ہیں، لیکن اپنا حال یہ ہے کہ ذرہ برابر مخالفت کی بھی تاب نہیں لاسکتے۔ جوان کے گروپ میں نہیں ہے وہ یا تو فرقہ پرست ہے یا رجعت پسند۔ حد تو یہ ہے کہ طلباء یونین کے لیڈران بھی ان کی نظروں میں Fundamentalist اور فرقہ پرست ہیں۔ حالانکہ یہ عام طالب علم ہیں، ان کا کسی نظری خیمے سے کوئی تعلق نہیں۔ اصل بات یہ ہے، یہ کہتے ہوئے صغیر بھائی نے چائے کی پیالی رکھی، جیکٹ کے بٹن کھولے، کرسی آگے کوکھسکائی جیسے اب سنہری دھوپ میں انبساط کے ساتھ داستان کا اگلا حصہ سنانے والے ہوں۔ بولے: مسلمان سولہ سال سے یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کی تحریک چلا رہے تھے۔ ایمر جنسی کے بعد جب دوبارہ مسز گاندھی برسر اقتدار آئی تھیں، انھوں نے اپنے الیکشن منشور میں اقلیتی کردار لوٹانے کی بات کی تھی۔ مراد آباد کے خونی حادثہ کے بعد اس بات کی کہیں زیادہ ضرورت تھی کہ کانگریس کے مسلم ووٹ بینک کو بچانے کے لیے کوئی ایسا علامتی قدم اٹھایا جائے جو مسلمانوں کو کانگریس کی ہی خواہی کا یقین دلا سکے۔ ۱۹۸۱ء کے اوائل میں اس سلسلے میں پارلیامنٹ میں نئے بل پیش کرنے کی توقع کی جا رہی تھی۔ ان ہی دنوں انڈین ایکسپریس کے نامہ نگار کو عرفان حبیب نے ایک ایسا انٹرویو دیا جس سے اقلیتی کردار کی مہم کو آخری مرحلہ میں زک پہنچ سکتی تھی۔ وہ اس وقت سوشل سائنسز کے ڈین کے عہدے پر فائز تھے۔ بس یہ سمجھو کہ انھوں نے اقلیتی کردار کی مہم کو سیوتاژ کرنے کی اپنی آخری سی کوشش کر ڈالی۔ بل تو خیر پاس ہو گیا لیکن جن لوگوں نے سولہ سال تک اس مشن کے لیے قربانیاں دی تھیں ان کے لیے یونیورسٹی کے اندرون سے خود اس کے ایک ٹیچر کی بے وفائی ناقابل برداشت بن گئی۔ طلباء مشتعل ہو گئے اور یونیورسٹی میں محاذ آرائی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

اچھا تو یہ کہانی ہے اس قضیے کے پس پردہ۔ دیکھئے چیزیں ہوتی کیا ہیں اور نظر کیا آتی ہیں۔ کہاں کی روشن خیالی اور کیسی رجعت پسندی۔ دیکھو بھئی میں کہتا ہوں نا (value-loaded) اصطلاحوں سے ہمیشہ گریز کرنا چاہئے۔ یہ کہتے ہوئے احمد اٹھ کھڑے ہوئے۔

## ۲۴

# سرخ جال

جے این یو میں میرا قیام طویل ہوتا جاتا تھا۔ اب ہمارے شب و روز کی ترتیب یہ تھی کہ صبح لاہریری سے کوئی کتاب ایشو کرالاتا۔ دن کا کچھ وقت اخبارات و رسائل کی ورق گردانی میں لگاتا۔ مختلف قسم کی انسائیکلو پیڈیا اور ضخیم حوالہ جاتی مجلدات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا۔ کبھی کبھی بڑی حیرت انگیز معلومات کا سراغ لگتا۔ ایک دن بیسویں صدی کے سائنسی اور تہذیبی ارتقاء پر کوئی باتصویر مرقع ہاتھ لگ گیا۔ صبح سے شام تک اسی کی ورق گردانی میں گزر گئے۔ ان کتابوں کے درمیان جتنا وقت گزارتا، حیرت و استعجاب میں مسلسل اضافہ ہوتا۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ نہ جانے کب، کس طرف سے، روشنی کا کوئی روزن اچانک وا ہو جائے۔ ان ہی دنوں میرا تعارف ٹی ایس ایلینٹ (T. S. Eliot) اور ایزرا پائونڈ (Ezra Pound) کی شاعری سے ہوا۔ مارکسزم کے بالاستیعاب مطالعہ کی بھی یہیں توفیق ہوئی۔ ایلینٹ اپنے لب و لہجہ کے سبب ایسا لگتا جیسے ہماری حسیت سے قریب تر ہوں۔ روشن خطوط میں ان کے شعری مجموعے آنکھوں کو بھلے لگتے۔ زبان و بیان کا آہنگ دل کو کھینچتا۔ گوکہ ان کا پوری طرح سمجھنا آسان نہ تھا، لیکن معانی کی ایک بنیادی سطح بھی شعر خوانی کا لطف دے جاتی۔ میں اکثر کوئی شعری مجموعہ لیے دور درختوں کی اوٹ میں کسی چٹان پر جا بیٹھتا۔ سرسبز و شاداب ٹیلوں کی اوٹ میں چڑیوں کی چچھاہٹ اور نگاہوں کے سامنے مسجد قوت الاسلام کے قطب مینار کا منظر، اور پھر جاڑے کی سنہری خوشگوار دھوپ میں گاہے گاہے ٹھنڈی ہواؤں کے تھیرے، اور اس منظر نامہ میں بلند آہنگی سے ایلینٹ کی شاعری کا پڑھنا۔ ایک دن ایلینٹ کی مشہور نظم ہولووین (The Hollow Men) کو پڑھتے ہوئے جب ان لائنوں تک پہنچا کہ

Our dried voices, when  
We whisper together  
Are quiet and meaningless  
اور بقول شاعر اپنا حال یہ ہے کہ

Shape without form, shade without colour,

Paralysed force, gesture without motion;

یہ کہانی ایک مردہ خرابے کی تھی جہاں خیال اور حقیقت کے مابین اور حرکت اور عمل کے مابین ایک سائے جیسا ابہام پایا جاتا تھا۔ بقول شاعر یہی نوحہ ہے اپنی اس چھوٹی سی کائنات کا جہاں تصور اور تخلیق کے مابین اور جذبات اور اس کے ردعمل کے مابین بھی سایہ ہی سایہ ہو۔

This is the way the world ends

Not with a bang but with a whimper.

زندگی کی بے لطفی کا یہ نوحہ جہاں انسان کو اپنے ہر عمل پر امر مستعار کا دھوکہ ہو، جب ہر چیز اپنی اصل میں کھوکھلی لگے اور زندگی میں چبائے ہوئے لقموں کا تعفن داخل ہو جائے تو فرد کو خواب کی دنیا میں بھی جائے فرار نہیں ملتی۔ کیا مجال کہ وہ خواب میں بھی آنکھ کھولنے کی جرأت کر سکے۔

ان دنوں شریعتی کے حوالے سے مغرب کی بے دماغ نقالی کا بھی بڑا چرچا تھا۔ بائیں بازو کے طلباء کی مجلسوں میں جب بھی بیٹھا اور گفتگو آگے چلی تو بات بورتھا اور پروتاری کے مابین ازل سے جاری کشمکش پر آپہنچی۔ کامریڈ طلباء و طالبات نے اس مارکسی تعبیر کو ایک ازلی وابدی حقیقت کے طور پر کچھ اس طرح اپنی گرہ میں باندھ رکھا تھا کہ اس کے علاوہ تعبیر و تفہیم کے کسی اور منہج کے بارے میں سننے کے روادار بھی نہ تھے۔ ان کے درمیان جب بھی بیٹھا ان کے ایمان کا درجہ حرارت ہمیشہ بلند پایا، سو کسی سنجیدہ گفتگو کا امکان باقی نہ رہا۔ مجھے ایسا لگتا جیسے ہمارے ان نوجوانوں کے ہاں بھی تعبیر و عمل کے مابین کسی منحوس سایے نے پڑاؤ ڈال دیا ہو۔ میں ان ہی خیالات میں نہ جانے کب تک گم رہتا کہ نیچے جھاڑیوں کی اوٹ سے کوئی بلندی کی طرف آتا دکھائی دیا۔

ارے یہ تو احمد ہیں اور ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ ارے حسن بھائی! آپ یہاں کہاں؟ مجھے تو آپ کی تلاش تھی۔ میں نے بڑھ کر حسن بھائی کو گلے لگایا۔

بولے: ہم لوگ آپ کی تلاش میں مجنوں کے ٹیلے کی طرف گئے تھے، اچھا ہوا آپ مل گئے۔ میں کل ہی بمبئی سے واپس آیا ہوں، اب ارادہ ہے کہ جلد از جلد پی ایچ ڈی مکمل کر لوں۔ احمد سے آپ کی آمد کا پتہ چلا سو ڈھونڈتا ہوا یہاں آپہنچا۔ حسن اور یسی زبان وادب کے ایک سینئر طالب علم تھے۔ شعر گوئی کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ مطالعہ وسیع اور عزائم بلند تھے۔ فلم انڈسٹری میں قسمت آزمائی کے خیال سے کئی بار بمبئی کا چکر لگا چکے تھے اور غالباً انھیں اسکرپٹ رائٹنگ میں کوئی چھوٹی موٹی شراکت بھی مل گئی تھی۔ لیکن ان کی طبیعت میں ایک طرح کی سیمابیت تھی۔ کوئی کہتا کہ یہ سب یکطرفہ ناکام عشق کے سبب ہے۔ گرلس ہاسٹل کے راستے میں گھنٹوں پتھر کی لاٹ پر بیٹھے رہنا اور غالباً اس خیال سے حظ حاصل کرنا کہ کب وہ اس راہ سے گزرے اور اس

کی ایک جھلک دکھائی دے۔ حسن بھائی کے بارے میں اس قسم کی روایتیں عام تھیں۔ حالانکہ جے این یو میں چلمن والے عشق کا رواج تھا اور نہ ہی اس تکلف کی ضرورت تھی، لیکن نہ جانے کیوں اس قسم کی روایتوں سے حسن بھائی کی پریشاں خیالی، سیماب فکری اور ذہنی تشنج کی ایک ایسی تصویر بن گئی تھی کہ ان پر ایک نارمل انسان ہونے کا گمان کم ہی ہوتا تھا۔ آج بڑے دنوں بعد حسن بھائی سے مل کر بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔

بہت عمدہ جگہ منتخب کی ہے، یہاں سے مہرولی کا منظر کتنا بھلا لگتا ہے۔ انھوں نے پاس والی پتھر کی ایک سل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اور اس بلندی سے قطب مینار کتنا قریب لگتا ہے۔ پرانے وقتوں میں مسجد قوت الاسلام کی کیا شان رہی ہوگی۔“ احمد نے اس منظر نامے پر کچھ اس انداز سے تبصرہ کیا جیسے وہ ان پتھروں کے نیچے دبی تاریخ کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہوں۔

’اب نہ تو شوکتِ اسلام کے مظاہر ہیں اور نہ ہی قوتِ اسلام کے علمبردار۔ اب تو بس کچھ کامریڈ باقی رہ گئے ہیں جو نگاہِ حسرت سے ان مناظر کو تکا کرتے ہیں۔ میں نے احمد کو زچ کرنے کی کوشش کی۔

کامریڈ بھی تو اصلی نہیں، ہم لوگوں نے تو دراصل اپنی شخصیتوں پر کامریڈ کا خول ڈال رکھا ہے۔ حسن بھائی نے وضاحت کی۔ بولے، تم اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ اپنی شخصیت کے اوپر ایک اجنبی شخصیت کو لادے پھر ناکتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو بالکل ایسا لگتا ہے کہ آپ بالکل اس کے رنگ میں رنگ گئے ہیں، لیکن پھر آپ کے اندرون میں کوئی چٹکی لیتا ہے، یاد دلاتا ہے کہ تم وہ نہیں ہو، تمہاری بنا میں تو دراصل کچھ اور ہی ہے۔

آپ نے بالکل صحیح جگہ انگلی رکھی ہے۔ یہ آواز صرف اندرون سے نہیں آتی، آپ کے ارد گرد وہ لوگ جنہیں آپ اپنا انصار و اعموان بناتے ہیں، انہیں اخوتِ باہمی کے سبب کامریڈ گردانتے ہیں، وہی لوگ جب پارٹی میں آپ کی گرفت مضبوط ہوتے دیکھتے ہیں یا آپ کلیدی عہدوں تک پہنچنے والے ہوتے ہیں تو اپنی حرکتوں سے آپ کو ایسی زک پہنچاتے ہیں کہ آپ کو یاد آجائے کہ آپ وہ نہیں ہیں جس کا دم بھرتے ہیں۔ آپ کی بنا میں اب بھی اسلام کا عنصر باقی ہے، پھر آپ کی وفاداری پر کیسے بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے صحیح کہا، دو گدھوں کی سواری میں آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔

’فری تھنکرس کا بھی تو ایک گروپ ہے۔‘

جی ہاں ابتداً تو میں نے اسی گروپ سے وابستہ ہونے کا سوچا تھا، لیکن ان کا گروپ چھوٹا تھا، کچھ لوگ فیشن میں خود کو فری تھنکر تو کہتے تھے لیکن سیاسی و سماجی طور پر یہ لوگ بھی حاشیے پر تھے۔ مرکز میں بائیں بازو کی طلباء تنظیموں کا قبضہ تھا، سو میں نے سوچا کہ جب یونیورسٹی میں ایک بھر پور زندگی جینا ہے تو کیوں نہ

کمیونسٹوں کے ساتھ ہی ہولیا جائے۔

مگر آپ تو ایک دینی ادارے سے آئے تھے؟ آپ کے لیے یہ ایک مشکل فیصلہ رہا ہوگا۔ میں نے احمد سے پوچھا۔

بولے: مشکل ہی نہیں میرے لیے تو ناممکن سا فیصلہ تھا۔ میرے پرانے دوستوں میں سے جس نے بھی سنادل تمام کر رہ گیا۔ بعضوں نے کفر والجاد کی پھبتی کسی، بعضوں نے قطع تعلق کر لیا۔

مگر آپ کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوچھی۔ دیوبند کا ایک فارغ التحصیل اچانک بے این یو میں آکر کامریڈ بن جائے۔

مجھے کیا سوچتی، حسن بھائی سے پوچھو۔ یہی مجھے ادھر لے کر آئے تھے لیکن تب بھی ہمارے اندر ایک جذبہ صادق تھا۔

جذبہ صادق؟ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

بولے: ہاں بے این یو میں آنے کے کچھ ہی دنوں بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اصحاب کھف کے کسی غار میں دس بارہ سال گزار کر آیا ہوں۔ یہ ایک بدلی ہوئی دنیا تھی جہاں میرا سکہ چلتا نہ تھا۔ اب جو میں دیوبند میں اپنے گزرے ہوئے شب و روز پر نظر ڈالتا تو حیرت ہوتی کہ اب تک ہم اپنی ہی دنیا سے غافل کس طرح ایک خیالی جزیرے میں نظر بند رہے۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رشتہ تقریباً منقطع تھا۔ اب جو مجھے ایک نئی دنیا سے واسطہ پڑا تو میں نے سوچا کہ اگر یہاں بھی سمٹے سمٹائے مولویانہ خول میں کنارے کنارے گزر گئے تو پھر ایک جدید دانش گاہ میں آنے کا کیا فائدہ۔ ایک بھر پور طالب علمانہ زندگی کی طلب مجھے بائیں بازو کے خمیے تک لے گئی۔

تو کیا آپ اپنے اس فیصلہ پر پشیمانی محسوس کرتے ہیں؟

بولے: پشیمانی کیسی، یہ تو ایک سوچا سمجھا اجتہادی فیصلہ تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مجھے افسوس ہوتا۔ ہمارے بعض ساتھی یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے دین کا سودا کر لیا۔ بھلا مسلمان کے دل سے بھی کہیں ایمان نکل سکتا ہے۔

’مگر یہ سب ایک نفسیاتی محضے کا معاملہ رہا ہوگا، بیک وقت دو متضاد شخصیتوں کو اپنے کندھے پر اٹھائے پھرنا، ایک طرف کامریڈ اور دوسری طرف احمد‘

اسے مانگے کی شناخت کا مسئلہ (Borrowed Identity Syndrome) کہتے ہیں۔ حسن بھائی نے معاملہ کی پرت کھولنے کی کوشش کی۔ بولے: جب آپ کسی اجنبی شناخت کو کسی مجبوری کے تحت اختیار کرتے

ہیں تو آپ کی ایک قطبی شخصیت میں کئی متبادل قطب جنم لینے لگتے ہیں۔ بسا اوقات معاملہ آپ کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے، آپ کو خود اس بات کا پتہ نہیں ہوتا کہ آپ کا اصلی قطب کون سا ہے۔ میرے اوپر بھی ایک زمانے میں ایسی کیفیت گزری ہے کہ میرے ذہن سے میری اپنی اصل شناخت محو ہو جاتی، میں اردگرد کے ماحول اور افراد سے کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو جاتا کہ کیا بتاؤں، یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ایک دن لیموں پانی کے اسٹال پر میں نے لیموں پانی کا آرڈر دیا۔ سامنے میز پر تازہ لیموں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ سوچا خود ہی اسے نچوڑ لوں۔ اب جو نچوڑنے کا یہ سلسلہ شروع ہوا تو میں یکے بعد دیگر مختلف گلاسوں میں لیموں نچوڑنے لگا۔ دکاندار نے مجھے روکنے کی کوشش کی، مگر میں کہاں رکنے والا تھا۔ کچھ دیر بعد میرے ایک دوست نے بڑی مشکل سے مجھے اس بات پر قائل کیا کہ میں یہاں گا ہک ہوں، دکاندار نہیں۔

’عجیب! یہ تو بڑی تکلیف دہ صورت حال ہے۔‘

بولے: جب آپ کسی مستعار شناخت کو اپنے کاندھے پر اٹھائے پھرتے ہیں تو وہ آپ سے قیمت طلب کرتی ہے۔

’مگر آپ جس ذہنی تشخ سے گزر رہے ہیں اس کے بارے میں تو زبان خلق پر طرح طرح کی کہانیاں ہیں۔‘ یہ سن کر حسن بھائی کے چہرے پر ایک لطیف مسکراہٹ طلوع ہوئی۔

بولے: یہاں بھی معاملہ بیک وقت دوہرے خول میں جینے کا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جب میں تشدد کمیونسٹ تھا۔ خود کو ادنیٰ مارکسسٹ کہنے میں فخر محسوس کرتا۔ ان ہی دنوں اولڈ کیمپس کے قریب سڑک کی دوسری جانب ایک بوسیدہ مسجد کے کھنڈر کا سراغ ملا۔ اس علاقے میں مسلم آبادی برائے نام تھی۔ یونیورسٹی کے کچھ مسلمان ملازمین اور طالب علموں نے اس مسجد کی بازیابی کے لیے وہاں ضروری مرمت کے بعد جمعے کی نماز شروع کر دی۔ اب مسلمان طلباء پر یہ ذمہ داری آن پڑی کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمعے کی نماز میں شریک ہوں تاکہ مسجد پر ہمارا دعویٰ مضبوط ہو جائے۔ میں ٹھہرا تشدد کمیونسٹ۔ عرصہ سے جمعے کی نماز سے غافل، لیکن یہ وقت اسلام کی حمایت میں اپنا وزن ڈالنے کا تھا۔ احمد سے پوچھو! اس وقت کس طرح ہم لوگوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ ہم لوگ بھی اس مہم کا حصہ بن گئے۔ ایک دن جمعے کی نماز کے لیے ٹوپی لگائے دوسرے مسلم طلباء کے ساتھ بس میں داخل ہو رہا تھا کہ میری نگاہ ورشا پر پڑی جو پچھلے دروازے سے اتر رہی تھی۔ ہماری نگاہیں چار ہوئیں، میں حسب معمول مسکرایا مگر اس کے چہرے پر حیرانی اور خفگی کے آثار نمایاں تھے۔ بعد میں اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم تو زورے بنیاد پرست نکلے۔ میں تو تمہیں روشن خیال سمجھتی تھی۔ میں نے اپنے تئیں بہت سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ کہاں ماننے والی تھی۔ اسے میرا کمیونزم ڈھونگ لگا۔ ایسا

لگا جیسے میری مسلم شبیہ کے اچانک اظہار سے اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہو۔ بس اتنی سی بات تھی۔ یہ کہہ کر حسن بھائی خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر مجلس پر اسی طرح خاموشی طاری رہی۔ پھر بولے، بھائی بات یہ ہے کہ جب آپ اپنے کندھے پر بیک وقت دو آدمیوں کو اٹھائے پھرتے ہیں تو ایک مرحلہ آتا ہے جب آپ کو یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ اس میں سے کس شناخت کو آپ باقی رکھیں گے اور کسے قربان کر دیں گے۔ میں نے مسجد کو ترجیح دی اور محبت قربان کر دی۔

’مگر یہ فیصلہ آپ کے لیے بڑا مشکل رہا ہوگا۔‘ بولے: میرے لیے تو یہ سب اچانک ایک جھٹکے میں ہو گیا۔ ہاں اس صورت حال کو تسلیم کرنے اور اس موقف پر جم جانے میں ضرور مشکلیں پیش آئیں، البتہ مجھے ان لوگوں پر ترس آتا ہے جو بے چارے بھرپور زندگی جینے کے شوق میں زندگی بھر ادنی مارکسٹ بنے پھرتے ہیں۔ ان کے اندرون سے گاہے بہ گاہے کوئی آواز تو آتی ہوگی، پیتے نہیں وہ اس سے کیسے نباہ کرتے ہیں۔

’یہ بھی تو نظام ہی کا ایک جبر ہے کہ اس ملک کے مرکزی اسٹیج پر کوئی کلیدی رول ادا کرنے کے لیے اور دنیا کی نعمتوں میں اپنا حصہ طلب کرنے کے لیے مسلمانوں کو اپنی شناخت کی آنچ دھیمی کرنا پڑتی ہے یا کسی اجنبی شناخت کا سہارا لینا پڑتا ہے، میں نے صورت حال کی سنگینی کی طرف توجہ دلائی۔‘

پھر تو مولویت میں ہی عافیت ہے۔ زندگی بھر مدرسہ اور خانقاہ کے جزیرے میں پڑے رہو۔ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا، احمد نے کہا۔

بولے: ارے بھئی سودا تو وہاں بھی دل کی موت کا ہے۔ بڑے بڑے مشائخ کی گردنوں میں کانگریس کی اتباع کا پٹہ پڑا ہے۔ ایک آزاد مسلم زندگی جو دنیا سے اپنا جائز حصہ طلب کر سکے، اس کے امکانات تو بہت معدوم ہیں ورنہ اس بات کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی کہ مسلمان اجنبی قالب کی تلاش میں نکلیں، حسن بھائی نے گفتگو کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

میں نے سوچا یہ کیسا نظام جبر ہے کہ عام ناظرین کو اس کے جبر کا کچھ بھی اندازہ نہیں۔ استاذی وقار حسین کی مجلس میری نگاہوں میں جھلملا اٹھی جو اکثر کہا کرتے تھے کہ اس کی سب سے بڑی شاعرت یہ ہے کہ یہ ہمیں اپنی اصل شاعرت اور خباثت پر مطلع بھی نہیں ہونے دیتا۔

## معرکہ کفر و اسلام

ادھر علی گڑھ میں معرکہ کفر و اسلام نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ طلباء کے خلاف انتقامی کارروائیوں میں شدت آگئی تھی، گویا اس بات کے آثار ہویدا تھے کہ یہ آگ اب آسانی سے ٹھنڈی ہونے والی نہیں۔ طلباء کی نظر میں وائس چانسلر سید حامد کا ہر قدم اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی سے عبارت تھا۔ دوسری طرف سید حامد طالب علم لیڈروں کو سماج دشمن عناصر کے طور پر دیکھنے لگے تھے۔ اس محاذ آرائی کے پیچھے دراصل بائیں بازو کی سیاست تھی، جس کا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شکار ہو گئے تھے۔ ویسے تو سید صاحب بڑے جہاندیدہ تھے۔ بات کی تہہ تک باسانی پہنچ جاتے لیکن عرفانی ٹولے کے پروپیگنڈے اور ان کے عزائم کو سمجھنے میں ان سے سخت چوک ہوئی اور اس کی انھیں اور یونیورسٹی کو بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ حالانکہ اپنی ذاتی زندگی میں وہ کسی روایتی مسلمان سے کم نہ تھے۔ وہ اپنی مادرِ درسگاہ کے وقار کی بحالی کے مشن پر آئے تھے، لیکن بائیں بازو کی سیاست نے انھیں ایک ایسے شخص کے طور پر پیش کیا جو بے دین، ضدی اور حمیت ملی سے عاری ہو اور جو اپنے طالب علموں کے لیے شفقت و محبت کے عنصر سے یکسر خالی ہو۔ گو کہ اس منفی شبیہ کا ان کی حقیقی شخصیت سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن اس تاثر کو زائل ہونے میں ایک عرصہ لگ گیا۔ بلکہ کہتے کہ وہ جب تک علی گڑھ میں رہے ان کی شخصیت پر اسی پروپیگنڈے کا پردہ پڑا رہا۔ ایک بار جب وہ لندن کے سفر سے واپس آئے تھے ان کے پاس Peter Watson کے ایک مضمون کا تراشا تھا جو غالباً ٹائمز لندن کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا، کہنے لگے بڑا فکر انگیز مضمون ہے۔ مسلمانوں کے زوال کے سلسلے میں بعض اہم امور کی طرف توجہ دلائی ہے، اردو حلقوں میں بھی اسے پڑھا جانا چاہئے۔ میں نے پیٹرویشن کا نام پہلی بار ان ہی کی زبانی سنا جو بعد میں مصنف کی بعض وقیع کتابوں تک میری رسائی کا ذریعہ بنا۔

ایک بار حبیب ہال میں طلباء اور پروووسٹ کے مابین محاذ آرائی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ معاملہ ڈپلین شکنی تک جا پہنچا۔ بعض طلباء پر تادیبی کارروائی کا خطرہ تھا۔ وہ لوگ میرے پاس آئے۔ میں نے ثالثی کے لیے حامی بھری۔ انھیں لے کر سید حامد صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ کسی میٹنگ میں تھے۔ چند منٹ کے لیے

باہر آئے، پوچھا کیا معاملہ ہے؟ میں نے کہا کہ یونیورسٹی کی حیثیت ایک علمی قبیلے کی ہے اور آپ اس کے سردار ہیں۔ قبیلے میں جب نچی سطحوں پر کوئی واقعہ ہو جاتا ہے یا لوگ آپس میں لڑ پڑتے ہیں تو بات قبیلے کے سردار تک پہنچتی ہے۔ ہم آپ کے پاس اسی امید کے ساتھ آئے ہیں کہ پرووسٹ اور طلباء کے مابین جو ناچاقی ہوئی ہے اور اس سبب دلوں میں جو دوریاں پیدا ہوئی ہیں انھیں دور کرنے کے لیے آپ دونوں فریقوں کو بلا کر سمجھا دیں۔ یہ سن کر سید صاحب مسکرائے۔ بولے: میں اپنا یہ فریضہ ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا، آپ لوگ مطمئن رہیں۔ ہم لوگ خوش خوش واپس آئے۔ تادہی کارروائیوں کا خطرہ ٹل چکا تھا۔

ایک بار طلباء نے پراکٹر کو یرغمال بنا لیا جو کسی ہنگامے کو فرو کرنے کے ارادے سے حبیب ہال کے دورے پر تھے۔ مطالبات میں ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ پرووسٹ فی الفور استعفیٰ دیں۔ ہنگامہ شام سے شروع ہوا اور آدھی رات تک شدت اختیار کر گیا۔ پراکٹر صاحب کو باہر نکالنے کی کوئی سبیل نہ رہی۔ پولیس کی مداخلت ایک نئی مصیبت کھڑی کر سکتی تھی۔ رات ایک بجے ہم لوگ تین چار طلباء کے ساتھ وی سی لاج پہنچے۔ راستے میں شوکت بھائی ملے جو حالات کا جائزہ لینے کے لیے نکلے تھے۔ جوش جہاد سے سرشار! کہنے لگے: 'ایس ایس ہال اور وی ایم ہال سے ہوتا ہوا آرہا ہوں، لڑکے ہر طرح تیار ہیں۔ اب انھیں میں کیا بتاتا کہ میں تو معاملہ کو ٹھنڈا کرنے نکلا ہوں۔ رات ڈیڑھ دو بجے کا وقت ہوگا۔ سید حامد ایک بڑی میز کے گرد اپنے انتظامی عملے اور حکومتی اہلکاروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ پرووسٹ کو فی الفور برخاست کرنے کا حکم جاری کر دیں تو لڑکوں کا اشتعال ٹھنڈا ہو سکتا ہے اور شاید پراکٹر کی رہائی کی سبیل بھی پیدا ہو جائے۔ انھوں نے کسی تامل کے بغیر دراز سے لیٹر ہیڈ نکالا اور ان کی برخاستگی کی تحریر لکھ کر میرے حوالے کر دی۔ ہال میں جب یہ خبر پہنچی تو معاملہ ٹھنڈا ہو گیا اور پراکٹر بحفاظت نکل آئے۔

ایک بار ڈرامہ کلب کے کسی پروگرام میں کوئی مخرب اخلاق سین اسٹیج ہو گیا۔ صورت حال نے نزاع کی شکل اختیار کر لی۔ اسلام پسند اور کمیونسٹ طلباء کے مابین تلواریں کھینچ گئیں۔ سید صاحب نے ڈرامہ کلب کے ذمہ داروں کو طلب کیا۔ میں اتفاق سے اس وقت وی سی لاج میں ملاقاتیوں کے کمرے سے متصل بیٹھا تھا۔ میں نے انھیں ذمہ داروں کا سخت محاسبہ کرتے سنا۔ واقعہ یہ تھا کہ سید صاحب نہ تو ضدی تھے اور نہ ہی روایت بیزار بلکہ وہ اسلام اور کفر کے مابین جاری جھڑپ (کراس فائر) میں پھنس گئے تھے۔ لیکن وہ کرتے بھی کیا۔ اس دور میں یہ تاثر عام تھا کہ بائیں بازو کی حمایت کے بغیر کیمپس کی زندگی میں کامیابی کا حصول کچھ آسان نہیں۔ مرکز مطالعہ تاریخ میں دو مولوی صاحبان کی سرگرمیاں اس خیال کی تائید کرتی تھیں جو اپنی تمام تر اسلام پسندیوں کے باوجود سیاسی طور پر بائیں بازو کا ہی حصہ سمجھے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کو سید

صاحب کی کوششوں سے رہائی نصیب ہوئی۔ یونیورسٹی میں ایسے لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو بائیں بازو کی سیاست سے بیزار تھے، مگر اسلامی حلقوں میں بھی ان کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ زیدی سسرٹس کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جو ایک بھرپور علمی اور سماجی زندگی جینا چاہتی تھیں۔ لیکن علی گڑھ کا روایتی معاشرہ ان کی جولانیوں کا ساتھ دینے سے قاصر تھا۔ جب یہ بہنیں سائیکل پر سوار ہو کر کیسپس میں نکلتیں تو روایتوں کے کتنے ہی تاج محل زمیں بوس ہو جاتے۔ زمیندارانہ معاشرے کے اقدار نے اسلام کا جو ہیولا تشکیل دیا تھا، اس میں ان جیسی خواتین کے لیے سماجی رول کی گنجائش خاصی کم تھی۔ لہذا ان کے لیے اور کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ وہ بحالت مجبوری بائیں بازو کے نظری سائبان میں پناہ لیں۔ کفر و اسلام کی یہ ہنگامہ آرائی دراصل دھوپ اور چھاؤں کا کھیل تھی۔ جو لوگ زندگی کے مرکزی اسٹیج پر اپنے لیے کسی کلیدی رول کے متلاشی ہوتے وہ دھوپ چھاؤں کے فراق میں رہتے۔ نئی وفاداریوں کو کبھی بخوشی اور کبھی باکراہ قبول کر لیتے۔ البتہ جن کے لیے یہ بات اہم تھی کہ وہ جو ہیں وہی رہیں تو ایسے لوگوں کے لیے ہر زمانے اور ہر جگہ کی طرح یہاں بھی زندگی آسان نہ تھی۔

علی گڑھ جسے اسلامیان ہند اپنا علمی اور فکری قلعہ سمجھتے تھے اور جس کے خصوصی اختیار کی بحالی کے لیے انھوں نے سولہ سال تک مسلسل تحریکیں چلائی تھیں، اسی علی گڑھ میں امکانات و مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے لازم سمجھا جاتا تھا کہ فرد اپنی اصل شناخت کے بجائے ایک اجنبی شناخت کا قالب اختیار کرے۔ خود کو مسلمان کہنے کی بجائے ادنیٰ مارکسٹ کہنے پر مجبور ہو۔ دل سے آپ خواہ کچھ بھی ہوں جب تک آپ بائیں بازو کی سایہ عاطفت میں پناہ نہیں لیتے، بعض شعبوں میں تو آپ پر ترقی کے دروازے بالکل نہیں کھل سکتے تھے۔ شعبہ تاریخ میں بعض مولوی صاحبان کی سرخ حکمت عملی کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، جس سے یہ تاثر مزید گہرا ہوتا تھا کہ اپنی اسلامیت کو جب تک سرخ قبائیں نہ چھپایا جائے شدت پسند مسلم ہونے کا خطرہ بنا رہتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اقلیتی کردار کی بحالی کے بعد بھی نہ تو علی گڑھ میں اور نہ ہی علی گڑھ سے باہر ملٹی حلقوں میں جشن کی کوئی کیفیت پیدا ہو سکی۔ طلباء کو شدت پسند اور مجرم باور کرانے میں بائیں بازو نے اپنے سارے ترکش خالی کر دیئے۔ یونیورسٹی مسلسل کھلتی اور بند ہوتی رہی۔ بڑی تعداد میں طلباء کے اخراج کے بعد جب حالات معمول پر آئے اور علمی زندگی کی رونق پھر سے بحال ہوئی تو معزول شدہ طلباء کے لیے ان کی اپنی طالب علمانہ حیثیت کو برقرار رکھنا ہی بنیادی مسئلہ بن گیا۔ جب انسانوں سے ان کے بنیادی حقوق سلب کر لیے جاتے ہیں تو انہیں یہی بات نعمت معلوم ہوتی ہے کہ وہ زندگی کی تمام مسرتوں سے محروم کم از کم زندہ تو ہیں۔ ملٹی شناخت پر غیر معمولی اصرار کے بجائے اب احتجاجی طلباء اس بات کو غنیمت جانتے کہ تادیبی کارروائی سے بچ بچا کر انھیں کم از کم امتحان میں شرکت کی اجازت مل جائے اور وہ

اپنی ڈگریاں لے کر باہر کی دنیا میں اپنی تنگ و تاز کے لیے امکان تلاش کر سکیں۔

ان تادیبی کارروائیوں سے یونیورسٹی تو راستے پر آگئی لیکن انتظامی مشنری میں بائیں بازو کی سبقت برقرار رہی۔ مانگے کی شناخت کا عذاب بدستور جاری رہا۔ شعبہ تاریخ جو اس گمراہی کا مرکز تھا وہاں سے طلباء میں اپنی اصل سے ہٹ جانے اور دقیانوسی شناخت کو خیر باد کہنے میں مقابلے کی کیفیت رہتی۔ ایک طالب علم نے جوش ترقی پسندی میں ٹائمنر آف انڈیا کو ایک مراسلہ میں تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ مدت سے ’گوٹکا قرآن‘ ایک بار پھر بولنے لگا ہے۔ صاحبزادے ایک روایتی مسلم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن مشکل یہ تھی کہ شعبہ تاریخ میں راہ یاب ہونے کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔ اس طرح کی باتوں پر دینی حلقوں میں اشتعال پیدا ہوتا۔ طلباء کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑتے اور یہ سرخ مجاہدین باسانی اپنے ادنیٰ مارکسٹ اساتذہ کے نور نظر بن جاتے۔ کئی سالوں بعد ایک بار ایک ایسے ہی طالب علم سے میری ملاقات لندن کے ایک علمی جلسہ میں ہو گئی۔ ابتداً تو کچھ کھنچے کھنچے سے رہے پھر جب برف پگھلی تو پتہ چلا کہ یہ حضرت بھی اندر سے پکے مسلمان ہیں بلکہ مجھ سے بھی کہیں بڑھ کر، متواتر اسلام کے مسلمات کو تنقید و تجزیہ کی میزان پر پرکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی خیال آیا شاید یہ تقلیب ذہنی قیام لندن کی برکات کے سبب ہو جہاں ان دنوں بڑی تیزی کے ساتھ یونیورسٹی کمیونسٹوں میں حزب التحریر اور دوسری احمیائی تحریکوں کے اثرات بڑھتے جاتے تھے، مگر حقیقت کچھ اور نکلی۔ بڑی سادگی اور معصومیت سے اپنی سرخ جیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر انھوں نے قبائے سرخ زیب تن نہ کی ہوتی تو یہاں اس مجلس میں آج مجھ سے ملاقات کا یہ امکان پیدا نہیں ہوتا۔

نظری قبا کی تبدیلی دراصل To be اور Not to be کا سوال تھا۔ یہ بقا اور کامرانی کی ایک ایسی جنگ تھی جس میں بہتوں کے لیے کامیابی کے امکانات محدود تھے۔ ہمارے ایک دوست جو آگے چل کر ایک صوبائی حکومت میں زنداں کے نگران اعلیٰ کے عہدے تک پہنچے، انھیں ایک دن جمعہ کی نماز میں نہ پا کر جب میں خیریت دریافت کرنے ان کے کمرے میں گیا تو پتہ چلا کہ انھوں نے بھی قبائے سرخ زیب تن کر لی ہے مگر انھیں بہت جلد اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی اصل سے دور جانے میں ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو علی الاعلان ’گوٹکے قرآن‘ کی مذمت میں مراسلہ لکھ بیٹھتے ہیں۔ گویا

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر  
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

والی کیفیت بنی رہتی۔

## شناخت بالجبر

علی گڑھ میں ڈھائی تین سال قیام کے بعد جب میں گھر لوٹا تو وہاں ایک دنیا بدل چکی تھی۔ اتنے قلیل عرصے میں ابا بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو جائیں گے، ان کے بالوں کی سیاہی پر سفیدی غالب آجائے گی، مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ میری نگاہیں گھر میں اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو تلاش کرتی رہیں، لیکن وہ کہیں نظر نہ آئے۔ البتہ نسبتاً بڑی عمر کے دو بچے متحرک دکھائی دیے۔ پہلے تو یہ گمان ہوا کہ شاید پڑوس کے ہوں پھر جب بہت دیر تک اپنے بھائیوں کی کوئی سن گن نہ ملی اور ان دونوں نسبتاً بڑی عمر کے بچوں کو گھر جیسی مانوسیت کے ساتھ مستقل مقیم دیکھا تو دل نے کہا یہ کوئی اور نہیں وہی دونوں چھوٹے بھائی ہیں جنہیں وقت کے ہاتھوں نے اس صورت میں متشکل کر دیا ہے۔ جب میں گیا تھا تب ابا کی گفتگو میں صورت حال کی تبدیلی کے لیے ایک عزم مسلسل کا اظہار پاتا اور وہ خود کو اس انقلاب کے مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کرتے۔ اب ان کی گفتگو کا بنیادی محور یہ تھا کہ وہ کسی طرح اس خواب کو اپنے بچوں تک منتقل کر دیں۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار بچپن میں ماں تعبدوں من بعدی کی تفسیر پر آ کر وہ کس طرح بے چین ہوا اٹھے تھے، تب ان کی زبان سے بمشکل یہ الفاظ نکلے تھے، ہاں بڑی مسؤلیت ہے بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اب وہ توحید کی اس مشعل کو اپنے بچوں کے ہاتھوں میں تمہا دینا چاہتے تھے۔ ایسا لگتا جیسے ان کا ہر جملہ اس سوال سے عبارت ہو ما تعبدوں من بعدی؟

ابا کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنے بچوں کی فتوحات کی داستانوں کو بڑے ذوق و شوق سے سنتے، ان کی جزئیات میں جھانکنے کی کوشش کرتے۔ انہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ نظری اور گروہی معرکہ آرائیوں نے جدید سیکولر دانش گاہوں میں بھی طلباء کے لیے کیسی کیسی آزمائشیں کھڑی کر رکھی ہیں۔ زاہدہ زیدی کا تعلق بائیں بازو سے تھا، وہ ہمیں امریکی ادب پڑھاتی تھیں۔ شومئی قسمت وہ میری ٹیوٹر قرار پائیں لیکن بات دو تین کلاسز سے آگے نہ بڑھ پائی اور مجھے اپنا ٹیوٹر تبدیل کرنا پڑا۔ دوسری طرف اسلوب انصاری جیسے اساتذہ بھی تھے جنہیں اپنی راسخ العقیدگی پر سخت اصرار تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا

کہ وہ کبار اساتذہ کی ایک مجلس سے احتجاجاً اس لیے اٹھ آئے تھے کہ وہاں ایک صاحب نے آنحضرتؐ کی شان میں کچھ ایسے جملے کہے تھے جس میں سوئے ادب کا پہلو نکلتا تھا۔ گویا یونیورسٹی کی چہاردیواریوں میں نظری وابستگی کو بڑا دخل تھا۔ ابا میری اس ذہنی الجھن کو بھانپ گئے۔ کہنے لگے کہ ہمارے لیے اصل امتحان تو یہی ہے کہ ہم ہر حال میں اپنی اصل پر قائم رہیں۔ أصلها ثابتة و فرعها فی السماء میں اسی بات کی طرف تو اشارہ ہے۔ اہل حق اگر اپنی بات کہنے میں لیت و لعل کا شکار ہوئے تو کلمہ طیبہ کے نموکے امکانات باقی نہیں رہتے۔ اور یہ اس ملک میں مسلمانوں کے لیے کوئی نئی صورت حال نہیں ہے۔ آزادی کے بعد سے ہی ان پر نئی نئی شناختیں تھوپی گئیں۔ انھیں ان ناموں سے پکارا گیا جن کے نہ وہ متحمل تھے اور نہ ہی سزاوار۔ منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے حصے میں صرف دھوکہ آیا۔ یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہوئے۔ انھوں نے پہلو بدلا پھر فرمایا کہ یہ دھوکہ دونوں طرف ہوا، یہاں بھی اور سرحد کے اس پار بھی۔

بولے: پاکستان تو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، لیکن جناح نے حصول پاکستان سے چند دن پہلے پاکستانی کانٹینٹیوٹنٹ اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے صریح الفاظ میں پاکستان کی دینی اساس کی نفی کر دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ خواہ کسی بھی مذہب یا ذات سے تعلق رکھتے ہوں ریاست کو اس سے کچھ بھی سروکار نہیں۔ بقول ان کے آنے والے دنوں میں کسی کو اس ملک میں نہ ہندو رہنا تھا اور نہ مسلمان کہ ہندو یا مسلمان ہونا فرد کا ذاتی معاملہ تھا۔ سیاسی طور پر سبھوں کی حیثیت ریاست کے شہری کی تھی۔ اس وقت بہت سے لوگوں کو جناح کے اس نئے لب و لہجے سے سخت وحشت ہوئی۔ اگر نئی ریاست میں نہ کسی کو مسلمان رہنا تھا اور نہ ہندو بلکہ یہ سب فرد کا ذاتی معاملہ تھا تو پھر پاکستان بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ کام تو متحدہ ہندوستان میں بھی ہو سکتا تھا۔ تحریک پاکستان کے غبارے میں پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ جیسے نعروں نے جو ہوا بھری تھی جناح کی تقریر نے بالکل ابتدائی مرحلہ میں اس غبارے سے ہوا نکال دی۔ دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کے لیے قیام پاکستان ایک نئی آزمائش بن کر سامنے آیا۔ پاکستان چونکہ اسلام کے نام پر بنا تھا اس لیے اسلام اور پاکستان کو ایک سکہ کا دو رخ سمجھا جانے لگا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے لازم ٹھہرا کہ وہ ہندوستان سے اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے اس پاکستان سے اپنی برأت کا علی الاعلان اظہار کریں جس کی بنا میں اسلامی ریاست کا تصور کارفرما تھا۔

پھر تو بڑی آزمائش کی گھڑی رہی ہوگی؟

بولے: ہاں، مسلمان راتوں رات اس ملک میں مجرم بن گئے تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو مسلم لیگ کی تحریک سے وابستہ نہیں تھے، انھیں بھی اپنی وفاداری کے ثبوت کے طور پر پاکستان کی ہجوسرائی کو ایک سیاسی

کلیے کے طور پر اختیار کرنا پڑا۔ دیکھتے دیکھتے اس ملک میں نیشنلسٹ مسلمانوں کی ایک نئی قبیل پیدا ہوگئی۔ ان نیشنلسٹ مسلمانوں کے لیے لازم قرار پایا کہ وہ اس ملک میں اپنے حقوق کے لیے جب بھی آواز بلند کریں یا کلمہ احتجاج زبان پر لائیں تو اس موقع پر پاکستان کے لیے چند کلمہ بد یا مذمت کے الفاظ ضرور ادا کریں تاکہ ان کی آہ و کراہ پر ملک دشمنی کا گمان نہ ہو۔ نیشنلسٹ مسلمان بھی دراصل ایک جبری شناخت تھی۔ یہ ایک ایسی قبائے مستعار تھی جس میں تقسیم ہند کے بعد بڑے بڑے مسلم سوراؤں نے اپنے آپ کو چھپائے رکھا۔ بیچارے کرتے بھی کیا تقسیم ہند نے ان کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ اب تم اسی سے اندازہ لگاؤ کہ راجا آف محمود آباد جو مسلم لیگ کے سکریٹری تھے اور جنہیں جناح کا دست راست سمجھا جاتا تھا ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ خود اپنے ملک میں اجنبی بن کر رہ جائیں گے۔ شاید وہ اس صورت حال کے لیے تیار نہ تھے، انھوں نے فی الفور مسلم لیگ سے استعفیٰ دے دیا۔ انھوں نے اس بات کا برملا اعلان کیا کہ ان کی پارٹی سے اسٹریٹجک سیاسی غلطی ہوئی ہے۔ اب اس نئی بدلی صورت حال میں انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ مشورہ دے ڈالا کہ انھیں ہندوستان کی طرف سے جنگ کے لیے کمر بستہ رہنا چاہئے خواہ یہ جنگ پاکستان کے خلاف ہی کیوں نہ لڑنی پڑے۔ ایک صاحب تھے ایم اے سلام جو مدراس کی صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ کے اہم لیڈر تھے انھوں نے بھی اس بات کے اعلان میں عافیت جانی کہ آندھرا کے مسلمان ہندوستانی ریاست کے تئیں وفادار ہیں اور وہ اس کی حفاظت میں اپنے خون کے آخری قطرہ تک نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔

اور جو لوگ پہلے سے ہی کانگریس میں شامل تھے یا جو مسلم لیگ کی تحریک سے تعلق خاطر نہیں رکھتے تھے، کیا انھیں بھی نیشنلسٹ مسلمانوں کی قبائیں پناہ لینا پڑا؟

بولے: مسلمان خواہ کسی بھی قبیل کا ہوئے ہندوستان میں اگر اسے پناہ مل سکتی تھی تو وہ اسی صورت میں کہ وہ اپنے نیشنلسٹ ہونے کا ثبوت دیتا رہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ امتحان اتنا آسان نہ تھا مجھے یاد ہے کہ آزادی سے چند ماہ پہلے گاندھی جی نے جب یہ بات کہی تھی کہ قومی اور صوبائی ریاستوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مکمل انصاف سے کام لے تو اس پر ہندو پرپریس میں بڑا شور و غوغا ہوا تھا۔ پریس والوں کا کہنا تھا کہ ہم نیشنلسٹ مسلمانوں کے سلسلے میں تو ایسا سوچ سکتے ہیں، لیکن عام مسلمانوں کو اس درجہ پر فائز کرنا خطرناک غلطی ہوگی کہ ان کے دل پاکستان کی محبت سے مملو ہیں، وہ مسلم لیگ کی تحریک میں شریک رہے ہیں، راتوں رات ان کی وفاداری نہیں بدل سکتی۔

یہ ملک کا عمومی مزاج بن گیا تھا یا صرف احیاء پرست ہندو تحریکیں اس خیال کو ہوادے رہی تھیں؟

بولے: بڑے بڑے بظاہر معتدل ہندو رہنما بھی فرقہ پرستی کے اسی دھارے میں بہہ رہے تھے۔ تم نے رام منوہر لویہ کا نام تو سنا ہوگا۔

ہاں، ان کا تو سوشلسٹ لیڈر کی حیثیت سے سیکولر حلقوں میں بڑا اعتبار ہے۔

بولے: تمہیں حیرت ہوگی کہ لویہ جیسے لیڈران بھی تقسیم کے بعد، غالباً یہ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی کسی میٹنگ کا واقعہ ہے، لوگوں کو پاکستان کے خلاف محاذ آرائی کی دعوت دیتے ہوئے یہ کہتے سنے گئے کہ میں ہندوستانی مسلمانوں سے خاص طور پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے اسلحوں سے دست بردار ہو جائیں، ہندوستان کے وفادار شہری بنیں اور اگر ضرورت پڑے تو پاکستان یا کسی بھی دوسرے ملک سے جنگ کے لیے تیار رہیں۔ ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۷ء کے اخبارات دیکھنا اس عہد کی سچی تصویر سامنے آجائے گی۔ ایک صاحب تھے گووند ولب پنٹھ، یہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ان کا بھی ہندوستانی مسلمانوں سے یہی مطالبہ تھا کہ وہ ملک سے وفاداری کو اپنا شعار بنالیں۔ انھوں نے صراحتاً یہ بات کہی تھی کہ ہندوستان کے ہر مسلمان پر یہ لازم ہوگا کہ وہ پاکستانی حملہ آوروں سے لڑتا ہوا اپنے خون کا نذرانہ پیش کرے۔ انھیں چاہئے کہ اپنے دل کو ٹولیں اور ابھی فیصلہ کر لیں کہ انھیں پاکستان ہجرت کرنی چاہئے کہ نہیں۔

یہ تو ایک یلغار کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف اس قدر سخت نفرت کے جذبات اٹھ آنے کا آخر سبب کیا تھا؟ ابھی چند برسوں پہلے تک تو خلافت تحریک میں ہندو اور مسلمان باہم شیر و شکر دکھائی دیتے تھے، بلکہ قیادت کی کمان بھی بڑی حد تک مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ سینتالیس تک پہنچتے پہنچتے مسلمانوں پر یہ زمین اس قدر تنگ ہو گئی کہ خود ان کے وطن میں ان سے وفاداری کا ثبوت مانگا جانے لگا اور انھیں اپنی اصل دینی اور قومی شناخت کے علی الرغم نیشنلسٹ آئیڈینٹیٹی میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا؟ میرے اس سوال پر والد صاحب نے ایک لمحہ کو توقف اختیار کیا جیسے تاریخ کا وہ سرا تلاش کر رہے ہوں جس کے بیان سے اس صورت حال کی صحیح تصویر سامنے آجائے۔ بولے: دراصل ہم جسے آزادی کہتے ہیں بہت سے ہندو زعماء اسے قدیم بھارت کے احیاء کے طور پر دیکھ رہے تھے اور یہ خیال صرف احیاء پرست ہندوؤں کا نہ تھا بلکہ کانگریس کی قیادت اور شخصیتیں بھی ڈھکے چھپے اسے ہزار سالہ مسلم عہد حکومت کے خاتمہ کے طور پر دیکھتی تھیں۔ ایک صاحب تھے بابو سمپر ناند، یہ یوپی حکومت میں کانگریس کے وزیر تعلیم تھے۔ آزادی سے چند ہفتوں پہلے انھوں نے ایک اخباری مضمون میں برملا اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ازمۂ قدیم میں بھی ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ تھا۔ ہمیں پاکستان کے الگ ہونے کا تو دکھ ہے، کیا پتہ یہ پھر آگے چل کر ہم سے آملے البتہ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ہم آزادی کی شکل میں ایک ایسی قیمتی چیز کو حاصل

کرنے جارہے ہیں جو ایک ہزار سال پہلے اس ملک نے کھودی تھی۔ بقول سمیر ناندن: تھائیسر کی جنگ میں محمود غوری کے ہاتھوں پر تھوی راج کی شکست سے بھارت نے اپنی خودی (سوا) کھودی تھی جس کے بعد ہمارے ہاں سائنس اور فلسفہ میں کوئی ترقی نہ ہوئی۔ ان ہزار سالوں میں کوئی آویںکار ہمارے ہاں نہ ہو سکا۔ اس طرح کی باتیں اس وقت کے رسائل و جرائد میں بکثرت ملیں گی۔ کبھی موقع ملے تو علی گڑھ کی لائبریری میں اخبارات و رسائل کی پرانی فائلیں دیکھنا۔ تمہیں اس بات کا اندازہ ہو سکے گا کہ اس ملک میں آزادی کی صبح مسلمانوں پر کتنی سخت آزمائشیں لے کر آئی تھی۔ بہت سے لوگ جن کا پاکستان کی تحریک سے کوئی فکری اور نظری تعلق نہیں تھا، انہوں نے بھی جب یہ دیکھا کہ منقسم ہندوستان میں ان کے لیے جینا مشکل ہو گیا ہے تو وہ یہ کہتے ہوئے پاکستان کی طرف ہجرت کر گئے کہ اب اس ملک میں جو لوگ رہ جائیں گے ان کی پوری زندگی یہ ثابت کرنے میں گزر جائے گی کہ وہ اس ملک کے سچے پکے اور وفادار شہری ہیں۔

ابھی گفتگو کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ مکتبہ کے سامنے ایک رکشہ آ کر رکا۔ دیکھو انہیں اترنے میں مدد کرو۔ ارے یہ تو ابا کے پرانے دوست ہیں مقامی کالج میں ریاضی کے پروفیسر۔ آج ان کے ہاتھ میں چھڑی دیکھ کر دل کو دھچکا سا لگا۔ ذکی صاحب کے چہرے پر اب وہ پہلی سی تازگی نہ تھی۔ مجھے دیکھ کر مسرت سے کھل اٹھے۔ یہ جان کر کہ ان کے آنے سے پہلے یہاں مسئلہ مسلم شناخت کا زیر بحث تھا، ایک آہ سرد بھری۔ بولے: انہوں نے ہماری اصل شناخت پر پردہ ڈالنے کے لیے بڑی بڑی ترکیبیں رچیں۔ کبھی کہا کہ ہم اقلیت ہیں، ہمارا مقام حاشیہ پر رہنا ہے۔ حالانکہ نظری اعتبار سے ہم تب بھی اکثریت کا درجہ رکھتے تھے لیکن ہمارے مقابلہ میں ایک مصنوعی اکثریت کا ہیولا تراشا گیا اور اسے ہندو اکثریت کا نام دیا گیا، حالانکہ ہندو ہونا نہ کوئی نظریہ تھا اور نہ ہی کوئی مذہب۔ یہ تو ایک عمومی اصطلاح تھی جو اہل عرب و فارس اس خطہ کے ساکنین کے لیے بلا امتیاز مذہب و ملت استعمال کرتے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ یہاں مختلف مذاہب اور دیوی دیوتاؤں کے ماننے والوں کے مختلف اور متضاد طائفے تھے۔ ذات پات کی ابدی تقسیم نے مختلف طائفوں کو باہم متصادم اور متخارب کر رکھا تھا۔ اس مکروہ صورت حال پر پردہ ڈالنے کے لیے ہندو مذہب کا مصنوعی ہیولی تراشا گیا اور اس مصنوعی منظر نامے میں مسلمان سب سے بڑی امت ہونے کے باوجود اقلیت قرار پائے۔ یہ کہتے ہوئے ذکی صاحب نے اپنی عینک اتاری، پانی کا ایک گلاس طلب کیا پھر قدرے توقف کے بعد بولے: ایک چیز ہوتی ہے forced identity یعنی وہ چیز جو لوگ آپ پر تھوپ دیتے ہیں، آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ تم فلاں ہو، حالانکہ ہم وہ ہوتے نہیں۔ اس طرح کی مخالفانہ تصویرگری کو میں شناخت بالجبر کہتا ہوں۔ مسلمانوں کو اس ملک میں اقلیت کہا گیا اور اتنی کثرت سے کہا گیا کہ بہت سے مسلمانوں کو اس بات پر یقین آ گیا کہ ہم واقعی

اقلیت میں ہیں، وہ خود بھی اپنے آپ کو اقلیت کہنے اور سمجھنے لگے۔

’یہ بالجبر والی اصطلاح آپ نے خوب استعمال کی‘۔ عبدالمستین صاحب نے مداخلت کی۔ بولے: اس میں تو بالجبر والی شاعت بھی آگئی۔

ذکی صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ بولے: ’جب آپ کو وہ کچھ باور کرایا جاتا ہو جو دراصل آپ ہوتے نہیں تو کتنی بے بسی معلوم ہوتی ہوگی ذرا اس بات کا اندازہ کیجئے۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی ہم پر ایک مصنوعی شناخت تھوپی گئی۔ ہمیں مجڈن کہا گیا لیکن ہم نے اس شناخت کو پوری قوت کے ساتھ مسترد کر دیا۔ ہم آج بھی مسلمان کہلاتے ہیں، لیکن اقلیت والی شناخت تو کچھ ایسی چمکی کہ اب ہم خود ہی اقلیت کی حیثیت سے حکومت سے مراعات کے طالب رہتے ہیں۔‘

قوموں کی زندگی میں شناخت اس قدر اہم رول ادا کرتی ہے مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا۔ حالانکہ اب اسے بارہا یہ بات سنی تھی کہ آپ جو سوچتے ہیں وہی ہوتے ہیں۔ لیکن تب میرے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ انسان کا self-perception اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس قدر اہم رول ادا کرتا ہے۔

## بہتر کھانوں کا دسترخوان

آج جمعہ کا دن تھا لیکن مکتبہ میں وہ پہلی سی چہل پہل نہ تھی۔ نہ تو شحمہ چچا کی شہینی آ کر رکی، نہ ہی علامہ خورش کھانے کی فرمائش کرتے دکھائی دیئے۔ نواب بیغمیر پور کے انتقال کی خبر ابھی چند دن پہلے ہی آئی تھی۔ پتہ چلا کہ انھوں نے بڑی کسمپرسی کے عالم میں وفات پائی۔ آخری دنوں میں والد صاحب نے بھائی جان کو ان کی خبر گیری پر مامور کر رکھا تھا۔ کسے خبر تھی کہ ایک رئیس زادہ اپنے آخری دنوں میں کوڑی کوڑی کو محتاج دنیا والوں کے لیے نشانِ عبرت بن کر رہ جائے گا۔ کہتے ہیں کہ پروفیسر ایک دن عالم اضطراب میں تھے۔ پلاؤ کی قاب ادھوری چھوڑ کر اٹھے۔ خالم خول کی گردان کرتے ہوئے جامع مسجد کے لیے نکلے جہاں وہ کبھی کبھی راتوں کو قیام کر لیا کرتے تھے۔ اس بات کو دو سال ہونے کو آئے، کسی کو نہیں معلوم کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔ انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا۔ پروفیسر کے اس طرح اچانک غیب کی خبر سن کر مجھے جامعہ ملیہ کے معروف صاحبِ قلم اور دانشور انور علی خاں سوز یاد آئے جو انگریزی زبان میں مسلم مسائل پر اپنی بیباک تحریروں کے لیے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ واقفین کہتے ہیں کہ ان کے اندر بھی ایک مضطرب روح بستھی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں پر جو گزری اور جو گزر رہی تھی بھلا اُن سے بہتر اس حادثہٴ فاجعہ سے کون واقف ہو سکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ بھی ایک دن گھر سے نکلے اور پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ عزیز و اقارب اور دوست احباب نے دلی کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن وہ نہ ملے۔ شاید قدرت کو ان پر رحم آ گیا تھا۔ یہ ملک اب ان جیسے مضطرب نفسوں کے قیام کے لائق نہیں رہ گیا تھا۔

مکتبہ میں اب نئی نسل کے نوجوانوں کا ڈیرہ تھا۔ مستقبل کے متلاشی تاریخ کے تحلیل و تجزیہ میں مشغول نوجوانوں کے پاس طرح طرح کے سوال ہوتے۔ جب شمالی ہند کے مسلمانوں کو یہ معلوم تھا کہ پاکستان بننے کی شکل میں بہار اور اتر پردیش کے علاقے ہندوستان ہی میں رہ جائیں گے تو انھوں نے مسلم لیگ کا ساتھ کیوں دیا؟ انھیں پتہ تھا کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان نہیں جاسکتے، پھر تقسیم کے اس خالی الدماغ منصوبے کی مخالفت میں کیوں نہیں اٹھ کھڑے ہوئے؟ کیا تقسیم ایک سازش تھی یا مسلم لیگ کی قیادت واقعی ایسا چاہتی

بھی تھی؟ ایک دن عبدالمعز نے پوچھا کہ سنا ہے پاکستان کا خیال محض ایک بارگیننگ چپ (Bargaining Chip) تھا۔ اس دھمکی کے ذریعہ جناح کانگریس کی قیادت سے زیادہ سے زیادہ مطالبات منوانا چاہتے تھے۔ ۱۹۴۰ء تک تو صورت حال یہی تھی، والد صاحب نے کہا۔ لاہور کے اس جلسہ میں جسے قراردادِ پاکستان کے نام سے جانا جاتا ہے، زیادہ سے زیادہ مسلم خود مختار ریاستوں کی تصویر ابھرتی ہے۔ اقبال کے ہاں بھی الگ ملک یا تقسیم وطن کے بجائے مسلم ثقافتی خطوں کے قیام کی بات ملتی ہے۔ ویسے بھی ہندوستان ہمیشہ سے وفاق کی ریاست رہا ہے۔ اس قسم کے ثقافتی خطوں کی بات جو ایک ہی سیاسی وحدت کے اندر ہوں کچھ عجب نہیں تھی۔ لیکن ۱۹۴۶ء کے بعد صورت حال اتنی تیزی سے بدلی کہ حالات پر کسی کا قابو نہ رہا۔

’تو کیا پاکستان حادثاتی طور پر وجود میں آ گیا؟‘

یہ کہنا تو مشکل ہے۔ ساری لڑائی اس بات کی تھی کہ مسلمان ڈھیلے ڈھالے وفاق میں اپنے ثقافتی مراکز کو محفوظ دیکھتے تھے اور کانگریس ایک مضبوط مرکز کے ذریعہ ملک کو کنٹرول کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کشمکش کا نتیجہ ایک غیر فطری حل کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ ایک پاگل پن تھا جس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ خدا کی زمین پر ریڈ کیلف نے ایک ایسی لائن کھینچی جس کی خون آشامی نے لاکھوں لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک پوری تہذیب تباہ ہو گئی۔

اگر یہ نہ ہوتا تو دہلی اور لکھنؤ کی کیا رونق ہوتی۔ حیدرآباد اور بھوپال میں علم و ادب کی دل بستگی کے کیسے کیسے امکانات ہوتے، عبدالمعز نے اپنے چشم تصور سے گم گشتہ مستقبل کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کی۔ بولے: گو کہ یہ سب کچھ اچانک ہوا لیکن حالات تو ایک مدت سے اسی رخ پر جا رہے تھے۔ مسلمان ایک مدت سے خیالی دنیا میں رہ رہے تھے۔ تقسیم کے بعد بھی انہوں نے سنبھلنے کی کوشش نہ کی۔ پھر پئے بہ پئے ایسے حملے ہوتے رہے جسے وہ سہار نہ پائے۔ باضابطہ ایسے قوانین بنائے گئے جن کا مقصد مسلمانوں کو ان کی املاک سے بے دخل کرنا تھا۔

اچھا!

ہاں جیسے املاک متروکہ کا قانون (Evacuees Property Act) اور دشمن کی املاک کا قانون یعنی

(Enemy Property Act)۔

اور اس پر مسلمان سیاسی قائدین نے کوئی احتجاج نہ کیا؟

بھلا وہ کیا کرتے، اس مہم کی کمان براہ راست سردار پٹیل کے ہاتھوں میں تھی۔ پنٹھ، کھر اور شکلا جیسے وزراء اعلیٰ مسلمانوں کو دیوار سے لگا دینے کے لیے اپنی تمام تر مساعی جاری رکھے ہوئے تھے۔ لیکن یہ تو

اس صورت حال کا صرف ایک پہلو ہے خود مسلمانوں میں اس بات کی سمجھ نہ تھی کہ اس نئی بدلتی صورت حال سے وہ کس طرح نبرد آزما ہوں۔ زمین داری کے خاتمے نے مسلمانوں کو چشم زدن میں آسمان سے زمین پر دے مارا تھا۔ مسلمان بیروزگار ہو گئے، ان کی آمدنیوں کے سوتے خشک ہو گئے۔ لکھنؤ کے بڑے بڑے نوابوں کا حال یہ ہوا کہ کچھ دنوں تک تو وثیقوں پر کام چلتا رہا، جو انھیں انگریزوں نے عطا کیے تھے، پھر افلاس و تنگ دامانی نے اپنے ڈیرے جمائے۔

یہ وثیقے کیا ہوتے تھے؟

عارضی بیکاری بھتے کہہ لو۔ پھر جب آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو ان نوابوں نے ہندو ساہوکاروں سے قرض لینے شروع کر دیئے اور پھر ان سودی قرضوں کے چکر میں ان کی بڑی بڑی کوٹھیاں اور محلات رستوگی ساہوکاروں کے قبضے میں چلی گئیں۔

انھوں نے اپنی بچی کچھی املاک کو بھی اگر صحیح طریقے سے سنبھالا ہوتا تو شاید آج لکھنؤ کے مرکزی مقامات پر مسلمانوں کا عمل دخل نظر آتا۔

تم صحیح کہتے ہو، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہ لوگ کام کرنے کو ہیج سمجھتے تھے۔ انھیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ ان کی جائیداد و املاک مناسب قیمتوں پر فروخت ہو کر خود ان کی اپنی تجارت کے لیے سرمایہ فراہم کریں۔ وہ اس بات کو معیوب سمجھتے تھے کہ لوگ یہ کہیں کہ ان کی فلاں کوٹھی بک گئی یا فرنیچر اور قیمتی املاک فروخت ہو گئیں۔ وہ اسے سماجی طور پر اپنی تذلیل کا شاخسانہ سمجھتے تھے۔ ہمارے عزیزوں میں ایک صاحب تھے۔ نواب بریلو کے نام سے جانے جاتے، بڑے طنطنے میں رہتے۔ حالات بدل گئے تھے مگر دماغ میں وہی عظمت رفتہ کا جنون تھا۔ باورچی خانہ میں جلانے کے لیے جب ایندھن نہ رہا تو قیمتی فرنیچر پر کلہاڑی چلوا دی۔ لوگوں نے بہت سمجھایا کہ ایک ایک فرنیچر کے بدلے سوکھی لکڑیوں کی ایک پوری ٹال آپ کو باسانی مل سکتی ہے، لیکن نواب صاحب کے لیے یہ بات قابل قبول نہ تھی۔ انھیں یہ بات ستائے دیتی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے کہ وہ دن بھی آگیا کہ نواب صاحب اپنے گھر کا فرنیچر بیچنے لگے ہیں۔ محرم کے موقعوں پر نواب صاحب شربت کی سبیل لگاتے۔ شکر کے پٹے کے پٹے کنویں میں ڈال دیئے جاتے۔ وہ تو اچھے دنوں کی بات تھی۔ اب نہ تو محرم کی وہ رونق رہی اور نہ ہی بول محمدی یا حسین کے نعروں میں وہ پہلا سا جوش و خروش جس میں ہندو اور مسلمان سبھی اپنا حصہ ڈالتے تھے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ کنویں کا زمانہ رخصت ہوا، اب یہ کام بہت کم پیسوں میں زیادہ مہذب انداز سے اسٹیل کے بڑے بڑے کنستروں سے انجام دیا جاسکتا ہے۔ لیکن نواب صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ وہ تو رمضان اور عید کے چاند کے اعلان کے لیے بھی توپ داغنے کو زیادہ قرین

اسلام سمجھتے تھے۔ لوگوں نے بہت سمجھایا، اب ٹکنا لوجی ترقی کر گئی ہے، یہ کام سائرن سے بھی لیا جاسکتا ہے، لیکن نواب صاحب کا کہنا تھا کہ توپ کے گولے داغے جانے سے شوکت اسلام کا جو اظہار ہوتا ہے وہ سائرن سے ممکن نہیں۔



پرانے جاہ و حشم کی آخری رت مجھے اپنے نانیہال میں دیکھنے کو ملی۔ میری عمر اس وقت یہی کوئی نو دس سال کی رہی ہوگی۔ زمینداری تو رخصت ہو گئی تھی، لیکن نانانے اپنی ترکیبوں سے اپنی عملداری کو برقرار رکھا ہوا تھا۔ خود کاشت زمینوں کے نام پر اب بھی ان کے پاس قطععات اراضی کا تاحدنگاہ سلسلہ تھا جس کے اندر چلنے پھرنے، سیر سپاٹا کرنے اور شکار کے لیے نکل جانے میں کچھ اسی قسم کا احساس ہوتا جیسے اب بھی کوئی چھوٹی موٹی ریاست آپ کی دسترس میں ہو۔ ہفتہ میں دو دن گاؤں میں بازار لگتے، لوگوں کے تنازعات کا تصفیہ ہوتا، اپنے مسائل کے حل کے لیے انصاف کے متلاشیوں کا مردان خانہ میں اثر دام رہتا۔ نانانے اپنی عملداری میں اب مقامی سر پنچ کے منصب کو داخل کر لیا تھا، لیکن یہ سب مصنوعی ترکیبیں آخر کب تک کفایت کرتیں۔ لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ان کا رشتہ راجا اور پر جا کا نہ تھا۔ بغاوت کی ہلکی آگ سینوں میں جلتی رہتی، آنکھوں میں مروّت کا پانی باقی تھا سو اکثر کو اس کے اظہار کی تاب نہ ہوتی لیکن ایک بے خبری تھی یا اسے تجاہل عارفانہ کہئے جس سے شاید اس تلخ صورت حال پر پردہ ڈالنا مقصود تھا۔ اچھے دنوں کے وہی پرانے مشاغل اب بھی جاری تھے۔ کبھی ان سے فرصت ملتی تو شکار کے لیے نکل جاتے، بڑا لطف آتا۔ خاص طور پر یہ احساس کہ اس عملداری میں آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں، احتساب اور جواب دہی سے بے نیاز۔

نانا کو بہتر کھانوں کا شوق تھا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آتا کہ اتنا بڑا دسترخوان بچتا کس کے لیے ہے۔ صبح سے شام تک مختلف قسم کی ڈشیں بنتی رہتیں۔ شیشے کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں مختلف قسم کے اچار، مرّے اور چٹنیاں اس پر مستزاد ہوتیں۔ کھاتے تو وہ دوہی وقت تھے اور ان کی خوراک بھی زیادہ نہ تھی، لیکن انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ بہتر ڈشوں کی روایت میں کوئی کمی رہ جائے مبادا لوگ اسے ان کے ادا بار پر محمول کریں۔

بڑے دسترخوان کے علاوہ نانا کا ایک اور شوق بڑے خاندان کی تمنا تھی۔ ابھی پہلی بیوی کے انتقال پر انھوں نے دوسری شادی کی تھی کہ اسی اثناء کسی شادی کی تقریب میں ایک اور بھلی صورت پر نظر پڑ گئی۔ پرانی آن بان کا تقاضہ تھا کہ اسے بھی اپنے حرم میں داخل کر لیا جائے۔ سیانے کہتے کہ حدیث میں بھی آیا ہے کہ مومن کو اپنے کنبہ میں برکت کی دعا کرنی چاہئے۔ گھر میں ماموؤں اور خالائوں کی فوج ظفر موج کے علاوہ

ایسے ملازموں کی بھی بڑی تعداد تھی، جو پشتوں سے خدمت پر مامور تھے۔ لڑکیوں بالیوں کی کلکاریوں پر ایک جشن مسلسل کا گمان ہوتا۔ ان خادماؤں کے نام بھی عجیب ہوتے۔ کوئی گلبدن کہلاتی تو کوئی چاندنی، کسی کا نام خوشبو ہوتا تو کوئی رسیلا کہی جاتی۔ ان شب و روز کو دیکھ کر بھلا کسے یقین آتا کہ باہر حالات بدل چکے ہیں۔ نانا نے اپنے تئیں حالات پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی، لیکن آخر کب تک! وہ اس اجڑتے ہوئے جاہ و حشم کی تاب نہ لاسکے۔ ایک دل کے دورے نے ان کا کام تمام کر دیا۔ ان کے بعد بڑے ماموں نے جاہ و حشم کو برقرار رکھنے کی سرٹو کوشش کی۔ وہ نئے زمانے سے شاید زیادہ آشنا تھے۔ انھیں اندازہ تھا کہ وہ ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان کے اعصاب بھی جواب دے گئے۔ بڑے ماموں کی موت کے بعد اب خاندان میں نرے بونے (pigmy) رہ گئے تھے۔ انھیں نہ اپنے پرانے جاہ و حشم کا کوئی شعور تھا اور نہ ہی پدرم سلطان بود کا خمار۔ ان میں سے بعضوں نے اپنی عامی صورت حال سے صلح کر لی اور بعض کبیدہ خاطر ہو کر خلیج کے ممالک میں ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ بہتر کھانوں کا دسترخوان آج بھی جب میری نگاہوں میں جھلملاتا ہے، نو عمر لڑکیوں کی کلکاریاں میرے کانوں میں گونجتی ہیں اور نانا کی عملداری میں شکار کے مشاغل یاد آتے ہیں تو یہ سب کچھ خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ کسے معلوم تھا کہ تقسیم ہند کے صرف چند سالوں کے اندر ہندوستانی مسلمانوں کے جاہ و حشم کی باتوں پر خواب کا گمان ہوا کرے گا۔

ہمارے پڑوس میں ایک صاحب تھے جو مغربی یوپی کے کسی شہر سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ ریسانہ ٹھاٹ باٹ ختم ہوئے تو کسی نے مشورہ دیا کہ جوتوں کی دکان کھول لو۔ حلال رزق کی سبیل پیدا ہو جائے گی۔ نہیں! کل تک جو لوگ ہمیں سلام ٹھوکتے تھے میں اب ان کے پیروں میں جوتے پہناؤں گا، انھوں نے اس تجویز کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ انھیں فن دندان سازی کا تھوڑا بہت تجربہ تھا، لیکن اپنے شہر میں یہ پیشہ بھی ریسانہ شان سے ہم آہنگ نہ تھا، سو قسمت آزمائی کے لیے گھر سے دور بہار کے ایک دور افتادہ شہر میں آ پڑے۔ یہاں کم از کم یہ اطمینان تو تھا کہ کوئی شخص ان کی مرضی کے بغیر ان کے سامنے منہ نہیں کھول سکتا تھا۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس نعمتِ عظمیٰ کو جو اس ملک میں انہیں سیاسی تفوق کی شکل میں مل گئی تھی بالکل قدر نہ کی۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ صورت حال ہمیشہ برقرار رہے گی۔ قدرت بار بار متنبہ کرتی رہی مگر ہم نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا، ابانا نے عبدالمعز کی مجلس آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ بولے: ۱۸۵۷ء میں سقوطِ دہلی کے بعد بھی ہماری آنکھیں نہ کھلیں۔ مسلمان تعلقہ دار اور زمیندار انگریزوں سے وثیقے اور سند پا کر مطمئن تھے کہ چلنے کسی طرح جھوٹے تقاضے کو سہارا مل گیا مفت خوری کی کچھ اور گنجائش نکل آئی۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ۹۰ سال کا عرصہ ہوتا ہے اس مدت میں تو مسلمان بہت کچھ پلان کر سکتے

تھے، عبدالمعز نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔

کیسے کرتے وہ ذہنی طور پر اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں رہے۔ حتیٰ کہ تقسیم کے بعد بھی جب ۱۹۵۱ء میں زمینداری کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان ہو گیا، چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور تعلقہ داروں کا حال یہ تھا وہ نئی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے بجائے اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے پر مصر رہے۔ ایک مدت سے انہیں خوشامدیوں میں گھرے رہنے کی عادت تھی، ان کے پاس اپنی زمین جائداد کو سنبھالنے کا بھی کوئی تجربہ نہ تھا۔ یہ جو تم کہانیوں میں پڑھتے ہو کہ نواب صاحب کے ہاں سانپ نکل آیا، نواب صاحب گھبرائے، خادمہ کو آواز دی کہ کسی مرد کو بلانا۔ خادمہ کو شاید تفریح سوچھی اس نے نواب صاحب کو یاد دلایا: خیر سے حضور بھی تو مرد ہی ہیں۔ یہ سن کر نواب صاحب کی خود شناسی بیدار ہو اٹھی۔ بولے: 'ارے ہاں تم نے بروقت یاد دلایا، لانا تو میری چھڑی اور دیکھنا کہاں ہے میری جوتی۔' جب تک نواب صاحب کسی اقدامی فیصلہ تک پہنچتے سانپ یہ جاوہ جانی سے رخصت ہو گیا۔

'کمال کے لوگ تھے!' عبدالمعز کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

'ایک اور دلچسپ واقعہ ہے، بچپن میں سنا تھا، پتہ نہیں اس میں کتنی صداقت ہے۔ مگر ہے تو اپنے عہد کے سماجی مسائل کا آئینہ دار۔ کہتے ہیں کہ نواب صاحب اور ان کی بیوی کا علاج چل رہا تھا۔ حکیم صاحب نے طبی جانچ کے لئے دونوں کا قارورہ طلب کیا۔ شومی قسمت بوتلیں باہم گڈ گڈ ہو گئیں۔ اب نواب صاحب دردِ ذہن میں مبتلا بستر سے اٹھنے کا نام نہیں لیتے کہ حکیم صاحب کا بڑا اعتبار تھا اور انہوں نے قارورہ میں حمل ٹھہرنے کی علامتیں واضح طور پر دیکھ لی تھیں۔'

'واقعی عجیب لوگ تھے!' عبدالمعز کے لئے اب اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ بولے: 'کتنا تقلیدی مزاج پایا تھا۔ ابا صحیح کہتے ہیں نری تقلید سے عقل کند ہو جاتی ہے، عبدالمعز نے اس لطفے میں بھی اپنے مسلک اہلحدیث کی فوقیت کا پہلو ڈھونڈ نکالا۔'

تقلید خواہ مذہب میں ہو یا سیاست میں، یہ ہمیں بندگلی میں پھنس جانے کا احساس دلاتی ہے۔ البتہ اس جرم میں صرف ربردماغ مقلدین ہی مبتلا نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ بھی جو بزمِ خود غیر مقلدین میں اپنا شمار کرتے ہیں ان کے ہاں بھی، اگر غور کرو تو معاملہ کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

'ربردماغ؟ کیا مطلب! میں نے پہلی بار یہ اصطلاح سنی ہے۔'

جس طرح ربر کو جتنا بھی کھینچو وہ دوبارہ اپنی اصل حالت میں واپس آجاتا ہے اسی طرح بعض لوگ لاکھ سمجھانے اور دلیل دینے کے باوجود اپنے سابقہ موقف سے چپکے رہتے ہیں۔ باپ دادا کے راستے کو ترک

کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اب سنو غیر مقلدین کے منج تقلید کا ایک لطیفہ بھی سن ہی لو۔ ایک صاحب تھے فن حدیث کے ماہر، راویوں کی چھان پھنک اور اسماء الرجال کے علم میں پید طولی رکھتے تھے۔ ایک دن زار و قطار روئے جا رہے تھے۔ شاگردوں نے انہیں اس طرح روتا دیکھ کر پوچھا حضرت کچھ تو بتائیے آخر کون سی مصیبت آن پڑی؟ بولے: 'ارے کیا بتاؤں غضب ہو گیا۔ میری بیوی کا سہاگ اجڑ گیا، میری بیوی بیوہ ہو گئی' یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگے۔ شاگردوں نے توجہ دلائی کہ حضرت آپ تو خدا کے فضل سے زندہ ہیں۔ آپ کے رہتے ہوئے بھلا آپ کی بیوی بیوہ کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ سن کر ایک لمحہ کے لئے چونکے جیسے بات سمجھ میں آرہی ہو۔ پھر یہ کہہ کر رونے لگے کہ بھئی تم لوگوں کی بات درست ہے لیکن جن صاحب نے یہ خبر دی ہے وہ ثقہ راوی ہیں، جھوٹ نہیں بول سکتے۔

عبدالمرشد شاید اشارہ سمجھ گئے تھے۔ بولے: واللہ حیرت کا مقام ہے، غور کیجئے تو ہر خیمے سے وجدنا آباؤنا کذا لک یفعلون کی صدا سنائی دیتی ہے۔

خیر یہ تو بات سے بات نکل آئی۔ اصل بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انگریز سات سمندر پار سے آکر ہماری قسمتوں پر قابض ہو گئے تو اس کا اصل سبب ہمارے اندرون میں تھا۔ ہم ایک مدت سے پٹی ڈگر سے ہٹ کر سوچنے کی صلاحیت کھو چکے تھے۔ ہر نئے چیلنج کے جواب میں ہمارا جواب پرانا ہوتا۔ ہمارے علماء و قائدین حقیقی دنیا سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ نئے عہد کے سوالات فتاویٰ کی پرانی کتابوں میں تلاش کرتے۔ شاہ ولی اللہ نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا تو جمہور نے آسمان سر پر اٹھا لیا، شاہ عبدالعزیز نے برطانوی ہند میں سود کی حرمت کو تحلیل و تجزئے کا موضوع بنایا مگر بات آگے نہ بڑھی۔

مگر یہ لوگ تو روایتی مقلدین کے خیمے سے تھے، بلکہ ان کے سرخیل کہہ لیجئے، عبدالمرعد نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

بالکل درست! تم نے صحیح سمجھا۔ مگر لوگ ایک انچ بھی پٹی ڈگر سے ہٹنے کے روادار نہ تھے۔ انہیں تو مدت سے تقلید مطلق کا چسکا لگ چکا تھا۔ ایک بند دماغی ان کا مقدر بن گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نوشتہ دیوار کو نہ پڑھ سکے۔ اپنے گرد ہونے والی پے بہ پے تبدیلیوں کے باوجود وہ اپنی بنائی ہوئی خیالی دنیا میں مست رہے۔

'گویا ایک پوسٹ ماڈرن ریپبلٹی نے انہیں آ لیا تھا' میں نے عبدالمرعد پر اپنے درسی علم کی دھاک بٹھانے کے خیال سے کہا۔

والد صاحب نے میری اس مداخلت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ انہیں شاید مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کی جلدی تھی۔ بولے: یہی بند دماغی اگر مذہبی زندگی میں داخل ہو جائے تو ایک میکا نیکی قسم کی دینداری جنم لیتی ہے، روح

عبودیت سے خالی۔ ساری توجہ اپنے حصے کا ثواب اکٹھا کرنے پر لگی رہتی ہے۔ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے ہاتھوں بندگانِ خدا کے حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ یہ انگریز جو باہر سے آکر ہمارے امور پر قابض ہو گئے تو اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ روایتی اور میکانیکی دینداری کے ہاتھوں ہماری اخلاقی حالت تباہ ہو چکی تھی۔ ایک طرف عرس کے میلے، رجب کے کونڈے، بڑے پیر صاحب کی نیاز اور محرم کے تعزیوں کا شور تھا جس سے دینی زندگی پر رونق معلوم ہوتی تھی اور دوسری طرف اسی کے ساتھ طوائفوں کے کوٹھے آباد تھے جسے رئیسانہ ٹھٹھٹ باٹ میں ایک ثقافتی علامت کے طور پر دیکھا جاتا۔ رقص و سرود اور شعر و سخن کے رسیا یہاں اپنی حاضری کو معیوب نہ جانتے۔ ایک مرتبہ والد مرحوم نے اپنے ایک زمیندار دوست کے ساتھ مجھے سفر پر روانہ کر دیا۔ ان دنوں میں مدھوبنی میں دورہ قرآن کر رہا تھا، تعطیل میں گھر آیا ہوا تھا۔ ان صاحب نے راستے میں ایک جگہ قیام کیا، ایک محل نما عمارت تھی، آسائش کا سارا سامان موجود تھا جو اس زمانے میں کسی بڑے رئیس کی کوٹھی میں ہوا کرتے تھے۔ ہم لوگ کچھ دیر ٹھہرے پھر تازہ دم ہو کر اگلی منزل کے لئے روانہ ہو گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہم جہاں ٹھہرے تھے وہ دراصل مٹی بانی کا مکان تھا۔ والد صاحب کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ اپنے دوست پر بہت خفا ہوئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بچے ان مراکزِ فنون و فساد سے آشنا ہوں۔

بہشتی زیور میں بھی تو مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے لکھنؤ کی ایک نیک بی بی کا تذکرہ کیا ہے جن کے میاں دن رات کوٹھے پر پڑے رہتے اور وہ اللہ کی بندی اس صورت حال پر احتجاج کے بجائے صبر و شکر پر گامزن وہیں کوٹھے پر کھانا بنا کر بھیجا کرتی، خلق میں اس کا بڑا نام ہوتا۔ عبد المعز نے اپنی معلومات کو کام پر لگاتے ہوئے ایک اور شہادت فراہم کی۔

بولے: بیٹا یہ اس زمانے کا عام مزاج تھا۔ ہمارے ایک عزیز کے ہاں شادی تھی۔ لڑکے کے پھوپھا کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ اس زمانے کی شادیوں میں روٹھے منانے کا بڑا رواج تھا۔ بات جب آگے بڑھی اور ان کی ناراضگی نے نازک رخ اختیار کر لیا تو لڑکی کے والد خود اپنے ہاتھوں میں شربت کا گلاس لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مگر پھوپھا تو ٹھہرے لڑکے والے، وہ اتنی آسانی سے کہاں ماننے والے تھے۔ کہنے لگے جناب اب بات بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ اب صرف شربت سے کام نہ بنے گا اس کے ساتھ شہوت کے لوازم بھی ہونے چاہئے۔

استغفر اللہ! کیسے کیسے لوگ تھے۔ عبد المعز نے حیرت کا اظہار کیا۔

ابا کا بیان جاری تھا۔ بولے: زمیندارانہ زندگی کی تن آسانی نے بڑے مفسد کو جنم دیا تھا۔ عموم بلوئی کے اس ماحول میں مذہب کا تذکرہ بے جوڑ معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے ایک دوست تھے ارتضیٰ حسین، ابھی پچھلے

سال ان کا انتقال ہوا۔ خدا غریقِ رحمت کرے۔ شہر کے مضافات میں چندن پٹی نام کا ایک گاؤں ہے جہاں اہل تشیع کی بڑی آبادی ہے، یہ وہیں کے رہنے والے تھے۔

پروین شا کر بھی تو شاید وہیں کی رہنے والی تھیں؟ چندن پٹی کے تذکرے سے جیسے عبد المعز کو کچھ اچانک یاد آ گیا ہو۔

بولے: ہاں ان کا خاندان بھی وہیں کا تھا جو بعد میں کراچی کو ہجرت کر گیا تھا۔ تو یہ ارتضیٰ صاحب بڑے بھلے آدمی تھے، بڑے ہی خدا ترس، مطالعہ کے شوقین۔ ایک دن کہنے لگے حافظ صاحب آج محرم کی آٹھویں تاریخ ہے۔ ہر روز مجلس میں بیٹھتا ہوں، مصائب اہل بیت سنتا ہوں مگر دل کی دنیا میں ہلچل پیدا نہیں ہوتی۔ بڑی بد نصیبی ہے ایسا لگتا ہے جیسے آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے ہوں۔ کیا بتاؤں جب دنیا دار ذاکرین کو مسند پر براجمان دیکھتا ہوں تو ان کے بیان پر ایک میکینکی عمل کا گمان ہوتا ہے۔ میں تو انہیں تاجرانِ خونِ حسین کہتا ہوں۔ ان کی بھاری بھر کم فیس کے بارے میں آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ مسند پر مرصع دھلی ہوئی شستہ زبان اور سٹیج سے اترتے ہی عامیانہ طرز کلام حتیٰ کہ گالم گلوں۔ اب ان بہرہ پیوں کا نوحہ سن کر آنکھوں میں آنسو اترے تو کیسے؟

’گویا اہل تشیع کی اخلاقی صورت حال بھی ہماری ہی طرح پتلی تھی۔‘

ان کی صورت حال تو اور بھی خراب تھی، ان کا غم ایک درجہ بڑھ کر تھا۔ لکھنؤ کے بیشتر نواب شیعہ تھے۔

زبان و ادب اور ثقافت کے حوالے سے ان کے ہاں بے جا تعلیٰ کو بڑا دخل تھا

’وہ تو رگِ گل سے بلبل کے پر باندھنے کے عادی تھے، عبد المعز نے لقمہ دیا۔‘

ہاں تم بالکل صحیح سمجھے۔ بے جا تکلفات اور اور تصنع بھری زندگی نے انہیں حقائق کی دنیا سے بے دخل کر دیا تھا۔ ۱۹۵۱ء کے زمینداری ایکٹ نے ان کی معاشی شہِ رگ کاٹ دی تھی۔ وہ تو اپنی بیش قیمت شہری املاک کی تنظیم نو بھی نہ کر سکے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جن ساہوکاروں کو انھوں نے اونے پونے اپنی کوٹھیاں فروخت کی تھیں یا جن کے ہاتھوں املاک رہن رکھی تھیں آگے چل کر ان ہی کی سیاست کے شکار ہو گئے۔

اچھا! وہ کیسے؟

بولے: تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ لکھنؤ ہندوستان کا وہ واحد شہر ہے جہاں ہندو۔ مسلم فساد نہیں

ہوتا، بلکہ مسلم۔ مسلم فساد ہوتا ہے۔

’آآں! کیا مطلب؟‘

بولے: مسلمانوں کے دو دھڑے شیعہ سنی آپس میں اس شان سے لڑتے ہیں کہ غیروں کو ہم سے

الجھنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی۔ دراصل ہم اندرونی اور بیرونی ہر دو محاذ پر پھسپائی کے شکار ہیں۔ ایک طرف تو احیاء پسند ہندو ہیں جو آزادی کو ویدک بھارت کے احیاء کے طور پر دیکھتے ہیں اور جن کے لئے ہمارا وجود قابل نفیس بن چکا ہے۔ دوسری طرف ہم نے باہمی رقابتوں اور مسلکی تنازعات کے لئے خاصی گنجائش پیدا کر لی ہے۔

’تو کیا آزادی سے پہلے شیعہ۔ سنی کی باہم رقابتیں اس طرح عیاں نہ تھیں؟‘ میں نے پوچھا۔  
 بولے: رقابتیں تو تھیں مگر اسی طرح جیسے بریلوی دیوبندی کے جھگڑے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے سے مختلف ہونے کا احساس نہ تھا۔ باہم شادیوں کا رواج تھا۔ قومی نوعیت کے کاموں میں دونوں فریقے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے۔ تم اپنی یونیورسٹی کے معاملے ہی کو لو۔ سرسید کو اپنے شیعہ دوستوں کا بھر پور تعاون ملا، اور صرف اثنا عشری شیعہ ہی نہیں بلکہ آغا خانی اور بوہرہ شیعوں کے نقوش بھی اس کی بنا میں موجود ہیں۔ لکھنؤ کا معاملہ تو ساٹھ کی دہائی میں بگڑا ہے جب سے شیعہ سنی تنازعہ میں جن سنگھ کی سیاست داخل ہوئی ہے۔

’جن سنگھ کی؟‘

ہاں! یہ بھی ہمارے باہمی نزاع کا ایک عبرت انگیز پہلو ہے۔ جن غیر مسلم ساہوکاروں نے شیعہ نوابوں سے ان کی املاک خریدی تھی اور جس کے سبب ان کی اہل تشیع سے دعا سلام تھی وہی لوگ اب جن سنگھ کی سیاست میں سرگرم تھے۔ سیاسی طور پر لکھنؤ اب تک کانگریس کا گڑھ سمجھا جاتا تھا جہاں سنی مدیح صحابہ کا جلوس نکالتے اور شیعہ اصحابِ ثلاثہ پر تبرّ اڑھتے۔ چنگاری تو موجود تھی، سنگھ کی مداخلت نے اسے شعلہ بنا دیا۔ سنگھ نے سنیوں کے مقابلے میں شیعوں کو اپنا تعاون پیش کیا اور اس کے بدلے انہیں شیعوں کے یکمشت ووٹ مل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۶۷ء کے صوبائی الیکشن میں شہر لکھنؤ کی چاروں کی چاروں اسمبلی نشستوں پر جن سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ پھر تو یہ ہوا کہ ہر چھوٹے بڑے الیکشن کے موقع پر شیعہ سنی فساد معمول کی بات ہو گئی۔ ابھی چند برسوں سے یہ آگ ٹھنڈی ہے جب سے جنٹا پارٹی کی حکومت نے شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے نزاعی جلوسوں پر پابندی لگا رکھی ہے۔

ابا کا بیان ابھی جاری ہی تھا کہ جامع مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ ’اچھا اب آپ لوگ نماز کی تیاری کریں، یہ باتیں تو چلتی ہی رہیں گی‘ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور مجلس برخواست ہو گئی۔  
 آج مسجد کو جاتے ہوئے نہ جانے کیوں ڈاکٹر کوکب قدر میرزا کا خیال آیا۔ کوکب صاحب شعبہ اردو میں استاد تھے مگر ان کا اصل امتیاز یہ تھا کہ وہ آخری تاجدارِ اودھ نواب واجد علی شاہ کے پڑپوتے تھے۔ جب

ان سے کوئی یہ کہتا کہ حضور ہم لوگ تو آپ کی پر جاہیں تو ان کے چہرے پر ایک خواب آسا کیفیت طلوع ہوتی جیسے ماضی پھر سے مرصع ہو کر نگاہوں کے سامنے آ گیا ہو۔ ان کی تحقیق و جستجو کی تمام تر تگ و تاز اسی خاندانی حوالے سے قائم تھی۔ کہاں علی گڑھ کی عسرت بھری معلمی اور کہاں اودھ کی عشرت انگیزیاں۔ جب لکھنؤ کے محلات ان کی نگاہوں میں جھلملاتے ہوں گے تو ان کے دل پر کیا گذرتی ہوگی۔ نواب واجد علی شاہ اپنی معزولی کے بعد ۳۱ سال زندہ رہے۔ اس عرصے میں بھی ان کے وہی ریسانہ مشاغل رہے؛ رقص و سرود، شعر و نغمہ اور پری چہروں سے نمل پانے کی حسرت۔ انھوں نے مختلف قسم کی ٹھہریاں اور راگ بھیرویں کی دسیوں لے ایجاد کیں۔ ان کا نغمہ بابل مورے نیہر چھوٹو ہی جائے، تو آج بھی کانوں میں رس گھولتا ہے۔ لیکن وہ اس بدلی ہوئی صورتِ حال کے مداوا کے لئے کچھ نہیں سوچ سکے، اتنا بھی نہیں جس کا اظہار شعر و نغمہ سے ہو سکے۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی ان سے مسلسل سرگوشی کرتا رہتا تھا کہ تم کوئی اور نہیں اودھ کے تاجدار ہو، معزول ہی سہی مگر ہو تو چھپلی عظمتوں کے امین۔ کہتے ہیں کہ جب وہ اودھ سے جلاوطن کئے جا رہے تھے تو ان کے ساتھ ایک ہزار باورچیوں کی فوج تھی۔ انہیں تاج برطانیہ سے بارہ لاکھ روپیوں کی پنشن ملتی تھی۔ کلکتہ کے میا برج میں، جہاں انھوں نے جلاوطنی کے دن گزارے، وہاں بھی انھوں نے ایک چھوٹا سا لکھنؤ آباد کر رکھا تھا۔ ان کی اگلی نسلیں بھی ماضی کے حصار سے باہر نہ نکل سکیں۔ ان کے کانوں میں بھی پدم سلطان بود کی گونج سنائی دیتی رہی۔ ایک طرح کا paranoia یا حبطِ عظمت ان کا مقدر بن گیا۔ اس طرح کی نفسیاتی کیفیت میں فرد کا تعلق حقیقی دنیا سے بڑی حد تک منقطع ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے عروج (peak) کے لمحات ماضی بعید میں دیکھتا ہے، اسے ایسا لگتا ہے کہ اچھے دن تو گذر گئے اب آگے جو کچھ ہے وہ زندگی کا تلچھٹ ہے۔ قوموں کی زندگی میں اس مرض مزمن کو ماضی گزینی کہتے ہیں۔

ایک نئی ابتدا کے لئے لازم ہے کہ ہم اپنے کمال کی انتہا اپنے ماضی میں دیکھنے کے بجائے مستقبل میں متصور کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ 'عظمتِ رفتہ' جیسی ترکیبیں دراصل ایک شکست خوردہ ذہنی رویے کی حامل ہیں جو ہمیں پہلے ہی مرحلے میں خالی کارتوس ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔

## شامِ غریباں

نئے تعلیمی سال کی ابتداء ہو چکی تھی۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ بہت سے پرانے احباب جو اب تک رسالہ تجدید کی ادارت اور رائرز فورم کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں میرے شریک و سہم رہے تھے، اب نئے تعلیمی کارواں کا حصہ نہ تھے۔ شاہد پرویز اور عادل محمود تو پہلے سے ہی تجارت کا ارادہ رکھتے تھے، قمر عباس اور آل علی انگریزی ادب کے طالب علم نہ تھے اور حلیم بھائی چونکہ ایک عالم جذب میں رہتے تھے اس لئے ان کے بارے میں کچھ اندازہ نہ تھا۔ ایک دن ہاسٹل کے سیرر نے ایک بڑے سائز کا گندمی لفافہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ چھٹیوں میں آپ کے کوئی دوست دے کر گئے تھے میں نے احتیاط سے الماری میں رکھ دیا تھا پھر یاد نہ رہا۔ کھول کر دیکھا تو لفافے میں پیتل کا ایک انتہائی نفیس پیپر کٹر (paper cutter) ایک چھوٹی سی تلوار کی شکل میں موجود تھا جس پر علم الانسان مالہ یعلم کی آیت قرآنی کندہ تھی۔ ساتھ میں ایک پتلی سی کا پی تھی جس کے سرورق سے ایک مختصر سا رقعہ ملحق تھا۔ لکھا تھا:

’عزیز دوست! سلام و رحمت۔ پتہ نہیں اب کب ملاقات ہو، حالات کدھر لے جائیں۔  
سر دست مجھے اپنی والدہ کی خبر گیری کرنی ہے۔ بھائی کی موت کے بعد وہ اپنے قابو میں نہیں  
ہیں۔ نقرس کی بیماری نے پریشان کر رکھا ہے۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ابھی تک ۱۳  
اگست کے سانچے کو بھلا نہیں پائی ہیں۔ وہ دن رات روتی رہتی ہیں۔ کاش کہ ہمیں بھول جانے پر  
قدرت ہوتی۔ مگر ہمارا کام تو بھولنا نہیں یاد دلانا ہے تاکہ اگلی نسلیں اس بربریت کو روک سکیں۔ تم  
لوگوں کے اصرار پر کئی بار کچھ لکھنے کی کوشش کی مگر ذہن ساتھ نہیں دیتا۔ موقع ملے تو اس تحریر کی  
نوک پلک درست کر دینا۔ ارادہ اس کی باقاعدہ اشاعت کا ہے۔ شاید کسی موقع پر علی گڑھ کا ایک  
چکر لگاؤں۔ تب تک کے لئے خدا حافظ۔  
عبدالحلیم صدیقی‘

خط پڑھ کر دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ خیال آیا، بے چارے حلیم بھائی پتہ نہیں کس حال میں ہوں۔ ان کا  
تعلیمی سلسلہ ایک بار پھر بحران کی زد میں تھا۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ شاید وہ جلد ہی لوٹ کر آئیں،

ملاقات کی کوئی سبیل پیدا ہو۔ کاپی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ جلی قلم سے لکھا تھا: شامِ غریباں ۱۳ اگست ۱۹۸۰ء۔ اندازہ ہوا کہ کوئی روز نامہ مچھ قسم کی چیز ہے۔ حاشے پر لال روشنائی سے طرح طرح کی علامتیں بنائی گئی تھیں۔ کہیں خالی مثلث پر اوپر کی جانب تیر کا نشان بنا تھا تو کہیں بیضوی دائرے کے بیچ میں لکھا تھا: 'وٹا ق موجود'۔ کہیں لکھا تھا: 'غور طلب' تو کہیں عین تاریخوں کے اندراج سے اوپر ذوالفقار کی چھوٹی سی تصویر بنی تھی۔ تحریر کے خاتمے پر ایک مہم ساز اچھ وضع کیا گیا تھا جس میں مختلف اعداد و شمار کے بیچ 'سینجلی'، 'سینجلی' کے الفاظ لکھے تھے۔ اب تک حلیم بھائی کی تحریروں کی درستگی کا طریقہ یہ رہا تھا کہ وہ پڑھتے جاتے اور میں سنتا جاتا، درمیان میں انہیں روک کر کوئی مشورہ دے دیتا یا کبھی جملوں کی ساخت میں معمولی تبدیلی کر دیتا۔ اب جوان کی کاپی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس پر یہ پیچیدہ نقوش و علامتیں نظر آئیں تو اس بات کا اندازہ ہوا کہ وہ اپنے دلِ مضطر کو سہارا دینے کے لئے مختلف وادیوں میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ روز نامے کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی تھی:

علی گڑھ ۵ ستمبر ۱۹۸۰ء

آج بخار کا ساتواں دن ہے۔ ڈاکٹر جگر کی لال پہلی گولیوں سے طبیعت اب گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے اندرون میں زندگی کی عمارت زمیں بوس ہو گئی ہو۔ کاش کہ خود کشی آسان ہوتی۔ والدہ کا خیال آتے ہی دل کانپ جاتا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں کہ مجھے زندہ رہنا چاہئے تاکہ میں اپنی اس دکھ بھری داستان کو قلم بند کر سکوں۔ لوگوں کو پتہ تو چلے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یہی سوچ کر ڈائری لکھنے کی ابتداء کی ہے۔ درد کی امانت سنبھال کر رکھنا سب کے بس کی بات نہیں۔ خدا مجھے ہمت دے۔

دہلی ۱۱ ستمبر ۱۹۸۰ء

آج بچوں کے گھر میں مسلم مجلس مشاورت کے اجلاس میں شرکت ہوئی۔ اجلاس تو مجلسِ عاملہ کا تھا مگر علی گڑھ سے کچھ طلباء بھی آگئے تھے۔ مجھے امید تھی کہ عید گاہ میں قتل عام کے ایک عینی شاہد کے طور پر شاید مجھے بھی کچھ بولنے کا موقع ملے گا مگر وہاں تو ہلڑکی کیفیت تھی۔ کون کس کی سنتا۔ پہلی بار امت کے بڑے بڑے قائدین کو مشاورت کرتے دیکھا۔ مفتی عتیق الرحمان صدر مجلس مشاورت کے علاوہ مولانا علی میاں ندوی، مولانا منت اللہ رحمانی، جماعتِ اسلامی کے مولانا محمد یوسف، ابراہیم سلیمان سیٹھ، سید شہاب الدین، مسلم مجلس کے ذوالفقار اللہ اور بھی بہت سے لوگ۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ جہاں دو مولوی ہوں وہاں ہر مسئلے پر کم از کم تین رائے ضرور

ہوگی۔ بس وہی صورت حال تھی۔ بات اس وقت بگڑ گئی جب حاضرین کو یہ لگا کہ ہمارے قائدین سخت موقف اپنانے سے کترارہے ہیں۔ بالآخر اس بات پر اتفاق ہوا کہ ایک وفد مراد آباد جائے مگر کب جائے یہ کوئی بتانے کو تیار نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہمارے قائدین کو اس سلسلہ میں کوئی جلدی نہ تھی۔ ایک تو قتل عام کے ایک مہینے بعد میٹنگ بلائی اس پر بھی یہ نہ لگتا تھا کہ کوئی ٹھوس منصوبہ ان حضرات کے پاس ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ لوگ مراد آباد کے شہداء پر فاتحہ خوانی کے لئے جمع ہوئے ہوں کاش میں اس جلسہ میں شریک نہ ہوتا تو کم از کم اپنے ملی قائدین کے بارے میں رومانی رائے رکھتا۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے۔

مجلس مشاورت کی کاروائی کو قریب سے دیکھ کر اس لطیفے پر یقین پختہ ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ابلیس کی مجلس میں بہت سے شیاطین اپنی اپنی کاروائیوں کی رپورٹ دے رہے تھے۔ ابلیس نے جاننا چاہا کہ اللہ کے ان نام لیواؤں کو جو خود کو آخری پیغام کا حامل سمجھنے کے خطبہ میں مبتلا ہیں ان کی ہمتیں توڑنے کے لئے تم لوگوں نے کیا کیا؟ یہ سن کر ایک شیطان بڑے فخر سے اٹھا، کہنے لگا مراد آباد میں نمازیوں پر گولیاں چلوائیں، مسلمانوں کے کاروبار تباہ ہو گئے، ان کی کمر ٹوٹ چکی ہے، اس سے ابھرنے میں انہیں برسوں لگ جائیں گے۔ مگر اس رپورٹ کو ابلیس نے ہلکے میں لیا۔ ایک دوسرے شیطان نے کہا: حضور ہم نے مسلم تعلیمی اداروں میں پھوٹ ڈال دی۔ مگر ابلیس پر اس بات کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اور میں نے مدرسوں میں غور و فکر اور نئے علوم کے راستوں پر روک لگا دی، اسلاف پرستی کو رواج دیا، ایک دوسرے شیطان نے بازی مارنے کی کوشش کی۔ مگر ابلیس پر پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ بولا اور بھی کسی کے پاس کچھ کہنے کو ہو تو بتائے۔ تب ہی ایک منحنی سا شیطان کھڑا ہوا، بولا: حضور میں نے مسلم مجلس مشاورت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی بنیاد رکھوادی ہے جس کی بنیاد میں اقدامی عمل سے پہلو تہی کا وہی پرانا فارمولہ ہے یعنی دوا را کین اور تین رائے۔ یہ سن کر ابلیس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس منحنی سے شیطان کو گلے لگا لیا۔ بولا تم نے صحیح ہدف پر نشانہ لگا یا اب یہ لوگ ان تنظیموں میں بیٹھ کر اپنے دشمنوں سے ہی دست سوال دراز کریں گے، ہر ظلم کے بعد انکو آڑی کا مطالبہ کریں گے کسی اقدامی عمل پر ان کے اندر کوئی اتفاق رائے نہ ہو سکے گا۔

علی گڑھ ۱۳ ستمبر ۱۹۸۰ء

آج دہلی سے واپسی ہوئی۔ مراد آباد اب بھی جل رہا ہے۔ ماموں سے فون پر بات ہوئی

بہت مایوس تھے۔ مسلمانوں کی فیکٹریوں کے لائسنس منسوخ کئے جا رہے ہیں۔ ان پر الزام ہے کہ وہ اپنی فیکٹریوں میں غیر قانونی اسلحے بناتے ہیں۔ پولس نے بعض غریب مسلم گھروں سے 0.32 بور کی پستول ضبط کی ہے۔ گویا اب مسلمانوں کو غیر قانونی اسلحہ کے جرم میں پھنسانے کی تیاری ہے۔ مسلمان اور فیکٹری؟ کیسا مذاق ہے۔ ہاں کبھی ایسا تھا پر اب تو ان کی اکثریت مزدوروں پر مشتمل ہے۔ اور مسلمانوں کی یہ فیکٹریاں جن پر اسلحہ سازی کا الزام ہے انہیں تو فیکٹری کہنا بھی تکلف ہے۔ کیا ہوتا ہے ان فیکٹریوں میں؟ ایک چھوٹی سی دھوکئی والی بھٹی، ایک سائیکل کا پرانا ریم، لوہے کے کسنے اور کھولنے والے کچھ فرمے، چند پلاس اور چمچکس اور ایک ڈریلنگ مشین۔ یہ ہے مسلم فیکٹری کا کل ساز و سامان جہاں کٹے، ٹمچے اور پستول تیار ہو سکتے ہیں۔ بعض ماہر فن اصلی پستول کی ایسی نقل تیار کر لیتے ہیں جس پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ اور اس کی قیمت اصل کا دسواں حصہ بھی نہیں ہوتی۔ حکومت کے لئے یہ معلومات نئی نہیں ہیں۔ ماضی میں عدالتوں نے یہ مشورے بھی دئے ہیں کہ ان فنکار ہاتھوں کو ڈھنگ کا کام دیا جائے تاکہ ان کا ٹیلنٹ صحیح کاموں میں صرف ہو۔ مگر حکومت تو مسلمانوں کو بدنام کرنے پر تلی ہے۔ وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی۔ وہ مسلمانوں کے قتل عام کا الزام بھی مسلمانوں پر ہی ڈال دیتی ہے۔

علی گڑھ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۰ء

روزنامہ قومی آواز میں آج یہ خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی ہے کہ مسلم مجلس مشاورت کے قائدین کا ایک وفد وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملا ہے۔ خبر جس انداز سے لکھی گئی ہے اس سے یہ تاثر قائم ہوتا جیسے یہ ملاقات ہمارے قائدین کی ایک بڑی حصولیابی ہو۔ پیارے قائدین! حوصلہ رکھیں، ابھی آگے اور بھی بہت سے مراد آباد آئیں گے، وزیر اعظم کے درشن کا آپ حضرات کو موقع ملتا رہے گا۔ مگر یہ ملاقات تو بہت مہنگی ہے۔ ڈھائی ہزار مسلمانوں کے خونِ ناحق اور پورا ایک شہر ویران ہونے کے بدلے آپ کے حصے میں صرف یہ منحوس درشن آتا ہے۔ ہے نا عجیب بات؟

علی گڑھ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ء

آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ خبروں سے واضح ہے کہ مشاورت کا یہ وفد مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کے بجائے دراصل وزیر اعظم کی ایماء پر بلکہ ان کی اجازت لے کر مراد آباد کے لئے روانہ ہوا۔ مراد آباد کی ضلعی انتظامیہ نے قائدین کے اس وفد کا استقبال کیا اور انہیں سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ کمشنر اور ڈی آئی جی نے ۱۹ لوگوں پر مشتمل اس وفد کو شہر کے مسلم اور

غیر مسلم عمائدین سے ملوایا۔ یہ وفد صبح گیارہ بجے پہنچا تھا اور اسے شام ڈھلنے سے پہلے شہر سے نکلنے کی جلدی تھی۔ انہیں ڈرتھا کہ ان کا رات میں یہاں قیام خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔ لیڈری میں خطرہ مول لینے کا اب رواج نہیں۔ چلئے رسم ادا ہو گئی۔ مراد آباد کے مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑیے۔ باغبان بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی۔

علی گڑھ، ۲۵ ستمبر ۱۹۸۰ء

ماموں سے آج پھر گفتگو ہوئی۔ مسلمانوں کو ایک نئی مصیبت کا سامنا ہے۔ حکومت مسلمانوں کے کوائف جمع کر رہی ہے: کن لوگوں کا کتنا نقصان ہوا، چھوٹی گھریلو فیکٹریاں کہاں کہاں ہیں، ان میں کس کس عمر کے کتنے لوگ کام کرتے ہیں؟ ان میں ۱۶ سے ۳۰ سالوں کے نوجوان کتنے ہیں؟ اور اسی قسم کے دیگر سوالات۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت شاید کوئی امدادی پیکیج دینا چاہتی ہے، بعض اس بات سے خائف ہیں کہ اگر ان کا مقصد ہماری مدد کرنا ہوتا تو ہمارے نوجوانوں کی فہرست کیوں بنائی جا رہی ہے۔ ابھی ان ہی نوجوانوں کی رہائی نہیں ہو سکی ہے جو قتل عام کے بعد گھروں سے اٹھائے گئے۔ پتہ نہیں یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ پولس اب بھی گھر گھر تلاشی لیتی پھرتی ہے اور جسے جی چاہتا ہے اٹھا لے جاتی ہے۔ کسے مجال کہ مزاحمت کرے۔ مزاحمت کرنے والے یا تو مارے گئے یا جیلوں میں بند ہیں۔ اب تو دب دب کر اور گھٹ گھٹ کر جینے کا رواج ہے۔ ایک عورت نے جس کے شوہر کو پولیس لئے جا رہی تھی آواز بلند کی تو پولیس والے نے اس کی گود سے دو سالہ بچے کو لے کر ہوا میں اچھال دیا۔ سنا ہے تب سے بچے سکتے ہیں۔ بے چاری عورت کیا کرے بچے کو دیکھے یا شوہر کو۔ کتنی بے بسی ہے۔ کاش کہ ہمارے قائدین اس صورت حال کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے۔ پتہ نہیں خدا نے ہمیں کس کے بھروسے چھوڑ دیا ہے؟ ہماری یہ درگت اسی لئے تو ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ مگر اسلام تو ہماری زندگیوں سے غائب ہے پھر خدا کی نصرت کیسے آئے۔ یہ عجیب منحصہ ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ سر عرش تماشا کیا ہے؟

پوری کا پی اسی طرح کے دردناک اندراجات سے پر تھی۔ کہیں غیروں کی ستم ظریفی کا شکوہ تھا تو کہیں اپنوں کی کم نگاہی کا ماتم۔ اوراق الٹتے ہوئے میری نگاہ ۳۰ اکتوبر کے ایک اندراج پر اٹک کر رہ گئی۔ لکھا تھا: سنا ہے تلافی مافات کے طور پر لکھنؤ میں پیام انسانیت کا ایک بڑا جلسہ ہوا ہے۔ قیصر باغ میں بھلے ہندو اور ڈرے سہے مسلمان ایک ساتھ اسٹیج پر بیٹھے۔ ملک کے ضمیر کو جگانے کی بات کی گئی۔ بتایا گیا کہ یہ فسادات

در اصل حد سے بڑھی ہوئی مادہ پرستی، حسد اور تنگ نظری کے سبب برپا ہوتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے اس لطیفے کی خوب پذیرائی ہوئی۔ یا تو ہمارے قائدین واقعی عقل سے پیدل ہیں یا وہ اصل صورتِ حال پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ تو narrative بدلنے کی کوشش ہے۔ اول تو مراد آباد میں کوئی ہندو مسلم فساد نہ ہوا یہاں تو پولس نے منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ دوم اس کا اصل مقصد مسلمانوں کا حوصلہ توڑنا ہے تاکہ وہ اپنی تنظیم نو کا خیال دل سے نکال دیں اور کانگریس کا ووٹ بینک بن کر رہیں۔ پھر اس بات کو ہم کیوں نہیں کہتے؟ لگتا ہے مراد آباد کے مظلوموں کی آہ و بکا ان پر شور تقرر یروں میں گم ہو جائے گی۔ یا اللعجب! میں نے کاپی بند کی۔ ایک نظر پیپر کٹر پر ڈالی۔ اس کی تراش خراش میں نفاست نمایاں تھی۔ میں نے سوچا ایک زمانہ تھا جب اصحابِ علم اور اصحابِ سیف کے حلقے باہم ایک دوسرے میں مدغم تھے۔ امت کا دانشور اور خطیب، فن سپہ گری اور شہہ سواری کا بھی ماہر ہوا کرتا تھا۔ مگر جب سے سیف و قلم کا تعلق ایک دوسرے سے ٹوٹ گیا امت میں قیادت کا گفتار ماڈل عام ہو گیا۔ بڑے بڑے حوادث کے جواب میں ایک جلسہ کرنا مسئلہ کا حل سمجھ لیا گیا۔

حلیم بھائی کی ڈائری خاصی طویل تھی۔ اس میں تاریخی اعتبار سے بہت سی کام کی باتیں تھی ہر صفحہ درد و کرب سے لبریز تھا مگر اس کے باوجود اس میں وہ کیفیت نہ تھی جو حلیم بھائی کے زبانی بیان کو سن کر پیدا ہوا کرتی تھی۔ جب وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں ۱۳ اگست کی شامِ غریباں کا بیان کرتے اور ان ماؤں کی گریہ زاری کی مقامی لب و لہجے میں تصویر کشی کرتے جن کے معصوم بچے عید گاہ میں پولس کی گولیوں کا نشانہ بنے تھے تو کلیجہ منہ کو آجاتا۔ ایسا لگتا ان کے منہ سے الفاظ نہیں غم و اندوہ کے دلخراش پیکر نکل رہے ہوں۔ خیال آیا کاش حلیم بھائی صرف ۱۳ اگست کی شامِ غریباں پر پوری کتاب لکھ ڈالتے۔ یہ سوچ کر میں نے مسودہ کو احتیاط سے الماری میں رکھا اور کھڑکی سے باہر حبیب ہال کے اندرونی لان میں دیکھنے لگا جہاں گلابی جاڑے کی دھوپ میں کچھ طلباء اخبارِ بنی کا لطف لے رہے تھے اور کچھ ان خبروں پر تبصرے میں مصروف تھے۔ یہاں بھی قیادت کا گفتار ماڈل سکہ رائج الوقت تھا۔

## علی گڑھ میگزین

ایک دن سورتی صاحب کی مجلس میں قیادت کے 'گفتار ماڈل' کا ذکر چھڑ گیا۔ پہلے تو یہ اصطلاح سن کر مسکرائے پھر کسی قدر سرزنش کے انداز میں بولے ہر جلسے اور ہر میٹنگ کو گفتار ماڈل کہہ کر مسترد کر دینا قرین انصاف نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کہہ کیا رہے ہیں۔ کلام کا بھی اپنا اثر ہوتا ہے، وزن ہوتا ہے۔ کوئی بات دل کی گہرائیوں سے نکلے تو اپنا اثر دکھاتی ہے۔ فمن يعمل مثقال ذرة خیراً یرہ ومن يعمل مثقال ذرة شراً یرہ کا یہی تو مطلب ہے۔ منکرات کے خلاف زبان کھولنا، سلطان جائز کے سامنے کلمہ حق کہنا، یہ سب فن کلام کے سہارے تو ہی انجام پاتا ہے۔ کلام انقلاب کی پہلی منزل ہے۔

'مگر یہ جو روز روز کے جلسے ہیں ان کو آپ کیا کہیں گے؟، میں نے احتجاج کیا۔ حکومت بار بار یہ یقین دہانی کراتی ہے کہ اس کا مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں۔ اور پرسنل لا بورڈ والے بار بار یہ بیان دیتے ہیں کہ وہ پرسنل لا میں مداخلت کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ پھر ایک کے بعد دوسرا بڑا جلسہ منعقد ہوتا ہے اور حکومت اس دوران یہی یقین دہانی کراتی رہتی ہے کہ اس کا پرسنل لا میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں۔ ان باتوں کا آخر کیا حاصل ہے۔ یہ سن کر سورتی صاحب مسکرائے۔ بولے: ارے بھئی اسے کلام نہیں حب کلام کہتے ہیں، یعنی ایسی بات جس کے پیچھے عمل کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ بعض تو میں حب کلام کی عادی ہو جاتی ہیں۔ یہ جو تم شیعہ ذاکرین کی مجلس میں مناقب اہل بیت سنتے ہو اور ہر جملے پر سامعین تحسین کے نعرے بلند کرتے ہیں یا سنی عظمت صحابہ کے جلسوں میں مناقب شیخین کی باتیں ہوتی ہیں تو ان کا بنیادی مقصد فی نفسہ یہ جلسے ہوتے ہیں۔ یہاں بیان کی آٹھ بلند رکھنے کے لئے اکثر تاریخی حقائق کو بھی قربان کر دیا جاتا ہے۔ جہاں بیان فی نفسہ اہم ہو جائے، جلسے جلوس مسائل کا حل سمجھ لئے جائیں وہاں کلام بے عملی کا نقیب بن جاتا ہے۔

'اور یہ جو آپ کہتے ہیں کہ ہر کلمہ کا وزن ہوتا ہے، کلمہ حق رائیگاں نہیں جاتا؟'

بولے: اس کلمے کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ تو ستر اط کوز ہر کا پیالہ پلواتا ہے، حلاج کی جان کے

درپے آجاتا ہے۔ تم اقبال انصاری کے پروگراموں میں نہیں جاتے، بڑے زندہ مسائل زیر بحث لاتے ہیں۔ دانشور بننا چاہتے تھے مگر بن گئے دولت مند۔ سعودی عرب میں وقت ضائع کر آئے۔ جری آدمی ہیں آپ ان سے ملتے رہیں۔

اقبال صاحب شیکسپیر تنقید کا پرچہ پڑھاتے تھے لیکن ان کا اصل جوہر کلاس سے باہر کھلتا تھا۔ کبھی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹوں پر بحث تو کبھی پولس ریفرام کی باتیں، کبھی انسانی حقوق کی دستوری ضمانتوں کا حوالہ تو کبھی مسلم کش فسادات کا ذکر جسے وہ پوگرم یعنی نسل کشی سے تعبیر کرتے۔ بلابالغہ وہ ایک شخص نہیں ایک انجمن تھے۔ ان کی جولانیوں کا میدان مختلف سمتوں میں پھیلا ہوا تھا۔ ملک بھر میں حقوق انسانی کے لئے کام کرنے والی انجمنوں سے ان کے گہرے رابطے تھے۔ ان کی میٹنگوں میں ہونے والی گفتگو سے خطرے کی بو آتی۔ ایک بار غالباً کسی فساد کے موقع پر ہم لوگ طلباء کی طرف سے ایک محضر نامہ جاری کرنا چاہتے تھے۔ خیال آیا کیوں نا اقبال صاحب کو ایک نظر دکھا دیا جائے۔ رات کے نو بج رہے تھے، مگر صبح اس کا اجراء بھی ضروری تھا۔ اس بے وقت آمد پر بھی انہوں نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ مسودہ کی نوک پلک درست کر دی۔ رخصت کرتے ہوئے بولے: ارے بھئی دو تین لوگوں کو اس بات پر مامور رکھئے، میں تو ہمہ وقت حاضر ہوں، آپ لوگوں کو اگر کچھ ہو جائے تو کم از کم دو تین لوگ ضمانت کے لئے تو فوری تیار رہیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ اس ملک میں حساس اور زندہ موضوعات پر کلام کرنا دراصل خطرات کو دعوت دینا ہے۔

ان دنوں میں شعبہ انگریزی کی ادبی انجمن کا سکریٹری بھی تھا جس کے چھوٹے بڑے جلسے گاہے بہ گاہے منعقد ہوتے رہتے۔ اساتذہ میں ظہور عثمانی صاحب بڑی پابندی سے شرکت کرتے۔ عثمانی صاحب کا علم گہرا تھا ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر بھی اٹھنے کا جی نہ چاہتا۔ فارسی اشعار کے فی البدیہہ ترجمے وہ اس شان سے کرتے چلے جاتے کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ ان جلسوں میں چائے کافی کے اہتمام کے لئے ہم لوگ آپس میں چندہ کر لیتے۔ ایک بار دوستوں نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ اگلے پروگرام میں اسلوب انصاری صاحب کو صدارت کی دعوت دی جائے اور چائے بھی ان کی طرف سے ہو جائے۔ تجویز معقول تھی مگر اسلوب صاحب خشک آدمی تھے، ان کے علمی دبدبے اور شخصیت کے جلال سے بڑے بڑے لوگ کانپتے تھے۔ وہ جب آرٹس فیکلٹی کے کارڈور سے گذرتے تو طلباء کا شور مچاتا، شمشاد مارکٹ سے گذرتے تو 'جب پیار کیا تو ڈرنا کیا' کی ریکارڈنگ سنتے ہوئے سرمست لڑکے بار ادب میں کچھ اس طرح کھڑے ہو جاتے جیسے رنگے ہاتوں پکڑے گئے ہوں۔ میں نے ہمت جٹائی، اسلوب صاحب نے میری معروضات سنیں، ایک لمحے کو توقف کیا، پھر میری طرف نگاہ اٹھائے بغیر ہی بولے: 'کیوں نہیں، کیوں نہیں'۔ لیجئے صاحب چائے کی دعوت پکی

ہوگئی۔ میں کمرے سے باہر آیا، مجھے اپنی شوخی پر حیرت ہوئی۔ خیال آیا اگر وہ نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتے تو میرا کیا ہوتا۔ پروگرام کے خاتمے پر میں نے اسلوب صاحب کی ضیافت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ چائے فی نفسہ اہم نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ یہ کس کے ساتھ پی گئی ہے۔ میری اس بات کو بعض احباب نے نیاز مندی پر محمول کیا اور اسے علی گڑھ کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی حالانکہ استاد اور شاگرد دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے توقیر و شفقت کا جذبہ باہمی تھا۔ ایک بار شعبے کی ایک سالانہ تقریب میں طلباء کی طرف سے مجھے مسٹر شیڈول کا خطاب دیا گیا۔ شیڈول ایک بسیار نویس متشاعر قسم کا شخص تھا اس کی طرف مجھے منسوب کرنے کا مطلب میری تحریری صلاحیتوں کا مذاق اڑانا تھا۔ گو کہ ان خطابات کی اہمیت ہنسی مذاق سے زیادہ نہ ہوتی تھی لیکن اسلوب صاحب سے نہ رہا گیا انہوں نے اپنے اختتامی کلمات میں اس بات کا سخت نوٹس لیا۔ اس خطاب کو بدذوقی پر محمول کیا اور اسے میری نسبت حقیقت سے پرے قرار دیا۔

اب اسے میری خوش قسمتی کہئے کہ ایک دن جعفر ذکی صاحب، جو آگے میرے مربی اور سپروائزر بھی ہوئے، نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا اور بولے اسلوب صاحب کی خواہش ہے کہ آپ علی گڑھ میگزین کی ذمہ داری قبول کر لیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! مگر جب کوئی چیز اتنی آسانی سے مل رہی ہو تو بندے کا پھیلنا لازم ہے۔ سو میں نے کہا: میں اس بار گراں کو قبول کرنے کو تیار ہوں مگر میری کچھ شرائط ہیں۔ وہ کیا؟ انہوں نے جانا چاہا۔ وہ یہ کہ مجھے اپنی ٹیم بنانے کی آزادی ہو۔ بولے اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔

جعفر ذکی صاحب کے دفتر میں لکڑی کی ایک دیوہیکل الماری کھڑی رہتی تھی۔ پتہ چلا یہی میگزین کا دفتر ہے۔ الماری کے ساتھ ہی انھوں نے کمرے کی چابی بھی مجھے عنایت کر دی اور میں نئے شمارے کی منصوبہ بندی میں لگ گیا۔ ایک دن پرانے شماروں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے میری نگاہ علی گڑھ میگزین کے ہیومن نمبر (humour number) پر جا پڑی۔ یہ ۱۹۶۱ء کا خاص شمارہ تھا جو کسی محمد صدیق کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ ادارتی نقطہ نظر سے یہ شمارہ پیشہ ورانہ مہارت کا بھرپور اظہار تھا۔ ہر مضمون اپنی جگہ مناسب، ہر تحریر کی نکتہ سبک درست۔ لکھنے والوں میں کچھ ایسے نام نظر آئے جو میرے لئے اجنبی نہ تھے۔ مشتاق احمد یوسفی جنھوں نے اس شمارے میں شائستگی کی مذمت میں اپنا زور قلم صرف کیا تھا، آگے چل کر دنیا کے مزاح کے شہنشاہ کی حیثیت سے جانے گئے۔ محمد حامد انصاری جنھوں نے کھیل کود کے پتھوولوجی کو موضوع سخن بنایا تھا آگے چل کر نائب صدر جمہوریہ کے منصب تک پہنچے۔ انور صدیقی جنھوں نے ڈاننگ ہال کی ستم گری کا خاکہ اڑایا تھا، آگے چل کر جامعہ ملیہ میں صدر شعبہ اور پھر میری پی ایچ ڈی کے ممتحن قرار پائے۔ محمد حسن جنھوں نے اپنے مضمون کلچر کی خودکشی میں میرس ہال کے ایک ثقافتی پروگرام کو موضوع گفتگو بنایا تھا وہ اب اردو کے معروف

نقاد اور بے این یو میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ مولس رضا جنھوں نے اپنے مضمون میں ممتحن حضرات کی خبر لی تھی، اب ایک معروف جغرافیہ داں کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے بانیوں میں بھی ان کا نام آتا تھا اور اس وقت دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اور ان سب سے بڑھ کر ایس زین العابدین جنھوں نے ۱۹۹۴ء کے عنوان سے مستقبل کے ایک خیالی سفر علی گڑھ کی روداد لکھی تھی۔ زین صاحب کی ادارت میں جدہ سے نکلنے والا امور اقلیات کا جرنل اپنے بلند پایہ علمی معیار کے باعث قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہیومن نمبر کے جواز پر دلیل قائم کرتے ہوئے فاضل مدیر نے لکھا تھا: 'ہماری زندگی غم و اندوہ سے اس قدر بوجھل ہو گئی ہے کہ اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان کائناتوں کو کچھ دیر توجہ کی زندگی پر کسی اور زاویے سے نگاہ ڈالی جائے۔ اگر ہم کھل کر تہقہہ لگانے کی پوزیشن میں نہ ہوں تو کم از کم مسکرانے کی کوئی سبیل تو ضرور ہی پیدا ہو جائے۔'

عالیہ کاظمی، جو اس وقت ایم اے کی طالبہ تھیں، نے چند ادبی لطائف رقم کئے تھے۔ لکھا تھا: ایک بار جونا تھن سوئفٹ نے یہ سوال اٹھایا کہ جب سرکار ہر چیز پر ٹیکس لگاتی ہے تو نسوانی حسن اس سے مستثنیٰ کیوں ہے؟ مگر مشکل یہ تھی کہ نسوانی حسن کا تخمینہ لگانا آسان نہ تھا، سو اس مشکل کا حل یہ نکالا گیا کہ اس کام کو خود خواتین کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح بد صورت سے بد صورت خاتون سے بھی ٹیکس کی شکل میں معقول رقم وصول ہو جایا کرے گی۔ ایک دوسرا لطیفہ میکسم گورکی کے حوالے سے تھا۔ ایک بار گورکی کسی سرائے میں قیام پذیر ہوئے جہاں انہیں رات بھر کھٹملوں نے پریشان کئے رکھا۔ صبح اٹھ کر انھوں نے سرائے کی مالکن سے اس بات کی شکایت کی۔ مالکن نے تکرار کیا، بولی نہیں جناب ہمارے ہاں ایک مجرڈ کھٹمل کا وجود بھی نہیں ہے۔ گورکی نے برملا کہا: میں مجرڈ کی بات کب کہہ رہا ہوں میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ سب شادی شدہ اور کثیر العیال ہیں۔ ایک لطیفہ برنارڈ شا کی بابت تھا۔ ایک بار شا موسیقی کی مجلس میں بیٹھے تھے جہاں ایک شخص وائلن بجا رہا تھا۔ شا کچھ دیر وائلن کی آواز سنتے رہے پھر بولے: آج مجھے اس شخص کو وائلن بجاتے ہوئے دیکھ کر پیڈریوسکی کی یاد آ رہی ہے۔ 'مگر پیڈریوسکی تو وائلنٹ نہیں تھا، کسی نے کہا۔' تو یہ کب ہے؟' شانے جواب دیا۔

رسالے کے پچھلے صفحے پر ایک اشتہار چھپا تھا جس میں اگلے شمارے کو سٹائر نمبر (Satire Number) کے طور پر نکالنے کا اعلان تھا۔ پتہ نہیں اس منصوبے کا کیا بنا البتہ اس شمارے کو دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں کسی زندہ اور حساس موضوع پر ایک خاص شمارے کی ترتیب کا خیال گردش کرنے لگا۔

گرمی کی آمد کے ساتھ ہی خالد میاں اپنے موبائل رسٹوراں کو دھکیلتے ہوئے حبیب ہال کے اندرونی دروازے تک لے آتے۔ صبح صبح جب آلو کے پرائٹوں کی اشتہاء انگیز خوشبو ہاسٹل کے کمروں میں پھیلتی تو مختلف سمتوں سے ناشتے کی فرمائش آنے لگتی۔ ایک روپے میں گرما گرم پرائٹھے، اوپر سے ٹماٹر کی چٹنی مفت۔ اگر دل عیاشی پر کچھ زیادہ ہی آمادہ ہو تو ساتھ میں آملیٹ کا آمیزہ بھی لگوا لیجئے۔ غالباً اتوار کی کوئی صبح تھی یا چھٹی کا کوئی دن، بالائی منزل سے جہاں میرا قیام تھا، خالد میاں کو آواز دے رہا تھا کہ میری نظر سٹمشی پر پڑی جو چند طلباء کے ساتھ لان میں پڑی کرسیوں پر براجمان ناشتے کے ساتھ اخبار بنی کا لطف لے رہے تھے۔ غالباً سٹمشی نے میری آواز سن لی تھی۔

’ارے بھئی نیچے اترو نیچے! کبھی تو زمینی حقائق کا سامنا کرو!‘ اس نے آوازہ کسا۔

میں نے سٹمشی کی دعوت قبول کرنے میں ہی عافیت جانی۔ جب سے ایم اے کی کلاسیں شروع ہوئی تھیں میں غیر نصابی سرگرمیوں سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ ادھر اساتذہ مستقل تلقین کرتے رہتے کہ ایم اے کی پڑھائی ارتکاز چاہتی ہے، کامل یکسوئی کے بغیر گوہر مطلوب حاصل نہیں ہو سکتا۔ شیکسپیر کے خصوصی مطالعات اور عالمی ادب کے اضافی پرچے نے، جس میں روسی، فرانسیسی، جرمن اور دیگر زبانوں کے ضخیم ناول اور کلاسیکی ادب پارے شامل تھے، کسی دوسری سرگرمی کے لئے گنجائش کم ہی چھوڑی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طلباء کے مختلف حلقوں میں درس و ارشاد کا سلسلہ ہی نہیں رکا بلکہ اخبارات و رسائل دیکھنے کی بھی فرصت نہ رہی۔ سٹمشی کے لہجے میں ایک طرح کا شکوہ تھا۔ کہاں صبح و شام کی مجلسیں، پرانی کتابوں پر تازہ بحثیں اور کہاں اب شعبہ انگریزی کے ایک کمرے میں دیرات گئے تک اعتکاف مسلسل۔

نیچے لان میں مسلم مسائل پر گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے، یار ہمارے ملی قائدین بھی خوب ہیں۔ حکومت بار بار یقین دہانی کراتی ہے کہ اس کا پرسنل لاء میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں اور ہمارے قائدین کہتے ہیں کہ پرسنل لاء میں مداخلت کی کوئی کوشش ہرگز برداشت نہیں کی جائے گی۔ یہ قصہ

کیا ہے یار۔ یہ لوگ اصل مسائل کو زیر بحث کیوں نہیں لاتے؟ اب بتائیے نیلی میں اتنا بڑا فساد ہوا پھر بھی امت میں کوئی اشتعال، کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔

ہاں یار تین ہزار مسلمان مار دیئے گئے اور وہ بھی صرف سات گھنٹوں کے اندر، ایک دوسرے طالب علم نے تائید کی۔

تین ہزار تو سرکاری اعداد و شمار سے قریب ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مرنے والوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہیں ہوگی۔

دس ہزار! میں نے حیرت پوچھا۔

ہاں بعض صحافیوں نے نیلی کے قتل عام کو جنگ عظیم دوم کے بعد بہیمیت کا سب سے بڑا واقعہ قرار

دیا ہے۔

اور اس ظلم کا انداز بھی تو دیکھئے کتنا وحشیانہ ہے۔ نیلی اور اس کے اطراف میں بنگالی مسلمانوں کی آبادیوں پر چہار طرف سے لوگ اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے جنگلی جانوروں کا شکار کھیلا جا رہا ہو۔ ڈھول تاشے کی آوازیں، جئے اے اہوم (مادر آسام زندہ آباد) کے نعرے اور بھالے برچھیوں اور جدید اسلحوں سے لیس انسانوں کے غول کے غول ان آبادیوں کا محاصرہ تنگ کرتے گئے۔ پہلے گھروں کو آگ لگائی، پھر زندہ انسانوں کو نکال کر کھلے میدان میں لائے اور پھر باقاعدہ قتل عام کا آغاز ہوا۔ عورتوں اور بچوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔

جاننے ہو ایسا کیوں؟ سٹمشی نے مداخلت کی۔ بولے: بات یہ ہے کہ وہ ہماری نسل کشی کے درپے ہیں۔

’سنا ہے مسز گاندھی نے جائے حادثہ کا دورہ کیا ہے اور اب صدر جمہوریہ بھی وہاں جانے والے ہیں۔ کیا واقعی حکومت کو مسلمانوں کی بے بسی پر ترس آ گیا ہے۔‘

ارے بھئی یہ سب سیاسی داؤ پیچ ہے۔ یہ سارا فساد مسز گاندھی کی سیاسی انا نیت اور ضد کے سبب ہی تو

برپا ہوا ہے۔

اچھا! میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ہاں انڈیا ٹوڈے (India Today) کی رپورٹ میں لکھا ہے، سٹمشی نے اپنے تھیلے سے انڈیا ٹوڈے کا تازہ شمارہ نکالتے ہوئے کہا۔ بولے: عام طور پر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ آسام میں الیکشن کے لیے فضا سازگار نہ تھی۔ پوزیشن کی بیشتر پارٹیاں بی جے پی، جنتا پارٹی اور لوک دل کے دونوں دھڑے الیکشن کے بائیکاٹ کی پرزور مہم چلا رہے تھے۔ اٹل بہاری واجپئی جنہیں عام طور پر معتدل لیڈر خیال کیا جاتا ہے اور جنہیں

ان کے انتقال کے بعد خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک جمعیۃ العلمائی مولوی نے بھارت کا انمول رتن قرار دیا تھا، حالانکہ انھوں نے اپنی زندگی میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے یہ بات کہہ دی تھی کہ جو ایک بار سوئم سیوک ہو جاتا ہے وہ ہمیشہ سوئم سیوک ہی رہتا ہے۔ انھوں نے اس موقع پر اپنی شعلہ بار تقریر میں اس بات کا اشارہ دیا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

’غیر ملکی باشندے یہاں آگھے ہیں اور حکومت کوئی قدم نہیں اٹھا رہی ہے۔ اگر یہ پنجاب میں آئے ہوتے تو پتہ ہے کیا ہوتا! لوگ انھیں ٹکڑے ٹکڑے کاٹ کر پھینک چکے ہوتے۔‘

ایسی صورت میں مسز گاندھی نے ہر قیمت پر الیکشن کرانے کی ٹھان لی۔ چونکہ الیکشن کے بائیکاٹ کو عوامی حمایت حاصل تھی اس لیے کانگریس کے حامی بنگالی مسلمانوں نے ووٹ ڈالنے کا عندیہ ظاہر کیا تو ایک تصادم کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ بس یہ سمجھئے کہ سیاسی کراس فائر میں بنگالی مسلمان خواہ مخواہ پھنس گئے۔

’گویا یہاں بھی مسلمان کانگریس کی سیاست کا شکار ہو گئے۔‘

ہاں جانتے ہو آسام میں مسلمانوں کی آبادی پینتیس فیصد کے قریب ہے۔ کشمیر کے بعد یہ واحد صوبہ ہے جہاں مسلمان عددی اعتبار سے فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ مسز گاندھی چاہتی ہیں کہ مسلمانوں کا مجموعی ووٹ ان کی جھولی میں پڑتا رہے۔ اب تک روایتی طور پر آسام میں کانگریس کی حکومت مسلمانوں کی بدولت ہی قائم رہی ہے۔

’اور کوئی مسلم خاتون وزیر اعلیٰ بھی تو رہی ہیں۔‘

انورہ تیور کی بات کر رہے ہیں آپ؟ وہ تو صرف دو مہینے وزیر اعلیٰ رہ پائیں، لیکن ان نمائشی عہدوں کے لیے اصل قیمت تو عوام کو دینی پڑتی ہے۔

گفتگو کا یہ سلسلہ جاری تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ نیلی میں اتنا بڑا حادثہ ہوا اور مجھے اس کا کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ ادھر دس بارہ دنوں سے میں لوگوں کی گفتگو میں نیلی کا تذکرہ سنتا لیکن مجھے اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ ذرا رک کر پوچھ لوں کہ یہ نیلی کیا بلا ہے؟ طلباء کرکٹ کے کھلاڑیوں، ورلڈ کپ، ویسٹ انڈیز، اسٹیفی گراف اور ان جیسے دسیوں غیر مانوس الفاظ کا ذکر کرتے۔ کچھ الفاظ کچھ دنوں بعد گفتگو سے غائب ہو جاتے۔ میں نے سوچا یہ نیلی بھی اسی قبیل کی کوئی چیز ہوگی، جس کا جاننا میرے لیے ضروری نہیں۔ مجھے نہ کھیلوں میں دلچسپی تھی اور نہ اس کی کوئی معلومات۔ ابھی چند دن پہلے ایم اے سال اول اور سال دوم کے طلباء کے مابین کرکٹ کا مقابلہ طے پایا تھا۔ دونوں کلاسوں کی لڑکیاں اپنے اپنے ہم جماعتوں کی حوصلہ افزائی کے لیے میچ دیکھنے آئی تھیں۔ کھیلنے والوں میں بھی غیر معمولی جوش و خروش تھا کہ اس قسم کے مواقع شولری (chivalry) کے

اظہار کے لیے علی گڑھ کی روایت پسند سوسائٹی میں قابل قبول سمجھے جاتے تھے۔ دوسرے دن طالبات نے میری غیر حاضری کا شکوہ کیا۔ بولیں: تم نہیں آئے، بہت لطف آیا، ہم لوگوں نے تمہیں بہت مس کیا۔ میں نے مصروفیت کا بہانہ بنایا، معذرت کی، پوچھا کون جیتا؟ بولیں ہم لوگ۔ میں نے پوچھا: کتنے گول سے؟ یہ سن کر وہ سب ششدر رہ گئیں۔ بعضوں نے قہقہہ لگایا اور بعضوں نے کہا ٹھیک ہی کیا تم نہیں آئے۔ میں نے سمجھا یہ نبی بھی شاید کسی طالبہ کا نام ہو، خود کو اس ذکر خیر سے دور رکھنا ہی مناسب معلوم ہوا، لیکن اب جو انڈیا ٹوڈے کا تازہ شمارہ ہاتھ میں آیا اور اس کے سرورق پر چلتے مکانوں کی تصویر کے ساتھ The Burning of Assam کی سرخی دیکھی تو دل اندر سے دہل سا گیا۔ اپنی غفلت پر سخت غصہ آیا۔

انڈیا ٹوڈے نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ بارہ فروری ۱۹۸۳ء کو جب مسز گاندھی ایئر فورس کے ہیلی کاپٹر سے گواہٹی آئی تھیں تو انھیں یہ بات خوب معلوم تھی کہ وہ اپنے ساتھ ایک ایسا بم لے کر آئی ہیں جو خود ان کے ہاتھوں میں پھٹ سکتا ہے۔ انھوں نے سخت حفاظتی حصار میں الیکشن کے ان جلسوں کو خطاب کیا جہاں خطرات کم تھے اور جن میں سے بیشتر کا تعلق مسلم علاقوں سے تھا۔ گویا وہ پینتیس فیصد (35%) مسلم ووٹوں کے بل پر الیکشن جیتنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے مسلم کارڈ کا بڑی عیاری کے ساتھ استعمال کیا۔ اپوزیشن کی ساری پارٹیاں الیکشن کے خلاف تھیں۔ خود سرکاری ایجنسیوں کا اندازہ یہ تھا کہ ستاسی لاکھ ووٹروں میں سے صرف بیس فیصد لوگ ہی حق رائے دہی کا استعمال کر پائیں گے اور وہ بھی صرف مسلم اکثریتی علاقوں میں۔ ایسا اس لیے کہ دوسری پارٹیاں الیکشن کے بائیکاٹ کی مہم چلا رہی تھیں۔ ٹیلیفون کے رابطے اور دیہی علاقوں کو ملانے والے پل تباہ کیے جا رہے تھے۔ اپوزیشن ہر قیمت پر الیکشن کے انعقاد کے خلاف تھی اور اس کے پیچھے کچھ اسی قسم کی عوامی تحریک تھی جو بہار میں بے پرکاش کی تحریک کے دوران دیکھنے میں آئی تھی۔ بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر۔ ایسی صورت میں مسز گاندھی ہانکے پکارے مسلمانوں کو پولنگ بوتھ میں لانا چاہتی تھیں تاکہ الیکشن کی خانہ پری ہو سکے۔ صورت حال یہ تھی کہ مقامی سرکاری ملازمین نے الیکشن ڈپوٹی میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ آسام طلباء یونین اور گن پریشنڈ نے اٹھارہ دنوں سے کی تحریک عدم تعاون چلا رکھی تھی۔ مختلف فوجی اور نیم فوجی دستوں کے ڈیڑھ لاکھ جوان اس دھماکہ خیز صورت حال سے نپٹنے کے لیے آسام کے مختلف علاقوں میں تعینات تھے۔ بیشتر سیاسی لیڈران یا تو گرفتار کر لیے گئے تھے یا روپوش ہو گئے تھے۔ ایسی صورت میں کانگریس کو مسلمانوں کی مسیحائی کا دعویٰ تھا۔ مرکزی وزیر ریلوے غنی خاں چودھری جو اندرا کانگریس کے رہنما تھے وہ مسلمانوں سے برملا کہتے پھرتے تھے کہ اگر انھوں نے کانگریس کو ووٹ نہ دیا تو ان کے دشمن انھیں دوبارہ بنگلہ دیش میں پھینک دیں گے۔ مسلمان خوف زدہ تھے اور اس خوف میں انھوں نے

کانگریس کے لیے ووٹ کرنے کی ٹھان لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کی ہٹ دھرمی اور غلط سیاست کے خلاف جو عوامی غیظ و غضب کا طوفان اٹھ رہا تھا، مسلمان اس طوفان کے نشانے پر آگئے۔ انڈیا ٹوڈے کا کہنا تھا کہ مسز گاندھی کی ان غلطیوں کے لیے کوئی ان سے سوال نہیں کرے گا بلکہ اس کی قیمت ملک اور قوم کو ادا کرنی پڑے گی۔

نا آگہی میں کتنی عافیت ہے، میں نے سوچا۔ آسام کے مسلمانوں پر ایک قیامت گزر گئی اور مجھے اس کی ہوا بھی نہ لگی۔ ان دنوں میں جرمن مصنف ٹامس مان کی مشہور زمانہ ناول *Buddenbrooks* کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ مصنف نے ایک تاجر فیملی کی تین چار نسلوں پر مشتمل واقعات کو کچھ اس طرح قلمبند کیا تھا جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ پہلی نسل جس تجارت کو اپنی جدوجہد سے ترقی کی بلندیوں پر پہنچاتی ہے۔ دوسری، تیسری اور چوتھی نسل تک آتے آتے یہ سب کچھ اس طرح تباہ و برباد ہو جاتا ہے کہ اس خاندان کے نام لیواؤں کے پاس صرف ایک یا سبھراقصہ رہ جاتا ہے۔ یعنی پہلی نسل جو فتوحات حاصل کرتی ہیں اگلی نسلیں اس جاہ و حشم کو برقرار نہیں رکھ پاتیں۔ سیاست ہو یا تجارت ہر جگہ یہ (Buddenbrooks effect) یکساں کارگر نظر آتا ہے۔ ایسا اس لیے کہ اگلی نسلوں کو جاہ و حشم تو منتقل ہوتا ہے، لیکن اس جاہ و حشم کو وجود میں لانے والے نصب العین (mission statement) سے ان کا تعلق کمزور پڑ جاتا ہے۔ مغل ہوں یا عثمانی ترک یا روم و فارس کی سلطنتیں، ان سب کے زوال میں *Buddenbrooks effect* کی کارفرمائی آسانی دیکھی جاسکتی ہے۔ ناول میں دکھایا گیا تھا کہ چوتھی نسل تک پہنچتے پہنچتے ایک متمول خاندان کچھ اس طرح تباہ ہوا کہ ایک بچی کے علاوہ خاندان کا کوئی فرد باقی نہ بچا۔ نیلی میں بھی مسلمانوں کو ایک منظم نسل کشی کا سامنا تھا۔ کیا ہندوستانی مسلمان بھی تباہی کے اسی راستے پر چل نکلے ہیں۔ ان کے مشن اسٹیٹمنٹ کو کیا ہوا؟ وہ کانگریس کی سفاک سیاست کا شکار کیسے ہو گئے۔

### پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھیے

میں نے بہت سوچا لیکن کوئی واضح تصویر ابھر کر سامنے نہ آسکی۔ ایک دن شمشاد مارکیٹ سے گزرتے ہوئے انڈیا ٹوڈے کے تازہ شمارے پر نظر پڑی، جس کے سرورق پر معصوم بچوں کی اجتماعی تدفین کا منظر دکھایا گیا تھا۔ میدان میں ہر طرف بچوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے یہ شمارہ خرید لیا۔ رسالے میں بعض دل دہلا دینے والی تصویریں تھیں۔ لکھا تھا کہ ایسا لگتا ہے کہ حملہ آور نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی نئی نسل کو سرے سے فنا کر دینا چاہتے تھے، بلکہ ان کا یہ بھی منصوبہ تھا کہ کوئی عورت باقی نہ بچے جو مستقبل میں مسلم بچوں کو جنم دے سکے۔ صبح آٹھ بجے سے قتل عام شروع ہوا جو دن بھر بلکہ بعض رپورٹوں کے مطابق دیرات تک جاری

رہا۔ رپورٹر نے ایک عجیب بات یہ لکھی تھی کہ اٹھارہ فروری کو یہ قتل عام ہوا ہے، اس کے چند ہی دنوں بعد جب مسز گاندھی جائے وقوع کا معائنہ کرنے پہنچی ہیں تو انھیں اس قتل عام کا کوئی نشان دیکھنے کو نہیں ملا۔ تو کیا اتنی تیزی سے سارے آثار مٹا دیئے گئے۔ رپورٹ تو یہ کہتی ہے کہ انسانی خون کی کثرت سے کھیتوں میں پانی کا رنگ لال ہو گیا تھا۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے کٹے پھٹے جسم، مُٹلہ اور مسخ شدہ حالتوں میں ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ درد و کرب کا یہ منظر نامہ اتنی سرعت کے ساتھ کیسے غائب ہو گیا۔ میں نے رسالہ کے سرورق پر اپنی یادداشت کے لیے یہ مختصر سا نوٹ لکھا:

’نیلی میں انسانوں پر جو قیامت گزری ہے اس کی کر بنا کی کا عام لوگوں کو کوئی اندازہ نہیں۔ اموات تین ہزار ہوں یا دس ہزار، ان کی تعداد سے کرب کی شدت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ کاش کہ ہمیں معلوم ہوتا کہ مرنے والے بے جان نمبر نہیں بلکہ ہماری طرح گوشت پوست کے عام انسان تھے اور انھیں بھی زندگی صرف ایک بار جینے کو ملی تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آزاد ہندوستان کا سب سے بڑا قتل عام ہمارے اجتماعی حافظے میں محفوظ رہ پائے گا؟‘

اس واقعہ کو عرصہ گزرا۔ سال ۲۰۱۳ء کے آخری ایام تھے۔ میں اپنے تصنیفی مشاغل کے سلسلے میں علی گڑھ میں مقیم تھا۔ ان ہی دنوں مسلم یونیورسٹی کی طرف سے برج کورس کے تعلیمی تجربہ کے لیے مجھے پروفیسر شپ کی پیشکش ہوئی۔ بعض رسمی کارروائیوں کی خانہ پری کے لیے زندگی میں پہلی بار تعلیمی اسناد کی ضرورت پیش آئی۔ اسی تلاش میں پرانی فائلوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے انڈیا ٹوڈے کا وہ شمارہ نظر آیا جس پر میرا نوٹ آج بھی اسی طرح چپکا ہوا تھا۔ اس تحریر پر نظر پڑتے ہی بس یہ سمجھنے کہ ۱۹۸۳ء کا وہ کربناک منظر نامہ پھر سے نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ ان ہی دنوں ملکیو کی مورہ (Makiko Kimura) کی کتاب *The Nellie Massacre of 1983* شائع ہو کر آئی تھی جو حسن اتفاق سے میرے مطالعہ کی میز پر موجود تھی۔ تیس سال کے اس طویل عرصے میں نیلی کے قتل عام پر لکھی جانے والی تحریروں کی تعداد حیرت انگیز طور پر کم تھی۔ ملکیو ایک جاپانی مصنفہ ہیں جو جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں تحقیقی مطالعہ کے لیے آئی تھیں۔ قدرت نے ان سے یہ کام لے لیا۔ اس کے علاوہ دو ہزار آٹھ (۲۰۰۸ء) میں ہیمنڈ رنارائن کی ایک مختصر سی کتاب شائع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا *25 Years on... Nellie still haunts*۔ ہیمنڈ نے لکھا تھا کہ میں ان دنوں انڈین ایکسپریس کا نامہ نگار تھا اور میں نے اس قتل عام کے مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میں بہت دنوں سے اس درد کو اپنے اندرون میں سمیٹے ہوا تھا۔ میں نے اسے لکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم نے پچیس سال بعد یہ کتاب کیوں لکھی تو میرا جواب یہ ہے کہ میں اس کرب کو آخر کب تک

چھپائے رکھتا۔ میرے لیے اس کا لکھنا گویا اندرونی کرب سے رہائی کی ایک صورت ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ سو باسری کرشنن کی ایک ڈاکومنٹری What the Fields Remember بھی ان ایام کی یاد دلاتی ہے جب خیر الدین اپنے دو بچوں کو لے کر بھاگ رہے تھے۔ چھوٹے بچے کو انھوں نے اپنی پیٹھ پر باندھ رکھا تھا اور بڑے کی انگلیاں تھام رکھی تھیں۔ یہ تینوں باپ بیٹے بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ اچانک کسی نے ایک تیز دھار کے اسلحہ سے ان کے بچے پر حملہ کر دیا۔ بچہ دفعتاً ڈھیر ہو گیا۔ اب انھوں نے پیٹھ پر بندھے بچے کو لے کر سامنے تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ اس لمحہ پیچھے سے ان پر تیز دھار کے اسلحہ سے دوسرا وار پڑا۔ انھوں نے تیرنے کی کوشش کی۔ پلٹ کر دیکھا تو ہمت جواب دینے لگی۔ ان کے بچے کا سر دو حصوں میں کٹ کر مخالف سمتوں میں جھول رہا تھا۔ خیر الدین کہتے ہیں کہ آج بھی یہ منظر جب میری نگاہوں کے سامنے آتا ہے تو میری راتوں کی نیند غائب ہو جاتی ہے۔ میں نے اپنے خاندان کے بیس لوگ اس قتل عام میں کھوئے ہیں۔ مجھے انسانوں سے ڈر لگتا ہے۔ میں آج بھی انصاف کی تلاش میں عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹا رہا ہوں، مگر انصاف ملے تو کیسے؟ حکومت نے اس حادثے کی تحقیقات کے لیے جو تیاری کمیشن مقرر کیا تھا اس کی رپورٹ منظر عام پر نہیں لائی گئی۔ چھ سو صفحات کی اس رپورٹ کو بعد میں بعض لوگوں نے حق اطلاعات کے تحت حاصل کیا۔ اس رپورٹ میں جن لوگوں کو ملزم ٹھہرایا گیا تھا، اول تو ان میں سے ایک بڑی تعداد پر پولیس نے کوئی کارروائی نہ کی۔ پھر جن دوسو ننانوے لوگوں پر فرد جرم عائد کی گئی تھی انھیں بھی ۱۹۸۵ء کے آسام معاہدے کے تحت جو وزیراعظم راجیو گاندھی اور پرنولا کمار مہنتا کے مابین طے پایا تھا، عام معافی دے دی گئی۔ خیر الدین اور دوسرے متاثرین اس ناانصافی پر چیخ اٹھے۔ انھوں نے ۲۰۰۷ء میں ہائی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن نقار خانے میں طوطی کی سنتا کون ہے۔

اگست ۲۰۰۷ء میں جب ملکیو کیمورہ اپنے دوسرے تحقیقی دورے پر وہاں پہنچی ہیں تو، اتنے سال گزرنے کے بعد بھی، انھیں ہر طرف درد و کرب کی وہی داستان سننے کو ملی۔ کسی نے کہا کہ میرے خاندان کے ستر لوگ مارے گئے، کسی نے بتایا کہ میری ماں کو چھبیس زخم لگے تھے لیکن وہ معجزاتی طور پر بچ گئیں، البتہ ہم نے اپنے خاندان میں سترہ لوگ کھو دیئے۔ بعض لوگ تو آج بھی مسز گاندھی کے ان وعدوں کا ذکر کر رہے تھے جو انھوں نے باز آباد کاری کے سلسلے میں نیلی کے مسلمانوں سے کیے تھے۔

’اندرا گاندھی نے ہم سے ووٹ دینے کو کہا تھا اور پھر جب وہ قتل عام کے بعد یہاں آئیں تو انھوں نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ جو ہوا سو ہوا، البتہ آپ لوگوں کو یہ جگہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے۔ میں آپ کی باز آباد کاری میں ہر ممکن مدد کروں گی۔ میں ہر طرح سے آپ کے لیے حاضر ہوں۔

آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس جگہ کو ایک مثالی گاؤں بنائیں گی۔ گھر اور سڑکیں بنائی جائیں گی۔ ہاسپٹل، اسکول اور پولیس اسٹیشن قائم کیے جائیں گے لیکن ہمیں دو ہزار روپیوں اور چھتوں کے لیے تین ہنڈل ٹن کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔

کیمرہ کہتی ہیں کہ بعض لوگوں نے اس بات کی بھی شکایت کی کہ مسلمان متاثرین کو معاوضے کے نام پر صرف پانچ ہزار روپے دیئے گئے جبکہ حملہ آوروں میں سے مرنے والے خاندان کو پینتیس ہزار روپے کا معاوضہ پیش کیا گیا۔ بعضوں نے اس بات کی بھی شکایت کی کہ ابھی حال ہی میں بہار سے تعلق رکھنے والے اڑتالیس لوگ بالائی آسام کے علاقے میں مارے گئے۔ سماج وادی پارٹی نے ان میں ہر ایک شخص کے متعلقین کو معاوضے کے طور پر ایک لاکھ روپے پیش کیے۔ آسام حکومت نے تین لاکھ، وزیراعظم منموہن سنگھ نے دو لاکھ اور بہار حکومت نے ایک لاکھ کی رقم پیش کی۔ اس طرح مجموعی طور پر یہ رقم سات لاکھ ہوگئی۔ منموہن سنگھ نے اپنے وزیراعظم بننے کے بعد دہلی کے سکھ مخالف فسادات میں مارے جانے والے لوگوں کے لیے بھی معاوضے کی رقم بڑھا کر سات لاکھ کر دی تھی۔ پھر یہ مسلمانوں کا خون ہی اتنا ارزاں کیوں ہے جنہیں صرف پانچ ہزار کے معاوضے پر ٹر خا دیا گیا ہے۔

ملکیو کیمرہ کو پڑھتے ہوئے مجھے نبلی کے ان مسلمانوں پر بڑا ترس آیا جو آج بھی مسز گاندھی کے وعدوں کا خواب سجائے انصاف کے منتظر ہیں۔ نبلی اور اس کے اطراف میں پھیلی ہوئی مسز گاندھی کی قائم کردہ ان مثالی بستیوں میں لوگوں کو انصاف تو کیا ملتا البتہ اس جہنم جہنم زندگی نے چھوٹی بڑی کلفتوں کی اہمیت ان کی نظر میں ختم کر دی ہے۔ اب ظلم و بربریت کا بڑے سے بڑا واقعہ بھی نبلی کے رستے زخموں کے سامنے چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ اکانومک اینڈ پولیٹیکل ویکی کے مطابق (محولہ ۲۰ مئی ۱۹۹۵ء) جولائی ۱۹۹۴ء میں زیریں آسام کے بارپیشا ضلع میں بوڈو دہشت گردوں کے ہاتھوں ایک ہزار بنگالی مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ ہزاروں لوگ زخمی ہوئے۔ ساٹھ سے زیادہ گاؤں جلا کر خاکستر کر دیئے گئے، حتیٰ کہ جو لوگ حکومت کے ذریعہ لگائے گئے پناہ گزین کیمپ میں مقیم تھے، انہیں بھی بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس حادثے پر کسی عمومی بے چینی کا اظہار شاید اس لیے نہیں ہو سکا کہ مسلمانوں کا قتل عام اب اس ملک میں معمول کی بات سمجھی جاتی تھی۔

انڈیا ٹوڈے کے سرورق پر جنوٹ چپکایا گیا تھا وہ میرے دل و دماغ پر کچھ اس طرح چپکا کہ اب ہر وقت یہ فکر ستانے لگی کہ کون سا ایسا قدم اٹھایا جائے جو ہمارے اجتماعی حافظے میں ان کرب ناک یادوں کو محفوظ کر سکے۔ میں نے سوچا یادیں امانت ہوتی ہیں اور اجتماعی یادوں کی حیثیت قومی امانت سے کم نہیں۔ جو

قومی اپنی یادداشت کو محفوظ نہیں رکھ پاتیں وہ دشمنوں کے لئے مسخ شدہ اور گمراہ کن تاریخ نویسی کا راستہ کھلا چھوڑ دیتی ہیں۔ اور اگر تاریخ کے بیانات گمراہ کن ہوں تو ان سے سبق و عبرت حاصل کرنے کے بجائے مومن ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسا جاتا ہے۔ خاص طور پر ایک ایسے ملک میں جہاں حکومتیں اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لئے راتوں رات شواہد کو ضائع کر دینے اور خود کو مجرم کے بجائے مسیحا بنا کر پیش کرنے میں پد طولی رکھتی ہوں۔

ان ہی دنوں ایک رات پروفیسر میرے خواب میں آئے۔ آج ان کے جذب پر غضب حاوی تھا۔ اچکن غبار آلود، خون میں لت پت، کچھ دیر خالم خول کی گردان کرتے رہے پھر کہنے لگے: یہ عذاب دم لیتا ہے، ٹھہرتا ہے مگر اپنے اختتام کو نہیں پہنچتا۔ کوئی خدا سے کہے کہ وہ اب بس بھی کرے۔ میں نے جب اس اجمال کی تفصیل چاہی تو انھوں نے عالم غضب میں ہوا میں اپنی مٹھی بلند کی۔ بولے: تم نہیں دیکھتے جو لوگ کل تک یہاں حکمراں تھے آج وہی لوگ کتنے بے بس بنا دیئے گئے ہیں۔ ہائے تقسیم وطن کے وہ دلدوز مناظر۔ بڑے بڑے رؤساء اور شرفاء کو ذلت کی قبایز تن کرنا پڑی۔ نازک اندام مسلم دوشیزائیں جانوروں کی طرح ہانک لی گئیں۔ کل جن کی طرف کوئی نگاہ غلط انداز ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، زمانے کے ہاتھوں وہ کیسے روندی گئیں۔ اور پیاری فاطمہ من..... نہ ننھی معصوم بچی، میری بہن، محض بارہ سال کی۔ جانتے ہو کیا کیا درندوں نے اس کے ساتھ۔ پہلے تو اسے دوسری عورتوں کی لٹتی عصمت کو دیکھنے پر مجبور کیا گیا اس کے لیے یہی صدمہ کیا کم تھا پھر اسے اجتماعی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ کہتے تھے مار ڈالیں گے مگر نہ جانے کیوں چھوڑ دیا۔ جان تو بچ گئی مگر وہ تو اندر سے پہلے ہی مر چکی تھی، وہ اپنا غم کسی سے کہہ بھی تو نہیں سکتی تھی۔ کسے الزام دیں، کس سے منصفی چاہیں؟ پروفیسر نے ایک دلخراش آہ بلند کی اور بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

فاطمہ اب آسمانوں میں اپنے رب کے پاس ہے۔ جنت کے باغات میں ٹہل رہی ہے۔ میں نے انھیں تسلی دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے میری سادہ لوحی پر حیرت کا اظہار کیا۔ بولے: تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم۔ دنیا کی کچھ بھی خبر نہیں۔ آخری بار میں نے اسے نیلی کے قتل عام میں دیکھا۔ پروفیسر شاید آپ کے حافظہ میں چیزیں خلط ملط ہو گئی ہیں، شاید اسی لیے وقت کا شاعر چھین لے مجھ سے حافظہ میرا کی دعائیں مانگتا ہے۔ بولے: بالکل فضول یہ بھی مسئلہ کا حل نہیں۔ پچھلی یادیں اگر محو بھی ہو جائیں تو نئے حوادث اس سے کہیں تلخ یا دوں کو جنم دیتے ہیں۔ اور یہ تلخ یادیں مسلسل رستی رہتی ہیں۔ بڑے سے بڑا حادثہ اگر اپنے انجام کو پہنچ چکا ہو تو اس سے آپ سنبھالا لے سکتے ہیں، زندگی کے منتشر تانے بانے کو پھر سے مرتب کر سکتے ہیں، لیکن اگر حادثہ ایک امر مسلسل بن جائے تو یہی یادیں صحت مند تناظر فراہم کرنے کے بجائے ایک ناقابل علاج

رستا زخم بن جاتی ہیں، ایک ایسا ناسور جس سے رہائی کی امید توڑ دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب ابد تک اسی صورت حال میں زندگی جینا ہے۔ اس ہلا مارنے والی گھٹن کے بیان کی ان الفاظ میں تاب نہیں جو عام صورت حال کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ سچ پوچھو تو یہی ہے ہندوستانی مسلمانوں کا اصل کرب۔

’پھر یادوں کی تجلی سے مستقبل کی شاہراہ کیسے روشن کی جائے؟‘

بولے: ممکن ہے، قصص و حکایات کے ذریعے بعض باتیں گاہے گرفت میں آجائیں یا قاری کو ایسا لگے کہ حقیقت یہیں قریب سے دل کے تاروں کو چھوتی ہوئی گزر گئی ہے۔ یہ جو آسمانی کتابوں کا اسلوب ہے جہاں قصص و تمثیل کا سہارا لیا گیا ہے تو اس کی وجہ بھی تو یہی ہے کہ عالی خیالات اور غیر معمولی حوادث کی ترسیل عام انسانی زبان کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ کسی صاعقہ کا بیان ایک نئی لغت چاہتا ہے۔ نیٹھے نے شاید اسی لئے *Thus Spake Zarathustra* میں ایک آسمانی اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی۔ خیال تو گرفت میں نہ آیا، ہاں اس فراق میں وہ اپنا محور کھو بیٹھا۔ زبان پر جب آپ اس کی حیثیت سے زیادہ بوجھ ڈالتے ہیں تو وہ لڑکھڑاتی اور زمین بوس ہو جاتی ہے۔ کبھی زبان ٹوٹی ہے اور کبھی بیان کرنے والے کے اندرون میں کوئی چیز کچھ اس طرح منہدم ہوتی ہے کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ یہ جو آپ بعض لوگوں کو ہکلاتے دیکھتے ہیں تو یہ دراصل وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا لاشعور کسی غیر معمولی حادثہ کے سبب مجروح ہو جاتا ہے اور اکثر انھیں اس بات کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ مجروح لاشعور والے لوگ اپنی صورت حال کا کوئی واقعی تجربہ بھی نہیں کر پاتے۔

میں نے پوچھا: اس مرض کہن کا کوئی علاج بھی ہے یا اب ہندوستانی مسلمانوں کو اسی رستے زخموں کے ساتھ جینے جانا ہے؟ بولے: کوئی مرض ایسا نہیں جس کا علاج نہ ہو۔ اس سلسلے کی پہلی منزل مرض کی تشخیص ہے۔ کرب مسلسل کے قیدی گھٹ گھٹ کر جینے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ وہ اس سے نکلنے کو ایک امر محال سمجھتے ہیں۔ لیکن جو لوگ ظلم مسلسل کے عادی ہوتے ہیں اور جن کے ہاتھوں ہندوستانی مسلمانوں کی یہ درگت بنی ہے وہ بھی چین سے نہیں رہ پاتے، ان کا ضمیر انھیں کچوکے لگاتا ہے، بے چین کیے رہتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس ضمیر نہیں ہوتا، یہ درست نہیں۔ مظلوم کی آہ و کراہ میں تو پھر بھی خدا کی نصرت اور رحمت کے وعدے ملتے ہیں جس کے سہارے وہ اپنے زخم کی مرہم پٹی کر سکتا ہے۔ ظالم کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں ہوتی کہ وہ اپنی بے چینی اور خفت مٹانے کے لیے مزید ظلم کا راستہ اختیار کرے۔ ایک شیطانی گرداب دائری اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ جب زبان بیان کی متحمل نہ ہو تو لکھنے والا پھر لاجینی الفاظ کی بازیگری سے خود کو اور

دوسروں کو دھوکہ کیوں دے۔

’یہ جو تم میری بیاض دیکھتے ہو تو بھی یہ آڑی ترچھی لکیریں اس لیے کھینچ رکھی ہیں کہ ظلم کے مقابلہ میں خاموشی سے بغلوی بہتر ہے۔ خالم مخول!‘

مجھے ایسا لگا جیسے ایک کربناک گھٹن ان کی شخصیت پر مرسم ہو گئی ہو۔ ٹوٹی، پچکی بغلوی بلکہ مجذوبی شخصیت اپنے اندر ایک الست کی شاکی جو زبان حال سے یہ کہہ رہی ہو کہ اے رب کائنات تو نے میری روح کو کیوں مجروح کر دیا۔ جسم کا زخم تو دکھائی دیتا ہے لیکن روح جب ایک بار اپنا شاکلہ کھودے تو صرف ایک ناقابل انگیز کرب رہ جاتا ہے، ایک رستا ہوا زخم مسلسل، ایک ابدی اور دائمی عذاب۔

میں نے پوچھا: ’پھر ہندوستانی مسلمان اس سانحہ عظمیٰ کی کوئی یادگار، کوئی نشانی کیوں نہیں قائم کرتے؟ ہمارے ہاں تو حسین کے غم کی ایک زندہ روایت موجود ہے، نوحوں اور مرثیوں، سوز خوانوں کے الم انگیز بیانیے، ذاکروں کی معجز بیانیاں، ان سب کے باوجود ہم اپنے کرب کو اب تک دنیا کے سامنے کیوں نہ لاسکے۔ اہل یہود کی طرح اتنا تو کر ہی سکتے تھے کہ اس حادثہ عظمیٰ کا کوئی میموریل ہی قائم کر دیتے جہاں Never Again کی تختی آویزاں ہوتی۔‘

بولے: اہل یہود کے مقابلہ میں ہمارا زخم کہیں گہرا ہے، افسوس کہ ہمیں اس کا اندازہ نہیں۔ اہل یہود اپنی تلخ یادوں کے میوزیم اس لیے بنا سکے کہ وہ پوسٹ ٹراما میں جیتے تھے، اس کے برعکس ہندی مسلمان خود کو ایک کرب مسلسل (Continuing Traumatic Disorder) کی صورت حال میں پاتے ہیں۔ اگلی نسل کا کرب پچھلی نسل سے زیادہ کربناک ہو جاتا ہے۔ نئے چیلنج کے آگے پرانے خطرات چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ کرب کا گراف مسلسل بڑھتا جاتا ہے۔ حادثہ اپنی انتہا کو پہنچے جب تو مسلمان اس وقوعہ کا کوئی علمی تجزیہ کریں، یہاں نہ تو گیس چیمبر ہیں اور نہ ہی Concentration Camp، یہاں سب کچھ ایک نامحسوس عمل ہے جس کا صحیح اندازہ ہندوستانی مسلمانوں کے اعلیٰ مقام قائدین کو بھی نہیں۔

## برغمال قیادت

مجھے ابا کی وہ بات بار بار یاد آتی کہ ایک نسل تو اس فریب کاری کو سمجھنے میں گزر جائے گی۔ پھر خیال آتا کہ اگر ہماری نسل نے فہم و ادراک کا کام مکمل کر لیا تو کیا عجب کہ قدرت اگلی نسل کو اقدامی عمل کے لیے منتخب کر لے۔ خیال آیا کیوں نہ علی گڑھ میگزین کو مسئلہ کی تفہیم کے لیے استعمال کیا جائے اور اس شمارے کو ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر خصوصی نمبر کی حیثیت سے شائع کیا جائے۔ احباب نے اس خیال کا استقبال کیا اور ایک خصوصی نمبر کی تیاری میں اس موضوع پر شائع شدہ کتابوں اور رسائل و جرائد کے خصوصی شماروں کی چھان بین کا کام شروع ہو گیا۔ اس سلسلہ میں جو پہلی دو کتابیں میرے ہاتھ لگیں وہ دو اسمتھوں کی تھیں؛ ایک ڈونالڈ یوجین اسمتھ کی *India as a Secular State* اور دوسری ولفرڈ کینٹول اسمتھ کی *Islam in Modern History*۔ پہلی کتاب میں مصنف نے آثار و شواہد کی روشنی میں دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ ہندوستانی سیکولرازم کی حقیقت سے پردہ اٹھایا تھا۔ گو کہ یہ کتاب بیس سال پہلے شائع ہوئی تھی، لیکن اس کو پڑھنے سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ پانی گہرا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر کسی خصوصی شمارے کی تیاری وسیع الجہات مطالعے کی طالب ہے۔ پھر ایڈیٹر کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ اب تک اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہو وہ اس کی نظر میں ہوتا کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ منقذ مین کے کاندھوں پر کھڑا ہو کر نئے راستے کی نشان دہی کر سکے۔ ادھر نصابی سرگرمیوں کا بوجھ اس قدر بڑھتا جاتا تھا کہ کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کب دوسرے تعلیمی سال کی ابتدا ہوگی۔ ہمارے دونوں نائب مدیران نے اپنی الگ راہ نکال لی تھی۔ منوج یادو جو آگے چل کر سی بی آئی کے اعلیٰ عہدیدار مقرر ہوئے اور سہیل احمد جو مدھیہ پردیش میں جیلوں کے منتظم اعلیٰ کے عہدے تک پہنچے یہ دونوں اپنے اپنے ہال کی میگزین نکالنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ اسی دوران ایک دن یہ اطلاع آئی کہ شعبہ کی طرف سے طلباء و طالبات کا گروپ دہلی میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی کتاب میلے میں شرکت کے لیے جائے گا۔ گویا موضوع پر نئی اور نادر کتابوں کی دستیابی کا ایک سنہری موقع قدرت نے بیٹھے بٹھائے فراہم کر دیا تھا۔ اسلوب صاحب کی قیادت میں کتاب میلے کی سیر، بھلا اس سے

بڑی خوش نصیبی کیا ہو سکتی تھی۔ دیر شام ڈھلے واپسی ہوئی۔ بس میں نشستوں کا اہتمام کچھ اس طرح تھا کہ اگلی صف میں اسلوب صاحب اور ان کے معتمد خاص ڈاکٹر رضوان الدین، جن کے ذمہ ویسے تو سمینار لائبریری کی دیکھ ریکھ کا کام تھا، لیکن ان کی زیادہ تر توجہ طلباء کی اخلاقیات پر نظر رکھنے میں صرف ہوتی تھی، تشریف فرما تھے۔ تین چار گھنٹے کا سفر، بس جب آگے بڑھی تو طلباء و طالبات کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں باہم گفتگو میں مصروف ہو گئیں۔ رفعت اور فریدہ مجھ سے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ یہ دونوں لڑکیاں تہذیب و شائستگی کے خاص سانچے میں ڈھلی تھیں۔ شعر و ادب کا ذوق ان میں رچا بسا تھا۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں طلباء کے مقابلے میں کچھ اس جوش و خروش سے حصہ لیتیں جیسے اپنے علمی تفوق کی جنگ لڑ رہی ہوں۔ فطرتاً شوخ و چنچل طبیعت کے باوجود سر ہمیشہ دوپٹے سے ڈھکا ہوتا اور جب وہ اپنے خاص انداز میں سلام کرتیں تو ایسا لگتا کہ مخاطب کا دل انھوں نے اپنی مٹھی میں لے لیا ہو۔ سفر جب آگے بڑھا تو رفعت نے خواہش ظاہر کی کہ وہ مجھے کلام اقبال سنانا چاہتی ہے۔ اس نے اپنی مترنم اور دلکش آواز میں لوح بھی تو قلم بھی تو... گانا شروع کیا۔ ایک کے بعد دوسری نظم اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ اساتذہ کے کلام کا اشاک ختم ہو گیا۔ سفر ابھی باقی تھا اور اس نے شاید یہ محسوس کیا کہ میرے اشتیاق میں ابھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اب اس نے ایک فلمی نغمہ الاپنا شروع کیا، دے دے پیار دے، دے دے پیار دے، دے دے پیار دے... وہ پورے ذوق و شوق سے گارہی تھی اور میں ایک عجیب محضے میں گرفتار تھا۔ اگلی نشست پر اسلوب صاحب، بیچ میں اور پچھلی نشست پر رفعت کی نغمہ سرائی۔ دے دے پیار کا نغمہ، جب اسلوب صاحب کے کانوں سے ٹکرایا تو انھوں نے رضوان صاحب سے تشویش کا اظہار کیا۔ رضوان صاحب نے اپنی لمبی گردن اور محاسبانہ نگاہوں سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولے: کچھ نہیں، شاز صاحب کو لڑکیاں نغمے سنار ہی ہیں۔ یہ سن کر اسلوب صاحب کو قدرے اطمینان ہوا۔ بولے: اچھا اچھا۔ اور ان کی تشویش رفع ہو گئی۔ دوسرے دن یہ قصہ رضوان صاحب نے ہم لوگوں کو سنایا۔

مسلم مسائل پر علی گڑھ میگزین کے خصوصی شمارے کی اشاعت کا پروگرام سنتے ہی بعض لوگوں نے میرے خلاف یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ میں شدت پسند خیال کا آدمی ہوں اور یونیورسٹی میگزین کو اپنے نظریات کی اشاعت کے لیے استعمال کر رہا ہوں۔ ایک صاحب جو کج کلاہی کے لیے مشہور تھے انھوں نے میرے اندر ایک ریڈیکل اور سخت گیر نوجوان کا پیکر ڈھونڈ نکالا۔ حالانکہ میرا لبرل ازم ہر خاص و عام پر عیاں تھا۔ جو شخص مہرِ رخوں کی مجلس میں بیٹھ کر ان سے دے دے پیار دے کا نغمہ سن سکتا تھا اس پر اسلامی شدت پسندی کا الزام چہ معنی دارد؟ مگر

بگڑتی ہے جب ظالم کی نیت نہیں کام آتی دلیل اور حجت

میگزین ابھی تیاری کے مرحلے میں تھا کہ میرے مشفق استاد اور میگزین کے نگران اعلیٰ اسلوب انصاری صاحب ریٹائر ہو گئے۔ اس دوران ایم اے کا رزلٹ بھی آ گیا تھا جس میں میری پہلی پوزیشن آئی تھی، لیکن یہ بات بھی میرے حق میں نہ جاتی تھی کہ اب میں تکنیکی اعتبار سے طالب علم نہیں رہ گیا تھا۔ نئے نگران نے پہلی ہی میٹنگ میں میرے دم ختم کو توڑنے کے لیے اس نکتے کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ انھوں نے میرا تحریر کردہ ادارہ اندیشوں کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ جا بجا نشانات لگائے پھر فرمایا: میاں ابھی آپ کے کریئر کی شروعات ہے۔ آگے چل کر آپ کو بڑے عہدوں پر پہنچنا ہے۔ اس طرح کی تحریر لکھ کر آپ اپنے کریئر میں آگ لگا رہے ہیں۔ آپ ابھی ان نزاکتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ میں نے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا کہ میرے لیے تو اس بات کا امکان باقی ہے کہ آنے والے دنوں میں مجھ پر یہ نزاکتیں منکشف ہو جائیں مگر میں اپنی عمر کے اس حصے میں جو باتیں سمجھ رہا ہوں وہ... میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ صورت حال کو بگڑتی دیکھ کر جعفر ذکی صاحب نے مداخلت کی اور غیر معمولی طوالت کے بہانے بعض پیرا گراف کے حذف کرنے پر مجھے آمادہ کر لیا۔

ادھر کج کلاہوں کے حلقے میں یہ افواہ گشت کرتی کہ وائس چانسلر سید حامد صاحب کو میری شدت پسند طبیعت کے سبب میگزین کے سلسلے میں تشویش ہے۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ ان دنوں جب بھی میری ان سے ملاقات ہوتی وہ اسی طرح شفقت و محبت سے پیش آتے۔ تکنیکی طور پر گو کہ میں اب طالب علم نہیں رہ گیا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے ہاسٹل میں میرے قیام کو منظوری دے رکھی تھی اور میگزین کی مالیات میں اس قدر اضافہ کر دیا تھا کہ یہ خصوصی شمارہ پچھلے تمام شماروں کے مقابلے میں بہت زیادہ تعداد میں شائع ہوا۔ میگزین کی اشاعت کے بعد تحسین اور حوصلہ افزائی کا سب سے پہلا خط مولانا علی میاں ندوی کا آیا۔ انھوں نے لکھا تھا:

’دعویٰ گڑھ میگزین کا خصوصی نمبر ۱۹۸۴ء حال میں ملا۔ معلوم نہیں تاخیر سے شائع ہوا یا ہم کو تاخیر سے پہنچا۔ آپ کے قلم کے سطور اور اپنا انٹرویو پڑھا، مسرت و اطمینان ہوا۔ آپ کی انگریزی تحریری صلاحیت کا اتنا اندازہ نہ تھا جتنا کہ اس شمارہ سے معلوم ہوا۔ آپ کے یہ مضامین آپ کے درخشاں ادبی و صحافتی مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ اللہ اس کو صادق کرے۔ آپ کو اپنی اس صلاحیت کو پروان چڑھانا چاہیے اور اس کو مزید ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے انٹرویو اندیشہ و شک کے ساتھ پڑھنا شروع کیا لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ میرے خیالات کی صحیح ترجمانی ہے۔ اس میں اکثر ضروری بات آگئی ہے۔ اس پر میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔‘

مولانا علی میاں سے میرے مراسم کو اب ایک مدت ہو چکی تھی۔ ان سے خط و کتابت کا سلسلہ برسوں سے جاری تھا۔ گا ہے بہ گا ہے ندوہ میں ان کا مہمان ہوتا۔ کبھی ان کے آبائی وطن رائے بریلی کا چکر بھی لگ جاتا۔ ایک بار ان کی خصوصی دعوت پر رمضان کے چند ایام بھی رائے بریلی میں گزارنے کا موقع ملا۔ میں نے مولانا کو جس قدر قریب سے دیکھا انھیں حسن سلوک، شائستگی اور اخلاق و تہذیب کے اعلیٰ مدارج پر پایا۔ البتہ میں اس وقت ٹھٹھا کا جب عصر کی نماز کے بعد شرکاء کے آگے اہلی کے بیچ کے ڈھیر لگا دیئے گئے تاکہ معتکفین مختلف اذکار و وظائف میں مشغول رہ سکیں۔ مریدوں کو مشغول رکھنا اہل سلوک کا پرانا و طیرہ رہا ہے۔ ان دنوں مجھ پر رسول اللہ کی زیارت کی دُھن سوار تھی۔ یہ شوق اتنی شدت اختیار کر گیا تھا کہ میں اہل سلوک کی ہر آزمودہ ترکیب اور ہر مجرب نسخہ کو آزمانا چاہتا تھا۔ ایک دن خاص طور پر اس بارے میں گفتگو کے لیے مولانا علی میاں صاحب کے حجرے میں داخل ہوا۔ مولانا ایک چار پائی پر تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے غالباً اپنی کسی کتاب کا پروف پڑھ رہے تھے۔ فرش پر مختلف اطراف میں ان کے مریدین اور شاگرد بیٹھے تھے۔ انھوں نے حاضرین کو کمرہ خالی کرنے کا عندیہ دیا۔ فرمایا: یہ میرے عزیز ہیں کچھ باتیں کرنے آئے ہیں۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے پوچھا کہ کیا عالم بیداری یا رویا میں رسول اللہ کی زیارت ممکن ہے؟ انھوں نے سیوطی اور دوسرے علماء کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ہاں کیوں نہیں۔ اس طرح کی گفتگو سے میرے اندر ملاقات کا شوق تو مزید بھڑک اٹھا لیکن اس مقصد کے لیے کسی واضح راستہ کا تعین نہ ہو سکا کہ اہل سلوک کی دنیا میں کوئی بندھا ٹکا فارمولہ ہر شخص کے لیے یکساں کارگر نہیں ہو سکتا۔ مولانا کی ان ہی شفقتوں اور عنایات کا اثر تھا کہ جب میں نے مسلم مسائل پر علی گڑھ میگزین کا خصوصی شمارہ نکالنے کا فیصلہ کیا تو مجھے ان سے اس مسئلہ پر انٹرویو کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس سلسلہ میں خط و کتابت کے بعد تاریخوں کا تعین ہوا اور میں متعینہ وقت پر ٹیپ ریکارڈر لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ مولانا شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ آج ان کی طبیعت بھی کھلی نظر آ رہی تھی۔ انھوں نے ادب اسلامی پر اپنی ایک تصنیف عنایت فرمائی اور اقبال کا یہ شعر پڑھا:

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن

جو شئی کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

اب میں نے ٹیپ آن کیا اور انٹرویو باقاعدہ شروع ہوا۔ میرے پہلے ہی سوال پر مولانا ٹھٹھکے۔ فرمایا: آپ نے تو ادب پر انٹرویو کا کہا تھا۔ غالباً مولانا کو التباس ہو گیا تھا۔ میں نے صفائی دی۔ بتایا کہ علی گڑھ میگزین کا خصوصی شمارہ مسلم مسائل پر شائع ہو رہا ہے جس کے لیے میں خاص طور پر آپ سے انٹرویو کے لیے

حاضر ہوا ہوں۔ بولے: یہ ایک حساس موضوع ہے اور میری طبیعت کو انٹرویو سے مناسبت نہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ سوالات لکھ کر دے دیں، میں ان کے جوابات بھجوادوں گا۔ میں نے بالمشافہ گفتگو پر اصرار کیا لیکن مولانا کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔ میں ان کے عقیدت مندوں میں سے تھا اور میرے اصرار میں بھی عقیدت مندوں کا سا انداز نمایاں تھا، یعنی راضی بہ رضا۔ انٹرویو نہ لے کر بھی میں نے اسے اپنی کامیابی پر محمول کیا اور خوش خوش وطن کی راہ لی۔ میں نے جب یہ نامکمل انٹرویو والد صاحب کو سنایا تو انھوں نے میری معتقدانہ اندازِ گفتگو پر تشویش کا اظہار کیا۔ بولے: انسان کو پروپیگنڈے سے مرعوب نہیں ہونا چاہئے۔ مولانا میں بڑی خوبیاں ہیں، صاحب تصنیف ہیں لیکن وہ اس فن میں تنہا نہیں ہیں۔ تم ان سے طالب علم کی طرح استفادہ کرو، معتقد بننے کے لیے تو بہت سے لوگ موجود ہیں۔

میں جب بھی ندوہ جاتا مولانا کی فرشی مجلس میں خصوصی اکرام کا مستحق سمجھا جاتا۔ کبھی کبھی ایسی صورت حال بھی آئی کہ ان کی اپنی چارپائی کے علاوہ کوئی اور کرسی دکھائی نہ دی، جب بھی میں نے مریدوں کے سے انداز میں فرش پر بیٹھنے کو گوارا نہ کیا۔ مولانا ان نزاکتوں سے واقف تھے۔ انھوں نے ہمیشہ مجھ جیسے طالب علم سے اکرام کا معاملہ کیا۔ انھیں میرے اندر شاید کوئی مرید تو نظر نہ آیا البتہ میگزین کی اشاعت کے بعد انھوں نے میری ادارت میں پرسنل لاء بورڈ کے انگریزی رسالہ کے اجراء کی فی الفور توثیق فرمادی۔ انھوں نے ۱۴ دسمبر ۱۹۸۵ء کے ایک مکتوب میں لکھا تھا:

’دکھنؤ میں حسین سید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک آپ کا ذکر رہا۔ آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے مسرت ہوئی۔ انگریزی رسالے کی تجویز معقول ہے۔ آپ مولانا رحمانی صاحب کو بھی تجویز بتائیں۔‘

جلد ہی مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کا خط آیا کہ رسالہ کا بجٹ بنائیے۔ کام کا آغاز کر دیجئے۔ اگلے مہینے دہلی میں عاملہ کا جلسہ ہے اس موقع پر اگر آپ آجائیں تو مناسب رہے گا۔ ابھی یہ بیل منڈھے نہ چڑھی تھی کہ مجھے اپنی پی ایچ ڈی کے سلسلے میں انگلینڈ کا سفر پیش آ گیا اور یہ منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۲ء تک کا عرصہ مولانا علی میاں سے میری قربت اور ان کی خصوصی توجہ و شفقت کا زمانہ رہا۔ کبھی دہلی، کبھی لکھنؤ اور کبھی تکیہ کلاں میں ان سے ملاقات کے لیے پہنچ جاتا۔ مولانا بھی مجھ سے خاص شفقت کا معاملہ کرتے۔ ندوے کے ایک سفر کی بابت میں نے ان دنوں علی گڑھ میگزین میں کچھ اس طرح لکھا تھا:

’۲۲ ستمبر کو جب میں وہاں پہنچا ندوہ کا موسم خاصا خوشگوار تھا۔ ایک طالب علم نے گیٹ ہاؤس

تک پہنچنے میں میری مدد کی۔ پتہ چلا کہ مولانا ابھی رائے بریلی سے آنے ہی والے ہیں۔ چند لمحوں بعد کسی کارکی آواز سنائی دی۔ مولانا تشریف لے آئے تھے۔ ’اچھا آپ آگئے، مولانا نے شفقت بھری آواز میں کہا۔ کچھ دیر میں چائے آگئی مولانا نے اصرار کیا کہ میں بسکٹ بھی لوں۔ ہم لوگ ادبی اور مذہبی امور پر گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے اپنی ادبی تقریروں پر مشتمل ایک کتاب منگوائی اور میری حیثیت سے بڑھ کر میری قدر افزائی کرتے ہوئے بعض مقامات سے کچھ اہم سطریں پڑھ کر سنائیں۔ اقبال کے چند اشعار پڑھے۔ باقاعدہ گفتگو کے لئے دوسرے دن کا وقت طے پایا۔ دوسرے دن شام کے وقت طلباء یونین کی رسم تنصیب کی تقریب بھی تھی۔ مولانا نے اصرار کیا کہ میں ایک رات مزید قیام کروں تاکہ اس میں میری شرکت ہو سکے۔ آپ ہمارے عزیز ہیں، مہمان ہیں میری خواہش ہے کہ آپ اس تقریب میں ضرور شریک ہوں، ان کا چہرہ سکینت سے پر اور محبت سے معمور تھا، ان کی روشن آنکھوں میں شفقت و مسرت کی جھلک تھی، انھوں نے میرے رکنے پر اصرار جاری رکھا۔

(محولہ علی گڑھ میگزین [انگریزی] ۱۹۸۴ء، ص ۱۶۹)

اس کثرتِ ملاقات سے بعض حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ شاید وہ مجھے کسی بڑے رول کے لیے تیار کر رہے ہیں، البتہ برسوں کے اس تعلق کو اس وقت سخت صدمہ پہنچا جب دسمبر ۱۹۹۲ء میں بابرئ مسجد کے انہدام کے بعد میں نے دہلی میں ملی پارلیامنٹ کے پہلے قومی اجلاس کے انعقاد کا اعلان کیا۔ انہدام کے بعد مسلمانوں پر سخت مایوسی طاری تھی۔ ملی قیادت زمیں بوس ہو چکی تھی۔ ایسی صورت میں ایک نئے طرزِ فکر کے ساتھ امت کی تنظیم نو کی اس آواز کو بڑے پیمانے پر پذیرائی مل رہی تھی۔ مہینوں کی جدوجہد کے بعد ہم لوگوں نے ممی کی سخت جھلستی ہوئی گرمی میں دہلی کے ماؤنٹ لکھنؤ ہال میں ملک بھر کے مضطرب مسلمانوں اور خاص طور پر نوجوان قیادت کو اس جلسہ میں طلب کیا تھا۔ علی میاں سے اپنے قریبی مراسم کے سبب مجھے یہ توقع تھی کہ اس انقلابی مشن پر مولانا اپنا دستِ شفقت ضرور رکھیں گے۔ مجھے ان سے شرکت کی توقع تو نہ تھی البتہ ان کے تائیدی پیغام کے لیے میں نے اپنے بھائی فہیم اختر صاحب کو خاص طور پر ان کی خدمت میں بھیجا۔ مولانا نے میرا خط پڑھا۔ تائید کے مسئلہ پر تحفظ کا اظہار کیا۔ بولے: موجودہ صورت حال میں، میں کسی نئی قیادت کو سامنے لانا مناسب نہیں سمجھتا۔ برادرِ مکرم نے بہت کہا کہ آپ تحریری طور پر اس خط کا جواب دے دیجئے مگر انھوں نے اس زبانی پیغام پر اکتفا کرنا ہی مناسب جانا۔ اس واقعہ کے بعد مولانا سے میرے مراسم میں وہ پہلی ہی گرم جوشی نہ رہی۔ ہم دونوں اپنی اپنی دنیا میں کام کرتے رہے۔ میری ان کی آخری ملاقات ان دنوں

ہوئی جب ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ مولانا اس حملہ سے بڑی حد تک نکل آئے تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں اپنی کتاب 'ہندوستانی مسلمان: ایام گم گشتہ کے پچاس برس' پیش کی۔ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ مسرت کا اظہار کیا پھر خادم کو آواز دے کر قرآنی افادات نامی کتاب کا ایک نسخہ منگوایا۔ بولے: لیجئے میری طرف سے اسی ضخامت کی یہ کتاب قبول کیجئے۔ شام کی عمومی مجلس میں جہاں مولانا عبداللہ عباس اور کچھ دوسرے حضرات بھی بیٹھے تھے، میرے ایک رفیق عبدالحمید سوانور جو اس سفر میں میرے ساتھ تھے، انھوں نے مولانا سے استفہار کیا کہ ڈاکٹر (راشد شاز) صاحب کا موقف ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایک عرصہ سے سیاسی ارتداد کے نرنغے میں ہیں، اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ مولانا نے سوال سنا، خاموش رہے۔ شاید وہ کسی ایسی گفتگو کے موڈ میں نہیں تھے۔ جب انھوں نے کئی بار اسی سوال کو مختلف انداز سے پوچھنے کی کوشش کی تو عبداللہ عباس صاحب کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے اس اصرار کو سوائے ادب پر محمول کیا۔ میں مولانا کی عیادت کے لیے حاضر ہوا تھا۔ ان کی عمر اور صحت کا بھی تقاضا تھا کہ اگر طبیعت آمادہ نہ ہو تو اس قسم کے حساس موضوع پر گفتگو کے لیے اصرار نہ کیا جائے۔

مولانا علی میاں سے قربت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس عہد کی بعض اہم شخصیات، لیڈروں اور علماء سے پہلی بار ان ہی مجلسوں میں متعارف ہوا۔ ایک بار علی میاں کی خصوصی دعوت پر بورڈ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں شریک ہوا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں میگزین کے خصوصی نمبر کی تیاری میں مشغول تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب مجھے ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی قیادت کو قریب سے دیکھنے، سننے اور اس سے بالمشافہ تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ یہ فرشی مجلس تھی جس میں شرکاء کی تعداد تیس، چالیس سے زیادہ نہ تھی۔ نمایاں لوگوں میں ابراہیم سلیمان سیٹھ، سید شہاب الدین اور بورڈ کے عہدے داروں میں مولانا علی میاں اور منت اللہ رحمانی صاحبان شامل تھے۔ اس موقع پر مجاہد الاسلام قاسمی نے ایک مربوط اور بمسوط تقریر کی تھی اور شاید اسی لیے انھیں نئے ابھرتے ہوئے نوجوان عالم کی حیثیت سے دیکھا جا رہا تھا۔ قرارداد کی تیاری اور میمورنڈم کی ڈرافٹنگ کا سارا کام سید شہاب الدین صاحب نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ مسودہ جب تیار ہو گیا تو مولانا نے ایک نظر قرارداد پر ڈالی۔ بلند آہنگی سے پڑھتے ہوئے ہر نکتہ کو مناسب بتایا اور عاملہ کی یہ دوروزہ مجلس اپنے اختتام کو پہنچی۔ ان دو دنوں میں کبھی کھانے کی میز پر اور کبھی چائے کے وقفے کے دوران مجھے ان دور دراز سے آئے ہوئے قائدین سے تبادلے کا خوب خوب موقع ملا۔ ایک بات جو اس عہد کے قائدین میں دیکھی وہ ان کا انکسار اور چھوٹوں کے لیے خاص شفقت تھی۔ البتہ یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی ملی قیادت کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔ بات بحث و

مباحثہ اور قرارداد کی تیاری سے شروع ہوئی اور وزیراعظم سے ملاقات اور ان کو میمورنڈم پیش کرنے پر ختم ہوگئی۔ قرارداد اور میمورنڈم والی اس ملی قیادت کا آنکھوں دیکھا حال میں نے علی گڑھ میگزین کے خصوصی شمارے میں کچھ اس طرح لکھا تھا:

’آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا دوروزہ اجلاس کوئی بڑا جلسہ نہ تھا، جیسا کہ آل انڈیا کے لفظ سے تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ویسٹرن کورٹ کا کمرہ نمبر چار اس اجلاس کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا جہاں فرشی مجلس آراستہ تھی۔ مقررہ وقت پر جب میں وہاں پہنچا تو دو دور دور تک کسی میٹنگ کے آثار نہ تھے۔ کچھ دیر بعد لوگ آنے لگے۔ حضرت مولانا قاسم کے لوگ، مذہبی قائدین، اسلامی قانون کے شارحین اور اس قبیل کے دوسرے لوگ۔ میں نے دیکھا ایک صاحب، جو ستر کے لپیٹ میں ہوں گے، درمیانہ قد، فرہ بدن، سفید براق طویل داڑھی اور ہاتھ میں ایک قدیم طرز کا عصا لیے وارد ہوئے۔ یہ تھے مولانا منت اللہ رحمانی، بورڈ کے سکریٹری اور مونگیر کی خانقاہ کے سجادہ نشین۔

میں نے مولانا رحمانی سے اپنا تعارف کرایا۔ پتہ چلا کہ وہ میرے خاندان سے بخوبی واقف ہیں اور میرے بارے میں پہلے سے ہی بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہم لوگ وہیں ایک گوشہ میں بیٹھ گئے اور مولانا کی شفقت و محبت سے جلا پا کر میں نے مسلم مسائل پر ان سے گفتگو چھیڑ دی۔ ان کی گفتگو سے ایسا لگا جیسے مولانا مسلم عوام سے سخت نالاں ہوں۔ انھیں اپنی قوم کو پھر سے ایک نئی زندگی عطا کرنے کی کچھ امید نہیں رہ گئی تھی۔

’مولانا کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اس وقت ہندوستانی مسلمان خوف و ہراس کی فضا میں جی رہے ہیں اور جو قوم عدم تحفظ کا شکار ہو وہ آگے بڑھنے اور پراعتماد منصوبہ بندی میں خاطر خواہ حصہ نہیں لے سکتی۔ میں نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنی بات رکھ دی۔

بولے: مسئلہ کا کوئی فوری حل ممکن نہیں۔ یہ ہماری ہزار سالہ تاریخ کی پیداوار ہے۔ ہمارے پرکھوں نے جو کیا ہے اسے آج ہم بھگت رہے ہیں۔‘

اس سے نجات کا بھی کوئی راستہ ہے مولانا! کیا علماء اور مذہبی قائدین عظمت رفتہ کی بازیابی میں کوئی رول ادا کر سکتے ہیں؟ پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی میں نے انھیں یہ مشورہ دے ڈالا کہ کس طرح علماء ایک مؤثر رول ادا کر سکتے ہیں۔

بولے: ’عزیزم! آپ کو صورت حال کا صحیح اندازہ نہیں۔ اخلاقی طور پر مسلمان بہت ہی

خستہ حال ہیں، وہ بھروسے کے قابل نہیں۔ علماء پر انھیں اعتماد نہیں۔ علماء اب موثر نہیں رہ گئے ہیں۔ ان کے اندر کذب بیانی آگئی ہے۔ شدید آپسی اختلافات ہیں۔ بڑی افسوس ناک صورت حال ہے۔ مولانا مسلم قوم سے بہت مایوس تھے۔ میرے راست سوالات نے انھیں پریشان کر دیا تھا۔ گفتگو کے آخر میں انھوں نے کہا کہ آپ نوجوان ہیں۔ آپ لوگ خود تو میدان میں نہیں آتے، سارا الزام ہم لوگوں کے سر ڈال دیتے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ آپ جیسے لوگ آگے آئیں۔ گفتگو کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ مولانا علی میاں ندوی تشریف لے آئے۔ اب تک ہماری فرشی مجلس میں کچھ اور لوگ بھی شامل ہو چکے تھے۔ دہلی کے ایک مقامی بزرگ نے کسی کے انتقال کی خبر سنائی اور یہ شکوہ کیا کہ مولانا قحط الرجال بڑھتا ہی جاتا ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ مستقبل سے خوف زدہ ہوں۔ حال تو ان کی گرفت سے پہلے ہی پھسل چکا تھا۔

بورڈ کی میٹنگ میں شرکت کے بعد مجھے اس بات کا شدید احساس ہوا کہ ہم جسے مسلمانوں کی اجتماعی ملی قیادت سمجھتے ہیں اس کی حقیقت ایک سراب اور واہمہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ بیشتر قائدین نے اپنی اپنی خانقاہوں، تکیوں، اداروں، انجمنوں اور مدرسوں میں انتظام و انصرام کی کمان سنبھال رکھی ہے۔ ان کی گونا گوں تنظیمی اور سماجی مصروفیات اس بات کی اجازت ہی کب دیتی ہیں کہ وہ امت کے مسائل کا باقاعدہ تحلیل و تجزیہ اور مستقبل کے لیے کوئی موثر پلاننگ کر سکیں۔ اور پھر کسی ایسی منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی ملک گیر تنظیمی ڈھانچہ بھی تو نہیں۔ اپنی موجودہ صورت حال میں یہ حضرات زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتے ہیں کہ کسی ہنگامی صورت حال پر کوئی میٹنگ طلب کر لیں۔ پھر قرارداد، میمورنڈم، اخباری بیانات اور زیادہ سے زیادہ وزیراعظم سے بالمشافہ ملاقات کے ذریعہ انھیں اپنے موقف سے آگاہ کر دیں۔ مگر عوام تو ان حضرات کی طرف بڑی پُر امید نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ وہ ان کی ایک اپیل پر بڑے بڑے اجلاس کے لیے وسائل کا انبار لگا دیتی ہے۔ اسے دین کے نام پر خرچ کرنے کا جو تصور عطا کیا گیا ہے اس کی پوری پاسداری کرتے ہوئے وہ مسجدوں اور مدرسوں کو دل کھول کر چندہ دیتی ہے۔ زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں اور قربانی کی کھالیں خوشی خوشی مولویوں کے حوالے کر دیتی ہے۔ بورڈ کی ایک آواز پر شریعت کے تحفظ کے لیے عامۃ الناس کے غول کے غول سڑکوں پر نکل پڑتے ہیں۔ عام لوگ تو اسی تاثر کے ساتھ جیتے ہیں کہ ایک بیدار مغز، بے لوث اور صالح قیادت ہمارے جملہ امور پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ کاش کہ انھیں پتہ ہوتا کہ عدیم الفرصت مسلم قائدین کے اس کارواں کے پیش نظر مروجہ نظام (status quo) کو برقرار رکھنے کے علاوہ سرے سے کسی منصوبہ کا کوئی وجود ہی نہیں۔

ایک دن برآمدے میں گرین لیبیل کی ارغوانی چائے سے شغل کر رہا تھا کہ میرا پڑوسی عبداللہ افغانی ادھر آ نکلا۔ عبداللہ ارغوانی چائے کا شیدا تھا، اچھے دنوں میں ماسکو میں انجینئرنگ کا طالب علم رہ چکا تھا۔ اب علی گڑھ میں اسی نامکمل تعلیم کی تکمیل میں مصروف تھا۔ ان دنوں شہر کے بعض علاقوں سے ہندو مسلم کشیدگی کی خبریں آرہی تھیں۔ بات ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر چل نکلی۔ میں نے کہا: بد قسمتی سے ہمارے ہاں کسی متحدہ اور مشترکہ کوشش کا فقدان ہے۔ مسلمانوں کے پاس کوئی قیادت ہے اور نہ ہی کوئی منصوبہ بندی۔ ہمارا گراف مسلسل نیچے گر رہا ہے۔ یہ سن کر عبداللہ نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ بولا: ایسا لگتا ہے تم غلط لوگوں کی صحبت میں پڑ گئے ہو۔ حلقہ احباب بدلو، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ نیا اخبار لگوا لو۔ پھر خود ہی کہنے لگا کہ جب میں ماسکو میں تھا تو ہمارے روسی احباب کہتے تھے کہ افغانیوں میں بڑا میل جول ہے، اتحاد ہے اور اسی اتحاد کی بدولت انھوں نے روس جیسی عسکری قوت سے ٹکر لے رکھی ہے۔ ادھر افغانستان سے روز خبریں آتی تھیں کہ کس طرح مجاہدین کے مختلف گروہ اپنے حلقہ اثر میں دوسرے گروہوں کو دیکھنے کے بالکل روادار نہ تھے۔ ایک یہودی لطفہ ہے۔ تم بھی سنو بات سمجھ میں آجائے گی۔ کہتے ہیں کہ ایک یہودی نے ہا کر سے کہہ کر اپنے ہاں ایک عرب اخبار لگوا لیا۔ جب اس کے یہودی دوستوں کو پتہ چلا تو انھیں سخت حیرت ہوئی۔ انھوں نے پوچھا کہ تم یہودیوں کا اخبار چھوڑ کر عرب اخبار کے خریدار کیسے بن گئے؟ اس نے بتایا کہ یہودی اخبار پڑھتے پڑھتے میں ڈپریشن کا مریض ہو گیا تھا۔ جب دیکھو یہی خبریں پڑھنے کو ملتیں کہ یہودیوں میں آپس میں اتحاد نہیں۔ اسرائیل کے مستقبل کو خطرہ ہے۔ یہودیوں کی نئی نسل تورات کی تعلیمات سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اگر اس عمل کو روکا نہ گیا تو یورپ اور امریکہ میں یہودی اپنی شناخت کھودیں گے۔ کبھی خبر آتی کہ ملی اور قومی پروجیکٹ کے لیے یہودی تاجر اور سرمایہ دار اپنا پیسہ خرچ کرنے سے کتراتے ہیں۔ مسلسل مایوس کن خبریں پڑھتے پڑھتے میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ اب عرب اخبار پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ریاست اسرائیل کو ٹیکنالوجی اور عسکری ہر دو سطح پر تمام عالم عرب پر فوقیت حاصل ہے۔ اسرائیل کا معیار زندگی امیر ترین عرب ملکوں سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ پر بھی ہمارا قبضہ ہے۔ سب سے زیادہ نوبل پرائز بھی یہودیوں کے حصے میں آتے ہیں۔ امریکی پالیسی سازوں پر بھی ہمارا زور چلتا ہے، ہماری حمایت کے بغیر کوئی امریکی صدر الیکشن نہیں جیت سکتا۔ گویا ہم یہودیوں نے پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔ جب سے میں نے عرب اخبار پڑھنا شروع کیا ہے ایک عالم ترنگ میں رہتا ہوں۔

عبداللہ قہقہے بکھیر کر چلے گئے مگر میری فکر مندی ان باتوں سے کہاں کم ہونے والی تھی۔ میں نے سوچا یہ جو ہر طرف قیادت کے بحران کا چرچا ہے، قحط الرجال کا شکوہ ہے تو ایسا کیوں نہ ہو۔ ہم قائدین بنا کب

رہے ہیں ہماری ساری توجہ تو تبعین اور مریدین بنانے پر ہے۔ مستقبل کے لئے بیدار مغز اور حوصلہ مند نوجوانوں کی نئی قیادت تو وہ تیار کر سکتا ہے جسے خود قیادت کے اعلیٰ مقام کا شعور ہو، جو اس راہ کی پیچیدگیوں سے واقف ہو۔ یہاں جو لوگ ہماری قیادت پر قابض ہیں ان میں سے بیشتر حضرات یا تو سجادہ نشین اور پیر قسم کے لوگ ہیں یا مدرسوں اور مسجد کے متولیان جنہیں یہ منصب وراثت میں ملا ہے۔ پیر تو مرید ہی بنائے گا اگر اس نے قائد بنا دیا تو اس کی اگلی نسلیں کیا کریں گی؟

میں نے بہت غور کیا کہ آج جو لوگ قیادت کی کرسیوں پر متمکن ہیں انہیں قائد کس نے بنایا؟ مسلم عوام نے یا حکومت نے؟ عوام کا لانعام بے چارے اس پوزیشن میں کہاں! حکومت جس سے بات کرتی ہے، جسے اہمیت دیتی ہے، بالفاظِ دگر جسے قائد کے طور پر پروجیکٹ کرتی ہے وہ اس امت کا قائد بن جاتا ہے۔ حال ہی میں حکومت نے مسلم قیادت میں تبدیلی کا عندیہ دیا تھا جس پر بورڈ کے سکریٹری جنرل مولانا منت اللہ رحمانی کو خاصی تشویش تھی۔ انھوں نے ۲۲ جنوری ۱۹۸۶ء کے ایک مکتوب میں مجھے لکھا تھا:

’حکومت ہمارے کس بل کو جانتی ہے۔ ہماری صفوں میں انتشار شروع ہو گیا ہے۔ بورڈ کی اصلی طاقت پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کا ایک ہونا تھا، صدحیف کہ اس میں شکاف پڑ گیا۔ ایک جماعت مسلم پرسنل لاکانفرنس کے نام سے قائم ہوئی ہے اور اسے آگے بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کانفرنس سے حکومت کا کیا اور کیسا تعلق ہے غور کرنے کی بات ہے۔ ان حالات میں ہم نے سعی کی تھی کہ دفعہ ۱۲۵ کا معاملہ جلد سے جلد ترطے ہو جائے۔ باتیں ہونیں، معاملہ ختم ہوا۔ حکومت ہی کی فرمائش پر بورڈ کی طرف سے دفعہ ۱۲۵ کی ترمیم کا مسودہ مرتب کر کے پیش کر دیا۔ یہ واقعہ ۲۳ دسمبر کا ہے۔ ذمہ داروں نے کہا تھا کہ دو چار روز میں یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن آج ایک ماہ گزر گیا، حکومت خاموش ہے جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اب ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ ساری گفتگو ایک فریب تھی اور ہم نے دھوکہ کھایا۔ ان حالات میں بورڈ کے کام کو اور تیز کرنا ہے، حکومت پر اثر ڈالنے کی کوشش کرنا ہے۔‘

گویا یہ بات بڑی حد تک حکومت کی صوابدید پر تھی کہ وہ جسے چاہے اور جب تک چاہے مسلمانوں کا قائد تسلیم کرے اور جب چاہے ایک نئی قیادت کھڑی کر لے۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کا قائد بننا تلوار کی دھار پر چلنے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا، ایک طرف حکومت کے لئے قابل قبول ہونا اور دوسری طرف مسلمانوں کا اعتماد برقرار رکھنا۔ یہ یرغمال مسلم قیادت امت کے لئے کیا کرتی اس کے لئے تو اپنا وقار بحال رکھنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔

## رہ نورِ دِشوق

نومبر کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ میں قدوائی ہاسٹل میں اپنے کمرے کی بالکنی میں بیٹھا ارغوانی چائے کو ہلکی دھوپ سے دو آتشہ کرنے میں مصروف تھا کہ میرے پاس وائس چانسلر سید حامد صاحب کا ایک قاصد آیا۔ بولا: 'آپ کے لئے ڈی ایس ڈبلو آفس میں کوئی اہم پیغام ہے آپ فوراً ڈین صاحب سے ملیں۔ ان دنوں ڈی ایس ڈبلو آفس میں کسی طالب علم کی طلبی خطرے کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اور اگر اس کی پشت پر وائس چانسلر آفس بھی ہو تو سمجھ لیجئے کہ خطرہ بڑا ہے۔ ابھی گذشتہ سال حبیب ہال کے ہنگاموں کے بعد جن طلباء کا ہاسٹل سے اخراج ہوا تھا ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ پتہ نہیں اب کیا معاملہ ہو، میں نے اس اندیشے کے ساتھ ڈی ایس ڈبلو آفس کا رخ کیا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ میری نظر معاون ڈین شمس الدین صاحب پر پڑی۔ بڑی شفقت سے ملے۔ فرمایا: یونیسکو اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے باہمی تعاون سے کراچی میں نوجوان ایڈیٹرز کی ایک بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی ہے۔ وائس چانسلر صاحب کی خواہش ہے آپ اس میں یونیورسٹی کی نمائندگی کریں۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور کانفرنس میں شرکت کی حامی بھری۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کو اپنی شرکت کی آمادگی کا ٹیلیکس بھیج دیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ میرے پاس پاسپورٹ نہ تھا اور ان دنوں اس کا حصول کچھ آسان بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ان دنوں پاسپورٹ آفس شاستری بھون میں ہوا کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر جو لوگوں کی طویل قطار اور شور و ہنگامے کی کیفیت دیکھی تو دل ڈوبنے لگا۔ پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ جب اپنی باری آئی تو پتہ چلا کہ اول تو پاسپورٹ بننا دو چار دنوں کی بات نہیں، دوم یہ کہ مطلوبہ کاغذات کی فہرست کافی طویل ہے۔ بڑی مشکل سے دوپہر تک پاسپورٹ آفیسر تک رسائی ہو سکی۔ اسے شاید میری پریشانی اور مسکین صورت پر رحم آ گیا۔ اس نے کانفرنس سے متعلق کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے پھر فکر مندی کے انداز میں کہنے لگا کہ آپ کی کانفرنس میں وقت بہت کم ہے، جب تک مطلوبہ کاغذات نہ ہوں ہم آپ کو پاسپورٹ جاری نہیں کر سکتے۔ میں بھی کہاں آسانی سے ہار ماننے والا تھا۔ میں نے اسے شوقِ سفر کا حوالہ دیا، کانفرنس کی اہمیت بتائی۔ آدمی بھلا تھا

بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ بولا مجھے پتہ ہے پاسپورٹ نہ ملا تو آپ کا یہ سفر مارا جائے گا، ایک اوسر (موقع) آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ دیکھئے ایک ترکیب ہے اگر آپ کسی گزیٹڈ آفیسر یا ممبر پارلیامنٹ سے توثیقی خط لے آئیں تو راستہ نکل سکتا ہے۔ ممبر پارلیامنٹ کا ذکر سنتے ہی میرے چشم تصور میں ابراہیم سلیمان سیٹھ کے نام کی وہ تختی جھلملانے لگی جو اردو زبان میں لکھی ہونے کے سبب میری توجہ کا مرکز بنی تھی۔ میں نے پاسپورٹ آفیسر سے فائل لی اور تقریباً بھاگتا ہوا سیٹھ صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچا جو سڑک کے دوسری جانب واقع تھی۔ گھنٹی بجائی، سیٹھ صاحب نے دروازہ کھولا۔ آنے کا سبب دریافت کیا اور بلاتا خیر متعلقہ کالم میں اندراجات لکھ کر مختلف قسم کی مہریں لگا دیں۔ ایک خط الگ سے پاسپورٹ آفیسر کے نام بھی دیا جس میں میری شان میں توصیفی کلمات لکھے تھے۔ آدھ پون گھنٹے بعد جب میں اس خط کے ساتھ پاسپورٹ آفیسر کے پاس پہنچا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ بولا: آپ نے اتنی جلدی یہ سب کیسے کر لیا۔ خیر پانچ بجنے کا انتظار کیجئے آپ کو پاسپورٹ تیار ملے گا۔

توقع تھی کہ کراچی ایرپورٹ پر کانفرنس کا عملہ استقبال کے لئے موجود ہوگا۔ مگر یہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ کانفرنس ملتوی ہوگئی ہے اور اس کی اطلاع بذریعہ ٹیلیکس ہماری یونیورسٹی کو بھی ارسال کر دی گئی تھی۔ میں چونکہ اپنی تیاری کے سلسلے میں علی گڑھ سے کئی دن پہلے نکل چکا تھا اس لئے بروقت مجھے اس کی اطلاع نہ ہو سکی۔ خیر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ میں نے سوچا کانفرنس نہ سہی سفر تو ہوا، اصل چیز تو سفر ہے جسے اہل نظر نے وسیلہ ظفر بتایا ہے۔ بلکہ اصل ہدف تو سفر ہی ہونا چاہیے ورنہ منزل تو جمود کا علامہ ہے۔ بقول شاعر

تورہ نورِ دُشوق ہے منزل نہ کر قبول

ہمارے میزبانوں نے میری دلچسپی کی رعایت سے میرے لئے چار پانچ دنوں کا ایک بھرپور پروگرام ترتیب دے ڈالا جس میں مختلف سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کا دورہ، تاریخی مقامات کی سیر، اہل دانش سے گفتگو اور کراچی یونیورسٹی میں طلباء و اساتذہ سے اجتماعی ملاقاتیں شامل تھیں۔ کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے سربراہ پرانے علیگ نکلے انہوں نے اپنے حلقہ احباب کی ایک ایسی بزم سجائی جہاں ہر شخص علی گڑھ کے بارے میں باریک بین تفصیلات کا طالب تھا۔ شمشاد مارکٹ میں کیا اب بھی طلباء کے جگمگاتے اسی طرح لگتے ہیں، گراموفون پر نغمے اسی طرح بجتے ہیں، کیفے ڈی پھوس کا کیا حال ہے اور اس طرح کے دسیوں سوالات جن سے ایسا لگتا تھا کہ پرانے علیگیوں کی یہ نسل اپنے زمانے کے علی گڑھ کی تلاش میں ہو۔ نو سٹیلجیا کی کیفیت جب ذرا کم ہوئی تو گفتگو سنجیدہ موضوعات کی طرف چل نکلی۔ ایک صاحب جن کا نام غالباً نظامی تھا انہوں نے کچھ سوالات اٹھائے۔ بولے: کیوں بھی سنا ہے یونیورسٹی کا اقلیتی کردار دوبارہ بحال ہو گیا ہے۔ اس سے کچھ

فائدہ بھی ہوگا یا یہ سب ہوائی باتیں ہیں؟ اس سے پہلے کہ میں کچھ عرض کرتا ایک دوسرے صاحب نے فرمایا: ارے بھئی بات قانون کی نہیں، بات تو نیت کی ہے۔ ان کم بختوں کی نیت اگر درست ہوتی تو پاکستان ہی کیوں بنتا؟ میں نے عرض کیا کہ اقلیتی کردار کی بحالی سے اتنا تو ضرور ہوا ہے کہ مسلمانوں کو نفسیاتی اور جذباتی سطح پر کچھ سہارا ملا ہے۔ قانونی اعتبار سے پارلیامنٹ نے یونیورسٹی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی فلاح و بہبود کے لیے موثر اقدامات کرے۔ ایک اعتبار سے حکومت نے مسلم ہندوستان میں علی گڑھ کے روایتی رول کو تسلیم کیا ہے۔

یہ تو بڑا اہم ڈیولپمنٹ ہے، ان کے منہ سے نکلا۔

جی ہاں اور اس سلسلے میں یونیورسٹی نے اقدامی عمل کے طور پر مرکز فروغ تعلیم و ثقافت مسلمانان ہند کے نام سے ایک باقاعدہ ادارہ بھی قائم کر دیا ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اتنے بڑے کام کے لیے اضافی فنڈ کہاں سے آئے گا۔ اور اس سمت میں عملی پیش رفت بھی تو اسی وقت ہوگی جب یونیورسٹی میں امن و امان بحال رہے۔ جب سے نیا ترمیمی ایکٹ آیا ہے، یونیورسٹی کفر و اسلام کی معرکہ آرائی میں مبتلا ہے۔ یہ معرکہ ٹھنڈا ہوتا تو کام کی بات سوچی جائے۔ میں نے تفصیلات کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

بولے: کفر و اسلام کی جنگ ابھی بھی وہاں جاری ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی یہ جھگڑے تھے۔ اس زمانے میں کمیونسٹوں کی قیادت تاریخ کے پروفیسر محمد حبیب صاحب کے ہاتھوں میں تھی اور علی گڑھ کی روایت پسند فکر کی کمان پرووائس چانسلر یوسف حسین خان نے سنبھال رکھی تھی۔ ان دنوں تاریخ کے شعبے میں کچھ تنازع تقرریوں کے خلاف بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔

محمد حبیب جامعہ والے تو ان ہی کے بھائی تھے نا، ایک صاحب نے دریافت کیا۔

بولے: جی ہاں اور اس وقت جن صاحب نے علی گڑھ میں مارکس ازم کا علم بلند کر رکھا ہے وہ حبیب صاحب کے صاحب زادے ہی تو ہیں۔

اچھا! مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ اللہ اللہ صاحب زادگان کا دور شروع ہو گیا ہے۔ وہی ہنگامے، وہی معرکے، وہی اسلام، وہی کفر، علی گڑھ کی بھی عجیب دنیا ہے۔

ہمارے زمانے میں یاور جنگ وائس چانسلر تھے۔ انہیں نہ جانے کیا سوچھی کہ انہوں نے میڈیکل کالج میں جہاں انٹرنل طلباء کے لیے پچھتر فیصد نشستیں محفوظ ہوتی تھیں اسے گھٹا کر پچاس فیصد کر دیا۔ لوگوں نے بہت سمجھایا کہ اس طرح مسلم طلباء کا تناسب مزید کم ہو جائے گا، مگر وہ نہ مانے۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ دراصل ان کی پشت پر عبدالکریم چھاگلہ کا ہاتھ تھا جو اس وقت مرکزی وزیر تعلیم تھے۔

چھا گلہ تو پرانے لیگی تھے، ایک صاحب نے تبصرہ کیا۔

بولے: جی ہاں مگر جب وہ اپنے اصل سیکولر روپ میں سامنے آئے تو بڑے خطرناک ثابت ہوئے۔ انھوں نے یاور جنگ کو اس لیے بھیجا کہ وہ علی گڑھ کو عثمانیہ یونیورسٹی کی طرح اپنے روایتی رنگ و آہنگ سے دور کر دیں۔ آپ کو پتہ ہے حیدرآباد پر پولیس ایکشن کے وقت یاور جنگ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اب وہ چھا گلہ کی ایما پر علی گڑھ فتح کرنے کی مہم پر آئے تھے۔ چھا گلہ نے ایک آرڈیننس کے ذریعہ یونیورسٹی کورٹ کی اہمیت ختم کر دی۔ انھوں نے تو یہاں تک کہا کہ یونیورسٹی حکومت کا قائم کردہ ادارہ ہے جس پر دستور کی دفعہ ۳۰ کا اطلاق نہیں ہوتا جو اقلیتی اداروں کو تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ وہ تو کہنے کے ڈاکٹر محمود علی گڑھ کی حمایت میں بروقت کھڑے ہو گئے۔ وہ علی گڑھ کے طالب علم بھی تھے اور کانگریسی بھی مگر جب علی گڑھ پر بن آئی تو انھوں نے کانگریس سے وفاداری پر یونیورسٹی کی وفاداری کو ترجیح دی اور مسلمانوں کے مختلف گروہوں کو مسلم مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا۔ نظامی صاحب! یہ بھی دیکھئے کتنی عجیب بات ہے سید محمود جیسے کانگریسی کو علی گڑھ کو بچانے کے لیے بڑھاپے میں ستیہ گرہ کی کال دینا پڑی۔ انھیں ایسا لگا کہ آزاد ہندوستان میں ایک بار پھر مسلمانوں کو اپنی آزادی کی جنگ لڑنی پڑ رہی ہو۔

مجلس کے خاتمے کے بعد بزرگ علیگیوں کا یہ قافلہ مجھے الوداع کہنے کے لئے میری کار تک آیا۔ ایک صاحب نے فرط محبت میں میرا ہاتھ تھام لیا، کہنے لگے: علی گڑھ ہماری آخری امید ہے، ہماری جمع پونجی ہے اسے سنبھال کر رکھئے گا، اس کے بغیر ہم لوگ یہاں روٹ لیس محسوس کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھرا آئیں۔ الوداع کے لئے ہاتھ بلند ہوئے اور ہماری کار آگے بڑھ گئی۔

## ت سے تفنگ

ہماری اگلی منزل لاہور تھی جہاں سے چند دن بعد دہلی کے لئے ہماری واپسی کا سفر طے تھا مگر لاہور میں جو کچھ مجھے نظر آیا اس نے دید کی خواہش میں مزید اضافہ کر دیا۔ اپنے بزرگ کرم فرما نعیم صدیقی صاحب سے ملاقات کے لئے جب میں منصورہ پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کلاشکوف بردار نوجوانوں کی ٹولیاں جگہ جگہ خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ مہمان خانہ ہو یا مسجد، سبزہ زار ہو یا انتظامی دفاتر ہر جگہ ان حضرات کی چلت پھرت سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسلامی تحریک اب مسلح معرکہ آرائی کے مرحلے میں داخل ہو گئی ہو۔ پتہ چلا کہ پشاور سے افغان مجاہدین کا کوئی قافلہ آیا ہے۔ یہ بندوق بردار نوجوان دراصل حفاظتی عملے کا حصہ ہیں۔ افغان جہاد کے بارے میں میری معلومات اخبارات و رسائل کی مرہون منت تھیں۔ اب جو اتنی ساری بندوقیں نوجوان ہاتھوں میں دیکھیں اور انھیں جذبہ جہاد سے سرشار پایا تو ایسا لگا جیسے جہادی عزائم کو رومانویت کے پر لگ گئے ہوں۔ برصغیر میں پھر سے ایک آزاد مسلم ریاست کا تصور نگاہوں میں جھلملانے لگا۔ اپنی محرومی پر افسوس ہوا۔ خیال آیا میں بھی نہ جانے کس دنیا میں رہتا ہوں۔ ایک ایسے دور میں جب اسلام کے عالمی غلبہ کے لیے مسلح جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے، میرا اس جدوجہد میں کوئی حصہ نہیں۔

مہمان خانہ میں کھانے کی میز پر اور کبھی مسجد کے صحن میں جہادی قائدین سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا۔ ایک دن عشاء کی نماز کے بعد اپنے کمرے میں داخل ہو رہا تھا کہ میری نگاہ اپنے پڑوسی مہمان رمضان مرادوف پر پڑی جو میری ہی طرح دن بھر کی مصروفیت پینا کر اپنے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ مرادوف سے میرا پہلے بھی کئی بار آمناسامنا ہوا تھا لیکن کبھی تفصیلی تعارف کی نوبت نہیں آئی تھی۔ آج انھوں نے خود پہل کی۔ فرمایا کہ اگر آپ زیادہ تھکے نہ ہوں تو کیوں نہ ساتھ میں چائے پی جائے۔ اب جو گفتگو کا سلسلہ دراز ہوا تو پتہ چلا کہ مرادوف چیچنیا کے رہنے والے ہیں اور پیشے کے اعتبار سے صحافی ہیں۔ عام طور پر اسلام آباد میں قیام رہتا ہے اور جہاد افغانستان ان کی خاص دلچسپی کا موضوع ہے۔ ان کے ہاتھ میں عربی رسالہ الجہاد کا تازہ شمارہ دیکھ کر میں نے پوچھا: آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا واقعی سرخ افواج اب حوصلہ ہار رہی ہیں؟

بولے: اس میں دورائے نہیں کہ سوویت یونین میں افغان جنگ کے سلسلہ میں سوچنے کا انداز بدل رہا ہے۔ روسی اس جنگ کو مزید طول دینا نہیں چاہتے۔ اس اعتبار سے اسے مجاہدین کی کامیابی سمجھنا چاہئے، لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ جنگ کے بعد کیا ہوگا۔ اصل چیلنج جنگ نہیں بلکہ جنگ کے بعد ملنے والی ممکنہ فتح ہے، جس کے لیے ہمارے پاس کوئی تیاری نہیں۔

’جنگ کے بعد؟ کیا مطلب؟ اس کے بعد تو ایک آزاد اسلامی ریاست ہوگی جہاں مجاہدین اُمرہم شوریٰ بینہم کے مطابق اجتماعی زندگی کا نقشہ ترتیب دیں گے۔‘

بولے: تمہاری باتوں میں بڑی معصومیت ہے۔ کاش کہ عملی زندگی بھی اتنی ہی سادہ ہوتی۔ میں نے کہا: بہت سے لوگ مجاہدین کی باہمی رزم آرائیوں کے سبب مستقبل کے افغانستان میں باہمی خانہ جنگی کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ یہ ایک قنوطی طرز فکر ہے ہمیں اس سے نکلنا چاہئے۔

بولے: میں اس خطرے کی بات نہیں کرتا، میرا درد کچھ اور ہے۔ ہم لوگوں نے جہاد افغانستان کو خالص اسلامی جہاد باور کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اسے فرض عین قرار دیا۔ یہاں تک کہا گیا کہ پوری امت پر یہ جہاد فرض ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مختلف ملکوں سے شوقی شہادت سے سرشار نوجوانوں کی کھیپ کی کھیپ اس جہاد میں شرکت کے لیے آرہی ہے۔ انھیں تو یہی لگتا ہے کہ افغانستان اس دور کا مدینہ ہے۔ جہاد کے خاتمہ کے بعد جب امریکہ اپنی پشت پناہی ختم کر دے گا تو اسلامی اخوت پر مبنی اس نظریہ جہاد کا کیا ہوگا۔ پھر اس جہاد کو فرض عین سمجھنے والے لوگ کدھر جائیں گے؟

’آپ مستقبل کے اندیشوں سے کیوں پریشان ہیں۔ کیا عجب کہ آزاد افغانستان بین الاقوامی سطح پر نشاۃ ثانیہ کا نقطہ آغاز بن جائے۔‘

بولے: آپ کی باتوں میں معصوم آرزو کا غلبہ ہے، جوش و خروش ہے، حقیقت پسندی کا آمیزہ ذرا کم کم ہے۔ اس بات کو ذرا اس طرح سمجھئے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے الجہاد میگزین کے صفحات الٹے۔ عشاق الحور کے ایک کالم کی طرف اشارہ کیا، بولے: دیکھئے کسی مجاہد کی داستان ہے جس کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ اس جنگ میں مجاہدین پر خدا کی خاص عنایات کی بارش ہو رہی ہے۔ شہیدوں کی لاشوں سے کستوری اور مشک و عنبر کی مہک آتی ہے۔ ان خوشبوؤں کے سبب دور سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں قریب ہی کسی شہید کا لاشہ پڑا ہے۔ بمبار طیارے جب بمباری کے لیے آتے ہیں تو چڑیوں کا ایک جھنڈ مثل سحاب ان کے نیچے کچھ اس طرح آجاتا ہے کہ انھیں اپنا ٹارگیٹ دکھائی نہیں دیتا۔ بسا اوقات یہ چرند و پرند اپنی غیر مرئی قوت کے سبب ان بموں کو اوپر ہی فضا میں روک لیتے ہیں۔ لوگوں نے ان جنگوں میں باقاعدہ فرشتوں کو آسمانوں

سے اترتے ہوئے دیکھا ہے جو مجاہدین کے دوش بدوش گھوڑوں پر سوار دشمنوں سے لڑتے ہیں۔ ان صاحب کی ایک کتاب بھی ہے، یہ اس رسالہ کے مدیر بھی ہیں۔ شاید آپ ان کے نام سے واقف ہوں، ان کا نام عبداللہ عزام ہے۔ آپ وہ کتاب ضرور دیکھئے جو انھوں نے جہاد میں پیش آنے والے معجزات و کرامات پر لکھی ہے۔ یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں جو انھوں نے مختلف راویوں کی زبانی اپنی کتاب میں جمع کر دی ہیں۔ ایک شہید کے بارے میں لکھا ہے جس کا نام، جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، غالباً ابن جنت تھا۔ کئی دن بعد اس کی لاش قبر سے نکالی گئی تاکہ اسے آبائی قبرستان میں منتقل کیا جاسکے۔ کہتے ہیں کہ نوجوان کے والد نے شہید کی لاش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بیٹے! اگر تو واقعی خدا کی راہ میں شہید ہوا ہے تو مجھے کوئی ایسی نشانی دکھا جس سے تیری شہادت کے مقبول ہو جانے پر مجھے یقین ہو جائے۔ یہ سننا تھا کہ شہید کے لاشہ میں حرکت ہوئی، اس نے اپنے والد کو سلام کیا، مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور کوئی پندرہ منٹ تک اپنے باپ کا ہاتھ اپنی مٹھی میں لیے رہا۔ راوی کہتا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس طرح کی باتوں سے جہاد افغانستان کا درجہ حرارت تو بلند ہو گیا، لیکن ہم نے یہ نہیں سوچا کہ اس طرح ہم نے اپنے نظریہ شہادت کی بنیادیں ہلا دیں۔

اچھا! مجھے یہ اندازہ نہ تھا۔ اس قسم کی باتیں بھی جوش جہاد میں ثقہ علماء نے لکھ رکھی ہیں۔ عبداللہ عزام تو، میرے خیال میں، سلفی جہادی اخوانی خیمے کے آدمی ہیں۔ ان کے ہاں تو اس قسم کی کرامتوں پر زور نہ ہونا چاہئے، میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

بولے: یہ تو بس ایک مثال ہے ورنہ ان کی تحریروں اور تقریروں کو سن کر تو ایسا لگتا ہے کہ ملائے اعلیٰ میں بھی اس وقت افغانستان کا مسئلہ سرفہرست ہے اور خدا ہر قیمت پر مجاہدین کو فتح و کامرانی عطا کر دینا چاہتا ہے۔ انھوں نے مختلف راویوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ بندوق کی گولی مجاہدین کے جسموں پر لگی، مگر بے اثر۔ ٹینک انھیں روند گیا مگر ان کا بال بھی بریک نہ کر سکا۔ تین تین سو نیپام بم ان کی صفوں پر گرائے گئے لیکن کیا مجال کہ ایک بھی پھٹا ہو۔ ایک شہید کے بارے میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے مرنے کے بعد بھی کلاشنکوف کے دستہ پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی۔ لوگوں نے بہت کوشش کی مگر شہید کے ہاتھ سے اسلحہ نہ نکال پائے۔ پھر جب اس کے والد نے اس سے کہا کہ یہ اسلحہ تمہارا نہیں بلکہ مجاہدین کی ملکیت ہے تو شہید نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ ایک شہید کی لاش سے دور آسمانوں میں روشنی کی ایک لکیر جاتی ہوئی دکھی گئی۔ اور اس طرح کے دسیوں واقعات جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ افغان جہاد ایک آسمانی منصوبہ ہے جس کو خدا کی خاص نصرت و تائید حاصل ہے۔ کل جب حقائق کی دنیا میں مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے تو نہ صرف یہ کہ

جہاد اور اس کے طریقہ کار کے سلسلے میں بددلی پیدا ہوگی بلکہ خدا سے ہمارا اعتبار ہی اٹھ جائے گا۔ مگر یہ تو ایک شخص کا ذاتی رویہ ہے، اسے آپ پورے جہاد پر کیسے منطبق کر سکتے ہیں۔ میں نے عبداللہ عزام کے نظری حصار سے جہاد افغانستان کو آزاد کرانے کی اپنی سی ناکام کوشش کی۔ بولے: عزام محض ایک شخص نہیں اور نہ ہی کسی انجمن یا مدرسہ فکر کا نام ہے۔ جہاد افغانستان کے تناظر میں ان کی حیثیت بابائے جہاد کی ہے۔ نظری طور پر وہ تمام مجاہدین کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ افغان جہاد کو عالمی اسلامی پروجیکٹ بنانے میں ان کا بنیادی رول ہے۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنی میز سے ایک کتاب اٹھائی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: یہ ہے وہ کتاب جسے اس جہاد کی نظری بائبل کی حیثیت حاصل ہے۔

میں نے کتاب کے سرورق پر ایک نگاہ ڈالی، یہ دراصل ایک عربی کتاب کا ترجمہ تھا۔ اصل کتاب کا نام کچھ اس طرح لکھا تھا: الدفاع عن اراضی المسلمین اہم فروض الأعیان۔ ۱۳۳۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۷۹ صفحات پر مشتمل ایک فتویٰ شامل تھا جس میں یہ باور کرایا گیا تھا کہ سلف سے خلف تک تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب دارالاسلام کے ایک انچ پر بھی دشمن قابض ہو جائے تو تمام مسلمان مرد و عورت پر جہاد ایک فرض عین بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بیٹے کے لیے باپ کی اور بیوی کے لیے شوہر کے اجازت کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ عزام کے اس فتویٰ پر وقت کے کبار علماء نے اپنے تائید کی مہر ثبت کر رکھی تھی۔ سعودی عرب کے شیخ ابن باز اور شیخ عثیمین سے لے کر مصر کے شیخ منیع، یمن کے شیخ عمر سیف اور دبیوں علماء کی تائید اس فتویٰ کو حاصل تھی۔

میں نے عبداللہ عزام کا نام تو بار بار سنا تھا لیکن جہاد کے نظری منظر نامے میں مجھے ان کی اس کلیدی اہمیت کا اندازہ نہ تھا۔ میں نے کہا: جب وقت کے تمام ہی کبار علماء اس جہاد کو فرض عین قرار دینے پر متفق ہیں تو کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ ہم ایک خدائی اسکیم کے تحت آگے بڑھ رہے ہیں۔ افغانستان مستقبل میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ شاید خدا کو ہمارے ہاتھوں کوئی بڑی تبدیلی لانا مقصود ہے۔ بولے: کاش کہ آپ کی بات صحیح ہوتی۔ ہماری صفوں کا یہ اتحاد، میدان جہاد سے آنے والی معجزات و کرامات کی کہانیاں اور سب سے بڑھ کر جہاد جیسے فریضہ کو بین الاقوامی سطح پر منظم کرنا، ان سب کے پیچھے رضائے الہی سے کہیں زیادہ تائید امریکی کارفرما ہے۔

مگر امریکیوں کی تو یہ مجبوری ہے اور کیا پتہ یہ بھی اسی خدائی منصوبہ کا حصہ ہو؟

میری اس بات پر مرادوف مسکرائے۔ بولے: اس میں کوئی شبہ نہیں، یہ ایک اسٹریٹجک پارٹنرشپ کا

معاملہ ہے۔ اگر صرف اس قدر سمجھا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ امریکہ نے اپنے دشمن کا زور توڑنے کے لیے ہماری مدد کی ہے اور ہم اس صورت حال سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جب ہم اس جنگ کو تقدس کے ہالے میں گھرا دیکھتے ہیں۔ دیکھئے معجزات و کرامات کے بیان سے وقتی طور پر تو جوش و خروش میں اضافہ ہو سکتا ہے، لیکن ان خوش گمانیوں سے ہماری فکری الہیات کی جڑیں ہل جاتی ہیں۔ آج ہم نے فرض کفایہ کو فرض عین بنا دیا۔ فلسطین اور افغانستان کو جہاد کی سر زمین قرار دیا اور اس سبب کہ افغانستان میں مجاہدین کی صف بندی کے لیے ایک کھلی فضا اور بین الاقوامی حمایت حاصل ہے، ہم نے افغان جنگ کو فلسطین پر مقدم کر دیا۔ لیکن کل جب جنگ ختم ہوگی امریکی ہماری پشت پناہی سے منھ موڑ لیں گے تو ہمارے لیے اس جنگ کو فرض عین کہنا اور اس پر جے رہنا مشکل ہو جائے گا۔ جنگی اسٹریٹیجی تو بدلتی رہتی ہے۔ آج امریکی ہمارے ساتھ ہیں، عجب نہیں کل کوئی اور اپنی مصلحتوں کے تحت ہمارے ساتھ آکھڑا ہو، لیکن نظری پوزیشن تو روز روز نہیں بدلی جاسکتی۔ آج کا فرض عین امریکی سرپرستی ہٹ جانے کے بعد فرض کفایہ نہیں بن سکتا۔ اگر ہم نے ان باتوں کو نہیں سمجھا تو جنگ کے بعد جب دنیا بھر میں جہاد کی تبلیغ کے لیے کھلی چھوٹ نہ ہوگی اور جب آج کی طرح امریکہ اور یورپ کے شہروں میں جہاد افغانستان کی حمایت میں آپ کو تقریروں کی اجازت نہ ہوگی، اس وقت آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ امریکی سرپرستی کے غیاب نے پوری دنیا کی اسلامی تحریک پر مایوسی اور محرومی کی طناب کھینچ دی ہے۔

رات خاصی ہو چکی تھی۔ میں نے استاذ رمضان مرادوف سے اجازت لی۔ میں نے سوچا مرادوف بے جا وساوس کا شکار ہیں۔ جن لوگوں نے محض اپنے جذبہ شہادت کے بل بوتے پر سرخ افواج کو پسپائی پر مجبور کیا ہے کل وہ امریکی پشت پناہی کے غیاب میں بھی مسئلہ کا کوئی حل ضرور نکال لیں گے۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہ آتی کہ جو امریکہ ایران میں اسلامی تحریک کے درپے ہے، جو ایرانی ملاؤں کے نزدیک شیطان بزرگ کی حیثیت رکھتا ہے وہی امریکہ افغانستان میں اسلامی جہاد کا حامی و ناصر اور پشت پناہ کیوں بن گیا ہے؟ کیا واقعی مرادوف کی باتوں میں صداقت ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری گردنیں خطے میں امریکی مفادات اور عالمی سطح پر امریکی تفوق کو برقرار رکھنے میں استعمال ہو رہی ہیں۔ خیال آیا شنیدن کے بود مانند دیدن، کیوں نہ خود اپنی آنکھوں سے حقائق کا مشاہدہ کیا جائے۔ سنا ہے کہ پشاور میں درہ خیبر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر میلوں میل افغان مہاجرین کے کیمپ آباد ہیں، جن میں مجاہدین کی تربیت گاہیں بھی ہیں اور ان کے دفاتر بھی۔ بین الاقوامی پولیس کے نمائندوں نے بھی ان دنوں اسی شہر میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ اور دنیا بھر سے آنے والے بیرونی مجاہدین کے استقبال کے لیے بھی اسی شہر میں دفاتر اور مہمان خانوں کے دروازے کھلے

ہیں، سو کیوں نہ پشاور کو کوچ کیا جائے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کل صبح مجھے بالاکوٹ کے تحقیقی اور علمی سفر پر نکلنا تھا جس کے انتظامات محب مکرم نعیم صدیقی صاحب کی خاص عنایتوں سے پہلے ہی طے پا گئے تھے۔ ایک دن میں نے نعیم صدیقی صاحب کی خدمت میں مولانا مودودی کے دو خطوط پیش کیے۔ مولانا مودودی نے بڑے ابا (حسین سید) کے نام اپنے ایک مکتوب میں یہ لکھا تھا کہ ہم لوگ چھبیس سال سے پاکستان کو دارالاسلام بنانے کی جو کوشش کر رہے تھے ایسا لگتا ہے کہ اب اس خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ آپ کچھ دن رک کر تشریف لائیں تاکہ ہم پوری شان کے ساتھ دارالاسلام میں آپ کا استقبال کر سکیں۔ خط پڑھ کر نعیم صاحب نے فرمایا: ہاں مولانا پر امید کا ایک ایسا دور بھی گزرا ہے۔ بات برصغیر میں اسلامی تحریک کی تاریخ پر چل نکلی۔ بالاکوٹ کے شہداء کا ذکر بھی آیا۔ غالباً انھوں نے میرے اشتیاق کو بھانپ لیا۔ میز سے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اس پر یہ تحریر لکھی:

’برادرم عبدالہادی صاحب! انڈیا سے عزیز راشد شاز آئے ہیں، یہ بالاکوٹ جانا چاہتے ہیں۔ انھیں راستے اور موسم کی رہنمائی دیجئے۔‘

یہ رقعہ گویا بالاکوٹ کے سفری انتظام کی رسید تھا۔ جب میں بالاکوٹ پہنچا تو پتہ چلا کہ یہاں پہلے سے ہی میری آمد کی بلچل ہے۔ سردی زوروں پر تھی۔ بخ بستہ ہوائیں ایسا لگتا جسم میں سرایت کر رہی ہوں۔ مغرب سے کچھ پہلے ہماری کار جامع مسجد پہنچی جس سے متصل ایک دریا بہتا تھا اور جس کے کنارے گرم پانی کے چشمہ سے لوگ وضو کر رہے تھے۔ مغرب کی نماز میں میری آمد کا اعلان ہوا کہ ایک نوجوان محقق اور اسی راہ عزیمت کے ایک مسافر ہمارے درمیان آج موجود ہیں۔ میرے لیے اچانک اتنے بڑے مجمع کو خطاب کرنا ایک بڑا امتحان تھا جو بفضل الہی بخوبی اپنے انجام کو پہنچا۔ دوسرے دن آثار و شواہد کی زیارت کرتے ہوئے جب میں سید احمد شہید اور اسماعیل شہید کی قبروں تک پہنچا تو ان کی سادہ اور ویران قبروں پر منت کے دھاگے اور دعاؤں کے رنگ برنگے جھنڈے دیکھ کر مولوی کفر توڑ بہت یاد آئے جو سید صاحب کے قریبی رفقاء میں تھے اور جو بعد تک زندہ رہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں شرک و بدعت مٹانے کی اتنی جلدی ہوتی کہ وہ جہاں کہیں بھی کوئی امام باڑہ، تعزیہ رکھنے کا چوکہ یا قبر و درخت پر منت کے دھاگے اور دعاؤں کے جھنڈے دیکھتے تو اس پر اپنے عصا کی آہنی انی سے پل پڑتے اور اسے نیست و نابود کر کے ہی دم لیتے۔ ان کے اسی جذبہ استیصال شرک و بدعت کے سبب ان کا نام مولوی کفر توڑ پڑ گیا تھا۔

اپنے تمام تر اخلاص کے باوجود تحریک مجاہدین باہمی رزم آرائیوں اور غیر حقیقی اہداف میں الجھ کر رہ گئی۔ میں نے جب اس سفر کے بارے میں اپنا تنقیدی تاثر مولانا علی میاں صاحب کی خدمت میں زبانی

پیش کیا تو انھوں نے مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ باندازِ تادیب فرمایا کہ صرف اسلامی تحریکوں کا انسائیکلو پیڈیا بننے سے کام نہیں چلے گا، آپ کو عملی میدان کے لیے بھی تیاری کرنی چاہئے۔ اس زمانے میں تحریک مجاہدین کی ناکامی کے اسباب پر میں نے کچھ اس انداز سے روشنی ڈالی تھی:

’... (ایک) سبب جو بہت واضح ہے اور جس کا اندازہ یقیناً اس تحریک کے کارکنوں کو بھی رہا ہو گا وہ غلبہٴ اسلام کے سلسلے میں حقیقی دشمن کے تعین کی غلطی سے متعلق ہے۔ شاہ ولی اللہ کی تصانیف اور خود شاہ اسماعیل کی کتابوں میں کثرت سے اس حقیقت کا اظہار ہوا ہے کہ نظامِ اسلامی کے قیام میں اصل روڑا انگریز تھے جو اپنی قوت و سیادت سے بڑی تیزی سے ہندوستان پر چھاتے جا رہے تھے۔ سید صاحب کے عہد میں ہی دلی انگریزوں کی پنشن خوار ہو چکی تھی، مسلمانوں کے سیاسی زوال کی کسک ہر شخص محسوس کر رہا تھا۔..... سید صاحب اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ فیصلہ کن لڑائی انگریزوں سے ہونی ہے اور اسی لیے وہ مدینۃ الاسلام کی تلاش میں سرحد تک گئے بھی تھے، لیکن اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اتنی بڑی قوت سے مقابلے کے لیے ان کی تیاری بہت تھوڑی تھی۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کم ہی کی گئی کہ یہ تہذیب جو مانند طوفان بڑھتی چلی آتی ہے اس کی اساس کن بنیادوں پر ہے اور اس کی جڑوں پر ضرب کیسے لگائی جاسکتی ہے؟..... یہ اللہ والوں کی سنت ہرگز نہیں ہے کہ دشمن تو ہر طرح کے جدید آلات حرب سے لیس ہو، جدید قسم کے میزائل، لڑاکا طیارے اور خطرناک بموں کے ساتھ میدان جنگ میں آگیا ہو اور ہم جوشِ ایمانی میں محض چھمردانی کے ڈنڈوں سے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں۔‘

(محولہ غلبہٴ اسلام، ص ۳۱، ۳۲، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء)

ان دنوں ہر پل ایسا لگتا تھا جیسے عالمِ اسلام میں ایک نئی صبح کی آمد آمد ہو۔ ایران میں شیطانِ بزرگ امریکہ کو ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ ادھر افغانستان میں مجاہدین نے سرخ افواج کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان دنوں میں نے ’اسلامی انقلاب کا دستور العمل‘ کے نام سے تین سو صفحات پر مشتمل ایک مبسوط کتاب بھی لکھی تھی، جس میں جمہوری طریقہ کار سے لے کر فوجی بغاوت تک کے تمام مروجہ اور معروف نسخوں کو بروئے کار لانے کی وکالت کی گئی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت مشفق و مکرم محمد صلاح الدین، مدیر ’تکبیر انٹرنیشنل‘، کراچی کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ افسوس کہ ان کے دفتر پر حملے اور آتش زنی کے واقعات نے اس اسکیم پر پانی پھیر دیا اور چند سالوں بعد خود انھیں بھی جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔



اپنے دل و دماغ میں صبح انقلاب کی ایک رومانوی تعبیر سجائے میں پشاور پہنچا جسے اس وقت عالمی جہاد کے epicentre کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ دوپہر کا کھانا مجاہدین کے ایک کیمپ میں ہوا جو شہر کے مضافات میں واقع تھا۔ جگہ جگہ چیک پوسٹ پر نوجوان پہرہ دے رہے تھے۔ عصر کی نماز ایک عارضی عمارت کی زیریں منزل میں ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ عمارت یا تو زیر تعمیر تھی یا پھر کیمپ کے لیے اسی قسم کی عارضی اور نامکمل عمارت بنانے کا رواج تھا۔ تہہ خانے میں ٹھنڈک شدید تھی۔ نماز کے لیے مسلح مجاہدین نے جب اپنے اپنے اسلحے کھول کر اپنے سامنے فرش پر رکھ دیئے تو ایسا لگا کہ

نہ مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سایے میں

نماز عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سایے میں

ان دنوں یوسف اسلام کا نغمہ Afghanistan is Islam خاصا مقبول ہو رہا تھا۔ وہ Cat Stevens سے نئے نئے یوسف اسلام بنے تھے۔ مغرب کے ایک مشہور معنی کا اسلام قبول کرنا ہی کیا کم بڑی بات تھی، اب جو انھوں نے اسلام کو سراپا افغانستان بتایا تو ایسا لگا کہ جہاد افغانستان کے بغیر اسلام کی ہر تعبیر بے معنی ہے۔ شرق سے غرب تک جہاد افغانستان کے سلسلے میں ایک غلغلے کی کیفیت تھی۔ ایک ایسا رومان انگیز غلغلہ جس میں عقلی تحلیل و تجزیے کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔

ان کیمپوں کا دورہ کرتے ہوئے میری نگاہ ان معصوم بھولے بھالے بچوں پر پڑی جو اپنے لٹے پٹے خاندان کے ساتھ یہاں مقیم تھے اور جو اب مہاجر اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کا خاندان جنگ کی آگ سے محفوظ رہا ہو۔ اکثر بچے یتیم اور عورتیں بیوہ تھیں۔ ان کے ارد گرد دنیا کس طرح بدل گئی تھی اس کا اندازہ اس نئے قاعدہ سے ہوتا تھا جو حروف شناسی کے لیے یہاں انھیں ان کیمپوں میں پڑھایا جا رہا تھا۔ الف سے اللہ، اللہ ایک ہے۔ ب سے بابا، بابا مسجد جاتے ہیں۔ پ سے پیچ یعنی پانچ، اسلام کے پانچ ستون ہیں۔ ت سے فننگ یعنی رانقل، جواد نے مجاہدین کے لیے رانقل خریدی ہے۔ ج سے جہاد، جہاد فرض ہے، بابا جہاد کو گئے ہیں۔ د سے دین، ہمارا دین اسلام ہے۔ ریاضی کی کتابوں میں بھی جمع تفریق سکھانے کے لیے اسلحوں کی تصویروں کا سہارا لیا گیا تھا۔ طالب علم کو یہ سوال حل کرنا تھا کہ اگر دس روسی کافروں میں سے پانچ مارے گئے تو باقی کتنے بچے؟ اس وقت تو کسی نے اس طریقہ تعلیم کے نفسیاتی پہلو پر توجہ نہ دی کہ ہم جوش جہاد میں سرشار تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ کتابیں بھی امریکہ سے مرتب ہو کر آئی تھیں۔ امریکی سینیٹر چارلی ولسن کے حوالے سے بعد میں یہ بات بھی پتہ چلی کہ امریکی جنگ ویتنام کا

بدلہ افغانستان میں لینا چاہتے تھے۔ جب پچیس ہزار روسی فوجی فنا کے گھاٹ اتر گئے تو ولسن نے کہا تھا کہ جنگ ویتنام میں اٹھاون ہزار امریکی فوجی مارے گئے تھے۔ ابھی تو تینتیس ہزار کا حساب باقی ہے۔ وہ افغانستان کے آخری شہری تک روس سے لڑنا چاہتے تھے: (to fight the Russians to the last Afghan)۔ وہ تو کہتے کہ روس دو ملین افغانیوں کی جان لے کر ہی واپس چلا گیا ورنہ امریکہ تو آخری افغانی مسلمان تک جہاد جاری رکھنا چاہتا تھا۔

ان کیمپوں سے گذرتے ہوئے یتیم معصوم بچوں کے چہروں پر خوف و یاس کی جو کیفیت دکھائی دی اس نے پہلی بار مجھے نغمہ جہاد کے پیچھے چھپی درد و کرب کی دنیا سے آگاہ کیا۔ تاحد نظر محروموں کی یہ بستیاں جنہیں دیکھ کر ہی کلیجہ منہ کو آتا تھا، بھلا سرحد کے اس پار کیا صورت حال رہی ہوگی جہاں اس وقت بھی بموں کی برسات جاری تھی۔ بستوں کی بستیاں قبرستان بن گئیں، شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے، بے شمار کھاتے پیتے خاندان مہاجر اور خانہ بدوش بننے پر مجبور ہوئے۔ دس لاکھ تو اس وقت تک جنگ میں کام آچکے تھے لیکن جو لوگ ہمیشہ ہمیش کے لیے معذور ہو گئے، جو عورتیں بیوہ ہوئیں اور جو بچے یتیم ہوئے ان کی صحیح تعداد کسے معلوم۔ یہ کہیے کہ پورا ایک ملک تباہ ہو گیا اور ہم ان سب کے باوجود امریکی نصاب کے مطابق اپنے بچوں کو ت سے تلفنگ اور ج سے جہاد پڑھا رہے تھے۔

اگلی صبح حزب اسلامی کے امیر گلبدین حکمت یار سے ملاقات کے لیے مخصوص تھی۔ فجر سے ذرا پہلے ہمارے میزبان نے جگایا۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ شہر کے مضافات میں واقع ایک بڑے کمپاؤنڈ میں پہنچے جہاں اس وقت چند کلاشنکوف بردار سکیورٹی کے نوجوانوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ مجھے ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھایا گیا جہاں میز پر دنیا بھر کے اخبارات و رسائل قدرے بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ میری نظر نیشنل جیوگرافک میگزین کے سرورق پر پڑی جس پر ان دنوں ایک افغان مہاجر بچی شربت گلہ کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں بلا کا خوف سمٹ آیا تھا۔ آگے چل کر یہ تصویر افغان مہاجرین کی بے بسی اور حرماں نصیبی کے علاقے کے طور پر مشہور ہوئی۔ ابھی میں میگزین کے صفحات کو الٹ پلٹ ہی کر رہا تھا کہ پرسکون اور ویران کمپاؤنڈ میں ایک بالچل کی کیفیت پیدا ہوئی۔ یکے بعد دیگرے سنہرے رنگ کی تین یکساں دیوہیکل گاڑیاں کمپاؤنڈ میں داخل ہوئیں۔ اندر سے سکیورٹی کے مسلح نوجوان برآمد ہوئے اور انہوں نے کمپاؤنڈ کے مختلف حصوں پر اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ پھر کچھ نوجوانوں نے گاڑیوں سے ملاقاتیوں کے کمرے تک دوریہ حصار بنا لیا۔ اسی دوران پچھلی گاڑی سے حکمت یار برآمد ہوئے۔ آج ان کے سبز عمامہ پر سنہری دھاریاں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ اس سے پہلے کہ میں

کچھ کہتا انھوں نے جہاد افغانستان کے خالصتاً اسلامی جہاد ہونے اور اس معرکہ میں حزب اسلامی کے بنیادی رول کی وضاحت کر دی۔ مستقبل کے سلسلے میں وہ خاصے پُر امید نظر آئے۔ افغان دھڑوں کی باہمی چپقلش کے سلسلے میں انھوں نے میرے اندیشوں کو باطل قرار دیا۔ شاید وہ جنگ کے ان فیصلہ کن مراحل میں ان حساس موضوعات پر گفتگو قرین مصلحت نہیں سمجھتے تھے۔ کوئی گھنٹہ بھر کی اس گفتگو میں میں نے حکمت یار کو ایک اچھا مدبر اور کریم النفس انسان پایا۔ انھیں اس بات کا احساس تو ضرور تھا کہ امریکی اور دوسری مغربی طاقتیں جہاد میں ان کی پشت پناہی کر رہی ہیں، لیکن وہ اس بات سے غافل بھی نہیں تھے کہ امریکی ایجنڈا ان کے اپنے افغانی اسلامی ایجنڈے سے مغائر ہے۔

ناصر باغ، جہاں نیلی آنکھوں والی لڑکی رہتی تھی، اس کیمپ کی بھی، ان دنوں کچھ اور ہی شان تھی۔ دنیا بھر کے عمائدین، کیا شرق اور کیا غرب، وہاں اپنی حاضری کو خوش بختی جانتے۔ کبھی برطانوی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر افغانیوں کو یہ یقین دہانی کرانے آئیں کہ آزاد دنیا کے دل آپ کے ساتھ ہیں، اور یہ سن کر فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھتی۔ کبھی امریکی صدر رونالڈ ریگن، وزیر خارجہ جورج شلٹز اور وزیر دفاع ایبلی برجر کی آمد پر ہمارے جوش جہاد میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا۔ کبھی نائب صدر بش کی زبان سے مجاہدین کے حق میں کلمہ خیر سن کر ہم پھولے نہیں سماتے۔ اس کیمپ میں کبھی جاپانی وزیر اعظم کی آمد ہوتی تو کبھی ترک وزیر اعظم ترکت اوزال اور سعودی فرمانروا شاہ خالد، مجاہدین کی ہمت افزائی کے لئے بنفس نفیس تشریف لے آتے۔ اللہ اللہ کیا دن تھے جب ہمارے جہاد کے صف اول کے قائدین کارٹر، ریگن، تھیچر اور بش ہوا کرتے تھے۔ ہمارے ائمہ جمعے کے خطبوں میں نہایت الحاح و زاری کے ساتھ اللہم دمر دیار ہم و شنت شملہم و فرق جمعہم کی بددعائیں کرتے ہوئے والروس والصین و سائرہ دھریین کی سرحاح بھی ضروری سمجھتے۔ کسے پتہ تھا کہ آنے والے دنوں میں مغرب کے یہی جہادی کمانڈر جو آج مجاہدین کے ساتھ تصویریں کھنچوانا باعث توقیر جانتے ہیں، ہماری پشت پناہی سے اس طرح ہاتھ کھینچ لیں گے کہ ہمارا جہاد، دہشت گردی اور ہمارا شوق شہادت، ناقابل معافی جرم قرار پائے گا۔

## بیگو اچور بہ

پشاور کے اس سفر پر کوئی دس سال گزرے ہوں گے۔ بوسنیا میں جنگ بند ہو چکی تھی۔ ڈائمن معاہدے کے بعد حالات معمول پر آ رہے تھے۔ میں ایک امن کانفرنس میں شرکت کے بعد زغرب کے اسلامی مرکز میں مقیم تھا جہاں میری ملاقات ایک عرب نژاد سابق مجاہد عبدالرحمن سے ہوئی۔ روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، سیاہ گھنگھریالے بال، عمر یہی کوئی تیس پینتیس کے لپیٹ میں ہوگی۔ مرکز کے بیرونی حصے میں ایک چھوٹا سا بازار لگا تھا جہاں بوسنیائی عورتیں کھانے پینے کی چیزیں فروخت کر رہی تھیں۔ میری نگاہ خشک گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر اٹک کر رہ گئی۔ خیال ہوا کل شام کے کھانے میں بیگو اچور بہ (بے کا شور بہ) میں شاید اسی گوشت کے چھوٹے چھوٹے قتلوں کی آمیزش رہی ہوگی۔ اور کیا عجب کہ وہ کو فتنے جو بلقان کے علاقوں میں آ کر چوٹے بن گئے ہیں ان کی بنا میں بھی یہی خشک گوشت استعمال ہوتا ہو۔ میری دلچسپی دیکھ کر ایک عرب نوجوان میری رہنمائی کے لیے سامنے آئے۔ پتہ چلا کہ یہ دراصل smoked meat ہے جسے ایک خاص درجہ حرارت پر کچھ اس طرح پکایا جاتا ہے کہ یہ بہت دنوں تک استعمال کے قابل رہ سکے۔ بات جب آگے بڑھی تو پتہ چلا کہ بوسنیائی مہاجرین کا یہ قافلہ اب سرائیو کی طرف لوٹنے کو ہے۔ ابتداً تو مجھے عبدالرحمن پر بوسنیائی مسلمان ہونے کا گمان ہوا کہ ان کا رنگ عام عربوں کے مقابلے میں کہیں صاف تھا لیکن جب گفتگو آگے بڑھی تو ان کے انگریزی تلفظ سے عربیت جھلکنے لگی۔ پتہ چلا کہ وہ شامی سعودی ہیں جو کوئی بارہ سال پہلے جہاد افغانستان میں شرکت کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ جہاد نے ان کی زندگی کا رخ کچھ اس طرح بدلا کہ ان کے لیے دوبارہ وطن واپسی اور معمول کی زندگی جینے کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔

میں نے پوچھا: تمہارا نام عبدالرحمن الدوسری تو نہیں؟ یہ سن کر ان کے چہرے پر ایک چمک آئی۔ مسکرائے، بولے: تم دوسری کو کیسے جانتے ہو؟

ان کے بارے میں ذرائع ابلاغ میں کچھ باتیں آتی رہی ہیں۔

بولے: ہاں وہ میرے دوستوں میں ہیں۔ ہم لوگ افغانستان میں ساتھ رہے، پھر جب حالات

بدلے تو ادھر نکل آئے۔

اب آگے کیا پروگرام ہے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: اب تو بقا کی جنگ ہے۔ Survival کا مسئلہ ہے۔ خود بوسنیا کی سرزمین اب ہمارے لیے تنگ ہو گئی ہے۔ تم نے ڈائٹن معاہدے کا ذکر تو سنا ہوگا۔ جنگ بندی کی اہم شرطوں میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ بیرونی مجاہدین بوسنیا کی سرزمین سے نکال دیئے جائیں گے۔  
'پھر آپ اب تک کس طرح نکلے ہوئے ہیں؟'

بولے: ایک مختصر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے مقامی عورتوں سے شادی کر لی، وہ مغربی جاسوسی ایجنسیوں کے راڈار پر بھی نہیں آئے اور ذرائع ابلاغ بھی ان سے ناواقف ہے۔ اب وہی لوگ یہاں رہ گئے ہیں۔ اس میں بھی دو چار ایسے ہیں جنہیں مغربی میڈیا نے خطرناک دہشت گرد کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ بیچارے اپنے قیام کی قانونی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ایک تو یہی ہمارے دوست الدوسری ہیں جنہیں ابو عبد العزیز کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایک اور صاحب ہیں ابو حمزہ جن کا تعلق شام سے ہے۔ انہیں مغربی میڈیا نے ابو حمزہ المصری کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ابو حمزہ کی سخت گیر ایجنسی بیٹھے بٹھائے ابو حمزہ السوری کے سر منڈھ گئی ہے۔ دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد میں نے محسوس کیا کہ عبدالرحمن کی روشن مسکراتی آنکھوں میں سنجیدگی اتر آئی ہے۔ خاص طور پر جب انہیں یہ پتہ چلا کہ میں دو ڈھائی سال پہلے بھی زغرب کے اس مرکز میں آیا ہوں تب ایک جنگ مخالف انجمن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی پوریج کی ایک کانفرنس اس سفر کی تقریب بنی تھی۔ اُن دنوں اس مرکز میں لٹے پٹے بوسنیائی مسلمانوں کا ہجوم تھا۔ یتیم معصوم بچوں اور ستائی گئی بیوہ عورتوں کی آہ و بکا سے فضا مشتعل اور مضطرب رہا کرتی تھی۔ یہ سب سن کر ایسا لگا جیسے عبدالرحمن کی یادوں کے درتچے اچانک کھل گئے ہوں۔

بولے: آپ نے بھی کس زمانے کی یاد تازہ کر دی۔ وہ تو جہاد کا موسم تھا۔ ہم سب شوق شہادت میں مچلے جاتے۔ عرب بریگیڈ (El-Mudzahidin) کی اس وقت بڑی اہمیت تھی۔ سرب اور کروٹ ہمارا نام سن کر ہی کانپتے۔ آپ اندازہ کریں کہ ساٹھ ہزار امریکی فوجیوں کا بحری بیڑہ کروشیا اور سربیا کے ساحلوں پر لنگر انداز تھا، لیکن انہیں زمین پر اترنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ حالانکہ اس وقت بوسنیا کی سرزمین پر عرب مجاہدین کی تعداد چھ ہزار سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ بات یہ ہے کہ ہم مرنے کے لیے لڑتے تھے، شہادت ہمارا مطلوب و مقصود تھا، جبکہ دشمن اپنی جان بچانے کے لیے لڑتا تھا۔ اس زمانے میں سیاہ لباس میں ایک عرب

مجاہد بھی نظر آجاتا تو دشمنوں کے اوسان خطا ہو جاتے۔

’سیاہ لباس! کیا مطلب؟ عرب مجاہدین کیا بلیک کمانڈوز جیسی کوئی تربیت لے کر آئے تھے؟‘  
بولے: نہیں ان معنوں میں نہیں۔ شروع سے ہی ہماری یونٹ نے سیاہ یونیفارم اختیار کر رکھا تھا۔  
اصل میں ہم لوگ افغانستان کے محاذ سے لوٹے تھے۔ ہم نے سرخ افواج کو شکست دی تھی۔ ہمارا مورال بہت بلند تھا۔

کتنے عرب مجاہدین بوسنیا میں شہید ہوئے ہوں گے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: ہمارے شہداء کی تعداد تین چار سو سے زیادہ نہ ہوگی۔ ہمارا نام ہی دشمنوں کے دلوں میں  
دہشت پیدا کر دیتا تھا۔

’اب جنگ کے خاتمے کے بعد آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟ بلکہ میں اگر یہ پوچھوں کہ اس پورے عمل  
میں آپ نے کیا کھویا اور کیا پایا تو آپ کیا کہیں گے؟‘

میرے اس سوال پر انھوں نے لمحہ بھر کے لیے توقف اختیار کیا۔ آنکھیں بند کیں، اپنا چہرہ دونوں  
ہاتھوں سے ڈھکا جیسے کوئی اہم نکتہ تلاش کر رہے ہوں۔ پھر کہنے لگے: پچھلے کئی مہینوں سے اسی سوال نے مجھے  
پریشان کر رکھا ہے۔ یہ صرف میرا ذاتی مسئلہ نہیں۔ پوری اسلامی تحریک کے لیے سنجیدہ غور و فکر کا موضوع ہے۔  
کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جامعہ ملک سعود کا ایک طالب علم شوقِ جہاد میں مختلف  
مرحلے سے گزرتا ہوا ایک ایسے مرحلے میں آپنچے گا، جب عالم اسلام کو اس کے جہادی عمل کی ضرورت نہیں رہ  
جائے گی اور جب خود اسے مقبول عام اسلامی تحریکیں ازکارِ رفتہ اور معطل عنصر کے طور پر دیکھیں گی۔ ان کے  
لئے افغانستان سے لے کر بوسنیا تک کی زمین تنگ ہو جائے گی۔ یہ کہتے ہوئے عبدالرحمن کچھ روہانے سے  
ہو گئے۔ میں نے سوچا، عبدالرحمن اسلامی تحریک کے جوہر قابل ہیں۔ وہ ایک قیمتی تجربے سے گزرے ہیں۔  
کیوں نہ ان کے ذاتی کوائف کی کچھ سن گن لی جائے۔ کیا عجب کہ اس طرح عصر حاضر کی اسلامی تحریک کے  
گم کردہ راستوں کی نشان دہی آسان ہو جائے۔

میں نے پوچھا: آپ کو پہلے پہل افغانستان جانے کا خیال کیسے آیا؟ ایک طالب علم کے لیے تو یہ  
مشکل فیصلہ رہا ہوگا۔

بولے: یہ ۱۹۸۳ء کی بات ہے۔ امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ میں گرمی کی چھٹیوں میں جدہ میں مقیم تھا۔  
ان دنوں افغان جہاد کا بڑا چرچا تھا۔ نوجوانوں کی بعض ٹولیاں شوق و تجسس میں پشاور ہو آئی تھیں۔ ان ہی کی  
زبانی یہ پتہ چلا کہ پشاور مدینۃ الجہاد بن چکا ہے۔ دنیا بھر سے مجاہدین کی ٹولیاں یہاں آتی رہتی ہیں۔ جا بجا

مکتب الخدمات للمجاهدین کی شاخیں قائم ہیں۔ ہر طرف جہادی نغموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ لوگ جوشِ جہاد سے سرشار ہیں۔ میدان کارزار سے مسلسل معجزات و کرامات کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے عہد صحابہؓ کے ایام پھر سے لوٹ آئے ہوں۔ خیال آیا پشاور کچھ دور نہیں۔ بیسویں صدی کے اس امّ المعرکہ کو کیوں نہ اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اسے ایک طرح کی جہادی سیاحت کہئے۔ ابتدا میں تو میرے سفر کی یہی نوعیت تھی۔ تلاش، تجسس اور سرزمین جہاد کی زیارت کا شوق۔ ایک دن جمعہ کے خطبہ میں شیخ عبداللہ عزام کو سننے کا موقع ملا۔ بس نہ پوچھے ان کی باتوں نے میرے دل کی دنیا بدل ڈالی۔ ان کی باتوں سے ایسا لگا کہ افغانستان عنقریب عالم اسلام کے نئے دارالخلافہ کی حیثیت سے ابھرے گا۔ فلسطین کی آزادی اور اسلام کے عالمی غلبہ کا راستہ بھی، ایسا لگتا تھا، افغانستان سے ہو کر گزرتا ہے۔ شیخ عزام کی تقریر نے مجھے ایک جہادی سیاح سے حقیقی مجاہد میں بدل دیا۔

’وہ خواب جو اس وقت آپ نے دیکھا تھا اس کے بارے میں اب آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟‘

میری اس غیر متوقع مداخلت پر عبدالرحمن چونکے۔ شاید وہ اس راست سوال کے لیے تیار نہ تھے۔

بولے: میں اس خواب کو مسترد تو اب بھی نہیں کرتا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ ہم سے شاید معاملات کو سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ جہاد کے لیے صرف خلوص اور اللہیت ہی کافی نہیں ہوتا، معاملہ فہمی بھی بڑی اہم چیز ہوتی ہے۔ اب جو میں غور کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جہاد افغانستان کو بڑی طاقتوں نے اپنے مقاصد کے لیے ہائی جیک کر لیا۔ خلیجی ممالک جو اسلامی بیداری کی تحریک سے خائف تھے، انھیں اس بہانے معرکہ جہاد کو دروازہ کی سرزمین میں منتقل کرنے کا موقع مل گیا۔ دوسری طرف مسلمانوں کے خون اور ان کے مالی وسائل خطے میں امریکی مفاد کے ضامن بن گئے۔ جہاد کو جب تک امریکی سرپرستی حاصل رہی، ہمارا مورال بلند رہا۔ لیکن جیسے ہی امریکی سائبان ہٹا ایسا لگا کہ ہم کھلے آسمان کے نیچے آگئے ہوں۔

’پہلی بار آپ کو جہاد کے ہائی جیک ہونے کا احساس کب ہوا؟‘

بولے: ۱۹۸۹ء میں افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے بعد امریکی سائبان غائب ہو گیا۔ مجاہدین آپس میں لڑنے مرنے لگے۔ ۱۹۹۲ء میں کمیونسٹ حکومت گر گئی مگر مجاہدین ایک متبادل حکومت کے قیام پر متفق نہ ہو سکے۔ ان تین برسوں میں ہی اسلامی جہاد کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ ان ہی دنوں بوسنیا میں معرکہ گرم ہو رہا تھا۔ عزت بیگو وچ یورپ کے عین قلب میں ایک آزاد مسلم ریاست کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ادھر پاکستانی میزبانوں نے بھی عرب مجاہدین کے لیے ملک چھوڑنے کے احکامات جاری کر دیے تھے۔ ہمارے لیے اپنے اپنے ملکوں میں جانا کچھ آسان نہ تھا۔ بوسنیا میں امید کی ایک نئی کرن دکھائی دی۔

ہمارے بہت سے ساتھیوں نے بوسنیا کی طرف کوچ کرنے کا پروگرام بنالیا۔  
بوسنیا کا تجربہ کیسا رہا؟ میں نے پوچھا۔

بولے: یہاں قیادت کا اختلاف تو نہ تھا، لوگ عزت بیگو کوچ کی ذات پر متحد تھے مگر یہاں بھی ہمیں ان ہی لوگوں کی منافقت کا سامنا تھا جو ہمارے ہمدرد تھے اور ہماری سرپرستی کا دم بھرتے تھے۔ امریکہ بھلا کیوں چاہتا کہ یورپ میں ایک آزاد مسلم ریاست قائم ہو۔  
'مگر امریکہ اور آزاد دنیا تو شروع سے بوسنیا کی حمایت کرتی رہی ہے۔'

بولے: جی ہاں مغربی ذرائع ابلاغ تو یہی باور کراتے رہے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اب آپ ہی دیکھئے سر بیا اور سلووینیا کے مابین ۱۹۹۱ء میں جب جنگ شروع ہوئی تو اسے امریکی مداخلت نے صرف چند دنوں میں روک دیا۔ سر بیا اور کروشیا کے مابین جنگ ختم کرنے میں بھی انہیں صرف چند ہفتے لگے۔ لیکن مسلمانوں کو سبق سکھانے اور بوسنیائی مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے سر بوں کو چار سال کا وقت دیا گیا اور اس دوران مہذب دنیا خاموش تماشائی بنی مسلمانوں کا قتل عام دیکھتی رہی۔ حد تو یہ ہے کہ جو عرب مجاہدین افغانستان میں امریکی حلیف تھے وہ جب اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے بوسنیا پہنچے تو انہیں اسی آزاد دنیا کے آزاد پریس نے دہشت گرد کے روپ میں پیش کیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ مغرب کی نگاہ بدلتے ہی خلیجی ممالک نے بھی ہم سے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔

'مگر میں نے تو سرکاری سطح پر سعودی عرب میں بوسنیا اور چیچنیا کی حمایت میں مہمیں چلتی دیکھی ہیں۔ پرنس سلطان نے تو بوسنیا کی حمایت کے لیے باقاعدہ اعلیٰ سطحی کمیٹی قائم کر رکھی تھی۔'

بولے: سعودی امداد تو مغربی امدادی ایجنسیوں کو آتی تھی، بھلا اس سے مجاہدین کا کیا تعلق۔ مجاہدین کے ہاتھوں میں تو وہی کچھ آتا تھا جو انفرادی طور پر خلیجی ممالک کے تاجران بھجواتے تھے۔ ملان میں ایک صاحب تھے شیخ انور شعبان، ان کے عرب ممالک میں بڑے رابطے تھے، ان کا بوسنیائی مجاہدین پر بڑا دبدبہ تھا۔ یہ کہتے کہ بلقان کے عبداللہ عزام تھے۔ ابھی دو سال پہلے وہ ایک چیک پوائنٹ پر شہید کر دیئے گئے۔  
تو گویا بوسنیا کا تجربہ بھی کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہا۔ میں نے عبدالرحمن کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کی۔

بولے: میں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ بوسنیا میں ہماری آمد کا بڑا فائدہ ہوا۔ ایک تو یہی کہ اخلاقی طور پر مقامی مجاہدین کا حوصلہ بلند ہوا۔ ثانیاً بوسنیائی مسلمان دین سے غافل تھے، ان کے اندر شراب اور خنزیر کی حرمت کا تصور بھی واضح نہ تھا۔ ہم لوگوں نے ان کی تعلیم و تربیت کی کوشش کی۔ بعض بستیوں کو ہمارے ساتھیوں نے

اسلامی خطوط پر منظم کرنے کا پروگرام بھی بنایا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ جب بوسنیائی ریاست کا چراغ گل ہونے کو تھا، ہماری آمد سے میدان جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ میں اسے ناکامی تو نہیں کہتا، ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ ڈائٹن معاہدے کے سبب ہم لوگ میدان جنگ میں جیتی ہوئی بازی مذاکرات کی میز پر ہار گئے۔

’کہیں تو کوئی بات ہے جو شاید ہماری گرفت میں نہیں آرہی ہے ورنہ افغانستان میں جہاد کے دس سال اور چار پانچ سالوں پر مشتمل بوسنیا میں ایک آزاد مسلم ریاست کی جدوجہد اپنے منطقی نتائج تک پہنچنے سے پہلے ہی کھلا گئی۔ آخر ایسا ہوا کیوں؟‘

بولے: تخصیص کے ساتھ تو کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہاں یہ ضرور لگتا ہے کہ یہ سب کچھ عمومی غلطی کی ایک کیفیت تھی۔ نئی صبح کا خواب ہی کچھ ایسا سرور انگیز تھا۔ خطباء و علماء کی معجز بیانیوں اس پر مستزاد۔ آپ سچ کہتے ہیں اس مسئلہ پر گہرے تحلیل و تجزیے کی ضرورت ہے۔ کاش کہ کوئی صاحب فکر اسے تفصیلی محاکمہ کا موضوع بنائے۔

عبدالرحمن کی یہ گفتگو میرے حافظے میں کہیں دب کر رہ گئی۔ برسوں بعد ریاض کی ایک علمی مجلس میں بوسنیا کے نائب صدر کو سننے کا اتفاق ہوا۔ جلسہ کی صدارت شہزادہ ترکی الفیصل کر رہے تھے۔ میرے اس سوال پر کہ بوسنیا میں ایک آزاد مسلم ریاست کا خواب کیوں کر دھندلا گیا؟ انھوں نے بڑے کرب سے بتایا کہ او آئی سی کے اجلاس میں ایک آزاد مسلم ریاست کو تسلیم کرنے کی جب بات آئی تو ممبر اراکین نے سوسو مصلحتیں تراشیں۔ انھوں نے اپنی برادری میں ایک نئے مسلم ملک کے داخلے کے سارے دروازے از خود بند کر دیئے۔ بولے: کہاں کی اسلامی اخوت اور کون سی امت مسلمہ۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا، آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے سوچا عبدالرحمن سچ ہی کہتا تھا۔ یقیناً کوئی بات تو ہے کہ ہم بر بنائے مصلحت بہت سی باتیں زبان پر لانا نہیں چاہتے۔ مگر جب تک کھل کر گفتگو نہیں ہوتی یہ کیسے پتہ چلے گا کہ آخر پانی مرنا کہاں ہے؟

## مسکین اقلیت

پشاور سے واپسی پر ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ ریاض کے سفر کی تقریب نکل آئی۔ مسلم جوانوں کی انجمن الندوة العالمية للشباب الاسلامی کی جانب سے ایک سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس مسلم اقلیتوں کے مسائل کا جائزہ لینے کے لئے بلائی گئی تھی اور اس میں میرے مجوزہ مقالے کا ابتدائی خاکہ منظور ہو گیا تھا۔ ابتداً تو مجھے اس بات پر غصہ تھا کہ غیر تو غیر اب اپنے بھی ہمیں 'اقلیت' سمجھتے اور اسی حیثیت سے ہمارے مسائل کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر مقالہ لکھنے بیٹھ گیا کہ جب تک بین الاقوامی فورم پر اپنے موقف کو دلائل و براہین کی روشنی میں پیش نہ کیا جائے محض رنج و غم کے اظہار سے کچھ حاصل نہیں۔ ان ہی دنوں ایک امریکی ماہر عمرانیات لوئس ورتھ (Louis Wirth) کی ایک تحریر میری نظر سے گذری تھی جس میں انھوں نے لفظ اقلیت کے سیاسی اور نفسیاتی مضمرات پر گفتگو کی تھی۔ مصنف کا کہنا تھا کہ کسی انسانی گروہ کو اقلیت قرار دے کر دراصل ہم اسے قومی دھارے سے الگ کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہم اسے یہ باور کراتے ہیں کہ وہ عام لوگوں سے الگ کوئی مسکین قسم کی مخلوق ہیں۔ خود اقلیت کہے جانے والے گروہ کو اپنے بارے میں رفتہ رفتہ اس بات کا یقین ہونے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے مختلف ہیں (they are a people apart)۔ ایسے لوگوں کو معاشرے میں عام طور پر کم تر سمجھا جاتا ہے، معاشرہ میں ان کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور قومی زندگی میں ان کا عمل دخل برائے نام بھی نہیں ہوتا۔ بقول لوئس ان کا لوگوں سے الگ (apart) ہونا ممتاز ہونے کے معنوں میں نہیں ہوتا، بلکہ ایک ایسی مخلوق کے معنوں میں ہوتا ہے جو بوجہ زندگی کے مرکزی اسٹیج پر کوئی رول ادا کرنے سے قاصر ہو، حاشیہ پر رہنا جن کا مقدر بن گیا ہو۔ ایسے لوگ آبادی کے اعتبار سے اگر ساٹھ فیصد بھی ہو جائیں تو ان کی کثرت تعداد ان کی محرومی، بے بسی اور مسکینی کا مدد انہیں کر سکتی۔ لوئس کو پڑھتے ہوئے مجھے بار بار ایسا لگا جیسے اپنے آپ کو اقلیت تسلیم نہ کرنے کا شدید داعیہ، جو میں اپنے اندر میں بچپن سے پاتا تھا، اسے علمی دلائل و براہین کی اساس فراہم ہو گئی ہو۔

میں نے سوچا ہندوستانی مسلمان جو صدیوں سے اس ملک کے مرکزی اسٹیج پر قائدانہ رول ادا کرتے

آئے ہیں اچانک انہیں اس واہمہ پر کیسے یقین آ گیا کہ وہ اقلیت ہیں، مسکین ہیں اور ان کی جگہ مرکزی اسٹیج کے بجائے اب ہمیشہ ہمیش کے لیے حاشیہ پر رہنا طے کر دی گئی ہے۔ پتہ چلا کہ ۱۸ء میں پہلی بار انگریزوں نے مردم شماری کے ذریعہ یہ عقدہ کشائی کی کہ اس ملک میں اونچی ذات کے ہندوؤں کی تعداد صرف پندرہ فیصد ہے جبکہ مسلمان اور دلت اقوام چونتالیس فیصد آبادی پر مشتمل ہیں۔ اب اونچی ذات کے ہندوؤں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے آپ کو برہمن یا چھتری شمار کرانے کے بجائے ایک ایسی شناخت میں پیش کریں جس میں دوسری اقوام کی عددی قوت بھی ان کے حصہ میں آجائے۔ ہندو حالانکہ کوئی قوم نہیں تھی اور نہ ہی یہ کسی مذہب کا نام تھا۔ یہ تو انڈس ویلی میں رہنے والی قوموں کو عربوں کا دیا ہوا نام تھا۔ عرب اہل ہند کو ہندوس سے مخاطب کرتے۔ اونچی ذات کے ہندوؤں نے اس نئی مبہم شناخت کو اپنے لیے کچھ اس طرح اختیار کیا کہ اس میں شودر/ دلت، آدی باسی بلکہ بعض مراحل میں توجین اور سکھ بھی اسی خانے میں آگئے۔ اور ان متضاد اور متخالف انبوہ عظیم کی سربراہی پر اونچی ذات کے ہندو کچھ اس طرح متمکن ہو گئے کہ مسلمانوں کو مجموعہ اضعاد کے اس سمندر میں اپنا وجود تحلیل ہوتا ہوا نظر آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اپنے تحفظ کی فکر ستانے لگی۔ وہ اس بات کو فراموش کر گئے کہ صدیوں سے اس ملک میں ان کی عددی قوت کا تناسب اس سے مختلف نہیں رہا ہے۔ اور یہ کہ کبھی بھی اس ملک میں ایک بین الہنود (Pan-Hindu) شناخت کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا تھا جس میں متضاد عقائد و نظریات رکھنے والی قومیں سما گئی ہوں۔

لوئس کی یہ تحریر میرے لیے بڑی چشم کشا ثابت ہوئی۔ جس بات کو میں بچپن سے محسوس تو کرتا تھا، لیکن عقلی طور پر اس کی توجیہ سے قاصر تھا، لوئس کی اس تحریر نے اسے زبان فراہم کر دی تھی۔ اب یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اقلیت قرار دینے کے پیچھے دراصل کون سے نفسیاتی اور سیاسی عوامل کارفرما رہے ہیں۔ اقلیت بن جانے کا سیدھا سا مطلب یہ تھا کہ اب ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مسکینی اور محرومی کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے۔ ویسے بھی کسی جمہوری نظام میں فیصلہ کن حیثیت تو ہمیشہ اکثریت کی ہوتی ہے۔ اور جہاں سب کچھ اکثریت کی ایما پر ہوتا ہو وہاں اقلیت ہونے کا احساس بھی ایک دائمی عذاب سے کم نہیں۔

میں نے بہت غور کیا مسلمان تو ہمیشہ سے برصغیر میں عددی اعتبار سے تھوڑے ہی رہے ہیں۔ ہندوستان پر ہی کیا موقوف عہد عمر میں جب اسلامی ریاست کی سرحدیں غیر معمولی طور پر وسیع ہو گئیں اور جب آگے چل کر بغداد، دمشق، قاہرہ جیسے مراکز وجود میں آگئے، تب بھی اسلامی ریاست کے ان اہم شہروں میں مسلمانوں کا عددی تناسب چار پانچ فیصد سے زیادہ نہ تھا۔ پھر کیا بات تھی کہ اس قلیل عددی تناسب کے

باوجود اقصائے عالم میں ان کا ڈنکا بجتا تھا۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ان کے قافلے کچھ اس شان سے حرکت میں رہتے کہ انھیں عدل و قسط کے قیام پر مامور کیا گیا ہے۔ تب انھیں ان کی عددی قلت محرومی اور بے بسی کا احساس نہیں دلاتی۔ تب 'اقلیت' جیسی مذموم اصطلاح سے ان کے حواس نا آشنا تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ اقوام عالم کی تاریخ میں ہمیشہ سے ایک چھوٹا گروہ عظیم اکثریت پر حکمرانی کرتا رہا ہے حتیٰ کہ موجودہ جمہوری ڈھانچے میں بھی تیس پینتیس فیصد ووٹ لانے والی پارٹیاں پارلیامنٹ اور اسمبلیوں میں اکثریت حاصل کر لیتی ہیں۔ خود امریکہ میں جو لوگ صدارتی طریقہ انتخاب کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہوتے ہیں انھیں بھی 'اقلیت کی حکمرانی' کا طعنہ سننا پڑتا ہے۔ گویا تعداد میں تھوڑا ہونا فی نفسہ کوئی عیب نہیں۔ مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب بعض قومیں اپنی قلت تعداد کو اپنی قوت سمجھنے کے بجائے اسے اپنی کمزوری پر محمول کرنے لگتی ہیں اور اس خیال کی اسیر ہو جاتی ہیں کہ وہ دوسروں سے کمتر ہیں، بے بس اور مجبور محض ہیں اور یہ کہ ان کے لیے اب سیادت کے مرکزی اسٹیج پر کوئی رول نہیں رہ گیا ہے۔ تعداد میں کم ہونا ایک بات ہے اور اقلیت ہونا یا اقلیت کی نفسیات میں مبتلا ہو جانا بالکل ہی دوسری بات۔

ریاض کی اس کانفرنس میں شرکت کے بعد مجھے اس بات پر یقین واثق ہو گیا کہ دنیا بھر میں مسلم اقلیات کو جو مختلف النوع قسم کے مسائل درپیش ہیں اس کا ایک بنیادی سبب وہ نفسیاتی حصار ہے جو ہم نے از خود اپنے گرد قائم کر رکھا ہے۔ یورپ کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے مسلم انجمنوں کے سربراہان سے گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا شدت سے احساس ہوتا کہ ان حضرات کے دل و دماغ پر پیمبرانہ مشن سے کہیں زیادہ ایک ثقافتی اور مشرقی گروہ ہونے کا احساس حاوی ہے۔ ان کی ساری تگ و دو اس امر پر ہے کہ انھیں ایک اقلیتی، مذہبی اور ثقافتی گروہ کی حیثیت سے میزبان معاشرے میں زندگی جینے کی سہولتیں میسر آجائیں اور بس۔ گویا انھوں نے ابتدا سے ہی مغرب کے معاشرے میں خود کو حاشیہ پر رکھنے کی پلاننگ کر رکھی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ امریکہ جیسے ملک میں جہاں سفید فام اقوام کا غلبہ ہے، اطالوی اور لاطینی قومیں کبھی بیرونی عناصر کے طور پر دیکھی جاتی تھیں، پھر رفتہ رفتہ انھیں سفید فاموں کا سا اعتبار حاصل ہو گیا۔ شمالی آئر لینڈ سے ہجرت کرنے والے لوگ جو اپنے کیتھولک عقیدے کے سبب انگلستانی حکمرانوں کے ظلم و ستم کا شکار رہے، امریکی معاشرے میں صدارت کے اہم منصب پر فائز ہوئے۔ اہل یہود جن کی ایک قابل ذکر آبادی نازی جرمنی کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر امریکہ کی طرف ہجرت کو مجبور ہوئی، انہوں نے بھی خود کو اقلیت یا مجبور محض تصور کرنے کے بجائے خود کو امریکی معاشرے کا انجن قرار دے ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل حرفت سے لے کر اہل فن تک اور اہل سیاست سے لے کر اہل تجارت تک ہر میدان میں اہل یہود نے اپنی سبقت کا جھنڈا گاڑ دیا۔

بعضے کہتے ہیں کہ سفید فام بننا بھی ایک تدریجی مرحلہ ہے۔ ہو سکتا ہے اس بات میں جزوی صداقت ہو، لیکن اصل بات جس سے انکار ممکن نہیں وہ یہ ہے کہ زندہ قومیں معاشرے کی متحرک مشین کا کمال حکمت کے ساتھ مطالعہ کرتی ہیں اور پھر اس امکان کی تلاش میں لگی رہتی ہیں کہ کب انھیں ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہونے کا موقع مل جائے۔ اس کے برعکس جو لوگ ابتدا سے ہی خود کو اقلیت قرار دے ڈالیں یا زیادہ سے زیادہ ایک تہذیبی اکائی کے طور پر خود کو مستحکم کرنے کے لیے کوشاں ہوں، وہ قیادت جیسے بارِ عظیم کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ پہلی نسل کے مسلمان جب عدل و قسط کے قیام کے لیے عسکری فتوحات کے جلو میں مختلف بلاد و امصار میں پہنچے تو انھیں مختلف ملکوں میں مختلف قسم کی زبان و ثقافت سے سابقہ پیش آیا، انھوں نے مدعو معاشرے کے متحرک انجن میں اپنے لیے ڈرائیونگ سیٹ تلاش کی۔ وہ اس معاشرے میں تبدیلی کا علامیہ بن گئے۔ یہ اور بات ہے کہ اس عمل میں ان کی اصل عرب ثقافت تحلیل ہو گئی۔ نئی زبانیں اور نئی تہذیبیں وجود میں آئیں۔ دیکھا جائے تو یہ بھی ایک اعتبار سے سفید فام بننے کا عمل ہے۔



ایک دن مرکزِ خزائی کی لابی میں ہم چند احباب بیٹھے تھے۔ کانفرنس کا کلیدی اجلاس ابھی ختم ہوا تھا۔ شرکاء کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں باہم گفتگو میں مصروف تھیں۔ ایک صاحب جو برطانیہ سے تشریف لائے تھے، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی اقلیتی حیثیت پر یہ کہہ کر اعتراض وارد کر دیا کہ اول تو اتنی بڑی تعداد اقلیت کے زمرے میں نہیں رکھی جاسکتی۔ ثانیاً سرکاری اعداد و شمار ہندوستانی مسلمانوں کی عددی قوت کی صحیح عکاسی نہیں کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ آزادی کے وقت برصغیر میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی نو کروڑ تھی۔ منقسم ہندوستان میں چار کروڑ مسلمان رہ گئے تھے۔ پانچ کروڑ مشرقی اور مغربی پاکستان کے حصے میں آئے۔ اب آپ ہی دیکھئے اس وقت بنگلہ دیش اور پاکستان کی مجموعی آبادی کتنی ہے اور اس تناسب سے چار کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کا تخمینہ کیا بنتا ہے۔ آپ کو اپنی صحیح عددی قوت کا اندازہ ہو جائے گا۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے میرا شانہ تھپتھپایا۔ زور کا قبضہ بلند کیا۔ بولے: یہ بڑے راز کی بات ہے جو میں نے آپ پر آشکار کر دی ہے۔ بات جب آگے بڑھی تو ایک ہندوستانی مندوب نے اس خدشہ کا اظہار کیا مبادا ہماری تعداد کی کثرت کہیں ہمیں اقلیت کے زمرے سے خارج کرنے کا سبب نہ بن جائے۔ اس طرح ہم ان مراعات سے بھی محروم ہو جائیں گے جو ہمیں اقلیت قرار دیئے جانے کے سبب حاصل ہیں۔ ڈاکٹر ساجد جواب تک خاموش تھے ہماری یہ گفتگو بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ ساجد برطانیہ کی ایک امدادی انجمن کے مشیر تھے۔ یہی کوئی پیننس چالیس کے لپیٹ میں ہونگے۔ بولتے تو ایسا لگتا جیسے کلاس روم میں طلباء سے مخاطب ہوں،

جیسے خاص اسی موضوع پر تیار ہو کر آئے ہوں۔ کہنے لگے ارے بھئی جس قوم کا سب کچھ چھن چکا ہو اسے اب کس چیز کے چھننے کا غم ہو سکتا ہے۔ اقلیت کے دستوری تحفظات کے زمرے سے تو ہندوستانی مسلمان کب کے باہر آچکے ہیں۔ کاش کہ انہیں اس بات کا علم ہوتا۔

کیا مطلب؟ میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لینا مناسب جانا۔

بولے: ۱۹۴۸ء کا ڈرافٹ کانسٹی ٹیوشن پڑھا ہے آپ نے؟ پھر آپ کو اس بات کا اندازہ کیسے ہو کہ ۱۹۴۸ء کا مسودہ تو انین جب ۱۹۵۲ء میں طویل بحث و مباحثے اور ترمیم کے بعد آئین ہند کی شکل میں سامنے آیا تو اس کی روح بدل چکی تھی۔ مسلمان دستوری تحفظات کے دائرے سے باہر آچکے تھے اور یہ سب کچھ اتنی عیاری کے ساتھ ہوا کہ بڑے بڑوں کو اس تبدیلی اور اس کے پیش آمدہ مضمرات کا اندازہ نہ ہو سکا۔

میں نے دستور ساز اسمبلی کی بابت تو بہت کچھ سنا تھا اور اس کی بعض بحثیں بھی میری نظر سے گزری تھیں، لیکن مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ۱۹۴۸ء کے مسودہ اور ۱۹۵۲ء کے منظور شدہ دستور میں اس قدر بنیادی نوعیت کا کوئی فرق ہے۔ میں نے پوچھا اس امر پر آپ کچھ مزید روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

بولے: کیوں نہیں، میرا تو تحقیقی مقالہ ہی اس موضوع پر ہے۔ میں نے ان دو وثیقوں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسلم اقلیات کو جن تحفظات کی ۱۹۴۸ء کے مطبوعہ مسودہ میں ضمانت دی گئی تھی، بعد کی ترمیم میں ان تحفظات کو یکسر کالعدم قرار دے ڈالا اور یہ سب کچھ جمہوریت، سیکولرزم اور ڈیموکریسی کے خوشنام نغروں کے جلو میں ہوا۔

میں نے کہا: براہ مہربانی تخصیص کے ساتھ بتائیے۔

بولے: ۱۹۴۸ء کے مسودہ میں اقلیتوں کے لیے متقنہ میں محفوظ نشستوں کا وعدہ تھا۔ سرکاری نوکریوں میں ان کا کوٹہ متعین کیا گیا تھا۔ کابینہ میں ان کی نمائندگی کو یقینی بنانے کی بات کہی گئی تھی۔ ساتھ ہی اس بات کی بھی سفارش کی گئی تھی کہ ایک ایسا انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے جو اقلیتوں کی نمائندگی کو یقینی بنائے اور اس امر کی مسلسل نگہبانی کرتا رہے۔ ۱۹۴۶ء کی دستور ساز اسمبلی جس کمیٹی مشن پلان کے تحت وجود میں آئی تھی اس کی بنیاد ہی اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔ لیکن آنے والے دنوں میں گفتگو کا رخ پوری طرح بدل گیا۔ پہلے تو شیڈول کاسٹ کو اقلیت کے خانے سے نکال کر ہندو قوم میں شامل کر دیا گیا۔ بقول کے ایم منشی جو اس بحث کے سرخیل تھے، شیڈول کاسٹ کو اقلیت سمجھنا درست نہیں تھا۔ ان کے نزدیک ہر بچن ہندو قوم کا ہی حصہ تھے۔ انہیں اس وقت تک ہی مراعات دینی چاہئیں جب تک کہ وہ ہندو قوم میں ضم نہ ہو جائیں۔ منشی کی پیش کردہ اس ترمیم کو اسمبلی نے قبولیت عطا کر دی۔

اچھا تو پہلے شیڈول کاسٹ بھی اقلیت کے زمرے میں آتے تھے! میں نے حیرت کا اظہار کیا۔  
 بولے: ہاں! نہ صرف یہ کہ وہ اقلیت کے زمرے میں رکھے گئے تھے بلکہ امید کرتا تو یہ بھی چاہتے تھے  
 کہ مسلمانوں کی طرح انہیں بھی جداگانہ انتخاب کے ذریعہ اسمبلی اور پارلیامنٹ میں نمائندگی ملے۔  
 پھر کیا ہوا؟ میں نے پوچھا۔

ہوتا کیا۔ گاندھی نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ ۱۹۳۲ء میں گاندھی نے پونا میں ورت رکھا کہ وہ  
 ہریجنوں کے لئے جداگانہ انتخاب کو کسی قیمت پر تسلیم نہیں کریں گے۔ وہ ہریجنوں کو اقلیت سمجھنے کے لئے  
 تیار نہیں تھے۔ وہ ہریجنوں کا سیاسی وزن ہندوؤں کے پلڑے میں ڈالنا چاہتے تھے اور اس میں وہ  
 کامیاب ہو گئے۔

مگر ہریجن تو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لئے اچھوت تھے، انہیں مندروں میں داخلے کی اجازت  
 بھی نہ تھی۔ گاندھی نے تو ایک اعتبار سے بڑا جرأت مندانہ اجتہاد کر ڈالا۔

بولے: گاندھی مستقبل کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ آنے والے دنوں میں قوت کا  
 عددی کھیل اہمیت اختیار کر لے گا۔ ہریجن اگر ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے سامنے آئے تو انہیں ہندوؤں  
 کے مقابلے میں مسلم معاشرے میں مذہبی اور سماجی انصاف کے امکانات زیادہ دکھائی دیں گے۔ انہوں نے  
 اسی خطرے کے پیش نظر چھوت چھات کی مخالفت میں تحریکیں چلائیں اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی کہ  
 ہریجنوں کو ہندو زمرے میں شامل کر لیا جائے۔ اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے۔

’مگر گاندھی تو ۱۹۴۸ء میں ہی رخصت ہو گئے، مسودہ قوانین میں ترامیم تو بعد تک ہوتی رہیں۔‘  
 بولے: انہوں نے بنیاد رکھ دی تھی، بعد والوں نے ان ہی خطوط پر ہریجنوں کو پہلے تو اقلیت کے  
 زمرے سے خارج کیا، پھر اقلیتوں کو ملنے والے تحفظات کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ اس سے اقلیت اور اکثریت  
 میں عدم اعتماد اور دوری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

’گویا ۱۹۴۸ء کے مسودہ میں مسلمانوں کے لئے کہیں بہتر امکانات تھے؟‘

بالکل! بعض باتیں تو بڑی اسٹریٹیجک نوعیت کی تھیں۔ مثلاً یہی جداگانہ انتخاب جسے مختلف بہانوں  
 سے ختم کر دیا گیا۔ اس کے بدلے ہریجنوں کو تو دس سال کے لئے خصوصی دستوری تحفظ کی بات کہی گئی البتہ  
 مسلمان ان تحفظات سے باہر رہ گئے۔ اقلیتوں کی کابینہ میں نمائندگی کے مسئلہ کو بھی مختلف بہانوں سے ٹال دیا  
 گیا۔ بس یہ سمجھو کہ ۱۹۴۸ء کے ڈرافٹ کانسٹیٹیوشن سے لے کر اکتوبر ۱۹۴۹ء کے ڈرافٹ کانسٹیٹیوشن کے وجود  
 میں آتے آتے اقلیتوں کو دیئے جانے والے سارے تحفظات صرف شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کے

لیے مخصوص ہو کر رہ گئے۔

تو گویا امبیڈکر نے صرف اپنی قوم کا خیال کیا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

بولے: نہیں یہ کہنا تو زیادتی ہوگی۔ امبیڈکر خود اس صورت حال سے سخت پریشان تھے، وہ تن تنہا اونچی ذات کے ہندوؤں کا مقابلہ کر رہے تھے، انہیں گاندھی جیسے مہاتما کا سامنا تھا جو ہر قیمت پر ہندوؤں کی بالادستی کو یقینی بنانا چاہتا تھا۔

’مگر گاندھی نے تو شودروں کے حق میں تحریک چلائی، انہیں ہریجن یعنی خدا کا بندہ بتایا، مندروں میں ان کے داخلے کی راہ ہموار کی.....‘

بس بس رہنے دو! اسی پروپگنڈے نے تو ہمارے دل و دماغ کو مسموم کر رکھا ہے۔ انہوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ بولے: گاندھی کو سمجھنا ہے تو امبیڈکر کو پڑھو جب ہی تمہیں پوری اسکیم سمجھ میں آئے گی۔ انگریزوں نے مردم شماری میں شودروں کو ہندو مذہب کے خانے میں ڈال دیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں ان کی تعداد ساڑھے چار کروڑ تھی، یعنی برصغیر کی مسلم آبادی کا نصف۔ شودروں پر اونچی ذات کے ہندوؤں کا دعویٰ تھا جب کہ شودر بڑی تعداد میں اسلام، عیسائیت اور سکھ مت اختیار کر رہے تھے۔ صرف پنجاب میں ۱۸۸۱ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان ان کا تناسب ۴۴ فیصد سے گھٹ کر ۲۹ فیصد رہ گیا تھا۔ ایسی صورت میں ہندوؤں کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر اس سیلاب کو نہ روکا گیا تو اونچی ذات کی بالادستی ختم ہو جائے گی۔ بقول سوامی ویویکانندا ہندوؤں کے دائرے سے نکل جانے والا ایک شخص صرف ہمیں ایک آدمی سے محروم نہیں کرتا بلکہ ہمارے دشمن میں ایک آدمی کا اضافہ کر دیتا ہے‘

’ویویکانندا بھی اس طرح سوچتے تھے! ان کی روشن خیالی کا تو شکاگو کی مذہبی پارلیامنٹ کے حوالے سے بڑا چرچا ہے۔‘

بولے: اگر میرا حافظہ خطا نہیں کرتا تو غالباً اپریل ۱۸۹۹ء کے پر بودھ بھارت کے شمارے میں ان کا انٹرویو دیکھ لینا۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ہندو زعماء اس صورت حال سے کس قدر پریشان تھے۔ ہندو مذہب میں جو اصلاحی تحریکیں چلیں اس کے پیچھے بھی دراصل اپنے خیمے کا استحکام تھا، شودروں کو تبدیلی مذہب سے روکنا تھا۔ آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی نے تو شودروں کو پاک کرنے کے لئے شدھی کی تحریک چلائی۔ پنجاب میں جات پات توڑک منڈل بھی آریہ سماجی مشن کا حصہ تھا، جس نے چھوت چھات کے خلاف اپنے سالانہ جلسے میں امبیڈکر کو خطاب کی دعوت دی تھی مگر جب انہوں نے یہ دیکھا کہ امبیڈکر ہندو بالادستی کو ہی سرے سے تسلیم نہیں کرنا چاہتے، وہ شودروں کو ہندو خیمے سے نکال لے جانا چاہتے ہیں تو انہوں

نے خطاب کی یہ دعوت واپس لے لی۔

’پھر تو امبیڈکر پر یہ امر بڑا شاق گذرا ہوگا۔‘

وہ تو خیر ان باتوں کے عادی تھے۔ انھوں نے اپنے مجوزہ خطبے میں لکھا تھا کہ ہندو سوسائٹی کی حقیقت ایک واسے سے زیادہ نہیں۔ ہندو ایک اجنبی زبان کا لفظ ہے، کسی قدیم سنسکرت ماخذ میں اس کا ذکر نہیں۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس لفظ کا استعمال نہیں ملتا۔ پھر ہندو سوسائٹی کہاں سے وجود میں آگئی۔ ہاں یہاں مختلف ذاتیں ضرور پائی جاتی ہیں۔ امبیڈکر تو ہندو ازم کو اچھوتوں کی دائمی تعذیب گاہ (veritbale chamber of horrors سے تعبیر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تعذیب گاہ سے نکلنے کے لئے انھوں نے بالآخر تبدیلیی مذہب کا راستہ اختیار کیا۔

’گاندھی بھی تو ذات پات اور چھوت چھات کے خلاف تھے انھوں نے...‘

’ارے ارے تم پھر پروپگنڈے کی زبان بولنے لگے، انھوں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ بولے: لگتا ہے تم نے لوئس فشر جیسے لوگوں کو پڑھ رکھا ہے۔

’جی آپ نے درست سمجھا، میں نے اپنا جرم قبول کیا۔‘

فشر جیسے مصنفین نے گاندھی کا ایک ایسا آسمانی ہیولی تراشا کہ ساری زمینی حقیقت پس پشت چلی گئی۔ گاندھی ان کے نزدیک خدا کے فرستادہ ہیں، عام انسان نہیں۔ ایک ہوتی ہے سوانح نگاری اور ایک ہوتی ہے hagiography، جسے ملفوظات نویسی بھی کہتے ہیں۔ گاندھی کو شروع سے اچھے ملفوظات نویس مل گئے۔ تمہیں حیرت ہوگی کہ ہندوستان واپس آنے سے پہلے ہی گاندھی اپنی دو سوانح لکھوا چکے تھے۔ یہ دونوں سوانح جنوبی افریقہ میں ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھیں۔ فرانسیسی سوانح نگار غوماغولوں نے ۱۹۲۴ء میں جب گاندھی کی سوانح *Mahatama Gandhi: The Man Who Became One with the Universal Being* شائع کی تھی اس وقت تک وہ گاندھی سے ملے بھی نہیں تھے۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں، جس نے گاندھی کو ایک شاطر سیاستداں کے مقام سے اٹھا کر انہیں مہاتما کے منصب پر فائز کر دیا۔

شاطر سیاست داں؟ میرے خیال میں اب آپ زیادتی کر رہے ہیں، میں نے احتجاج کیا۔

بولے: ارے بھئی حقیقت تو یہی ہے، آپ چونکہ انہیں تقدس کے ہالے میں گھرا دیکھنے کے عادی رہے ہیں اس لئے آپ کو میری باتیں عجیب لگ رہی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ایک شخص تحریک تو کھادی اور چرنے کی چلاتا ہو پراس کے آشرم کا خرچ جی ڈی برلا جیسے مل مالکان اٹھاتے ہوں، جو شخص جنوبی افریقہ

ہیں ہندوستانی سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کے لئے انگریز حکمرانوں سے ساٹھ گانٹھ رکھتا ہو، مقامی سیاہ فام باشندوں کو حقیر سمجھتا اور انھیں کچل ڈالنے میں انگریزوں کا معاون رہا ہو، جو ۱۹۲۰ء میں خلافت تحریک میں شامل ہو کر اسے Non-Cooperation Movement (تحریک عدم موالات) کا ہراول دستہ بنا دیتا ہو اور پھر جب اس تحریک میں جان پڑ جاتی ہو تو ۱۹۲۲ء میں اچانک، یک طرفہ طور پر، مسلمانوں سے مشورہ کئے بغیر، سنیہ گرہ کے خاتمے کا اعلان کر دیتا ہو اور اس طرح اس کے ساتھ چلنے والی تحریک خلافت اچانک خود کو بیاباں میں محسوس کرتی ہو۔۔ تو آپ ہی بتائیے ایسے شخص کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے؟

ڈاکٹر ساجد کا بیان ابھی جاری تھا کہ صدر دروازے پر کچھ ہلچل ہوئی۔ پتہ چلا کہ ہوٹل شیراٹن کو جانے والی بس اب روانگی کے لئے تیار ہے۔ گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ اب ہم لوگ بس میں آ بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر ساجد کی گفتگو سے ایسا لگتا تھا جیسے مہاتما کی شخصیت پر پڑی تقدس کی نقاب آہستہ آہستہ سرکتی جا رہی ہو۔ میں نے سوچا ڈاکٹر ساجد باخبر آدمی لگتے ہیں، پتہ نہیں ان سے پھر گفتگو کا موقع ملے یا نہیں ان سے کیوں نہ دستور ساز اسمبلی کی وہ باتیں معلوم کی جائیں جو ان کے تحقیقی مطالعہ کا خاص موضوع رہی ہیں۔ میں نے کہا: خیر امبیڈکر اور گاندھی کی چشمک کو چھوڑیے، یہ بتائیے کہ جب مسودہ قوانین میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں کی جا رہی تھیں اس وقت مسلم اراکین اسمبلی نے ان تبدیلیوں پر کوئی احتجاج کیوں نہ کیا؟

بولے: احتجاج کون کرتا۔ ابتدا میں دستور ساز اسمبلی میں اٹھائیس (۲۸) مسلم اراکین تھے۔ ان میں سے دس تو پاکستان کو ہجرت کر گئے۔ باقی جو بچے ان میں سے بعض تو اتنے مہبوت تھے کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ اس بدلی ہوئی صورت حال میں کیا کریں۔ غیر مسلم اراکین کے تیور بدل چکے تھے، ان کے لب و لہجے میں تبدیلی آگئی تھی۔ ایک صاحبہ تھیں بیگم اعجاز رسول جو دستور ساز اسمبلی کی رکن تھیں۔ انھوں نے تو جداگانہ انتخاب اور مسلمانوں کے لیے اسمبلیوں میں نشستیں محفوظ کرنے کی باقاعدہ مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ریزرویشن اقلیت اور اکثریت کے رشتے میں دراڑ ڈال دے گا۔ اس طرح ہم اکثریت کا دل جیتنے کا موقع کھودیں گے۔ ذرا سوچئے و لہجہ بھائی پٹیل جو اس کمیٹی کی سربراہی کر رہے تھے، بیگم صاحبہ کے دلائل سن کر کتنے خوش ہوئے ہوں گے۔

عجیب! میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

بولے: ہاں نیشنلسٹ مسلمانوں کی یہی تو مجبوری تھی۔ ان بے چاروں کو ملک سے وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے ہندو آقاؤں کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی۔ لیکن سب لوگ ایسے نہ تھے۔ یوپی کے مولانا حسرت موہانی، بہار کے حسین امام اور مدراس کے محبوب علی بیگ تو آخر آخر تک متناسب نمائندگی کے حق میں آواز

بلند کرتے رہے۔ لیکن ان کی آواز کو یہ کہہ کر دبا دیا گیا کہ مناسب نمائندگی کی باتیں بھی دراصل جداگانہ انتخاب کی ہی ایک بدلی ہوئی شکل ہوگی۔ پنڈت نہرو نے یہ کہہ کر اس مطالبہ کو دبانے کی کوشش کی کہ ایک مختصر سی اقلیت کے لیے یہ بات مناسب نہ ہوگی کہ اکثریت اس کے بارے میں یہ سوچے کہ وہ اکثریت پر اعتماد نہیں کرتی اور اپنے آپ کو علیحدہ رکھنا چاہتی ہے۔ پنڈت گووند ولہ پنت نے اس موقع پر یہ دلیل دی تھی کہ جداگانہ انتخاب سے مسلمان اگر پارلیامنٹ میں پہنچ بھی گئے تو وہ اپنی قلت تعداد کے سبب کسی فیصلہ کن پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔ فیصلہ تو اکثریت کے ووٹ سے ہی ہوگا۔ گویا آپ مناسب نمائندگی کے ذریعہ مسلمانوں کو پارلیامنٹ میں بھیجیں یا جداگانہ انتخاب کے ذریعہ مسلم اراکین پارلیامنٹ کی موجودگی یقینی بنائیں، جمہوری تماشے کے مداری اس بات سے خواب واقف تھے کہ آنے والے دنوں میں جمہوریت دراصل اکثریت کے جبر میں بدل جائے گی۔ ایک صاحب تھے زیڈ ایچ لاری، انھوں نے اس خطرے کا اسی وقت ادراک کر لیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جمہوریت میں ہر شخص کو نمائندگی کا موقع دیا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کی اہمیت ہے کہ ہر نقطہ نظر کو عددی تناسب کے اعتبار سے نمائندگی ملے۔ مگر یہاں پر جمہوریت کے نام پر اکاون فیصد لوگوں کی حکمرانی کا راستہ ہموار کیا جا رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسے جمہوریت تو کسی اعتبار سے نہیں کہہ سکتے۔

بات تو معقول تھی پھر کانگریس کے زعماء نے اس پر توجہ کیوں نہ دی؟

بولے: بات جتنی بھی معقول ہو آزادی کے فوراً بعد ایسا لگا جیسے اس ملک پر مسلمانوں کا استحقاق جاتا رہا ہو۔ پٹیل نے واضح الفاظ میں متنبہ کر دیا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد اب ہندوستان کے باقی ماندہ علاقوں میں دو قومی نظریہ کی بات آئندہ کوئی نہیں کرے گا۔ گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ مسلمانوں کو حکومتی مناصب میں اب کسی نمائندگی کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ ایک طرف مسلمانوں کو دستوری تحفظات کے دائرے سے باہر کیا گیا اور دوسری طرف سیکولر ازم اور ڈیموکریسی کا پروپیگنڈہ بھی جاری رہا۔ مسلمانوں کے حقوق میں اٹھنے والی آوازوں کو یہ کہہ کر دبا دیا گیا کہ اس طرح کی باتوں سے ملک کا سیکولر ڈھانچہ کمزور ہوگا۔ فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی سراٹھائے گی۔ احیاء پرست ہندو جو اس ملک کو ہندو راشٹر بنانا چاہتے ہیں انھیں منظم ہونے کا موقع ملے گا۔ لہذا مسلمانوں کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا کہ وہ خود کو ملک و وطن کے تئیں وفادار ثابت کریں اور دستور کے خالی خولی پٹارے کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھریں، مبادا کل ان سے یہ نفسیاتی سہارا بھی کوئی چھین لے۔ موجودہ ترمیم شدہ دستور کی حقیقت امبیڈکر سے بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ انھوں نے ۱۹۵۵ء میں راجیہ سبھا میں یہ بات کہی تھی کہ دستور ہند ایک عظیم الشان معبد تھا جو ہم نے

بنایا تو خدا کے لئے تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہاں خدا بٹھائے جاتے، شیاطین براجمان ہو گئے۔ میرے لئے ڈاکٹر ساجد کی گفتگو میں لطف و انبساط کا بڑا سامان تھا مگر بس اب ہوٹل کے سائبان میں داخل ہو چکی تھی۔ میں نے ان سے رخصت کی اجازت لی اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

ندوة الشباب کی کانفرنس میں دنیا بھر سے انقلابی نوجوانوں اور معروف مسلم شخصیات کی قابل ذکر تعداد جمع ہو گئی تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب اسلامیان کا ہر طرف بول بالا تھا۔ شرق سے غرب تک جدھر نظر اٹھائیے غلیجی سرمایہ اور امریکی سرپرستی، یا کم از کم مغربی نظام کفر کے تعارض کے بغیر، اسلامی تحریکیں مختلف قسم کے تعلیمی، ثقافتی، دعوتی اور جہادی منصوبوں میں مصروف دکھائی دیتی تھیں۔ ریاض کا مجمع اسلامیوں کا ایک طرح کا بین الاقوامی کارنیوال تھا جہاں مجھے دنیا بھر کے اہل فکر مسلمانوں سے رابطے کا موقع ملا۔ کانفرنس کے اختتام پر ہمارے پروگراموں کی ترتیب بھی کچھ اس طرح رکھی گئی تھی کہ ہم لوگ خصوصی طیارے سے مملکت کے مختلف شہروں میں اہم اداروں کی سیر کرتے رہے، لوگوں سے ملتے رہے۔ بہت سی دوستیاں اسی سفر میں کچھ ایسی بنیں کہ تازندگی رفاقتوں کے یہ بندھ ٹوٹ نہ پائے۔ کانفرنس تو تین چار دنوں میں ختم ہو گئی مگر اسلامیوں کی غلغلہ انگیز بحثیں سچ پوچھے تو تھمنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ ہر پل ایسا لگتا تھا جیسے ہم لوگ صحوۃ کے تابناک لمحات میں جی رہے ہوں، جیسے بہت جلد تاریخ کی کمان دوبارہ ہمارے ہاتھوں میں تھمائی جانے والی ہو۔

## متاع بالمعروف

صحوۃ کے ان غلغلہ انگیز ایام میں نہ جانے میں کب تک نجد و حجاز کی پر لطف مجلسوں کا لطف اٹھاتا رہتا کہ اچانک ایسا لگا کہ ان محفلوں سے اب دل اچاٹ ہوتا جا رہا ہو۔ ایک صبح حرم کی کے جوار میں واقع ہوٹل اجیاد میں ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا، دسترخوان پر انواع و اقسام کی نعمتیں سجی تھی مگر دل کچھ کھانے پر آمادہ نہ تھا۔ پہلے تو یہ خیال ہوا کہ یہ سب اپنی درویش طبیعت کے سبب ہے جسے پر آسائش ہوٹلوں میں نرم و گداز گدوں پر سونے کے بجائے فرش پر سونا زیادہ پسند ہے اور جسے مرغن اور لذیذ کھانوں کے بجائے ہمیشہ سے سادہ فطری غذا، تازہ پھل اور دال روٹی زیادہ عزیز رہی ہے۔ لیکن چند دنوں میں جب علامات واضح ہونے لگیں تو پتہ چلا کہ یہ کوئی روحانی تجربہ نہیں بلکہ ریقان کا شدید حملہ ہے۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اسی سفر میں شمالی افریقہ کے بعض ممالک کا بھی لگے ہاتھوں دورہ کر لیا جائے۔ بعض احباب اس بات پر مصر تھے کہ میں اپنی پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کے لئے برطانیہ کی لائبریریوں کا رخ کروں اور محبت مکرم سید حسن مطہر صاحب، جوان دنوں مسلم ورلڈ لیگ جرنل کے مدیر اعلیٰ تھے، نے تو اس سفر کے سارے ضروری انتظامات بھی کر رکھے تھے مگر میرے لئے اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں فی الفور وطن واپس لوٹ آؤں۔ دوران سفر طبیعت کچھ اس طرح بگڑی جیسے کوئی شکستہ جہاز مسلسل موجوں کے تلاطم میں ہو بلکہ چار گھنٹوں کے ہوائی سفر میں تو کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے یہ زندگی کا آخری سفر ہو۔ دہلی ایر پورٹ سے باہر نکلنے ہی نزلے زکام کا شدید حملہ ہوا۔ بعد از خرابی بسیار بھائی جان کی معیت میں کسی طرح گھر پہنچا۔ ابا مجھے اس قدر بیمار اور بے حال دیکھ کر پریشان ہوا۔ کوئی تین بجے صبح کا عمل ہوگا، میں تیز بخار میں تپ رہا تھا جہی مجھے اپنی پیشانی پر ابا کی انگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔ وہ میری تپتی پیشانی پر اپنا ہاتھ پھیرتے جاتے اور یا نار کونسی برداً و سلاما علی ابراہیم کا ورد کرتے جاتے۔ نہ جانے ان ہاتھوں میں کیا اثر تھا کہ تھوڑی دیر میں بخار کی شدت جاتی رہی، بے کلی اور بے چینی میں افاقہ ہوا۔ تبھی ابا کی زبان مبارک سے یا مسبب الاسباب کا نعرہ بلند ہوا اور وہ حسب معمول تہجد کی نماز میں مشغول ہو گئے۔

چند دنوں بعد جب طبیعت ذرا بحال ہوئی تو پتہ چلا کہ ملک میں ایک نئے طوفان کی آمد آمد ہے۔ مدت سے بند پڑی بابرئ مسجد جس میں دسمبر ۱۹۴۹ء کی ایک شب تاریک میں بعض شریکوں نے رام لالا کی مورتی ڈال کر غاصبانہ قبضہ کی کوشش کی تھی اور جس پر انتظامیہ نے غیر قانونی طور پر نقص امن کے بہانے تالا ڈال رکھا تھا وہ اچانک ہندوؤں کے درشن کے لیے یکم فروری ۱۹۸۶ء کو کھول دی گئی تھی۔ یہ سب کچھ حکومت کی ایماء اور انتہا پسند ہندو تنظیموں کی ملی بھگت سے کچھ اس طرح انجام پایا کہ مسلمان اس کے اسرار و عواقب کا پوری طرح اندازہ نہ کر پائے۔ گزشتہ چند مہینوں سے مسلمانوں کی ملی اور سیاسی قیادت مسلسل حکومت کے رابطے میں تھی۔ شاہ بانو کیس کے ممکنہ اثرات سے بچنے کے لیے ایک نئے بل کا مسودہ حکومت کو پیش کیا جا چکا تھا۔ مسلم علماء و دانشوروں کو اس بات کی امید ہو چلی تھی کہ وزیراعظم راجیو گاندھی مسلمانوں کے تئیں اپنی ذاتی ہمدردی اور شخصی دلچسپی کے سبب مسئلہ کا کوئی نہ کوئی مناسب حل نکال ہی لیں گے۔ طاہر محمود جوان دنوں دہلی یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر تھے اور جنھوں نے بورڈ کی ایماء پر راجیو گاندھی سے مل کر انھیں نفاذ کے سلسلے میں شریعت کی باریکیوں سے آگاہ کیا تھا ان کی توقعات کا درجہ حرارت تو اتنا بلند تھا، کہ اخبارات کی رپورٹوں کے مطابق، وہ ہر طرف یہ کہتے پھرتے تھے کہ مسلمانوں کے مسئلہ کو حکومت میں صرف ایک شخص سمجھتا ہے اور وہ ہے راجیو گاندھی کی ذات گرامی۔ خود وزیراعظم راجیو گاندھی اس بات کا عندیہ دیتے رہے تھے کہ وہ شاہ بانو کیس سے پیدا ہونے والے مداخلت فی الدین کے ازالے کے لیے جلد ہی ایک بل پارلیمنٹ میں لانے والے ہیں۔

ادھر ۱۹۸۳ء سے مسلم مجلس مشاورت کی طرف سے دہلی کی ان مسجدوں کی بحالی کی تحریک بھی چلائی جا رہی تھی جو آزادی کے بعد سے حکومت کی تحویل میں ہیں۔ اس سلسلہ میں سید شہاب الدین اور دوسرے سرکردہ لیڈروں کی جانب سے مسز گاندھی کو میمورنڈم بھی پیش کیا جا چکا تھا۔ اب راجیو حکومت کے دور میں شاہ بانو تحریک نے مسلمانوں کی جتھہ بندی کا جو ملک گیر منظر پیش کیا اور حکومت جس طرح مسلمانوں کی مذہبی اور ملی قیادت سے گفت و شنید کرتی نظر آئی، اس سے عام ہندو حلقوں میں بھی یہی تاثر پیدا ہوا کہ حکومت مسلمانوں کے ووٹ کے لیے ان کی خوشامد اور منہ بھرائی (تشیئ کرن) پر اتر آئی ہے۔ بقول علی میاں ندوی، جیسا کہ انھوں نے 'کاروان زندگی' میں لکھا ہے، اس عرصے میں وزیراعظم سے ان کی 'بے تکلف' ملاقاتیں ہوئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی اور روحانی قیادت نے راجیو گاندھی کو کچھ اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ وہ وہی بولتے ہیں جو مسلمان چاہتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ شاہ بانو بل پر ابھی گفتگو چل ہی رہی تھی کہ انتہا پسند ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے انھوں نے فی الفور بابرئ مسجد کا تالا کھلوا دیا۔ حکومت کے اس

اچانک اقدام سے مسلم قیادت ایک منحصر کا شکار ہو گئی۔ جس وزیر اعظم کی معاملہ فہمی اور شریف انفسی کے سلسلے میں وہ اب تک رطب اللساں رہے تھے اس نے حساب برابر کرنے کے لیے مسلمانوں کو تحفظ شریعت اور ہندوؤں کو باہری مسجد میں غاصب رام لالا کے مورتی کے درشن کی اجازت دے دی تھی۔ مگر مسلمان کرتے بھی کیا۔ ابھی بل کا پارلیا منٹ میں پاس ہونا باقی تھا، وہ پوری تندہی سے مجوزہ بل کے نوک پلک درست کرنے میں لگ گئے۔

ان ہی دنوں پاکستان ٹائمس میں نفقہ مطلقہ سے متعلق کوئی مضمون شائع ہوا تھا جس میں شاہ بانو کیس میں ہندوستانی سپریم کورٹ کے موقف کی توثیق کی گئی تھی۔ مضمون نگار کا کہنا تھا کہ ایک ایسی بے سہارا عورت کو جس کا طلاق کی صورت میں اب کوئی پرسان حال نہ رہ گیا ہو، اس کے گزر بسر کے لیے سابق شوہر سے معقول رقم کا حصول عین قرین انصاف اور قرآن کی اصل روح کے مطابق ہے۔ وللمطلقات متاع بالمعروف حقاً علی المتقین کی تعبیر میں مسلمانوں کے روشن خیال حلقوں کا یہ کہنا تھا کہ متاع بالمعروف ایک ایسی گراں بہا رقم ہے جو مطلقہ کو کسی کا دست نگر بننے سے بچا سکے۔ گویا متقی مسلمانوں کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ علیحدگی کی صورت میں بھی اپنی سابقہ بیوی کے سلسلہ میں حسن سلوک اور جود و سخا کا مظاہرہ کریں۔ روایتی حلقوں کا کہنا تھا کہ یہ آیت دراصل تلقین و ترغیب کی قبیل سے ہے۔ اسے حکم اور قانون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ دوسری طرف روشن خیال حلقوں کی دلیل یہ تھی کہ کسی نادار اور بے سہارا کی خبر گیری اور اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا تو ویسے بھی اسلام میں ایک مستحسن امر ہے، چہ جائیکہ وہ کوئی ایسی عورت ہو جو خود اس کے اپنے طلاق کے فیصلہ سے متاثر ہوئی ہو، اور جس کے نتیجے میں ایک بے سہارگی کی زندگی اس کا مقدر بن گئی ہو۔ پھر ایک خدا ترس شوہر متاع بالمعروف کی تلقین سے کیوں کر چشم پوشی کرے گا۔ دستور ہند کی دفعہ ۱۲۵ جس کے تحت شاہ بانو کو اپنے سابق شوہر سے گزارہ بھتہ دلانے کی بات کہی گئی تھی، ابتداءً دستور میں دفعہ ۲۸۸ کی شکل میں ان محرومین کے لیے وضع کی گئی تھی جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ ۱۹۷۳ء میں مطلقہ عورتوں کو بھی اس زمرے میں داخل کیا گیا اور یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ گزارہ بھتہ کی رقم سابق شوہر کے مالی حیثیت کے مطابق ہو اور ۵۰۰ روپے سے زائد تو ہرگز نہ ہو۔ شاہ بانو کے کیس میں ان کے شوہر کی مالی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کورٹ نے ۱۷۹ روپے ماہانہ کی رقم طے کی تھی۔ بورڈ کے روایتی علماء کا کہنا تھا کہ طلاق کی صورت میں جب مطلقہ سے مرد کا کوئی تعلق ہی نہ رہا، وہ اس کے لیے اجنبی بن گیا تو پھر وہ کسی اجنبی عورت کا خرچ کیوں اٹھائے۔ بورڈ نے اس کا حل یہ نکالا کہ مرد سے متاع بالمعروف کے حوالہ سے حسن سلوک کا مطالبہ کرنے کے بجائے مطلقہ عورت کے عزیز واقارب پر اس کی کفالت کی ذمہ داری ڈال دی

جائے اور اگر اس کے عزیز واقارب اس پوزیشن میں نہ ہوں تو وقف بورڈ اس کی کفالت کا ذمہ لے۔ مسلم علماء اس بات سے ناواقف نہیں تھے کہ وقف بورڈ اپنی بدانتظامی اور بدعنوانی کے سبب اپنے ملازمین اور ائمہ مساجد کو معقول تنخواہوں کی ادائیگی سے قاصر ہے۔ ایسی صورت میں بے سہارا مطلقہ عورتوں کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑنا ایک سنگ دلانہ اور مجرمانہ مشورہ ہے۔ مگر انھوں نے شریعت کی جو تعبیر پڑھ رکھی تھی اس میں تلقین و ترغیب کو احکام میں بدلنے کی کوئی گنجائش نہ تھی، پھر وہ بیچارے کرتے بھی کیا۔

کہتے ہیں کہ پاکستان ٹائمس کے اس کو مضمون پڑھنے کے بعد راجیو گاندھی جیسی بیہوش کا شکار ہو گئے تھے۔ غالباً ارون شوری نے انھیں یہ مضمون اس نوٹ کے ساتھ بھیجا تھا کہ ہندوستانی علماء فقہ مطلقہ کے سلسلے میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کو جس طرح خلاف شریعت بتا رہے ہیں، فی الواقع ایسا ہے نہیں۔ پڑوسی ملک میں اس بارے میں مسلمان اہل علم کی رائے مختلف ہے۔ راجیو گاندھی نے اس مضمون پر نجمہ ہبت اللہ سے رائے طلب کی جنھوں نے بورڈ کے علماء سے تبادلہ خیال کے بعد بتایا کہ اہل علم کے بعض محدود حلقے ہی متاع بالمعروف کی تشریح میں اس موقف کے حامل ہیں، ورنہ سواد اعظم روایتی علماء کے ساتھ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نجمہ ہبت اللہ نے وزیر اعظم کو یہ مصلحت بھی سمجھائی کہ روایتی علماء جن کے پیچھے جمہور مسلمانوں کی طاقت ہے، اگر ان کے مطالبہ کو تسلیم نہ کیا گیا تو کانگریس اپنے مسلم ووٹ بینک سے محروم ہو جائے گی۔ یہ بات راجیو گاندھی کی سمجھ میں آگئی اور انھوں نے مسلم خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے پارلیمنٹ سے ایک نئے بل کی توثیق کا ارادہ کر لیا۔ بالآخر بل کا مسودہ تیار ہوا۔ بورڈ کے علماء اور ان کے ماہرین قانون نے ایک ایک شق کو خوب چھان پھٹک کر دیکھا، لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ اس نکتہ پر کسی کی توجہ نہ گئی کہ نئے بل میں بھی سپریم کورٹ کے پرانے فیصلہ کی گنجائش جوں کے توں برقرار رہی۔ نئے بل کی دفعہ 3 میں صریح الفاظ میں لکھا گیا تھا:

"Notwithstanding anything contained in any other law for the time being in force, a reasonable and fair provision and maintenance to be made and paid within the iddat period by her former husband."

حیرت ہے کہ نہ تو ہمارے علمائے عظام کو اور نہ ہی بورڈ کے قانونی ماہرین کو اس بات کا ادراک ہو سکا کہ اس شق میں within the iddat period کے الفاظ آئے ہیں، for the iddat period کے نہیں۔ گویا یہاں اس بات پر سارا زور ہے کہ عدت کے دوران ہی متاع بالمعروف کی ادائیگی کو یقینی بنایا جائے۔ برسوں بعد سال 2001 میں بمبئی ہائی کورٹ نے کریم بنام کریم کے ایک مقدمہ میں اس نکتہ کی عقدہ کشائی کر دی کہ یہاں within سے مراد عورت کو ایک مناسب اور معقول رقم عدت کے دوران ہی دلوانے کی بات کہی گئی ہے۔

ستمبر ۲۰۰۱ء میں جب یہ مقدمہ سپریم کورٹ پہنچا تو عدالت عظمیٰ نے اس بات کی مزید توثیق کر دی کہ اس قانون کی شق ۳(۱) الف صرف ایام عدت کا احاطہ نہیں کرتی، بلکہ 'مطلقہ کی بقیہ زندگی پر بھی محیط ہے تا آنکہ اس کی کسی دوسری جگہ شادی ہو جائے'۔ البتہ اسے نفقہ کی رقم ایام عدت کے دوران ہی ادا کرنی ہے اور یہ رقم معقول اور مناسب ہونی چاہیے، جو صرف ایام عدت کے لیے کفالت نہ کرے کہ یہاں for کا لفظ نہیں بلکہ within کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ تو وہ صریح قانونی موٹوگافیاں تھیں جن کا بورڈ کے روایتی علماء اور ان کے قانونی ماہرین، جن میں عبدالرحیم قریشی، سلمان خورشید اور طاہر محمود جیسے صاحبان علم بھی شامل تھے، بروقت ادراک نہ کر سکے۔ بل کا مسودہ جب آخری مرحلے میں آیا تو اس میں اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی کہ اگر کوئی مسلم خاتون مجوزہ قانون کے بجائے دفعہ ۱۲۵ کے سیکولر قانون کے تحت ہی اپنا مقدمہ فیصل کرانا چاہتی ہے تو اسے اس بات کا بھی اختیار حاصل ہوگا۔ دیکھا جائے تو ایک اعتبار سے آخری لمحے کا یہ اضافہ پوری شریعت مہم کی لٹی تھی۔ شاہ بانو نے بھی تو اسی شق کا فائدہ اٹھا کر اپنے حق نفقہ کا مطالبہ کیا تھا۔ پھر اگر مسلمان عورت کے لیے اس سیکولر متبادل کا راستہ کھلا ہی رکھنا تھا تو تحفظ شریعت کے نام پر اتنی ہنگامہ خیز مہم کیوں چلائی گئی تھی۔ مسلمانوں کو تحفظ شریعت کے نام پر تو کچھ نہ مل سکا، نئے بل نے پرانی صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھا۔ برسوں بعد منی شکر ایئر نے اس بات کو راجیو گاندھی کی عبقریت پر محمول کیا کہ انھوں نے مسلم خواتین بل میں کچھ ایسی بات رکھ دی کہ روایتی علماء نے انھیں شریعت کا پاسبان سمجھا اور نئے بل کے پاس ہو جانے کے باوجود صورت حال میں سر مو کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ انھوں نے کمال عیاری کے ساتھ مسلمانوں کے مفروضہ تشکیلی کرن کے الزام سے بچنے کے لیے انتہا پسند ہندوؤں کو باہری مسجد کا تحفہ عطا کر دیا۔ غیر قانونی طریقے سے مسجد کا تالا کھلو کر سچ پوچھے تو انھوں نے اولین کارسیوک کی حیثیت سے تاریخ میں اپنا نام رقم کروا لیا۔

## شیوشکتی کا جاپ

وطن مالوف میں میرے قیام کو اب کوئی ایک ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس دوران بیماری کی علامتیں تو جاتی رہیں البتہ نقاہت ابھی باقی تھی۔ اب زیادہ تر وقت یا تو بستر میں لیٹے ہوئے اخبارات و رسائل کی ورق گردانی میں گزرتا یا پھر گاہے بہ گاہے حسب توہین مکتبہ کی مجلس میں جا بیٹھتا۔ میری بیماری کی اطلاع نجد و حجاز کی سرزمین سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں بھی احباب کے حلقے میں پھیل گئی تھی۔ ایک دن بنارس سے مولانا مقتدی حسن ازہری کا خط ملا جس میں انھوں نے یہ لکھا تھا:

’یہ معلوم کر کے تشویش ہوئی کہ آپ کو یرقان کی شکایت ہو گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو مکمل اور فوری صحت سے نوازے۔‘ اسی خط میں انھوں نے یہ مشورہ بھی دے ڈالا تھا کہ لندن کے لیے آپ کا پروگرام اچھا ہے۔ حالات جب اجازت دیں ضرور تشریف لے جائیے اور وہیں سے دین کی خدمت کا پروگرام بنائیے۔‘

مقتدی صاحب سے میری ملاقات ریاض کی اسی کانفرنس میں ہوئی تھی۔ وہ بھی اکثر ان بے تکلف شبینہ مجلسوں کا حصہ ہوتے جس میں صحوة اسلامیہ کے علم بردار بڑے بڑے منصوبے تشکیل دیتے۔ مختلف بلاد و امصار میں اسلامی تحریک کی کامیابیوں اور نئی فتوحات کا تذکرہ ہوتا۔ ان کے مکتوب نے ایسا لگا جیسے ایمان انگیز یادوں کے درتپے کو پھر سے وا کر دیا ہو۔ مجھے ڈاکٹر عبدالقادر عثمان علی یاد آئے جو ترائیہ میں امور امت کا ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے جو صرف مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے مختص ہو۔ انھیں میری گفتگو میں فکر فردا کی نہ جانے کون سی آمیزش نظر آئی کہ انھوں نے مجھے اپنے نئے نئے لیے مرکز کی زیارت کی دعوت دے ڈالی۔

ایک دن کانفرنس کے کسی عشائیے میں شیخ بن باز سے ملاقات کی تقریب نکل آئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دو جواں سال سعودی شہزادے شیخ کی خدمت میں پھل کاٹ کر پیش کرتے جاتے ہیں۔ شیخ بصارت سے محروم تھے، لیکن بصیرت سے قدرت نے انھیں وافر حصہ عطا کیا تھا۔ چند منٹوں کی ملاقات میں انھوں نے میرے

کوائف کو کھنگالا، پی ایچ ڈی کے موضوع کی بابت پوچھا اور پھر موضوع کے سحر میں اس طرح گرفتار ہوئے کہ ایک مختصر سی تقریر کر ڈالی۔ شیخ سے یہ تعارف اگلی ملاقاتوں اور ان کی مجلسوں میں حاضری کا بہانہ بن گیا۔ ایک دن شیخ کے اصرار پر دوپہر کا کھانا ان کے گھر پر کھانے کا اتفاق ہوا۔ دسترخوان پر ان کے مترجم خاص مولوی لقمان سلفی اور پروفیسر عبدالجلیل بھی موجود تھے، آخر الذکر جامع امام میں انگریزی کے سینئر پروفیسر تھے۔ دعوت و تبلیغ کی مجلسوں میں ان کی بڑی توقیر تھی۔ غیر مسلموں میں دعوت کے کام کا انھیں اچھا تجربہ تھا۔ عبدالجلیل صاحب کا بھی اصرار تھا کہ میں صحوۃ کے اس سفینے میں سوار ہو جاؤں جو فی زمانہ نجد و حجاز کی سرزمین پر رواں دواں ہے اور جس کی تابانی سے عنقریب ایک عالم منور ہونے کو ہے۔ شیخ نے ابھی چند نوالے ہی تناول فرمائے ہوں گے کہ تین چار بدو ہماری سینی کے گرد بیٹھے۔ وہ اسی سینی سے نوالہ لیتے جاتے اور شیخ کی خدمت میں اپنی معروضات بھی عرض کرتے جاتے۔ کھانے کے اختتام تک انھوں نے بہت سی باتیں کہہ ڈالیں۔ ان کا لہجہ بدویانہ اور درشت تھا۔ اس کے جواب میں شیخ صرف یہی کہتے کہ سینچر کے دن دفتر میں آنا وہاں اس قضیے کا کوئی حل نکالیں گے، مگر ان بدوؤں پر تین دنوں کی مہلت شاق تھی۔ کہنے لگے تم جھوٹے ہو، بات کو ٹالنا چاہتے ہو، اگر سنجیدہ ہوتے تو اس مسئلہ کو یہیں فی الفور حل کرنے کی کوشش کرتے۔ شیخ دفتر اور گھر کے فرق کی نزاکت بتاتے رہے لیکن ان بدوؤں نے جھوٹے اور مکار ہونے کا الزام ان سے واپس نہ لیا۔ جاتے جاتے یہ کہتے گئے کہ بن باز تمہیں خدا ہی ہدایت دے۔ میں نے دیکھا کہ شیخ کے چہرے پر خفگی کے ذرا بھی آثار نہ تھے۔ بن باز کی مجلسوں میں جب بھی بیٹھا ان کی کھر در، سادہ اور شفاف شخصیت کی عظمت بلکہ ہیبت کا نقش دل و دماغ پر گہرا ہوتا جاتا۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جہیمان اور اس کے انقلابی ساتھیوں کو، جنھوں نے پندرہویں صدی کی پہلی صبح کو حرم مکی میں ایک نئے انقلاب کا علم بلند کیا تھا ان نوجوانوں کی سزائے موت کے حکم نامے پر شیخ نے کس جگر سے دستخط کیے ہوں گے۔ حیرت ہوتی کہ کیا واقعی تعبیر کا اختلاف دین مبین کے مخلص حاملین کو اس طرح باہم متحارب کر سکتا ہے۔

ایک صاحب تھے راشد راجع، ام القریٰ یونیورسٹی کے وائس چانسلر۔ اتفاق سے میں نے کانفرنس کی جس نشست میں ہندوستانی مسلمانوں کے ثقافتی مسائل پر اپنا مقالہ پیش کیا تھا وہ اس جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ جلسہ کے خاتمے پر انھوں نے مجھے مکہ آنے کی دعوت دی اور وہیں کھڑے کھڑے ایک نوجوان استاد کی حیثیت سے میرا تقرر کر ڈالا۔ صحوۃ کے اس سفینے کی سواری کبھی قلب و نظر کو اپنی طرف کھینچتی اور کبھی یہ خیال آتا کہ ہندوستانی مسلمانوں پر جو کچھ گزری اور گزر رہی ہے، اس مشکل صورت حال میں ایک نظری اور فکری راستے کی دریافت کا کام کہیں اہم ہے۔ کاش کہ لوگ اس حادثہ فاجعہ کی حقیقت کو سمجھ پاتے۔ کاش کہ

وہ سیکولر ڈیموکریسی کی اس تعذیب گاہ پر مطلع ہو پاتے جس کا عذاب ہی یہ ہے کہ وہ اوشوٹز سے بدتر ہونے کے باوجود ایک آزاد جمہوری فضا ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

اب تک شہر میں میرے قیام اور میری بیماری کی اطلاع احباب کے حلقے میں پھیل چکی تھی۔ وقتاً فوقتاً لوگ مزاج پرسی کے لیے آتے رہتے۔ ایک دن اسکول کے کچھ پرانے ساتھی ملاقات کے لیے آئے۔ ان میں سے بعض کو کئی برس بعد دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ ظفر نے ابھی حال ہی میں بینک کی نیجری کا امتحان پاس کیا تھا۔ سجاد میڈیکل کے تیسرے سال میں تھے اور ان کی گفتگو سے ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی تھرڈ ایئر سینڈروم سے باہر نہیں آئے ہیں۔ آصف کے ہاتھ میں سنڈے میگزین اور انگریزی اخبارات کا پلندہ دیکھ کر میری طبیعت پھڑک اٹھی۔ میں نے کہا واللہ تم اب تک صحیفہ دجال کے سحر میں مبتلا ہو۔ آصف سے میری ملاقات پچھلے سال بھی ہوئی تھی۔ میں نے انھیں جب بھی دیکھا، اخبارات و رسائل کی ورق گردانی میں منہمک پایا۔ ان کی صبح ان ہی اخبارات و رسائل کی تلاوت سے شروع ہوتی۔ وہ خبروں کو اس انہماک سے پڑھتے جیسے صحیفہ ربانی پڑھ رہے ہوں۔ تب ہم لوگ اخبارات کو صحیفہ دجال کہا کرتے جس نے اکثر مسلم گھروں میں تلاوت قرآن کی جگہ لے لی تھی۔ آصف کے پاس ہمیشہ خبروں کا خزانہ ہوتا۔ جزویات اور تفصیلات پر ان کی نظر ہوتی۔ اپنے خاص انداز میں جب وہ ان خبروں کو داستان بنا کر پیش کرتے تو ایسا لگتا جیسے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں۔ ہم لوگ انھیں ان کی سحر البیانی کے سبب آصف بی بی سی کہا کرتے۔ آج انھوں نے آتے ہی باہری مسجد کا قضیہ چھیڑ دیا۔ بولے: پتہ ہے اب ملک میں آئندہ کیا ہونے کو ہے۔ پھر خود ہی جواب دیا کہ فرقہ پرستی کا عفریت اب آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا۔

پھر کیا کیا جائے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: کرنے کا مرحلہ تو بعد میں آتا ہے۔ پہلا مرحلہ تو سمجھنے اور منصوبہ بندی کا ہے۔ احیاء پرست تنظیمیں ایک عرصہ سے منصوبہ بندی کر رہی ہیں۔ ان کا ایک ایک قدم سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آگے بڑھ رہا ہے۔ مسلم قائدین کے اخباری بیانات اور ایکشن کمیٹی کی خالی خالی دھمکیاں ان کا سدباب نہیں کر سکتیں۔

پھر کیا کیا جائے، کچھ تو بتاؤ؟ میں نے پھر پوچھا۔

بولے: غور و فکر۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ سنجیدہ اور پیمبرانہ غور و فکر جس میں غارِ حرا والا ارتکاز شامل ہو تاکہ خدا ہمارے دل میں اس پیچیدہ مسئلہ سے نپٹنے کے لیے ترکیبیں ڈال دے۔ یہ کہتے ہوئے آصف کے لہجہ میں غایت درجہ کی سنجیدگی آگئی۔ بولے: اگر اس مسئلہ کو کمال بصیرت سے حل نہ کیا گیا تو آنے والے دنوں

میں اس آگ کی لپٹیں اسلامیان ہند کے آشیانوں کو جلا ڈالے گی۔

ارے بھئی فلسفیانہ باتیں نہ کرو، کوئی عملی ترکیب بتاؤ، ظفر نے مداخلت کی۔

عملی ترکیب تو مشترکہ غور و فکر سے بنے گی۔ اہم بات یہ ہے کہ ہمارے قدم صحیح سمت میں اٹھیں۔ اور ہاں یہ جو چار پانچ سالوں میں ملک کے منظر نامے میں ایک بڑی تبدیلی آئی ہے، اس کے حقیقت پسندانہ تجزیے کی ضرورت ہے۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے دو ڈھائی سال پہلے کی بات ہے جب وشو ہندو پریشد نے ملک بھر میں ایک ماتا بجنائے یعنی ہندوؤں کے ملک گیر اتحاد کی تحریک چلائی تھی اور صرف ڈھائی تین سال کے عرصے میں ملک کا منظر نامہ اتنا بدل گیا کہ آج ہر طرف مسلمانوں کے خلاف نفرت کا آتش فشاں پھٹتا دکھائی دیتا ہے۔

میرے خیال میں ۱۹۸۳ء سے بھی پیچھے جانے کی ضرورت ہے، ظفر نے مداخلت کی۔ بولے: احیاء پرست ہندوؤں کی بے چینی تو اسی وقت شروع ہوئی تھی جب ۱۹۸۱ء میں میناکشی پورم میں بڑے پیمانے پر قبول اسلام کے واقعات پیش آئے تھے۔ انہیں ایسا لگا گویا خطرے کی گھنٹی بج گئی ہو۔

’میناکشی پورم ایک فیکٹر ضرور ہے، لیکن ہمیں ذرا اور پیچھے جانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی غلطی تو میں سمجھتا ہوں کہ جبے پرکاش نارائن سے ہوئی، سجاد جو اب تک خاموش بیٹھے تھے، انھوں نے اپنا موقف صیقل کرتے ہوئے کہا۔ بولے: جتنا حکومت میں احیاء پرست ہندوؤں کو پہلی بار اس بات کا اندازہ ہوا کہ کانگریس آئی کا قلعہ ناقابل تسخیر نہیں۔ اور یہ کہ اسلام مخالف پروپیگنڈے اور مسلم دشمنی کی مہم میں وہ باسانی منافق کانگریس کو مات دے کر اس ملک کے اقتدار پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ تبھی سے آریس ایس اور اس کی ذیلی تنظیمیں مسلم دشمنی کو سیاسی منشور میں بدلنے کی ترکیبیں سوچتی رہی ہیں۔

تمہاری بات درست ہے۔ میناکشی پورم کے واقعات نے انھیں ایک موقع فراہم کر دیا کہ وہ اس ملک میں ہندوؤں کی مظلومیت کا پرشور پروپیگنڈہ کر سکیں۔ ۸۳ء میں تو خیر ملک گیر سطح کی مہم چلائی گئی تھی۔ ملک بھر میں ہندوؤں کو متحد کرنے کے لیے ۹۲ چھوٹے بڑے کارواں کئی مہینوں تک مختلف سمتوں میں متحرک رہے۔

’اس کے پیچھے تو بڑی منصوبہ بندی رہی ہوگی؟‘

میرے اس سوال پر آصف نے پہلو بدلا۔ بولے: ارے بھئی آزاد ہندوستان میں بلکہ کہہ لیجئے کہ اونچی ذات کے ہندوؤں کی صدیوں کی تاریخ میں اتنی بڑی کوئی اور تحریک دیکھنے کو نہیں ملتی جو اس قدر منظم انداز سے ملک گیر سطح پر چلائی گئی ہو اور جس میں تمام فرقے کے ہندوؤں کو شامل کیا گیا ہو، حتیٰ کہ وہ دلت

آدیاسی، جین اور سکھوں کے بعض دھڑے بھی جو کبھی بھی ہندومت کا حصہ نہیں رہے۔ ذرا اندازہ کریں کہ صرف ایک کارواں جو کٹھمنڈو سے رامیشورم کی طرف روانہ ہوا وہ تین لاکھ گاؤں سے ہو کر گزرا۔ پچاس ہزار میل کی مسافت طے کی۔ دوسرا بڑا قافلہ بنگال کے گنگا ساگر سے لے کر سوماتھ کی طرف روانہ ہوا اور تیسرے قافلے نے ہری دوار سے کنیا کماری تک مسافت طے کی۔ میں نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب گنگوتری کا پانی لے کر ٹرکوں کا قافلہ شہروں اور دیہاتوں سے گزرتا تو ٹھا کر عورتوں کے ساتھ دلت عورتیں بھی برکتوں کے حصول میں ان کے شانہ بہ شانہ نظر آتیں۔ پوری اور دوارکا کے شکر اچاریہ جو ہمیشہ سے چھوٹ چھات کے حق میں رہے ہیں، انھوں نے بھی نیچی ذات کے ہندوؤں کو اس طرح خلط ملط ہو جانے کی خاموش اجازت دے دی۔

ہندوؤں کے اور بھی تو مٹھ ہیں ان کا کیا موقف ہے؟ ظفر نے پوچھا۔

بڑے مٹھ چار ہیں، دو تو یہی پوری اور دوارکا کے۔ اس کے علاوہ چیوتر پیٹھ اور سیرنگوری کے شکر اچاریہ کو بھی مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں کی طرف سے تو کوئی بیان سامنے نہیں آیا، البتہ پوری کے شکر اچاریہ نرنجنا دیوتر تھا جو اپنے آپ کو ایک سوچا لیسواں جگت گرو کہتے ہیں، وہ مسلسل نفرت کی اس مہم کو ہوا دے رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ حکومت ہندو مخالف ہے جو مسلمانوں کی منہ بھرائی کے لیے مسلم خواتین کے سلسلے میں پارلیمنٹ میں نیا بل لانا چاہتی ہے۔ البتہ دوارکا کے شکر اچاریہ اس ساری مہم کو سیاسی شعبہ بازی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

مسلمانوں کو اس نازک وقت کے لئے پہلے سے ہی تیاری کرنی چاہئے تھی، ظفر نے رائے دی۔

بولے: یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنی منظم اور منصوبہ بند مہم کا مسلم علماء اور دانشوروں کی طرف سے بروقت نوٹس کیوں نہ لیا گیا؟

پہلی بار ہندوؤں کے ۸۵ مختلف فرقوں کے سادھوسنت ایک مارگ درشک منڈل (یکنہ) میں جمع ہوئے۔ اسی موقع پر ہندوؤں کے ۳۳ کروڑ دیوی دیوتاؤں کی صف میں بھارت ماتا کے نام سے ایک نئی دیوی کا اضافہ ہوا۔ آصف نے داستان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

اچھا! مجھے نہیں معلوم تھا کہ بھارت ماتا کی دیوی جو تصویروں میں شیر پر سوار دکھائی جاتی ہے، ایک تازہ بہ تازہ ایجاد ہے، سجاد نے کہا۔

مگر ۳۳ کروڑ دیوی دیوتاؤں کی موجودگی کے باوجود ایک نئی دیوی کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟ ظفر

نے سوال کیا۔

یہ سن کر آصف مسکرائے۔ بولے: پرانے دیوی دیوتاؤں سے ایک ایسے مذہب کا ہیولی نہیں تشکیل دیا جاسکتا تھا جو ہندوؤں کے مختلف فرقوں کو ایک نکتہ پر جمع کر سکے۔ بھارت ماتا کا تصور اسی خلا کو پُر کرنے کے لیے لایا گیا۔ حالانکہ انھیں خوب معلوم ہے کہ قدیم اکھنڈ بھارت جس میں پاکستان، بنگلہ دیش کے علاوہ نیپال، سری لنکا، بھوٹان، میانمار اور افغانستان تک کی سرحدیں شامل تھیں، اب ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ لیکن ہندوؤں کی ایک نئی مصنوعی قومی شناخت کی تشکیل کے لیے لازم تھا کہ سرزمین ہند کو ایک لائق عبادت دیوی کی شکل میں متصور کیا جائے اور ہندو قوم کو اس سرزمین، اس میں بننے والی ندیاں اور اس کے قدیم تاریخی مذہبی مقامات کے محافظ کے طور پر پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ ایک ماتا سجنکا کا جلوس جب روانہ ہوا ہے تو ان کے قافلوں میں مختلف ندیوں کے متبرک پانیوں کا کلس برکتیں لٹاتا رہا۔ اس پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہندوؤں کا وقار ان کی قدیم عبادت گاہوں کی بحالی پر منحصر ہے، اور یہ کہ اس ملک میں جہاں رام کے نام لیوا اکثریت میں ہیں، آج بھی رام لالا کی مورتی پر بابرہی مسجد کا قتل پڑا ہے۔ رام چاہتے ہیں کہ ان کے ماننے والے انھیں اس اسیری سے نجات دلائیں۔ مسجد کا تالا کھولا جائے اور ان کے درشن کی اجازت ہر خاص و عام کو ہو۔

’مگر ۱۹۸۳ء کی مہم میں ’تالا کھولو‘ کا مطالبہ شامل نہیں تھا، ظفر نے واقعات کی ترتیب درست کرنے کی کوشش کی۔

ہاں تم درست کہتے ہو۔ ۸۳ء میں تو صرف زمین ہموار کی گئی۔ تالا کھولنے کی مہم تو اگلے سال شروع ہوئی جب وی ایچ پی نے رام جنم بھومی سجناسمیتی بنائی اور رام کی مورتی کو سلاخوں کے پیچھے دکھایا اور پھر یہ مورتیاں مختلف شہروں میں اس خیال سے پھرائی گئیں کہ عام ہندوؤں میں رام کی مظلومیت کا تاثر قائم ہو جو اپنے ہی ملک میں آج بھی مسلمان بادشاہوں کی بنائی ہوئی عمارتوں میں قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔

یہ تو ستمبر ۱۹۸۴ء کی بات ہے میں اس وقت سینٹا مڑھی میں اپنے نانہال میں تھا۔ اس شورش کی ابتدا وہیں سے ہوئی تھی۔ سینٹا مڑھی کے بھی اپنے ہنگامے ہیں۔ وہاں سینٹا کی جائے پیدائش کے حوالے سے دو مندر ہیں اور دونوں کو اس بات کا دعویٰ ہے کہ سینٹا اسی مقام پر پیدا ہوئی تھیں۔

یعنی بیک وقت دونوں مقام پر؟ سجاد نے حیرت کا اظہار کیا۔

بولے: ہاں، ایک مندر پورونا دھام میں واقع ہے اور دوسرا اس سے تین کلومیٹر دور جاکنی استھان میں۔ دونوں کے پاس اپنے اپنے تالاب ہیں۔ ایک کا نام ارجیوا کنڈ اور دوسرے کا نام سینٹا کنڈ ہے۔ اور دونوں کو اس بات کا دعویٰ ہے کہ راجا جنک جب قحط سالی کے خاتمہ کے لیے اپنے ہاتھوں میں بل لے کر اندر

سے بارش کی پراتھنا کے لیے نکلے تو ان کے بل سے تانبے کا کوئی کلس ٹکرایا اور اسی کلس سے سینتا کا ظہور ہوا۔ بعض لوگ جو ہر تنازع میں مفاہمت کا پہلو نکال لیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ سینتا کے ظہور کی جگہ تو پورنا دھام ہی ہے، البتہ ان کی چھٹی کی رسم جاکی استھان میں ہوئی تھی۔

اس وقت تو سینتا مڑھی میں حالات کشیدہ رہے ہوں گے۔ تم تماش بینیوں میں کیسے شامل ہو گئے؟ میں نے ظفر سے پوچھا۔

بولے: اس وقت تو مقامی طور پر ایک جشن کا سماں تھا، البتہ جلوس جیسے جیسے آگے بڑھا اور ہندوؤں کی مظلومیت کا پروپیگنڈا عام ہوا، لوگوں کے جذبات مشتعل ہونے لگے۔ بات فسادات اور قتل و خون تک پہنچی اور سچ پوچھے تو پھر حالات پوری طرح بے قابو ہو گئے۔

تمہیں نہیں لگتا کہ رام جنم بھومی مکتی بیجنا کی مہم نے ہندو ازم کا ایک نیا قالب تشکیل دیا ہے؟ میں نے آصف سے جاننا چاہا۔

بولے: یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ میں تمہیں رام نومی اُتسو کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایودھیا میں سریوندی کے کنارے لاکھوں رام بھکتوں کے ہجوم کو خطاب کرتے ہوئے ایک سادھو نے بڑی دلچسپ بات کہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اب تک تو ہم یہ تلقین کرتے تھے کہ جوتا کے کاٹنا بووے تا ہی بووے تو پھول یعنی جو تمہارے راستے میں کاٹنا بوئے، اس کے قدموں میں تم پھول نچھاور کرو۔ لیکن اب میں یہ کہتا ہوں کہ جوتا کے کاٹنا بووے تا ہی بووے تو بھالا — وہ بھی ہم کو کیا سمجھے گا پڑا کسی سے پالا۔

اور وہ نعرہ بھی تو تھ یا تراؤں میں ان دنوں خاصا مقبول ہوا: بچہ بچہ رام کا — جنم بھومی کے کام کا۔ ظفر نے لقمہ دیا۔

ہاں ایک ملی ٹینٹ ہندو ازم اپنے پورے جو بن پر ہے۔ گزشتہ سال اوڈوپی میں سادھو سنتوں کی جو دھرم سند منعقد ہوئی وہاں بھی شیوشکتی کا جاپ کریں گے — اپنی رکشا آپ کریں گے، جیسے نعرے لگائے گئے۔ اس موقع پر پانچ لاکھ کا مجمع تھا۔ مختلف فرقوں کے نو سو سادھو جمع ہوئے تھے، جنہوں نے مشترکہ طور پر اس بات کا عہد لیا کہ وہ اب اپنے آپسی اختلافات بھلا کر نئی ہندو قومیت کی تعمیر کے لیے اپنے آشرموں اور مٹھوں سے نکل پڑیں گے۔ اشوک سنگھل کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان کی پچھلی چھ سو سالہ تاریخ میں ہندو اتحاد کا ایسا منظر کبھی دیکھنے کو نہیں ملا۔ اس وقت پورا اتر پردیش بارود کے دہانے پر ہے۔ میرٹھ، مراد آباد، سنبھل، بارہ بنکی اور کاشی متھر اسے مسلسل تشویشناک خبریں آرہی ہیں۔ جنگجو یا نہ ہندو ازم کے آگے اب حکومت بھی بے بس دکھائی دیتی ہے۔ آصف نے تشویش کا اظہار کیا۔

’ارے بھی حکومت کیا بے بس ہوگی وہ تو خود اس جرم میں برابر کی شریک ہے۔ تم یہ بات بھول گئے ابھی دو سال پہلے مسز گاندھی نے مہاراشٹر میں پنچایت الیکشن کے موقع پر شیو سینا کے ساتھ انتخابی اتحاد کیا تھا۔ اور مسز گاندھی تو بھارت ماتا کی استھاپنا تقریبات ۱۹۸۳ء میں شرکت کرنے کے لیے بنفیس بنفیس ہری دوار بھی تشریف لے گئی تھیں۔ کانگریس کے ایک لیڈر تھے داؤد دیال کھنہ وہ اتر پردیش میں کانگریس کے وزیر بھی رہے تھے۔ انھوں نے مسز گاندھی کو یہ خط بھی لکھا تھا کہ انھیں پردہ غیب سے یہ القا ہوا ہے کہ ایودھیا، وارانسی، متھرا جیسی ہندوؤں کی مقدس عبادت گاہوں کو اب آزاد کرانے اور انھیں واپس ہندوؤں کے حوالے کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

’ارے بھی قصہ کیا ہے؟ کبھی انھیں غیب سے القا ہوتا ہے۔ کبھی آپے آپے آپ اچانک رات کی تاریکی میں مسجد کے اندر بھگوان پرکٹ ہو جاتے ہیں۔ کبھی انھیں تعین کے ساتھ وہ جگہ معلوم ہو جاتی ہے جہاں بقول ان کے بھگوان رام پیدا ہوئے تھے۔

’اور یہ جگہ بدلتی بھی تو رہتی ہے۔ کل تک یہ لوگ مسجد کے باہر رام چبوترے کو رام جی کی جائے پیدائش بتاتے تھے اور وہاں رام کے نام کا جاپ ہوتا رہتا تھا اور اب ایک مدت سے رام لالا مسجد کے اندر براجمان ہیں۔‘ ظفر نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

’میڈیکل سائنس میں ایک اصطلاح ہے جو دراصل ذہنی مریضوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بسا اوقات دماغی چوٹ لگ جانے کے سبب مریض حقیقت کو خود تخلیق کرتا ہے اسے confabulation کا عمل کہتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص صبح سے شام تک ایک کمرے میں بند ہے۔ آپ کو اپنی دن بھر کی کارگزاری بتاتے ہوئے یہ بیان کرے گا کہ آج شام وہ ساحل سمندر پر چہل قدمی کر کے آیا ہے جہاں موسم بھی بڑا شاندار تھا اور پرانے دوستوں سے ملاقات میں لطف بھی آیا۔ اس طرح کے ذہنی مریض اپنے دعوے میں جھوٹے نہیں ہوتے۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ آج وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا اور اس شہر میں جہاں وہ رہتا ہے دور دور تک سمندر نہیں پایا جاتا، یہ ایک قابل رحم صورت حال ہوتی ہے۔

’تم درست کہتے ہو، آصف نے کہا۔ ہمارے خیال میں بعض اساطیری کرداروں سے متعلق نئے حقائق کی تشکیل بھی اسی زمرے میں آتی ہے ورنہ اہل فکر ہندوؤں پر یہ بات خوب واضح ہے کہ رام کوئی تاریخی کردار نہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ ان کا زمانہ ایک ملین سال پہلے تریٹیاگ کا ہے۔ بعض مورخین چودھویں اور پندرہویں صدی قبل مسیح کو ان کا زمانہ بتاتے ہیں، لیکن کوئی یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ موجودہ ایودھیا واقعی رام چندر جی کا ایودھیا ہے۔ اور جب ایودھیا کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا

مشکل ہو تو ان کی جنم بھومی کی نشاندہی کیسے کی جاسکتی ہے۔ رہا یہ دعویٰ کہ بابرؒ کی مسجد رام چند راجی کی جائے پیدائش پر تعمیر ہوئی ہے تو یہ بات اس لیے بھی درست نہیں کہ تلسی داس نے رام چتر مانس میں اس طرح کی کوئی بات نہیں کہی ہے۔

یہ تلسی داس کس زمانے کے آدمی ہیں؟ ظفر نے پوچھا۔

بولے: 'اسی زمانے کے جب بابرؒ کی مسجد تعمیر ہوئی۔ ۱۵۲۸ء بابرؒ کی تعمیر کا سال ہے۔ اس وقت تلسی داس تیس سال کے جوان رعنا تھے۔ وہ موجودہ ایودھیا میں رہے اور وہیں انھوں نے اپنی شاہکار کتاب رامائن مرتب کی۔ اگر بابرؒ کی مسجد رام کی جائے پیدائش پر وجود میں آتی تو تلسی داس جیسے رام کے معتقد اس تکلیف دہ صورت حال کا تذکرہ کرنے سے نہ چوکتے۔'

یہ سب باتیں تو درست ہیں لیکن اس خلطِ مبحث میں اصل سوال تو کہیں پیچھے رہ گیا۔ تم نے یہ بات تو بتائی ہی نہیں کہ اس دھماکہ خیز صورت حال کے تدارک کے لیے ہمیں کرنا کیا چاہئے۔ میں نے آصف کی انسائیکلو پیڈیا کی معلومات کو کام پر لگانے کی کوشش کی۔

ہاں تم صحیح کہتے ہو۔ آصف تقید و تجزیہ تو بڑی عالمانہ شان کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس فن میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں، مگر یہ مسئلے کا حل نہیں بتاتے۔ ظفر نے چٹکی لینے کی کوشش کی۔

ارے بھئی تحلیل و تجزیے کی بھی کم اہمیت نہیں۔ ڈائیکنا سس اگر درست ہو تو بس یہ سمجھو کہ آدھا علاج تو ہو ہی گیا۔ سجاد نے لقمہ دیا۔

یہ آپ لوگ مجھ سے ہر مسئلہ کا آخر حل کیوں چاہتے ہیں۔ میں نے تو پیسبری کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ بابرؒ کی مسجد کے مسئلہ پر ہمیں وہ کچھ نہیں کرنا چاہئے جو دانستہ یا نادانستہ طور پر ایکشن کمیٹی والے کر رہے ہیں۔ ایک طرف احیاء پرست ہندوؤں کی منصوبہ بندی ہے، برسہا برس کی تیاری ہے اور دوسری طرف ہم اشتعال کے جواب میں اشتعال اور نعروں کے جواب میں جوابی نعروں سے کام چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح تو ہم ان کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے آصف نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ چونک کو اٹھ کھڑے ہوئے اور رخصت کی اجازت چاہی۔ چلئے اقدامی عمل پر پھر کبھی گفتگو ہوگی۔ یہ کہتے ہوئے میں نے دوستوں کو رخصت کیا۔

## بولتی عمارتیں

مکتبہ میں طب یونانی اور ہومیوپیتھی کی کتابوں کا بڑا واقع ذخیرہ تھا۔ میں ان دنوں Hemiplegia سے متعلق ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ بیماری دراصل دماغی چوٹ یا spinal cord کے مجروح ہونے کے سبب ہوتی ہے۔ اگر دماغ کا دایاں حصہ مجروح ہو جائے تو جسم کا باایاں حصہ مفلوج ہو جاتا ہے اور اگر دماغ کا باایاں حصہ مجروح ہو جائے تو وہ جسم کے دائیں حصے کو پیغام نہیں بھیج پاتا۔ مریض کو اس بات کا اندازہ نہیں ہو پاتا کہ اس کا جسم اب اس لائق نہیں کہ دماغ کے فیصلے کو عمل میں لاسکے۔ وہ اٹھنا چاہتا ہے پر اٹھ نہیں پاتا۔ گویا دماغ اپنی پرانی دنیا میں جیتتا ہے اور اسے اپنے جسم کے مفلوج شدہ ہونے کا چنداں احساس نہیں ہو پاتا اور جب اس تلخ حقیقت سے پردہ اٹھتا ہے کہ قوی اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں تو اس پر مایوسی کی شدید کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس بیماری کی تفصیلات پڑھتے ہوئے نہ جانے کیوں میرا ذہن بار بار باری مسجد ایکشن کمیٹی کے ہنگامہ خیز بیانات کی طرف منتقل ہو جاتا۔ ایکشن کمیٹی کے قائدین کے پاس اشتعال انگیز بیانات کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ ایسا لگتا جیسے یہ لوگ Hemiplegia کے شکار ہوں۔ انھیں اس بات کا ذرہ برابر بھی احساس نہ ہو کہ مدت مدید سے ان کے قومی مضحمل اور مفلوج ہیں۔ ان کے بیانات تو ایک طرح کی شعلہ فشانہ سے معمور ہوتے، لیکن عملی اور اقدامی منصوبہ بندی کا سرے سے کوئی ذکر نہ ہوتا۔

آج سجاد کی زبان سے confabulation کا لفظ سن کر ایسا محسوس ہوا کہ بعض طبی اصطلاحیں سماجی اور سیاسی حقائق کو اپنی تمام تر جزویات کے ساتھ کچھ اس طرح مبرہن کر دیتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ انتہا پسند ہندوؤں نے نہ صرف یہ کہ ایک دانشورانہ confabulation کے زیر اثر مفروضہ حقائق کی ایک نئی دنیا تشکیل دی ہے، بلکہ بڑی آسانی سے مظلوم کو ظالم کے مقام پر لاکھڑا کیا ہے۔ آزادی کے بعد سے زندگی کے ہر گوشہ میں مسلمانوں کا گراف مسلسل گرتا رہا ہے، لیکن ان کی شاطر دماغی دیکھنے کہ مسلمانوں کی مظلومیت کی یہ داستان کچھ اس طرح مسخ ہوئی کہ اب اس ملک میں ہر طرف ہندو خطرے میں ہے، کا شور مچا ہے۔ قبضہ انھوں نے ہماری مسجد پر کیا ہے اور پروپیگنڈہ یہ ہے کہ رام لٹا مسجد کے آہنی دروازوں کے اندر محصور ہیں۔

ہندوؤں کو ان کے درشن کی اجازت نہیں۔ ملک بھر میں رتھ یا تراؤں کے ذریعے رام کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دکھایا جا رہا ہے۔ عام بھولے بھالے ہندو اس بات پر ایمان لے آئے ہیں کہ رام اپنے ہی ملک میں قیدی ہیں جبکہ مسلمانوں کی منہ بھرائی کے لیے ایک نئے مسلم خواتین بل لانے کی تیاری ہے۔ میں نے سوچا یہ کیسا ظلم ہے کہ مسلمان جو پچھلے چالیس سال سے اس ملک میں ہر پل موت موت جیتے ہیں، ان ہی کے سر ہندوؤں کی مفروضہ مظلومی کا الزام بھی ڈال دیا گیا ہے۔ اسے کہتے ہیں چانکیہ نیتی۔

ایک دن جب طبیعت میں تازگی اور نشاط کی کیفیت تھی، میں مکتبہ میں جا بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ عبدالمعز والد صاحب کو اے جی نورانی کا کوئی تازہ مضمون پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ وہ چند جملے پڑھتے ہیں اور پھر درمیان میں خوبصورتی سے اپنا تبصرہ بھی ٹانگ دیتے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ دیکھئے بھگوان کے پرکٹ ہونے کی حقیقت سے نورانی صاحب نے کیا خوب پردہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے ایک ریڈیو میسج کا حوالہ دیا ہے جو ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء صبح ساڑھے دس بجے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے کے نائر کی طرف سے چیف منسٹر گوند بلتھ، چیف سکریٹری اور ہوم سکریٹری کو ارسال کیا گیا تھا۔ اس پیغام کا متن کچھ اس طرح تھا:

’چند ہندورات کے وقت بابری مسجد میں اس وقت داخل ہو گئے جب وہ ویران پڑی تھی اور وہاں انھوں نے ایک مورتی نصب کر دی۔ ڈی ایم اور ایس پی اور پولیس فورس موقع پر موجود ہیں، صورت حال قابو میں ہے۔ رات میں حادثے کے وقت پندرہ پولیس والے ڈیوٹی پر تھے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اس کو روکنے کی کوئی خاطر خواہ کوشش نہیں کی۔‘

عبدالمعز نے زور کا قہقہہ لگایا۔ بولے، جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ لطیفہ یہ ہے کہ مقامی تھانے میں پولیس نے جو ایف آئی آر درج کیا ہے اس میں بھی بھگوان کے پرکٹ ہونے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سب انسپکٹر رام دو بے نے ایوڈھیہ پولیس اسٹیشن میں ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو جو ایف آئی آر لکھی ہے۔ اس ایف آئی آر کے مطابق:

’ماتا پرساد کا کہنا ہے کہ جب وہ صبح آٹھ بجے جنم بھومی پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ پچاس ساٹھ لوگ بابری مسجد کے بیرونی دروازے کا تالا توڑ کر یا دیوار پھلانگ کر داخل ہو گئے تھے اور وہاں انھوں نے شری بھگوان رام کی مورتی رکھی اور اندرونی اور بیرونی دیواروں پر گیروئے رنگ سے سینتارام لکھ دیا۔ ہنس راج جو اس وقت ڈیوٹی پر تھے، انھوں نے روکنے کی کوشش کی لیکن یہ لوگ نہ مانے۔ یہ لوگ پی اے سی کی بیٹالین کے پہنچنے سے پہلے ہی مسجد میں داخل ہو چکے تھے۔ صبح ضلعی انتظامیہ جائے وقوع پر صورت حال کا جائزہ لینے پہنچی۔ اس کے بعد پانچ چھ ہزار لوگوں کا مجمع جمع ہو گیا جو بھجن گاتا اور نعرے

بازی کرتا رہا، لیکن اسے روک دیا گیا۔ رام داس، رام شکتی داس اور دیگر پچاس ساٹھ لوگ مسجد میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے اس کے تقدس کو پامال کیا۔ ڈیوٹی پر موجود حکومتی اہلکار اور دوسرے لوگ ان واقعات کے شاہد ہیں، لہذا ان باتوں کو تحریر کیا جاتا ہے اور اسے فائل کیا جاتا ہے۔

اب ان دستاویزی شہادتوں کے بعد وی ایچ پی والے کس منہ سے بھگوان کے پرکٹ ہونے کی بات کریں گے۔ عبدالمعز نے والد صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بولے: اصل معاملہ پرکٹ ہونے کا نہیں۔ یہ باتیں تو عوامی پروپیگنڈے کے لیے کہی جاتی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انہیں مسلم تاریخی عمارتوں کے وجود سے چڑ ہے۔ وہ اسے مسلم تشخص کی علامت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ انہیں ایسا لگتا ہے کہ ملک کے چپے چپے پر یہ عمارتیں ہر لمحہ مسلمانوں کی تاریخی عظمت کو بیان کر رہی ہوں۔ یہ چاہتے ہیں کہ مسلم تشخص کی ان علامتوں کو نیست و نابود کر دیا جائے اور اس کی جگہ ہندو علامتوں اور تاریخی یادگاروں کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ تم دیکھو گے کہ آزادی کے فوراً بعد سے ہی یہ مہم بڑے زور و شور سے شروع ہو گئی تھی۔ سرکاری سطح پر جس طرح سومناتھ کی ترمین کاری کی گئی اس سے تو یہی لگتا تھا کہ ۴۷ء میں اس ملک سے انگریز نہیں گئے بلکہ محمود غزنوی کی حکمرانی ختم ہوئی۔

سیکولر ہندوؤں نے اس نفرت انگیز مہم کی روک تھام کے لیے کچھ نہ کیا؟ میں نے پوچھا۔

بولے: عملاً تو اس پروگرام میں خواہی نحو ای ہندوؤں کا تمام ہی طبقہ شریک رہا۔ کچھ استثنائی مثالیں البتہ ملتی ہیں جیسے بامبری مسجد کے مقتفل کیے جانے کے بعد فیض آباد ضلع کانگریس کے سکریٹری اکتشہ برہمچاری نے اخلاقی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسجد کی اصل حیثیت بحال کرنے کے لیے پر زور کوشش کی۔ نہرو نے بھی صوبائی حکومت سے اس واقعہ کے بعد سخت خفگی کا اظہار کیا، لیکن ان سب کے باوجود عملاً مسجد سے مسلمانوں کو بے دخل کر دیا گیا اور رام لالا کی مورت وہاں استھاپت ہو گئی۔

گاندھی اگر زندہ ہوتے تو شاید صورت حال مختلف ہوتی، میں نے کہا۔

بولے: گاندھی کے لیے یہ ایک بڑا اخلاقی چیلنج ضرور ہوتا مگر وہ بھی کیا کرتے۔ آزادی کے فوراً بعد غالباً یہ نومبر ۱۹۴۷ء کی بات ہے، گاندھی نے برلا ہاؤس کی اپنی دعائیہ مجلس میں دہلی کی ان ۱۳۷ مسجدوں کا تذکرہ کیا تھا، جو یا تو منہدم کر دی گئی تھیں یا پھر انہیں مندروں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ نہرو نے بھی وزیر داخلہ ولہ بھائی پٹیل کو اس صورت حال پر احتجاج کرتے ہوئے ایک خط لکھا تھا، لیکن ان باتوں سے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ آزادی کے بعد سے ہی تنگ نظر ہندوؤں کے لیے مسلمانوں کی تاریخی عمارتیں ایک مسئلہ بنی رہیں۔ یہ عمارتیں صرف اینٹ گارے کا ملغوبہ نہ تھیں۔ ان خالی عمارتوں میں بھی مسلمانوں کی

تاریخ بستی تھی۔ دہلی میں جب مسلمانوں کا قتل و خون جاری تھا، پاکستان سے آنے والے شہرنا تھی ان کے گھروں اور املاک پر قبضہ کر رہے تھے اور جب ان کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہ تھی تب دہلی کے مسلمانوں نے ان ہی تاریخی عمارتوں میں پناہ لی تھی۔ کوئی ڈیڑھ دو لاکھ مسلمان اپنے ہی شہر میں مسلم تاریخی عمارتوں میں پناہ گزیر ہو گئے تھے۔ بہت سے تنگ نظر ہندوؤں کو ایسا لگتا تھا کہ جب تک یہ عمارتیں باقی ہیں اس ملک سے مسلمانوں کا صفایا کچھ آسان نہیں۔

’مگر یہ عمارتیں تو ملک کے چپے چپے میں موجود تھیں۔ ان کے نام و نشان مٹانا بھی کچھ آسان نہ تھا۔ پھر انھوں نے اس مسئلہ کا کیا حل نکالا۔ کیا اس صورت حال سے سمجھوتہ کر لیا؟ عبدالمعز نے پوچھا۔  
بولے: ان عمارتوں کو محض قومی یادگار یعنی National Monument قرار دے ڈالا گیا۔ انھیں ہماری تاریخ سے دانتاً delink کرنے کی کوشش کی گئی۔

اچھا میرا ذہن اب تک ادھر نہ گیا تھا، عبدالمعز نے حیرت سے کہا۔

بولے: ’ہاں اس سلسلے کا سب سے پہلا حملہ تو لال قلعہ پر ہوا جس کی فصیل سے آدھی رات میں نہرو نے جشن آزادی کی پہلی تقریر کی۔ یہ ایک بڑا علامتی اقدام تھا جس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد اب لال قلعہ کی وراثت کے امین نہرو اور اس کے حواری قرار پائے ہیں۔ اس زمانے میں میرٹھ سے ایک انگریزی اخبار ڈان (Dawn) کے نام سے شائع ہوتا تھا، اس میں بعض اہل فکر مسلمانوں نے احتجاجی مراسلے بھی لکھے تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک لال قلعہ ان کی سیاسی اور ثقافتی قوت کا علامہ تھا۔ وہاں جب نہرو نے یونین جیک کو ہٹا کر نئے ہندوستان کا جھنڈا نصب کیا تو اس وقت اہل فکر مسلمانوں کو ایسا لگا جیسے وہ اب انگریزوں کی عملداری سے نکل کر ہندوؤں کی محکومی میں داخل ہو گئے ہوں۔ پتھر کی یہ بے جان عمارتیں سچ پوچھو تو بولنے لگی تھیں۔ حساس دل و دماغ ان آوازوں کو سنتے۔

’اور وہ شعر بھی تو ہے۔ پہلا مصرعہ تو مجھے یاد نہیں:

خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمین  
سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم کے تاجدار  
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار

عبدالمعز نے لقمہ دیا۔

بولے: ہاں تم نے صحیح سمجھا۔ تم نے مولانا آزاد کی تقریر تو سنی ہوگی کہ یہ دیکھو ..... مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں، تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں

جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سپنچی ہوئی ہے۔ آزاد نے اپنی تقریر کے لیے جامع مسجد کی سیڑھیوں کو منتخب کیا۔ وہ ان بولتے میناروں کی آواز بن گئے۔ نئی بدلی ہوئی صورت حال میں جب لال قلعہ کی فصیل پر نہرو کا قبضہ ہو چکا تھا، آزاد نے مناسب جانا کہ مسلمان ایک نئی ابتدا کے لئے جامع مسجد کو اس ملک میں اپنے ملی اسلامی تشخص کے علامیہ کے طور پر استعمال کریں۔

پھر تو آزاد کی اس تقریر پر بڑی لے دے ہوئی ہوگی، تنگ نظر ہندوؤں نے ان کی باتوں کا برا منایا ہوگا؟ عبدالمعز نے کہا۔

بولے: ہاں اس وقت تو دہلی سے مسلمانوں کا انخلاء ہو رہا تھا۔ ان کی ہوا اکھڑ چکی تھی۔ اندیشہ تھا کہ بہت سی دوسری چھوٹی بڑی مسجدوں کی طرح جامع مسجد پر بھی اغیار کا قبضہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہندو ازم کی تصویر بری طرح مسخ ہو جاتی۔ گاندھی اس نکتے سے واقف تھے۔ انھوں نے ستمبر 47ء کی ایک پراثرنا سبھا میں جامع مسجد اور لال قلعہ کی علامتی تاریخی حیثیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا، مجھے اصل الفاظ تو یاد نہیں، ان کی کلیات میں دیکھنا باسانی مل جائے گا، انھوں نے کہا تھا کہ دہلی ملک کا دارالسلطنت ہے جہاں جامع مسجد اور لال قلعہ موجود ہیں۔ یہ مغلوں کی بنائی ہوئی عمارتیں ہیں جو اب ہمارا تاریخی ورثہ ہیں۔ جو لوگ ہندوستان سے مسلمانوں کے نکل جانے کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ ان کے جانے کے بعد جامع مسجد کا کیا کریں گے۔ کیا ہم اس پر قابض ہو جائیں گے۔ ذرا سوچئے یہ کتنی خطرناک بات ہوگی۔ انھوں نے زور دے کر کہا تھا کہ مسلمانوں کا اس تاریخی مسجد پر حق ہے۔ ہم بھی اس کے فن تعمیر پر فخر کرتے ہیں۔ کیا ہم اسے زمیں بوس کر دیں گے؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس زمانے میں گاندھی کی پراثرنا سبھا کے حوالے سے ان کے فرمودات اخبارات کی زینت بنتے رہتے تھے۔ ان ہی دنوں ایک پراثرنا سبھا میں انھوں نے کہا تھا کہ جو لوگ جامع مسجد کو شیو مندر میں بدلنے کا خواب دیکھ رہے ہیں یا جو سکھ اسے گرو دارہ بنانا چاہتے ہیں تو وہ یہ جان لیں کہ ایسا کر کے وہ دراصل ہندو ازم اور سکھ ازم کی قبریں کھود دیں گے۔ کوئی بھی مذہب اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا۔

پھر ان بولتی عمارتوں کے مسئلے کو تنگ نظر ہندوؤں نے کیسے حل کیا؟ عبدالمعز نے پوچھا۔

بولے: ایک تو یہی طریقہ اپنایا گیا کہ انھیں سیکولر قالب میں ڈھال لیا جائے۔ انھیں قومی آثار کے طور پر دیکھا جائے، جن کی جڑیں ہندوستانی قومیت میں ہوں، مسلم شناخت میں نہیں۔

یہ تو خود ایک بہت بڑا کام تھا۔ ساری عمارتوں سے اس کا ثقافتی ماضی کھرچ کر نکالنا، تاریخی پس منظر

سے انھیں آزاد کرنا۔ میں نے اپنی سہولت کے لیے سوال کو کھولنے کی کوشش کی۔

بولے: ہاں اس مقصد کے لیے انھیں عمارتوں کی ترتیب و تنظیم اور ان کے گرد نئے آرائشی ڈھانچے تعمیر کرنے پڑے۔ سب سے پہلے تو ان مسلم عمارتوں کو سیاحتی مقامات کی حیثیت سے نامزد کیا گیا۔ پھر زائرین کی سہولتوں کے لیے ان کے اردگرد انتظامی ڈھانچے تشکیل دیئے گئے۔ اب چونکہ یہ عمارتیں نئے سیکولر ہندوستان کی قومی وراثتوں کی امین سمجھی جاتی تھیں اس لیے اسی تناظر میں ان کی اہمیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ مثال کے طور پر تاج محل کو جو مسلم فن تعمیر کے بہترین نمونے کے ساتھ ہی ایک مقبرہ ہے۔ اس کے اردگرد اسی احاطے میں دوسری قبریں بھی موجود ہیں۔ ایک جانب مسجد ہے۔ گویا ہر اعتبار سے اس کی حیثیت مسلمانوں کے ایک مذہبی اور متبرک مقام کی ہے، لیکن جو لوگ اس کا انتظام و انصرام دیکھتے ہیں اور جو اشتہارات دنیا بھر سے سیاحوں کو یہاں کھینچ لاتے ہیں وہ اسے محض مغل طرز تعمیر کے نفیس ترین نمونے اور عجائب عالم کے ایک نادر شاہکار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

’اب تو بعض لوگ یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ تاج محل دراصل قدیم شیومندر ہے۔ عبدالمعز نے کہا۔

بولے: ہاں یہ ایک دوسری سطح ہے۔ بعض لوگ ہیں جو ان عمارتوں کی نئی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں۔ یہ سب بے سرپرچی کی باتیں ہیں لیکن کیا کیا جائے۔ جھوٹ اگر کثرت سے اور منصوبہ بند طریقے سے بولا جائے تو اس کی گونج بھی، کچھ دیر تک ہی سہی، سنائی تو دیتی ہے۔ ایک صاحب ہیں پی این اوک، یہ سنگھی خیمے کے آدمی ہیں، انھوں نے تاج محل کو تیبو محالیہ یعنی شیومندر ثابت کرنے کے لیے باقاعدہ کوئی کتاب بھی لکھی ہے۔ مگر ان باتوں سے حقیقت کہاں بدلتی ہے۔ عمارتیں آج بھی بول رہی ہیں البتہ انھیں سننے کے لیے حساس دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ یہ کہتے ہوئے ابا نے پہلو بدلا، گھڑی کی طرف نگاہ کی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کھڑے ہوتے، عبدالمعز کہنے لگے یہ جو مغلوں کو اکثر مطعون کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی ساری توجہ لال قلعہ اور تاج محل بنانے پر صرف کر دی، کاش کہ یونیورسٹیاں بنائی ہوتیں تو آج ہمارا حال کہیں بہتر ہوتا، تو اب تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے ان تاریخی عمارتوں کو بنا کر بھی کچھ کم بڑا کام نہیں کیا۔ عبدالمعز کی یہ بات سن کر ابا مسکرائے۔ بولے، یہ سب لغو باتیں ہیں، خاصمانہ پروپیگنڈہ ہے جس کے ہم لوگ شکار ہو گئے ہیں۔ جس ملک میں اتنی عالیشان عمارتیں بن رہی تھیں تو یہ خود اس بات پر دال ہے کہ یہاں علوم و فنون کو ترقی حاصل تھی۔ تعلیمی ادارے ہر میدان کے لیے افراد پیدا کر رہے تھے ورنہ اتنی بڑی ریاست کے انتظام و انصرام کے لیے رجال کار کہاں سے ملتے۔ غیر ملکوں کو اتنے بڑے پیمانے پر مصنوعات کی برآمد کیسے ہوتی جس کے نتیجے میں ملک میں دولت کی ریل پیل ہو گئی تھی۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی بات ایسی

ضرورت تھی جو سلطنت کے زوال کا باعث ہوئی۔ ہمیں اس بات کا ضرور محاکمہ کرنا چاہئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دشمنوں کے پروپیگنڈوں کے زیر اثر اسلامیان ہند کے روشن کارناموں کے سلسلے میں بھی معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر لیں۔ اچھا چلو باتیں بہت ہو گئیں، آج اتنا ہی رکھو۔

عمارتیں کس طرح بولتی ہیں، سرگوشیاں کرتی ہیں اور بقول مولانا آزاد بجران کے لمحات میں مینارے کس طرح اُچک کر سوال کرتے ہیں، اس کا اندازہ مجھے پہلی بار اس وقت ہوا تھا جب ایک سفر کے دوران غیر ارادی طور پر اچانک میری نگاہ آگرہ کے قلعے کی فصیلوں سے جا لکرائی۔ صبح کا جھٹپٹا ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا۔ قلعے کی فصیلیں دھند میں ڈوبی ہوئیں، ایسا لگتا تھا جیسے مجھ سے ایک زمانہ کی بات کہہ رہی ہوں، جیسے صدیوں کی تاریخ مرصع ہو کر نگاہوں کے سامنے آگئی ہو۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

تب قلعے کی فصیلوں سے گزرتے ہوئے میرے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی تھی۔ اب جو اباً نے ان بولتی عمارتوں کا تذکرہ کیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ بجران کے لمحات میں یہ تاریخی عمارتیں بظاہر بے جان ہونے کے باوجود ہمارے لیے جذباتی سہارا فراہم کرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ ہمارے فطری مسکن ہوں جنہوں نے ہر لمحہ اپنا آغوش ہم پر وا کر رکھا ہو۔



سال ۲۰۰۵ء میں قومی پریس میں یہ شور اٹھا کہ مسلمان تاج محل جیسے قومی اور سیکولر ورثے کو جسے World Heritage کی حیثیت بھی حاصل ہے، ایک اسلامی علامت کے طور پر دیکھنے کی تنگ نظری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس شور کا پس منظر یہ تھا کہ ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد، جسے انتہا پسند ہندو غلامی کی یادگار کے طور پر دیکھتے تھے، مسلمانوں میں اپنی تاریخی عمارتوں کے سلسلے میں سخت تشویش پائی جاتی تھی۔ ایودھیا کی طرح کاشی اور متھرا کی مسجدیں بھی نشانے پر تھیں۔ کوئی کہتا کہ دہلی کی جامع مسجد دراصل شیو کا قدیم مندر رہا ہے اور کوئی تاج محل کو شیو یا کالی کا مندر بتاتا۔ اس ہنگامی صورت حال میں یوپی وقف بورڈ کے ذمہ داروں نے سوچا کہ کیوں نہ تاج محل کو وقف املاک کی حیثیت سے رجسٹر کرا لیا جائے۔ ۲۰۰۴ء میں فیروز آباد کے محمد عرفان بیدار نے الہ آباد ہائی کورٹ میں اس سلسلے میں مفاد عامہ کی ایک عرضی دائر کی۔ عرفان ۱۹۹۸ء میں ہی سنی وقف بورڈ کو ایک عرضداشت پیش کر چکے تھے، جس میں انہوں نے وقف بورڈ سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ تاج محل کے متولی کی حیثیت سے اس کی نگہداشت کا کام اپنے ذمہ لے لے۔ کورٹ نے وقف بورڈ کو اس سلسلے میں ضروری اقدامات کی ہدایات دیں۔ وقف بورڈ نے اس سلسلے میں شواہد اکٹھا کیے۔ بادشاہ

نامہ جو عبدالحمید لاہوری کی تصنیف ہے اور جس کا سال تصنیف ۱۶۲۹ء تا ۱۶۳۲ء ہے، اس میں اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ شاہجہاں نے تاج محل اور اس سے متعلقہ اراضی اور عمارتوں کو ایک وقف کی حیثیت سے قائم کیا تھا۔ ویسے بھی تاج محل کمپلیکس میں اصل مقبرہ یعنی تاج محل کے علاوہ مختلف قبریں ہیں، مسجد ہے اور تقریباً ساڑھے تین سو سالوں سے شاہجہاں کے عرس کی تقریبات بھی منعقد ہوتی رہی ہیں۔ یہ سب باتیں تاج محل کو ایک مسلم وقف کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لیے کافی ہونی چاہئے تھیں۔ لیکن بورڈ کے چیئرمین حافظ عثمان نے جیسے ہی رجسٹریشن کی کارروائی مکمل کی اور وقف کے متعینہ اصولوں کے تحت اس کے انتظام و انصرام کو اپنے ہاتھ میں لینے کا ارادہ ظاہر کیا، نام نہاد قومی پریس میں ایک بھونچال کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ عثمان کو اس بات پر مطعون کیا جانے لگا کہ انھوں نے ایک قومی تاریخی علامت کو فرقہ وارانہ چشمے سے دیکھنے کی غلطی کی ہے۔ اے ایس آئی جس کے انتظام و انصرام میں اس وقت تاج محل کا نظام ہے، وہ فی الفور سپریم کورٹ جا پہنچا۔ کورٹ نے وقف بورڈ کے رجسٹریشن کو بالآخر التوا میں ڈال دیا اور اس طرح ایک مسلم مقبرے سے نکلنے والی شوکت و عظمت کی داستان نام نہاد سیکولر قومی ورثے کی حصار میں گھٹ کر رہ گئی۔

اس واقعہ کے برسوں بعد جب ملک میں کانگریس کی Muslim Appeasement (بمعنی مسلم دشمنی) کا دور جا چکا تھا اور نریندر مودی کی قیادت میں ملک بھر میں ہندو راشٹر کا غلغلہ بلند تھا، مسی کی ایک تپتی سہ پہر میں ایک ہندو دھرم گرو میرے دفتر تشریف لائے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار ہندو۔مسلم مفاہمے کی تجاویز لے کر آتے رہے تھے اور متعدد ملاقاتوں کے سبب ان سے ایک طرح کی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ بات بابری مسجد قضیہ کے پرامن حل پر چل نکلی۔ کہنے لگے اس بات کا تو میں بھی قائل نہیں کہ مسلمانوں کی تاریخی عمارتوں اور مذہبی علامتوں کے بلے پر ہندو مندروں کا قیام ہو مگر مسئلہ یہ ہے کہ عام ہندو جب مسلم تاریخی عمارتوں کو دیکھتا ہے، جب وہ لال قلعہ اور تاج محل کے قریب سے گزرتا ہے تو اسے ایسا لگتا ہے کہ وہ آزاد بھارت میں بھی بونا ہو کر رہ گیا ہو، جیسے اس کا دھارمک ویکتو مسلمانوں کے مقابلے میں چھوٹا ہو۔

’مگر ایسا تو اس لئے ہے نا کہ ہندوؤں کا ایک طبقہ مسلم عہد حکومت کو ہندوستانی تاریخ کا روشن باب ماننے کے بجائے مسلم حکمرانوں کو بیرونی مداخلت کے طور پر دیکھتا ہے۔‘

جی ہاں! بالکل، آپ نے صحیح کہا۔ اسی طرز فکر نے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ خلیج پیدا کر دی ہے۔ اس تاریخ نویسی کی ابتدا تو انگریزوں نے کی، لیکن رفتہ رفتہ یہ ہمارے طرز فکر میں سرایت کر گئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلم عہد حکمرانی کی عمارتیں ہندوؤں کے بعض طبقات کو غلامی کی نشانیاں معلوم ہوتی ہیں۔

’بعض طبقات کو؟ ہمارے خیال میں تو اس تاریخ نگاری نے بڑے بڑے ہندو دانشور اور نام نہاد

سیکولر رہنماؤں کے دل و دماغ کو مسموم کر رکھا ہے۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد ہی جس طرح سومنات کی تعمیر نو کی تحریک شروع ہوئی اور عین سرکاری سرپرستی میں گاندھی، ٹیل، راجندر پرساد اور کے ایم منشی جیسے اساطین نے اس احیائی منصوبے میں جوش و خروش سے حصہ لیا اس سے تو اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نئے ہندوستان کے سلسلے میں ان حضرات کا خواب کیا تھا۔

بولے: دیکھئے ایک ہوتی ہے عمارت اور ایک ہوتی ہے اس کی سیاست۔ مسلم حکمرانوں نے جا بجا ایسی پر شکوہ عمارتیں تعمیر کر دیں جو آج بھی ناظرین کو ہر لمحہ ان کے جاہ و حشم کا احساس دلارہی ہیں۔ آزادی کے بعد مغلوں کی تعمیر کردہ دہلی اور انگریزوں کی تعمیر کردہ عمارتوں کو نیا قالب دینے کی کوشش ضرور کی گئی، ناموں کی تبدیلی بھی ہوئی مگر مجموعی منظر نامے سے مسلم عہد کی علامتوں کو محو نہ کیا جاسکا۔ اس کا قلیق اونچی ذات کے ہندوؤں کو بھی ہے اور پس ماندہ ذات کے دلت رہنماؤں کو بھی۔ بلکہ میرے خیال میں یہ جو رام مندر کا قضیہ ہے اس کے پیچھے بھی دراصل ایک ہندو ثقافتی اور سیاسی علامت کی تشکیل کی کوشش ہے۔ ابھی پچھلے سال گجرات میں سردار پٹیل کا فلک بوس مجسمہ تکمیل کو پہنچا ہے، دہلی میں لال قلعہ اور جامع مسجد کے مقابلے میں اکشر دھام مندر ایک نئے سیاحتی مقام کی حیثیت سے ابھرا ہے۔ یہ سب دراصل عمارتوں کی سیاست ہے۔ عوامی چہل پہل کے مقامات پر اپنے وجود کو منوانے کی کوشش ہے۔

’جہنا کے کنارے، اکشر دھام سے کوئی چھ سات کیلومیٹر کی دوری پر، دلت پریرنا استھل کے نام سے ایک اور زیارت گاہ بھی تو وجود میں آگئی ہے، میں نے اپنے غیر مسلم مہمان کو کریدنے کی کوشش کی۔

بولے: جی ہاں! دلتوں نے اس سلسلے میں بڑی سبک رفتاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ صرف نوئیڈا میں ہی نہیں، لکھنؤ میں بھی دلت پریرنا کنڈر کے نام سے ایک زیارت گاہ کی استھاپنا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ میں ایک امبیڈکر میموریل بھی قائم ہوا ہے جہاں امبیڈکر کا ایک قد آور مجسمہ دور سے ہی راہ گیروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ اور یہ ساری تعمیرات مایاوتی کے عہد حکومت میں ہوئی ہیں۔ دلتوں کو بھی تو آخر اپنے جاہ و حشم کے اظہار کا موقع چاہیے۔

’تو گویا تعمیرات کی اس دلت سیاست کے پیچھے گہرے معانی پوشیدہ ہیں؟‘

بولے: بالکل! حضرت گنج میں جہاں گاندھی کا ایک پرانا مجسمہ نصب چلا آتا تھا اب وہیں اس کے قریب میں امبیڈکر کا ایک دیوہیکل اور نفیس مجسمہ آویزاں کر دیا گیا ہے۔ اس طرح امبیڈکر اور گاندھی کی ازلی جنگ شاہراہ عام پر آگئی ہے۔ اتر پردیش میں امبیڈکر اپنے مجسموں کی کثرت کے سبب گاندھی سے کہیں زیادہ مقبول اور جاوداں نظر آتے ہیں۔ مایاوتی چار مرتبہ اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ رہیں، انھوں نے اور کچھ کیا ہو یا نہ

کیا ہو، اس پورے عرصہ میں انھوں نے عوامی مقامات پر دلت قبضے کی مہم پوری تندہی سے جاری رکھی۔ اور اب احیاء پسند ہندو اس مہم میں آگے آگے ہیں، لیکن کیا وہ ایک فلک بوس رام مندر کی تعمیر سے اس ملک کا جغرافیائی اور ثقافتی منظر نامہ واقعی بدل سکتے ہیں؟ میں نے اپنے مہمان سے پوچھا۔

بولے: رام مندر تو اب جمہور ہندوؤں کے لئے آستھا کا معاملہ بن گیا ہے، اسے تو یہ لوگ اپنے فتح کی علامت کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا اصل منصوبہ تو دراصل راجدھانی دہلی کی تقلیب نوکا ہے جسے سنٹرل ویسٹا (central vista) کا نام دیا گیا ہے۔ نئے ہندوستان کی نئی راجدھانی جس پر انگریزوں اور مغلوں کی تعمیراتی چھاپ کے بجائے ویدک بھارت کی شہر مہورت کا سایہ ہو۔

اپنے مہمان کی اس بے تکلف گفتگو نے مجھے ان کا بڑی حد تک گرویدہ کر دیا۔ میں نے سوچا یہ حضرت سچ ہی تو کہتے ہیں، سنٹرل ویسٹا بی جے پی کے لئے پریرنا کنڈر سے کم اہم نہیں۔ عوامی منظر نامے پر قبضے اور دہلی کی نظری اور تاریخی تقلیب کا اس سے نادر موقع اور کیا ہو سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلم دہلی کی تاریخی عمارتیں اور برطانوی عہد کی تعمیرات، نئے ہندو سمرات کی تعمیراتی بیوند کاری سے کس طرح اپنا مکالمہ اور مناقشہ جاری رکھتی ہیں۔

## بے نام حادثہ

ایک دن مکتبہ میں مجلس بزرگاں آراستہ تھی۔ بات بابری مسجد کے قضیے پر چل رہی تھی۔ عبدالمتین صاحب جو ابا کے پرانے دوستوں میں تھے بولے: حافظ صاحب! بابری مسجد کے اندر اچانک راتوں رات رام لالا کے پرکٹ ہو جانے کو لوگ تمسخر میں اڑا دیتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے اندھ و شواس کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک ایسا جنونی مذہبی فاشزم ہے جس کی نظیر ظلم و جبر کی معلوم تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ بھلا بتائیے ایک لغو اور بے بنیاد خیال کو روحانی اور اخلاقی جواز عطا کرنے کی ترکیب کسے سوچھی ہوگی۔

’جی ہاں اگر یہ دلیل مان لی جائے تو پھر تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔‘ مولانا افتخار صاحب نیا رپوری نے تائید کی۔ بولے: حد تو یہ ہے کہ دور درشن عین سرکاری سرپرستی میں ایک مذہبی جنون کی آبیاری میں شب و روز مشغول ہے اور حکومت کہتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ شریعت کی حفاظت کے لیے وہ پارلیامنٹ میں نفقہ مطلقہ کے بارے میں نیا قانون لا رہی ہے۔

’طرفہ یہ کہ بورڈ کے علماء راجیوگانڈھی کو مسلمانوں کا بھی خواہ سمجھتے ہیں۔ انھیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ بابری مسجد کا تالا بھی تو راجیوگانڈھی کی ایماء پر کھولا گیا ہے۔‘ عبدالمتین صاحب نے صورت حال واضح کرنے کی کوشش کی۔

مگر کانگریسی علماء تو اب بھی راجیوگانڈھی کی اسلام پسندی اور معاملہ فہمی کے گن گارہے ہیں۔ ذکی صاحب نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ ارون نہرو نے یہ بات صاف کر دی ہے کہ مسلم خواتین بل پیش کرنے سے مسلمانوں کی جو منہ بھرائی ہوئی ہے اس میں توازن قائم کرنے کے لیے ہی دراصل راجیوگانڈھی نے بابری مسجد کا تالا کھلوا یا ہے۔ آپ نے ارون نہرو کا وہ بیان نہیں پڑھا کہ جب انھوں نے یوپی کے چیف منسٹر سے پوچھا کہ بابری مسجد کا تالا کس کی ایماء پر کھولا گیا تو ان کا جواب تھا کہ یہ بات تو وزیر اعظم سے پوچھئے۔ اور جب انھوں نے وزیر اعظم سے اس بارے میں استفسار کیا کہ دور درشن پر مسجد کا تالا کھلنے اور رام لالا کے درشن کے مناظر کو اس طرح قومی سطح پر کس کی ایماء پر براڈ کاسٹ کیا جا رہا ہے تو وہ کوئی

واضح جواب دینے کے بجائے صرف مسکرا کر رہ گئے۔

حالات مسلسل دھماکہ خیز ہوتے جا رہے ہیں۔ ابا نے تشویش کا اظہار کیا۔ بولے: عوامی جوش و خروش کے اس سیلاب میں اب تو ایسا لگتا ہے کہ معاملہ حکومت کے ہاتھ سے بھی نکل گیا ہے۔

’پتہ نہیں یہ اونٹ آ خر کس کروٹ بیٹھے گا‘ عبدالمتمین صاحب نے کہا۔

’اونٹ اگر ایک بار بیٹھ جائے تو غنیمت سمجھئے، پھر نئی منصوبہ بندی کے لیے کچھ تو موقع مل جائے گا۔ یہاں تو مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی بیخ کنی کا یہ سلسلہ روکے نہیں رکتا۔ آزادی کو چالیس سال ہونے کو آئے، ہر روز ایک نئی مصیبت، ظلم کا ایک نیا انداز، کچھ چھن جانے کا نیا احساس۔ ملی گراف کے اس زوال کو آخر کیا نام دیا جائے۔ یہ لوگ اس ملک سے ہمارے تاریخی آثار بھی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اب تو لگتا ہے کہ عین حکومتی سرپرستی میں ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو برا بیچتے کرنے کی جو تحریک چلائی جا رہی ہے تو اب اس ملک میں مسلمانوں کو امن و عافیت کی کوئی صبح نصیب نہ ہوگی۔‘

جی ہاں اور غضب تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک ایسے وزیر اعظم کی ایماء پر ہو رہا ہے جسے بورڈ کے علماء کا اعتماد حاصل ہے۔ واقعی بڑی ہلا مارنے والی صورت حال ہے۔ ہماری محرومیوں اور حرماں نصیبیوں پر بھی منہ بھرائی کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ ہمارے علماء و دانشور حکومت کی منافقت کو معاملہ فہمی سے تعبیر کر رہے ہیں، حتیٰ کہ ضعف کے اس لمحے میں نئے بل کے حوالے سے فتح عظیم کا احساس پایا جاتا ہے۔ کتنی اذیت ناک ہے یہ صورت حال۔ خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد۔ افتخار صاحب نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا۔

جی ہاں! امر واقعہ تو یہی ہے کہ ہماری موت موت زندگی پر دستوری، جمہوری تحفظات اور مسلمانوں کی منہ بھرائی کا ایک ایسا خوشنما گنبد قائم کر دیا گیا ہے کہ ہماری آہ و کراہ اور چیخ و پکار اسی گنبد میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ باہر والوں کو اصل صورت حال کا کچھ بھی اندازہ نہیں ہو پاتا۔ کاش کہ اس اذیت ناک کیفیت کو کوئی نام دیا جاسکتا جس میں ہندوستانی مسلمان گذشتہ چالیس برسوں سے گرفتار ہیں، ابا نے کہا۔

نام کچھ بھی دیں، صورت حال کی سنگینی تو ہم سب پر واضح ہے۔ تعذیب اور گھٹن کی ایک ایسی صورت حال جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں۔

نام کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ جب تک اس صورت حال کو کوئی مناسب نام نہ دیا جائے لوگوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ ہم کس صورت حال سے دوچار ہیں۔ نازی جرمنی میں جب یہودیوں کو نسل کشی کا سامنا تھا تو انھوں نے اس عمل کے لیے anti-semitism اور pogrom جیسے الفاظ کا سہارا لیا۔ لیکن ظلم جس پیمانے پر ہوا تھا اس کے اظہار کو یہ الفاظ کفایت نہ کرتے تھے۔ سو پندرہ بیس سال کی محنت شاقہ کے بعد تجزیہ نگاروں نے

اہل یہود پر ہونے والے مظالم کے لیے holocaust کا لفظ منتخب کیا۔ اب یہ لفظ کثرت استعمال کے سبب نازی جرمنی میں اہل یہود پر ہونے والے مظالم کے لیے کچھ اس طرح مختص ہو کر رہ گیا ہے کہ ہولوکاسٹ کا لفظ آتے ہی ایک ایسی بربریت کا تصور ذہن میں آتا ہے جس کی نظیر نہ اس سے پہلے ملتی ہو اور نہ اس کے بعد۔ اسی طرح فلسطینیوں پر ۱۹۴۸ء میں ریاست اسرائیل کے وجود میں آنے کے بعد جو کچھ گزری اس نے ان کی زندگیوں کو پوری طرح تہہ و بالا کر دیا۔ تب سے امن و سکون کی کوئی صبح ان کے حصے میں نہ آئی۔ فلسطینی اس صورت حال کو نکتہ سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی ایک ایسی صورت حال جس میں سب کچھ تباہ ہو جائے۔ اب نکتہ کا لفظ آتے ہی فلسطینیوں پر گزرنے والی اذیت ناک صورت حال اپنے تمام تر ابعاد کے ساتھ نگاہوں میں روشن ہو جاتی ہے۔ دیرلین میں بے گناہ فلسطینیوں کا قتل عام، ان کے گھروں اور ان کی زمینوں سے ان کے جبری انخلاء، معصوم بچوں کی چیخ و پکار اور بے بس عورتوں کی آہ و بکا کا منظر سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں پر جو کچھ گزر رہی ہے اس کے بیان کے لیے تو ہم اب تک کوئی لفظ ایجاد کرنے سے قاصر رہے ہیں، ہے نایہ بے بسی کی انتہا۔ ابانے سلسلہ گفتگو کو دراز کرتے ہوئے کہا۔

بولے: یہاں تو بڑے سے بڑے قتل عام کو بھی فساد کے پردے میں چھپا دیا جاتا ہے، جیسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں ٹکرا جاتے ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوتی۔ مسلم اسپین میں بھی جہاں مسلمان قتل و غارت گری اور جبری انخلاء کے شکار ہوئے وہاں بھی ان کی تاریخی عمارتیں بڑی حد تک محفوظ و مامون رہیں۔ غرناطہ کے محلات اور مسجدوں سے آج بھی مسلم اسپین کی داستان عظمت سنائی دیتی ہے، لیکن ہمارا عذاب تو کہیں دو چند ہے۔ انہیں ہماری تاریخی عمارتیں بھی گوارا نہیں۔ یہ اسے ایام غلامی کے داغ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے ہیں۔ پھر اس صورت حال کا کیا نام دیا جائے جو اذیت کی تمام معلوم شکلوں سے کہیں بڑھ کر ہے اور جس کا سلسلہ روکے نہیں رکنا، مبادا تجزیہ نگار رک کر جائزہ لے اور اسے کوئی مناسب نام دے سکے۔

اس دن ابا کی زبان سے یہ نکتہ سن کر مجھ پر حیرانی کی ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی تھی۔ تب سے اب تک مجھے مختلف بلاد و امصار میں جانے کا موقع ملا۔ علماء و دانشوروں کی صحبتوں میں بیٹھا۔ تاریخ و تہذیب کے تفہیم و تجزیے میں مصروف رہا۔ زبانوں کے بننے بگڑنے اور نئی اصطلاحوں کی ایجاد و اختراع پر مطلع ہوا، لیکن علم و عرفان کے ہفت خواں طے کرنے کے بعد بھی جب میں ایک دن اپنے شفیق استاد اور بے تکلف دوست وقار حسین کی مجلس میں بیٹھا تھا اور بات اس تعذیب دائمی کے ادراک پہ چل نکلی تو ایسا لگا کہ میرے برسہا برس کی علمی ریاضت، تحلیل و تجزیے کی قوت اور لغت ہائے حجازی کی وسعت بھی اس کیفیت کے لیے کوئی صحیح اور مناسب لفظ وضع کرنے سے قاصر ہو۔

## ۴۰ خفیہ سرکلر

میری صحت اب اللہ کے فضل سے پوری طرح بحال ہو چکی تھی۔ خیال آیا کیوں نہ اس سال گرمی کے موسم کو برطانیہ کے علمی سفر کے لیے استعمال کیا جائے، مگر ابھی علی گڑھ میں بہت سے کام بنانے تھے۔ ایم فل کا زبانی امتحان سر پر تھا۔ والدین سے رخصت لے کر علی گڑھ پہنچا۔ اندازہ ہوا کہ طلباء میں بابرئ مسجد کے سلسلے میں بے چینی بلکہ اشتعال اور سراسیمگی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان چند ماہ میں جب سے بابرئ مسجد کے دروازے رام لہا کے درشن کے لیے کھول دیے گئے تھے، یوپی اور دہلی میں مختلف قسم کی ایکشن کمیٹیاں وجود میں آگئی تھیں، ان میں سے بیشتر علی گڑھ کے سابق طالب علموں نے بنائی تھیں اور وہ بجا طور پر یونیورسٹی کیمپس سے اپنے انصار و اعوان کی فراہمی کے خواہاں تھے۔ ان ایکشن کمیٹیوں کے قائدین اپنے گرما گرم بیانات اور شعلہ فشاں عزائم کے اظہار میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے تھے۔ مقابلہ سخت تھا اس لیے کہ پریس ان ہی بیانات کی سرخیاں بناتا جن میں جذبات کو مشتعل کرنے کے زیادہ امکان پائے جاتے تھے۔ لکھنؤ میں مظفر حسین کچھوچھوی کی قیادت میں جو ایکشن کمیٹی تشکیل پائی تھی اس میں اعظم خان اور ظفر یاب جیلانی کے نام نمایاں تھے۔ اول الذکر نے آگے چل کر سماج وادی پارٹی کے اساطین کے طور پر شہرت حاصل کی اور آخر الذکر پرسنل لاء بورڈ کے شرعی اور اسلامی وکیل کی حیثیت سے سامنے آئے۔ ان ہی مظفر حسین کچھوچھوی نے اپنے ایک دھمکی آمیز بیان میں کہا تھا کہ اگر بابرئ مسجد مسلمانوں کو فی الفور واپس نہ کی گئی تو ایکشن کمیٹی لاکھوں مسلمانوں کا جلوس لے کر مسجد کی بازیابی کے لیے ایودھیا جائے گی۔ اور اگر ہمیں اس عمل پر مجبور کیا گیا تو لوگ جان رکھیں کہ اس جلوس کے راستے میں آنے والا کوئی بھی مندر محفوظ نہیں رہے گا۔ اس طرح کے بیانات سے مسلم اکثریتی آبادی کے علاقوں میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ دوسری طرف ذرائع ابلاغ میں یہ تاثر پیدا ہو رہا تھا کہ مسلمان شاہ بانوقصیے میں حکومت کی منہ بھرائی سے حوصلہ پا کر اب اکثریتی طبقے کو کھلی دعوتِ مبارزت دے رہے ہیں۔ دہلی میں جاوید حبیب نے ایکشن کمیٹی کا علم تمام رکھا تھا۔ ادھر جامع مسجد کے منبر سے عبداللہ بخاری کی خطیبانہ گھن گرج مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

سید شہاب الدین، جو جنتا پارٹی کے عہد میں سیاست میں داخل ہوئے تھے اور اب مسلم انڈیا کے مدیر کی حیثیت سے خود کو مسلمانوں کا لائق ترین ترجمان سمجھتے تھے، وہ بھلا قیادت کی اس دوڑ میں پیچھے کیوں رہتے۔ انھوں نے بھی بھانت بھانت کی ایکشن کمیٹیوں کو ایک رابطہ کمیٹی میں پروانے اور اس کی قیادت پر خود کو متمکن کرنے کا پروگرام بنا لیا۔

ایکشن کمیٹی بنیادی طور پر علی گڑھ کے نوآموز اور جواں سال قائدین کا پروجیکٹ تھا۔ لیکن اپنے اشتعال انگیز بیانات کے سبب قومی میڈیا انھیں مسلمانوں کے ترجمان کی حیثیت سے پیش کر رہا تھا، حتیٰ کہ بورڈ کے سکے بند قائدین بھی جو تحفظ شریعت کی ہیجان انگیز تحریک کے سبب وزیر اعظم سے بار بار بلا تکلف ملاقاتیں کرتے اور قومی میڈیا انھیں خاطر خواہ اہمیت دیتا، وہ بھی ایکشن کمیٹی کے اشتعال انگیز بیانات کے سبب حاشیے پر چلے گئے تھے۔ مولانا علی میاں مسجد کے مسئلے پر کوئی عوامی تحریک چلانے کے حق میں نہ تھے، مگر ان کی اب سنتا کون تھا؟ تحفظ شریعت کے حوالے سے انھوں نے جس طرح ایک عوامی تحریک کی قیادت کی تھی اس کی بنیاد بھی جوش و خروش اور معاملہ فہمی سے خالی اتباع قیادت پر رکھی گئی تھی۔ کل شریعت کے نام پر اگر لاکھوں لوگ سڑکوں پر نکل سکتے تھے تو آج خانہ خدا کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے انہیں کون روک سکتا تھا۔ رہی بات تحلیل و تجزیے کی تو اس کا نہ کل رواج تھا اور نہ آج کوئی موقع۔ ایک ہیجان انگیز عوامی تحریک کے غبارے میں شریعت کے نام پر جو ہوا بھری گئی تھی، مسجد کے قائدین نے اس جوش و خروش کو اپنے حق میں استعمال کر لیا۔ یونیورسٹی کیمپس پر اس صورت حال کا اثر فطری تھا۔ نوجوانوں کے جذبات کا ایک آتش فشاں تھا جو کسی لمحے بھی پھٹ سکتا تھا۔ اس صورت حال کے ازالے کے لیے میں نے اپنی سی سی شروع کر دی۔ اس سلسلے میں سینئر طلباء سے تبادلہ خیال کیا گیا پھر خیال آیا کیوں نہ اس مہم میں نئے شیخ الجامعہ کو بھی شامل کر لیا جائے۔ اب تک نئے وائس چانسلر سید ہاشم علی سے میری کوئی باضابطہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ملاقات کا وقت طے پایا اور ہم پندرہ بیس سینئر طلباء نے ان کی چائے کی دعوت قبول کر لی۔

دی سی لاج میں اب فرنچیز کی ترتیب بدل چکی تھی۔ بائیں طرف لمبی راہداری میں جہاں سید حامد صاحب ایک چھوٹی سی میز پر اپنا دفتر جماتے تھے وہاں اب ایک بڑی کانفرنس میز آویزاں تھی، جس کے ارد گرد پندرہ بیس کرسیاں پڑی تھیں۔ ہم لوگ وقت مقررہ پر دی سی لاج جا پہنچے۔ ابھی ہم لوگ اپنی نشستوں پر پوری طرح براجمان بھی نہ ہوئے تھے کہ عقبی دروازے سے ہاشم علی صاحب کی بھاری بھر کم اور وجیہہ شخصیت طلوع ہوئی۔ مرکزی کرسی پر انھوں نے اپنی نشست سنبھالی اور چھوٹے ہی کہنے لگے: ہاں تو آپ لوگ مجھے

بتائیے، which rules you want me to break? وہ غالباً یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ سینئر طلباء کا یہ وفد مطالبات کا کوئی محضر نامہ لے کر آیا ہوگا۔ امتحانات، داخلے یا ہاسٹل کے کچھ مسائل، اس سے بڑھ کر اسٹوڈنٹ لیڈرس آخر سوچ بھی کیا سکتے ہیں۔ انھیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ ہم لوگ بابر می مسجد کے مسئلہ پر طلباء اور نوجوانوں میں پیدا ہونے والی بے چینی اور مستقبل کے حوالے سے پیدا ہونے والی بے یقینی کے مداوا کے لیے ان کے پاس آئے ہیں اور یہ کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اپنی اس فکر میں انھیں بھی شریک کریں۔ ہماری یہ باتیں سن کر ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بولے: آپ لوگوں کی آمد سے پہلے اساتذہ کا ایک وفد آیا تھا، جس نے آپ لوگوں کو مطعون کرنے اور محوِ شر باور کرانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہاں کے بیشتر اساتذہ کام چور ہیں، نکتے اور حرام خور ہیں۔ سیاست کرتے ہیں یہ سب۔ کاش کہ انھیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا۔ یہ کہتے ہوئے سید ہاشم علی کرسی سے اٹھے، اندرونی کمرے سے ٹائپ شدہ اوراق کی ایک فائل لے کر آئے۔ بولے: میں تو خود اس نظام کا زخم خوردہ ہوں۔ آزادی کے ابتدائی دنوں کی بات ہے، میں اس وقت بیوروکریسی کا حصہ تھا۔ حکومت ہند نے ایک خفیہ سرکلر جاری کیا تھا کہ کسی مسلمان کو اہم اور حساس عہدوں پر نہ رکھا جائے۔ میں نے پوچھا: اس سلسلے میں کسی حوالے یا شواہد کی آپ نشان دہی کر سکیں تو عنایت ہوگی۔ بولے: میں نے اس بات کا تذکرہ اپنے اس مضمون میں کیا ہے اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنے تازہ مقالے کی ایک کاپی مجھے عنایت کر دی۔ مضمون قومی یکجہتی کے موضوع پر تھا۔ ابتدائی سطروں میں مصنف نے اپنی بیالیس سالہ سرکاری خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات کا اعادہ کیا تھا کہ قومی یکجہتی کی حیثیت ایک خیالِ عبث کی ہوگی اگر ہندوستان کے ہر شہری کو احساسِ تحفظ حاصل نہ ہو، وہ اگر اپنے آپ کو ملک کا باوقار شہری محسوس نہ کرے، امورِ ملکی میں شراکت داری کا اسے موقع نہ ملے اور قومی زندگی میں اس کی چلت پھرت دکھائی نہ دیتی ہو۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے بی ایچ یو کے وائس چانسلر کو لکھے گئے اس مکتوب کا بھی تذکرہ کیا تھا جس میں انھوں نے ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو علی گڑھ کے ساتھ مل کر علماء و اساطین فن کا ایک مشترکہ محاذ بنانے کی دعوت دی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ دھماکہ خیز صورت حال میں جو اب سیاست دانوں اور مذہبی رہنماؤں کے کنٹرول سے باہر ہوتی جا رہی ہے، یونیورسٹی کے اساتذہ کو اہم رول ادا کرنا چاہئے۔ مقالے میں پی اے سی کے مسلم دشمن رویے کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا اور قومی یکجہتی کونسل سے اس بات کی شکایت کی گئی تھی کہ ہر فساد کے موقع پر مسلمان پولیس کی زیادتیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ فساد کے بعد مقدمات میں بھی وہی پھنسائے جاتے ہیں اور اس صورت حال کو حکومتی مشنری نے جان بوجھ کر روا رکھا ہوا ہے۔ قومی یکجہتی کونسل

بھی مسلمانوں کی اشک شوئی کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھانے سے قاصر رہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ کل اگر ایک خفیہ سرکلر مسلمان افسروں کو حساس عہدوں پر تعیناتی سے روک سکتا تھا تو آج جب اس سرکلر کی شاعت ہر خاص و عام پر واضح ہو گئی ہے، ایک ایسا سرکلر کیوں جاری نہیں ہوتا جو اس نظام میں مسلمانوں کے اعتماد کو بحال کر سکے۔ ہاشم صاحب سے اس کے بعد بھی میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ صاف دل کے سیدھے سچے اور کھرے آدمی تھے۔ اپنی بات بے لاگ لپیٹ کہتے جو علی گڑھ کی نیاز مندانہ فضا میں بسا اوقات اجنبی اور غیر مانوس معلوم ہوتی۔

## ۴۱ آتشِ نمرود

لندن کا مجوزہ سفر اب بھی دل و دماغ پر حاوی تھا۔ ایک طرف ملک کی ہيجان انگيز صورت حال اور دوسری طرف علمی زندگی کی ہفت خوانیاں، لیکن سفر کب کیا جائے اس بارے میں حيص بیص کا شکار تھا۔ ایک شب عشاء کی نماز کے بعد مصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے غور و فکر کر رہا تھا کہ اونگھ کی کیفیت طاری ہوئی۔ نیم بیداری اور نیم خوابیدگی کے اس عالم میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں اور دوران نماز میرے قدم کعبہ مشرفہ کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ مجھ پر ایک عالم وارفتگی طاری ہے، یہاں تک کہ میرے قدم حطیم سے آگے بڑھ کر مقام ابراہیم تک جا پہنچے ہیں۔ اب کعبہ پیچھے ہے اور میری نماز آگے۔ کوئی شخص مجھے اس صورت حال پر مطلع کرتا ہے اور میں اپنا قبلہ درست کر لیتا ہوں۔ آنکھ کھلی تو بہت دیر تک یہ خواب میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ پتہ نہیں اس کی تعبیر کیا ہوگی، مگر یہ سب کچھ اتنا واضح اور مبرہن تھا کہ اس کا بھونا مشکل تھا۔ خیال ہوا کہ کہیں یہ اس بات کا اشارہ تو نہیں کہ خدا مجھے اپنے گھر بلانا چاہتا ہے۔ ان دنوں حج کے ایام تھے اور وقوف عرفہ میں دس پندرہ دنوں کی مہلت رہ گئی تھی۔ اگلے دن برادر مکرم حسین ذوالقرنین صاحب کی دہلی آمد کی اطلاع ملی۔ خیال ہوا کیوں نہ ان سے ملاقات کے لیے دہلی کا سفر کیا جائے۔ وہ ان دنوں اپنے ایک عزیز عبدالرزاق کشمیری کی قیام گاہ پر ٹھہرے تھے جو حسن اتفاق سے سعودی سفارت خانے میں سیکنڈ سکرٹری کے منصب پر فائز تھے۔ باتوں باتوں میں حج اور اس موقع پر سعودی سفارت خانے کی بڑھتی مصروفیت کا تذکرہ چل نکلا۔ وہیں ایک خیال میرے ذہن میں کوندا، کیوں نہ لندن کا سفر براہِ جدہ کیا جائے اور اس طرح لگے ہاتھوں حج کی سعادت بھی اپنے حصے میں آجائے۔ خیال آیا کہ سرسید جب لندن کے سفر پر روانہ ہو رہے تھے تو اکبر الہ آبادی نے ان کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ

سدھاریں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے

وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

اگر لندن کے سفر میں حج کی سعادت بھی نصیب ہو جائے تو ایک ہی سفر میں خدا کا گھر اور خدا کی

شان دونوں ہی نظارے جمع ہو جائیں گے۔ میں نے عبدالرزاق سے پوچھا کہ ایامِ عرفہ کو اب دس بارہ ہی دن رہ گئے ہیں، کیا اس آخری لمحے میں بھی حج کا ویزہ مل سکتا ہے؟ بولے: کیوں نہیں، کل صبح پاسپورٹ لے کر سفارت خانے آ جاؤ اور سفر کی تیاری شروع کر دو۔

سفر حج کا پروگرام چونکہ اچانک اور غیر متوقع طور پر بن گیا تھا، اس لیے نہ تو اس سلسلے میں کسی روایتی انداز کی تیاری کا موقع تھا اور نہ ہی مناسک حج کے سلسلے میں کتابوں کی چھان بین کا کوئی موقع ملا۔ تھا بھی تو یہ ایک طالب علم کا سفر حج۔ میں ایک مختصر سی پوٹلی اٹھا کر سفر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ایک تنہا مسافر جس کے آگے نہ کوئی کارواں اور نہ پیچھے کوئی لائشکر۔ ایک عالم وارفتگی تھی جس نے مجھے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اسی عالم میں، میں جبل الرحمہ کی چوٹیوں تک جا پہنچا جہاں افغان مجاہدین کا ایک گروہ انتہائی الحاح و زاری کے ساتھ خدا کی نصرت اور اسلام کے غلبے کی دعا مانگ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرا رُواں رُواں اس دعا میں شامل ہو گیا ہو، جیسے خدا کی رحمت اب اس امت پر پھر سے سایہ فگن ہونے کو ہو۔ غلبہٴ اسلام کی تصنیف کا خیال بھی اسی چوٹی پر آیا۔ نہ جانے مستقبل کے کتنے منصوبے قلب و نظر میں جگمگا اٹھے۔ اسی عالم وارفتگی میں، میں بسوں کی طویل قطاروں کو چھوڑ کر پایادہ منیٰ سے مکہ کی طرف چل پڑا۔ حج سے فراغت کے بعد جب میں لندن کی طرف مَوجِ پرواز تھا مجھے اپنا وہ خواب یاد آیا جس میں میں دورانِ نماز چلتا ہوا کعبہ مشرفہ کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

کوئی چھ ماہ بعد جب میں لندن کے سفر سے واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ملک میں باہری مسجد کی بازیابی کے حوالے سے مسلمانوں کے جذبات میں ابال آیا ہوا ہے۔ دوسری طرف احياء پرست تحریکیں ایک آخری اور فیصلہ کن معرکے کی طرف بڑی سرعت اور تنظیم کے ساتھ اپنے قدم آگے بڑھا رہی ہیں۔ احياء پسندوں کو حکومت اور نظم و نسق قائم کرنے والی مشنری کی پشت پناہی حاصل ہے، جبکہ اس معرکہ آرائی میں مسلم قائدین کے پاس اشتعال انگیز بیانات کے علاوہ کوئی عملی منصوبہ سرے سے مفقود ہے۔ پریس اگر مسلمانوں کے بیانات کو شہ سرخیوں میں چھاپتا بھی ہے تو وہ اس لیے تاکہ احياء پرست ہندوؤں کی نقل و حرکت اور ان کے جارحانہ منصوبوں کو جواز فراہم کیا جاسکے۔ دسمبر ۱۹۸۶ء کی آخری تاریخیں تھیں جب میں واپس دہلی پہنچا تھا۔ دہلی کے ملٹی حلقوں میں اس کانفرنس کی بازگشت باقی تھی جو ابھی چند دن پہلے آل انڈیا باہری مسجد کانفرنس کے بینر تلے دہلی میں منعقد ہوئی تھی جس میں بھانت بھانت کی ایکشن کمیٹیوں اور علی گڑھ اولڈ بوائز پر مشتمل جواں سال مہم جو قائدین کو ایک بینر تلے لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کانفرنس سے دس رکنی باہری مسجد رابطہ کمیٹی کا ظہور ہوا جس کے کنوینر کی حیثیت سے سید شہاب الدین صاحب کا نام سامنے آیا۔ ابراہیم سلیمان

سیدھ اور عبداللہ بخاری اس کے اساطین میں تھے۔ یوپی اور دہلی کی بابرہ مسجد ایکشن کمیٹیوں کے علاوہ مسلم مجلس مشاورت کی بابرہ مسجد بازیابی کمیٹی کی تائید بھی اسے حاصل تھی۔ اس طرح پرسنل لاء بورڈ کے بعد سید شہاب الدین کی قائم کردہ رابطہ کمیٹی کو ایک بین الملٹی متحدہ محاذ کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پرسنل لاء بورڈ نے گزشتہ چند برسوں میں تحفظ شریعت کے حوالے سے جس عوامی ہيجان کو جنم دیا تھا، اس مشتعل مزاجی کا خمار ابھی باقی تھا۔ بابرہ مسجد کے قائدین نے اسی مذہبی جوش و خروش کو اب اپنی مہم جوئی کے لیے استعمال کر لیا۔ یہ کوئی وہی صورت حال تھی جب تحریک خلافت سے پیدا ہونے والی عوامی تحریک کو گاندھی نے کمال حکمت کے ساتھ تحریک عدم موالات میں تبدیل کر دیا تھا۔ ملک میں قیادت کا سفینہ اب بورڈ کے علماء کی عدم شرکت کے بغیر آگے بڑھ رہا تھا۔ دسمبر میں دہلی میں آل انڈیا بابرہ مسجد کانفرنس کا جو جلسہ ہوا تھا اس میں بورڈ کے کبار قائدین نے شرکت نہ کی تھی۔ مولانا علی میاں مسجد کی بازیابی کے لیے کسی عوامی تحریک کے حق میں نہ تھے، لیکن قیادت کا سفینہ اب آگے چل پڑا تھا، سوا کثرتی تنظیموں اور قائدین نے اس سفینے پر سوار ہونے میں ہی عافیت جانی۔

دہلی کی کانفرنس میں تین اہم فیصلے لیے گئے۔ اولاً ۲۶ جنوری کے جشن جمہوریہ کا بائیکاٹ کیا جائے۔ ثانیاً ۳۰ مارچ کو بوٹ کلب پر عوامی ریلی کا انعقاد ہو۔ ثالثاً اگر یہ دونوں اقدامات بھی مسجد کی بازیابی میں کارگر نہ ہوں تو اکتوبر کے مہینے میں مسلمان اقدامی عمل کے طور پر ایودھیا کی طرف مارچ کریں۔

یوم جمہوریہ کے بائیکاٹ کا اعلان ہوتے ہی قومی پریس میں ایک بھونچال کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ سید شہاب الدین اب رابطہ کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے ہر طرف موضوع بحث تھے۔ جشن جمہوریہ کے بائیکاٹ کی اس کال کو بہت سے لوگوں نے ملک دشمنی پر محمول کیا۔ اڈوانی نے جنتا پارٹی سے شہاب الدین کے اخراج کی مانگ کی۔ خود مسجد تحریک کے دوسرے قائدین جیسے بیس کا شکار ہو گئے۔ گوکہ آخری لمحہ میں سید شہاب الدین نے یہ کال واپس لے لی، لیکن قومی پریس میں اس نزاع سے ان کی مرکزیت اور اسٹریٹجک پوزیشن مستحکم ہو گئی۔ ویسے تو پرسنل لاء بورڈ کی تحفظ شریعت مہم بھی ایک پُرشور اور غیر منظم تحریک کی حیثیت سے سامنے آئی تھی۔ لیکن بورڈ کے علماء پر چونکہ روحانیت اور تقدس کا پردہ پڑا تھا، اس لیے ان کی اس مہم جوئی اور ہيجانی تحریک کے مضمرات و عواقب کا فوری طور پر اندازہ نہ ہو سکا۔ لیکن بابرہ مسجد کے قائدین جس طرح اشتعال انگیز بیانات اور غیر ذمہ دارانہ اعلانات میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کے نتیجے میں ہندوؤں کے خلاف مسلم قومی افتخار کی لڑائی جس طرح آگے بڑھ رہی تھی اس سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ آنے والے دنوں میں نفرت اور تصادم کے اس طوفان پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ میں نے ان

اندیشوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے سید شہاب الدین صاحب کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا۔ مگر میری بات ان کی سمجھ میں کہاں آتی۔ اس خط کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا:

مکرمی شاز صاحب! السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، دعاؤں اور نیک خواہشات کے لیے شکر گزار ہوں۔ ہم لوگ ایک تاریخی موڑ پر ہیں۔ جوش کے ساتھ ہوش کی بھی ضرورت ہے، لیکن مصلحت اور احتیاط سے کام نہیں چلے گا۔ اب تو بے دھڑک آتشِ نمرود میں کود جانے والے عشق کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہماری رہنمائی کرے اور ہدایت عطا فرمائے۔

سید شہاب الدین

آتشِ نمرود میں کود پڑنے کی دعوت صرف سید شہاب الدین ہی نہیں دے رہے تھے بلکہ مختلف ایکشن کمیٹیوں کے نوآموز قائدین اور جامع مسجد کے منبر و محراب سے بھی مسلسل ہندو احمیاء پرستوں کو دعوت مبارزت دی جا رہی تھی۔ ان ہی دنوں ایک نائب امام اس عزم کے ساتھ ایودھیا کے سفر پر نکلے تھے کہ وہ بابر مسجد میں فاتحانہ داخل ہو کر نماز پڑھیں گے یا پھر ان کی لاش ہی وہاں سے واپس آئے گی۔ روانگی سے پہلے جب کسی صحافی نے ان سے پوچھا کہ آپ کب تک لوٹیں گے تو ان کی زبان سے بے اختیار نکلا، پرسوں۔ حالات اب جس رخ پر بڑھ رہے تھے اس پر نہ اب حکومت کا اختیار تھا اور نہ ہی کسی مؤقر مسلم گروہ، ملی تنظیم یا دینی شخصیت کے بس میں تھا کہ وہ مسلمانوں کو قومی افتخار کی اس لڑائی میں شرکت سے روک سکے، جس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لیے ایک غیر منصوبہ بند جنگ میں پھنس کر رہ جانے کا امکان پیدا ہو گیا تھا، بلکہ ان کی پیہمانہ اور داعیانہ شان کے بھی خلاف تھا کہ وہ محض ایک قوم کی حیثیت سے اپنے دستوری حقوق پر اصرار جاری رکھیں۔

مارچ کی وسطی تاریخوں میں ایک دن سید شہاب الدین صاحب کی آمد کی خبر گرم ہوئی۔ سرسید ہال کے لان میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ فضا دیر تک نعرہ تکبیر سے گونجتی رہی۔ ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ء کو بوٹ کلب کے وسیع میدان میں ہندوستانی مسلمانوں کی عظیم الشان ریلی منعقد ہوئی جسے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے اجتماع بلکہ انبوہ عظیم کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ حالات انتہائی نازک تھے، دہلی کا سفر محفوظ و مامون نہ تھا۔ دہلی کی طرف جانے والی ٹریبنوں اور بسوں پر اغیار کی نظریں تھیں۔ خوف و اندیشے کی اسی فضا میں، میں اپنے ایک مشفق دوست محمد نور اللہ صاحب کے ساتھ اسٹیشن پہنچا۔ بڑی مشکل سے ایک ٹرین ہاتھ لگی۔ اس دن اکثر ٹرینیں یا تو التوا کا شکار تھیں یا دیر سے چل رہی تھیں۔ بوٹ کلب کے وسیع سبزہ زار پر

مسلمانوں کا ایک عظیم سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اسٹیج کے دائیں طرف ایک بہت بڑے سینر پر چلی حرفوں میں لکھا تھا:

نہ گھبراؤ مسلمانو خدا کی شان باقی ہے ابھی اسلام زندہ ہے ابھی قرآن باقی ہے  
یہ کافر کیا سمجھتے ہیں جو اپنے دل میں ہنستے ہیں ابھی تو کربلا کا آخری میدان باقی ہے  
ایسا لگتا تھا کہ مسلمان ایک آخری اور فیصلہ کن معرکہ آرائی کے لیے دہلی کی سرزمین پر ایک بار پھر جمع ہو گئے ہیں۔ ایک طرف عوامی جوش و خروش کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف اسٹیج سے ہونے والی تقریریں امت کے افتراق و انتشار پر دال تھیں۔ قائدین کے درمیان یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ اس تاریخ ساز ریلی کا حقیقی قائد کون ہے؟ جاوید حبیب کا کہنا تھا کہ بابر مسجد خود اس تحریک کی قائد ہے اسے کسی قائد کی ضرورت نہیں۔ عبداللہ بخاری مسلمانوں کے اس جم غفیر کو دیکھ کر جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ انھوں نے حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں اس مجمع کو اشارہ کروں کہ وہ مسلم وزراء کی کوٹھیوں میں آگ لگا دے اور ان کی ٹانگیں توڑ دے تو کیا ہو۔ اسی دوران سید شہاب الدین نے امام صاحب کو لگام دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے اشارتاً امام کا کرتا کھینچا، لیکن امام کہاں قابو میں آنے والے تھے۔ انھوں نے برسر اسٹیج سید شہاب الدین کو جھٹک دیا کہ وہ قومی اور ملی معاملے میں کسی لاگ لپیٹ کو روار کھنے کے قائل نہ تھے۔ اس تاریخ ساز ریلی سے واپسی پر میں نے بابر مسجد اور ہندوستانی مسلمان کے نام سے ایک کتابچہ لکھا جس میں قائدین کی غیر ذمہ دارانہ مہم جوئی اور بے بصیرتی پر سخت تنقید تھی۔ میں نے لکھا تھا:

’اے میرے عزیز ترین بھائیو! بابر مسجد کا سانحہ یقیناً ہندوستان میں تمہارے لیے ایک بھیانک مستقبل کی پیش گوئی کر رہا ہے، لیکن میرے نزدیک اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک تمہارا یہ رویہ ہے جس کے ذریعہ تم اس مسجد کی بازیابی چاہتے ہو۔ خدا کی قسم تم ایک بڑی خیانت کا ارتکاب کر رہے ہو، تم اللہ کے گھر کے نام پر اپنی قومی لڑائی کی جڑیں مضبوط کر رہے ہو، افسوس کہ اسلام کی آبروداؤ پر لگاتے ہوئے بھی تمہیں جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ تم ہر قیمت پر اپنی قومی ترقی کا سامان کرنا چاہتے ہو، کاش کہ تم نے ماضی کے تجربات سے کچھ سبق لیا ہوتا۔ تمہارے اسی انداز فکر نے محض قومی مفاد کی خاطر ملک کو تقسیم کروالیا، تمہیں اس بات سے تو خوف آتا تھا کہ غیر منقسم ہندوستان میں تم معاشی بد حالی کے شکار ہو جاؤ گے، ہندو تم پر حاوی ہو جائیں گے اور اس لیے ایک الگ خطے کا حصول ناگزیر ہو گیا۔ لیکن تمہیں اس بات کی کوئی فکر نہ رہی کہ منقسم ہندوستان کو اگر مسلمانوں نے خالی کر دیا تو عرصہ دراز تک یہ سرزمین اللہ اکبر کی صداؤں سے خالی ہو جائے گی

اور انسانوں کی ایک قابل لحاظ آبادی تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے سارے راستے یک لخت بند ہو جائیں گے۔ پھر اس لولی لنگڑی قومی فکر کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوا اور خدا کے نام پر مفاد پرستوں کے حاصل کردہ ملک پاکستان میں جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ خدا کا عذاب ہے، ایک بڑی خیانت کی سزا ہے۔ کاش کہ تم اس سے کچھ سبق لو۔ ان قومی مفاد پرستوں نے دشمنانِ اسلام کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ دیکھو پاکستان میں اسلام فیل ہو گیا، جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام کو داخل ہونے کا سرے سے موقع ہی نہیں دیا گیا۔ روزِ اوّل سے جس خطرناک غلطی کو روا رکھا گیا وہ یہ تھی کہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کی تنظیم نظریاتی بنیادوں پر کرنے کے بجائے نام نہاد قومی بنیادوں پر کی گئی اور جب قوم سے وابستگی اللہ سے وابستگی پر سبقت لے جائے، جب قومی مفاد سب کچھ قرار پائے تو ایسی صورت میں قوم کے اندر مختلف فرقوں کا وجود میں آنا اور ان کے درمیان باہمی کشمکش اور پھر خون ریزی کا ہونا عین فطری ہے۔ میں نے تقسیم کے سانحہ کا قدرے تفصیل سے اس لیے ذکر کیا کہ آج پھر مجھے اسی قسم کے خود غرضانہ اور نفس پرستانہ قومی نعرے سنائی دے رہے ہیں۔ آج پھر قوم سے وفاداری جسے ہم نے 'ملّی' ذمہ داریوں کا نام دے رکھا ہے، اللہ سے وفاداری پر سبقت لے جا رہی ہے۔

میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ مسحور کن قومی نعرے اور قومی مفاد کے لیے کی جانے والی کوششیں تمہارے درد کا درماں نہیں ہو سکتیں۔ ایک خاص قومی لڑائی میں تمہاری شکست یقینی ہے، افسوس کہ تمہاری اخلاقی پستی نے شکست و فتح کی تمیز بھی تم سے چھین لی ہے۔ ذرا غور کرو، اس غلط رویے کے ذریعہ ایک طویل قومی لڑائی کے نتیجے میں اگر تم نے باہری مسجد حاصل کر بھی لی تو اس سے اسلام کا کیا بھلا ہو جائے گا؟ ہاں یہ صحیح ہے کہ تم مقابل قوم کے سامنے سینہ پھلا کر کہہ سکو گے کہ تم ایک زندہ قوم ہو۔ تم اپنے قومی غرور کے نشے میں سرشار دوسروں پر حقارت بھری نظروں کے تیر پھینک سکو گے، لیکن یہ عمل جسے تم اپنی فتح سمجھ بیٹھے ہو دراصل تمہاری سب سے بڑی شکست ہوگی کہ اس پورے عمل میں تم نفرت کی جو فضا تیار کرو گے اور دوسری قوموں کے تعصب کی جس حد تک آبیاری کر چکے ہو گے، جس کا سلسلہ تمہارے سیکولر قوم پرست رہنماؤں کے ذریعہ شروع ہو چکا ہے، تو یقیناً جانو، نفرت اور تنگ نظری اور قومی تعصب کا یہ بھیا نک سیلاب تمہارا داعیانہ تشخص بھی بہا لے جائے گا۔ نتیجتاً ہندوؤں کی ایک بڑی اکثریت جس میں ابھی دعوتِ دین کے خاصے مواقع موجود ہیں اور جو وسیع النظری کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتی ہے انہیں بھی تم

ہندو تعصب کی دیواروں میں محصور کر دو گے۔ اس طرح قومی خطوط پر بابری مسجد کی بازیابی ملک میں ایک طویل عرصے کے لیے دعوت و تبلیغ اور افہام و تفہیم کا دروازہ بند کر دے گی۔ اور پھر یہ سلسلہ یہیں نہ رکے گا، مقابل قوم کا احساس شکست اس کے اندر انتقام اور نفرت کا شدید جارحانہ داعیہ پیدا کر دے گا اور پھر تمہیں اپنے تعمیر یافتہ قومی تعصب کے خول میں بھی پناہ نہ ملے گی۔

(ص ۱۱-۱۲)

گو کہ یہ کتابچہ مقبول عام رجحان کے خلاف تھا، لیکن اس کی غیر معمولی طور پر پذیرائی ہوئی۔ آناً فاناً اس کے کئی ایڈیشن نکل گئے۔ بہت سے لوگوں نے اسے اپنے حلقہ اثر میں مفت تقسیم کے لیے بڑے پیمانے پر خریدا۔ ملک بھر سے میرے پاس اس قسم کے خطوط آنے لگے کہ آپ نے ہمارے ملی انحراف کی بروقت نشاندہی کی ہے۔ کتابچہ کی پرشکوہ نثر اور ابوالکلامی لب و لہجے کے سبب بہت سے لوگوں نے مجھے معمر بزرگ سمجھا۔ انھوں نے میرے اوپر یہ فرد جرم بھی عائد کر دی کہ جب میں صورت حال کو اتنی باریک بینی سے دیکھ رہا تھا تو اب تک خاموش کیوں رہا۔ کتابچے کے آخر میں نئی آنے والی تصنیف 'غلبہ اسلام' کا بھی تعارف کرایا گیا تھا تاکہ جو لوگ اس ملک میں قومی افتخار کی لڑائی کے بجائے پیسبرانہ مشن کی تنظیم نو میں دلچسپی رکھتے ہوں ان کے لیے ایک واضح لائحہ عمل سامنے آجائے۔ بہت سے خطوط میں 'غلبہ اسلام' کی اشاعت کا بے صبری سے انتظار پایا جاتا تھا۔ میں نے سوچا ایک ایسے وقت میں جب ایک عمومی بے سمتی ہمارا مقدر بن چکی ہے، کیوں نہ 'غلبہ اسلام' کے نام سے ہندوستان میں احیائے اسلام کے منشور کی فی الفور اشاعت کا سامان کیا جائے۔ ملک میں ہندو مسلم منافرت کا درجہ حرارت مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ مختلف شہروں سے چھوٹے بڑے فسادات اور ہندو مسلم کشیدگی کی خبریں آرہی تھیں۔ ایسے میں تصنیف و تالیف پر توجہ مرکوز رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ابھی کتاب اپنے آخری مرحلے میں تھی کہ ایک دن غیر متوقع طور پر ایک خط نے میرے ذہنی ارتکاز کے سلسلے کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میرٹھ جہاں سے ان دنوں مسلم کشی کی وحشت ناک خبریں آرہی تھیں اس کے تار حلیم بھائی سے جڑ جائیں گے۔ میں جوں جوں خط پڑھتا جاتا خوف و سراسیمگی کی کوئی لہر، ایسا لگتا تھا، جیسے میرے وجود میں سرایت کرتی جا رہی ہو۔ لکھا تھا:

'برادر! سلام مسنون'

یہ خط میں میرٹھ کے ایک نرسنگ ہوم سے لکھ رہا ہوں جہاں چند دن پہلے میرا اینڈکس کا آپریشن ہوا ہے۔ ابھی آپریشن تھیٹر سے باہر ہی آیا تھا کہ نرسنگ ہوم پر بلوائیوں نے ہلہ بول دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مسلمان مریضوں کو یہاں سے نکال دیا جائے، لیکن ڈاکٹر بھٹناگر، جن کا یہ

زسنگ ہوم ہے، انھوں نے بلوائیوں کا یہ مطالبہ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشتعل بھیڑ نے زسنگ ہوم کو نقصان پہنچایا۔ بہت سا مال و اسباب لوٹ کر لے گئے۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ میری غیر مطبوعہ ڈائری کا مسودہ بھی اس ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ گزشتہ چار پانچ سالوں سے میں اپنے درد و کرب کو کاغذ پر اٹھیلتا رہا تھا۔ کسے پتہ تھا کہ یہ حادثہ بھی میری قسمت میں لکھا جائے گا۔

چند دن پہلے تمہارا ایک کتابچہ 'بابری مسجد اور ہندوستانی مسلمان' کے عنوان سے مختلف ہاتھوں میں ہوتا ہوا مجھ تک پہنچا تھا جس سے یہ پتہ چلا کہ تم ابھی تک علی گڑھ میں نکلے ہوئے ہو۔ مراد آباد میں پولیس کی دھڑ پکڑ سے بچنے کے لیے ہم لوگ میرٹھ چلے آئے تھے۔ عزیز واقارب نے سہارا دیا اور زندگی پھر سے چل نکلی۔ لیکن اب ایک بار پھر فسادات نے میرے گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے۔ رام جنم بھوی کی تحریک نے انسانوں پر بہیمیت طاری کر دی ہے۔ چند دن پہلے حکیم سیف الدین کے پاس طبی مشورے کے لیے گیا تھا، کہنے لگے کہ مسجد مندر قضیے کے سبب نفرت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اگر کہیں دو بھینسیں بھی لڑ جائیں تو ہم ایک کو مسلم بھینس اور دوسری کو ہندو بھینس کہہ کر ان کے طرفدار بن جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں تو برس برس تذکرہ لکھ دی ہیں۔ اصل بات جو میں تمہیں بتا کر دکھی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن نہ بتانے پر اپنا اختیار بھی نہیں، وہ یہ ہے کہ آج تقریباً پچیس دن ہو چکے ہیں میرا سب سے چھوٹا بھائی کلیم لاپتہ ہے۔ ذرا ہسپتال سے چھٹی ملے تو اس کی تلاش میں نکلوں۔ کوئی کہتا ہے کہ فساد میں مارا گیا۔ جس وقت پولیس والے اسلوں کی تلاش میں مسلم حملوں کی تلاش لے رہے تھے، وہ عقبی دیوار کو دکر بھاگ نکلا تھا۔ خدا جانے کہاں گیا۔ ملیا نہ اور ہاشم پورہ میں جو حادثات پیش آئے ہیں تو نہیں لگتا کہ وہ زندہ بچا ہوگا۔ ایک موہوم امید باقی ہے۔ اب تو غم سہنے کی جیسے عادت سی پڑ گئی ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کیا خدا اس دن بھی ہم جیسوں سے حساب لے گا۔ ہم آخر کتنی قیامتیں جھیلیں گے۔ ہر طرف لوگوں کی آنکھوں میں نفرت ہے۔ یہ جگہ اب انسانوں کے رہنے کی نہیں۔ ہم لوگ ایک بار پھر نقل مکانی کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ امر وہ، مراد آباد یا شاہجہاں پور، پتہ نہیں اگلی منزل کون سی ہو۔

دعاؤں کی درخواست کے ساتھ

تمہارا بھائی

عبدالحمید صدیقی

خط پڑھ کر خیال آیا کیوں نہ حلیم بھائی کی فی الفور مدد کا کوئی انتظام کیا جائے۔ ابھی چند دنوں پہلے میرٹھ اور ہاپوڑ کے کچھ طلباء نے متاثرین کی مدد کے لیے ایک ریلیف کمیٹی بنائی تھی جس میں میرے توسط سے بھی بعض لوگوں نے خطیر رقمیں دی تھیں۔ کمیٹی کا روح رواں ارشد میرے ہاسٹل میں ہی رہتا تھا۔ چند دنوں بعد جب ارشد اپنے احباب کے ساتھ ریلیف کی رقمیں لے کر میرٹھ کے سفر پر گیا تو وہ حلیم بھائی کی تلاش میں بھٹنا گرنرسنگ ہوم بھی پہنچا۔ تلاش بسیار کے بعد پتہ چلا کہ وہ ملیانہ کے محلہ شیخان میں رہتے تھے جہاں یا تو اب جلے ہوئے مکانات ہیں یا پھر یتیموں، بیواؤں کی آہ و بکا۔ اکثر لوگ نقل مکانی کر چکے تھے۔

ملیانہ کی بھی عجیب کہانی بتائی جاتی تھی۔ واقف کار کہتے ہیں کہ میرٹھ میں فسادات پر قابو پایا جا چکا تھا۔ زندگی معمول پر لوٹنے لگی تھی کہ ایک دن اچانک راجیو گاندھی نے چیف منسٹر ویر بہادر سنگھ کو دہلی طلب کیا اور ان سے اس بات کی شکایت کی کہ ہاشم پورہ اور املیان کے مسلمان اتنے سرکش ہو گئے ہیں کہ انھوں نے کرفیو کے دوران پولیس کو اپنے علاقے میں تلاشی کے لیے داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ یہ بات برداشت نہیں کی جاسکتی۔ ویر بہادر نے اطمینان دلایا کہ میرٹھ میں اب حالات قابو میں ہیں۔ لیکن فرمان وزیر اعظم کا تھا۔ وہ دوسرے دن میرٹھ پہنچے اور انھوں نے پی اے سی کے اہلکاروں کے ساتھ ہاشم پورہ اور املیان کے باشندوں کی سرکشی کی شکایت کی۔ ویر بہادر عموماً بھوجپوری بولتے تھے اور ان کی زبان میں لکنت تھی۔ ان کی لکنت کے سبب پولیس افسران کو ایسا لگا جیسے وہ ملیانہ کہہ رہے ہوں اور اس طرح املیان کے مسلمانوں کا انتقام ملیانہ کے مسلمانوں سے لے لیا گیا۔ ان دنوں یہ تاثر بھی عام تھا کہ راجیو گاندھی نے اپنے خاص مقاصد کی تکمیل کے لیے ویر بہادر سنگھ کو یوپی کا چیف منسٹر بنایا تھا۔ ان کے ہاتھوں بابر مسجد کا تالا کھلوا یا، اتر پردیش کے مسلمانوں کو سبق سکھایا گیا اور جب ان کی بدانتظامی کا چرچا عام ہوا تو انھیں وزارت علیا کے عہدے سے ہٹا کر اپنی کابینہ میں وزیر اطلاعات کے منصب پر لے آئے۔ اور جب یہ اندازہ ہوا کہ ویر بہادر راز ہائے سر بستہ سے پردہ اٹھانے میں پیداک ہوتے جا رہے ہیں اور وزیر اعظم سے اپنے خصوصی تعلقات کا تذکرہ کرنے میں احتیاط ملحوظ نہیں رکھتے تو چند ہی ماہ بعد فرانس کے ایک دورے کے موقع پر پراسرار حالت میں ان کی موت بھی واقع ہو گئی۔ حقیقت کا علم تو اللہ ہی کو ہے، لیکن ایک خاص مدت کے لیے این ڈی تیواری کے ہاتھوں سے وزارت علیا کا عہدہ لے کر اسے ویر بہادر کو سونپنا اور پھر مشن کی تکمیل کے بعد دوبارہ این ڈی تیواری کو وزارت علیا کا عہدہ سونپ دینا تو اسی بات کی غماضی کرتا ہے کہ راجیو گاندھی کو ویر بہادر سے جو کام لینا تھا وہ انھوں نے لے لیا۔

## مولانا سبجانی

بابری مسجد ریلی کے بعد ملک بھر میں اور خاص طور پر اتر پردیش کے مختلف شہروں میں مسلم کش فسادات نے شدت اختیار کر لی تھی۔ رمضان کا آخری عشرہ تھا، مئی کا مہینہ، گرمی کی شدت اور ہر روز نئی نئی تشویشناک خبروں کا سلسلہ۔ ایک دن جب میں لاہور سے واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بجلی غائب ہے، معین اور مجاہد برآمدے میں بیٹھے اخبارات کی ورق گردانی کر رہے ہیں اور آج خلاف معمول ان دونوں پر سنجیدگی طاری ہے۔ معین اور مجاہد میرے پڑوسی تھے، نیچرل سائنس میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور ان دونوں حضرات کا زیادہ تر وقت اپنی لیب میں گذرتا تھا۔ یہ دونوں جب اکٹھے ہو جاتے تو مجلس کو قبضہ زار بنائے رکھتے۔ بذلہ سنجی میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن آج ان پر سراپیمگی طاری تھی۔ پتہ چلا کہ میرٹھ سے فسادات کی جو خبریں آرہی تھیں ان میں ایک نئے انداز کی بربریت کا واقعہ سامنے آیا ہے۔ پہلے تو پولس اور فوجی دستوں نے مسلم محلوں کی پوری طرح ناکہ بندی کر دی۔ لوگوں کو گھروں سے نکال کر سڑکوں پر لائے، قطاروں میں کھڑا کیا۔ بوڑھے، بچے، نوجوان اور عورتیں الگ کی گئیں۔ صرف محلہ ہاشم پورہ میں ۷۰۰ لوگ گرفتار ہوئے جن میں ۴۲ نوجوانوں کو قتل عام کے ارادے سے الگ کر لیا گیا۔ مجموعی طور پر شہر کے مختلف مسلم محلوں سے ڈھائی ہزار سے زائد نوجوان اٹھائے گئے جن کے بارے میں پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں گئے۔ باقاعدہ گرفتار ہونے والے اور پولس کے تشدد کے نتیجے میں حوالات اور جیلوں میں مرنے والوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ ۴۲ نوجوانوں کے بہیمانہ قتل عام کی خبر چونکہ اچانک غیر متوقع طور پر سامنے آگئی تھی اس لئے ذرائع ابلاغ میں واویلا مچ گیا تھا۔ مجاہد کا کہنا تھا کہ آزاد ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا انوکھا تجربہ ہے جہاں مسلم نوجوانوں کو پولس اور فوج کے مشترکہ آپریشن میں حراست میں لیا گیا اور پھر رات کی تاریکی میں انہیں ہنڈن نندی کے کنارے ایک ایک کر کے گولی ماردی گئی اور ان کی لاشیں ندی میں پھینک دی گئیں۔ وہ تو کہتے کہ ندی کے کنارے دور دور تک مسلمانوں کی بستیاں آباد ہیں جب گاؤں والوں کو ندی میں تیرتی لاشوں کا علم ہوا تو انہوں نے بروقت زندہ بچ جانے والوں کی تلاش شروع کر دی۔ چار لوگوں میں زندگی کے آثار ابھی باقی

تھے جنہیں داخل ہسپتال کیا گیا۔ ادھر در بھنگہ کا بابو دین انصاری جو پولیس کی گولی سے زخمی ہو کر نیم مردہ حالت میں جھاڑی میں پھنس کر رہ گیا تھا اور جسے مردہ سمجھ کر پولس والے چھوڑ کر چلے گئے تھے آخری وقت میں اپنے رب سے مناجات میں مشغول تھا۔ خدا نے اس کی دادرسی کے لئے و بھوتی نرائن سہنا کو بھیجا جو غازی آباد کے ایک فرض شناس پولس آفیسر تھے۔ انھوں نے بابو دین کو جھاڑی سے نکالا، تھانے لائے اس کا بیان قلم بند کروایا اور اس کی بنیاد پر پی اے سی کی ۴۱ ویں بٹالین کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی۔ وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ اس وقت دہلی کے یو پی بھون میں سو رہے تھے انہیں جب اس ایف آئی آر کا پتہ چلا تو بہت گھبرائے۔ واقف کار کہتے ہیں کہ وہ ننگے پیر اپنی کار کی طرف یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ ای تو گج ہوئی گوا، ای تو گج ہوئی گوا۔ انہوں نے فی الفور غازی آباد کا رخ کیا، و بھوتی نرائن کی معطلی کے احکام جاری کئے اور جس ہسپتال میں زندہ بچ جانے والوں کا علاج چل رہا تھا اس پر پولس کا پہرہ بٹھا دیا تاکہ ذرائع ابلاغ والے وہاں داخل نہ ہو سکیں۔

ملیانہ اور ہاشم پورہ سے آنے والی خبروں نے معین اور مجاہد جیسے نہ جانے کتنے نوجوانوں کے چہروں سے مسکراہٹیں چھین لی تھیں۔ کل تک جن آنکھوں میں مستقبل کا خواب دکھائی دیتا تھا آج وہاں وحشت نے ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ کل تک جن نوجوانوں کی مجلسیں مہ جینوں کے تذکروں سے مملو ہوتی تھیں آج وہاں اس سوال نے اہمیت اختیار کر لی تھی، آیا اس ملک میں ہمارا نام و نشان باقی بھی رہ پائے گا یا نہیں۔ مجاہد ابھی چند دنوں پہلے جرمنی میں کسی کانفرنس میں اپنا مقالہ پیش کر کے لوٹے تھے، تب وہ مستقبل کے سلسلے میں بڑے پراعتماد دکھائی دیتے تھے۔ آج بہت فکر مند دکھائی دیئے۔ کہنے لگے کہ قتل و غارت گری کے واقعات مسلسل بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس آگ کے پھیلنے میں ہمارے ملٹی قائدین بھی نادانستہ طور پر دشمنوں کے آلہ کار بن گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم گرما گرم جوانی نعروں سے رام جنم بھومی کی تحریک کو تقویت پہنچا رہے ہوں۔ وہ کس طرح؟ میں نے پوچھا۔

بولے: اب دیکھئے ۳۰ مارچ کو بامبری مسجد ریلی ہوئی جسے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے اجتماع کا نام دیا گیا۔ اشتعال انگیز تقریریں ہوئیں۔ ہندوؤں کو ایسا لگا کہ مسلمان ایک بار پھر منظم ہو رہے ہیں۔ ایک ہفتہ کے بعد رام نومی کا تہوار تھا جسے ہندوؤں نے جوانی حملے کے طور پر استعمال کیا۔ ملک بھر میں رام بھگتوں کا یہ جلوس جن علاقوں سے گزرا وہاں بے گناہ مسلمانوں کا خون ارزاں ہو گیا۔ میرے خیال میں رام نومی کے جلوسوں کا شاید اتنا رول نہیں۔ اصل آگ تو ۱۶ مئی کی تقریر نے لگائی ہے، معین نے کہا۔

کون سی تقریر؟ میں نے پوچھا۔

بولے: بوٹ کلب کی تقریر۔

مگر وہاں تو ۳۰ مارچ کو ریلی ہوئی تھی، میں نے وضاحت کی۔

بولے: ۳۰ مارچ کی ریلی کا تو سب کو پتہ ہے۔ اسی بوٹ کلب میں ۱۶ مئی کو وزیر اعظم راجیو گاندھی نے بھی کانگریس کے کارکنوں کو خطاب کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ کچھ لوگ ملک کو غیر مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے پیچھے بیرونی ہاتھ ہے۔ امریکہ پاکستان کو مسلح کر رہا ہے۔ راجیو گاندھی نے کہا تھا: 'ان کو ہم کڑا کے جواب دیں گے، ایسا جواب دیں گے کہ ان کو جو ماں باپ ہوئے ہیں ان کی نانی یاد کرادیں گے۔' تو گویا راجیو گاندھی ہندو کارڈ کھیل رہے تھے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: یہ تو بہت واضح ہے۔ بوٹ کلب میں عبداللہ بخاری کی تقریر نے اگر مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کیا تھا تو راجیو گاندھی کی تقریر ہندوؤں کو واضح الفاظ میں یہ پیغام دے رہی تھی کہ حکومت مسلمانوں اور ان کے سرپرستوں کو نانی یاد کرادینے میں سنجیدہ ہے۔

مگر اس بیان پر تو ہمارے ملٹی قائدین نے کوئی واویلا نہیں مچایا، معین نے سوال کیا۔

بولے: کیسے مچاتے، ملٹی قائدین تو انہیں اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے ہیں۔ نفقہ مطلقہ کے مسئلہ پر آپ نہیں دیکھتے تھے کہ مسلمان علماء اور کانگریس کے مسلم لیڈران کس طرح راجیو گاندھی کی مسلم دوستی میں رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ اکثر مسلم قائدین انہیں صاف ذہن، روشن خیال اور مسٹر کلین سمجھتے ہیں۔ حالانکہ بابری مسجد ان ہی کی ایماء پر کھلی۔ سرکاری ٹیلی ویژن پر مسجد میں پوجا پاٹ کے مناظر ان ہی کی خاموش حمایت کے سبب دکھایا جاتا رہا۔

'تمہارا خیال درست ہے۔ وزیر اعظم کو ایسا بیان نہیں دینا چاہئے تھا۔ مجاہد نے معین کی تائید کی۔

بولے: ارے بھئی راجیو کا تو یہ خاص انداز ہے۔ وہ کمزوروں کو سبق سکھانے سے کب چوکتے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں جب ملک بھر میں سکھوں کے خلاف فسادات ہو رہے تھے اور جب صرف دہلی میں تین ہزار سے زائد بے گناہ سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اس وقت بھی راجیو گاندھی نے اس قتل عام کو جواز بخشنے ہوئے کہا تھا کہ جب کوئی بڑا درخت گرتا ہے تو دھرتی ہلتی ہے۔ یہ تو ہمارے روشن خیال اور سیکولر وزیر اعظم کا خاص طریقہ واردات ہے۔

عجیب! میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

میرا خیال ہے معین صحیح کہتے ہیں، مجاہد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بولے: 'ہندو احواء پرست

اور حکمراں کانگریس دونوں ہی مسلمانوں کو نانی یاد دلانے کی مہم میں ایک دوسرے کے شریک و سہم بن گئے ہیں۔ پرسوں میں دہلی میں تھا، دریا گنج کے علاقے سے گذر رہا تھا وہاں ایک اسکولٹر کشتا پر نظر پڑی جس پر بڑے بڑے بینروں پر اشتعال انگیز نعرے لکھے تھے: 'اس بار عید کیسی ہوگی؟ مراد آباد جیسی ہوگی'۔ دوسری طرف لکھا تھا: 'جو مانگے گا باری، اس کا سہ ہے آخری'۔ لاؤڈ اسپیکر پر اشتعال انگیز نغمے بجاتے اور نعرے بازی کرتے ہوئے اس کے پیچھے بھگوا دھاری نو جوانوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی چل رہی تھی۔ ہر پل ایسا لگ رہا تھا کہ ایک نیا فساد اب شروع ہوا چاہتا ہے۔ کیا بتاؤں بہت وحشت ہو رہی تھی کہ پتہ نہیں کب خون خرابہ شروع ہو جائے۔ کیسپس سے باہر نکلو تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا کس قدر ہمارے خون کی پیاسی ہو رہی ہے...'

مجاہد کی گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ زینے پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ارے سبحانی چچا آپ! آئیے آئیے تشریف لائیں! آپ ابھی تک محو استراحت نہیں ہوئے؟ معین نے انہیں دیکھتے ہی آواز بلند کیا۔

مولانا حسن سبحانی کی بھی عجب کہانی تھی۔ وہ ۲۷ سال کی عمر میں پی ایچ ڈی کی غرض سے یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے۔ وہ ایک بڑے مردِ قلندر کے بیٹے تھے۔ کانپور کی مسجد چھلی بازار کی شہادت کے خلاف علم احتجاج بلند کرنے اور اس راہ میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والے مولانا آزاد سبحانی سے ایک دنیا واقف ہے۔ وہ پاکستان تحریک میں بھی پیش پیش رہے لیکن جب تقسیم کے بعد انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار دیکھی تو یہیں رکنے کا فیصلہ کر لیا۔ حسن سبحانی صاحب کا کمرہ ہمارے کمرے سے قریب ہی تھا۔ جب بھی ملاقات ہوتی اردوئے معلیٰ میں خیریت پوچھتے۔ کیا مجال کہ انگریزی کا کوئی لفظ ان کی زبان کو آلودہ کر سکے۔ مثلاً فرماتے: کیا آپ مذاکرہ تقرری میں نہیں بیٹھے تھے؟ سنا ہے عزیز ی فاروق کا تقریر دوں جمع دو میں ہو گیا ہے، وہیں دارالاقامہ میں انہیں خورش اور رہائش کی سہولت بھی مل گئی ہے۔

موسم ابر آلود دیکھ کر لڑکے ان سے تقاطر امطار کی بابت سوال کرتے۔ ایک صاحب زادے جو غالباً کسی انگریزی اسکول کے پروردہ تھے انہوں نے تو جوشِ زبان دانی میں اپنے ایک کلاس فیلو کو سبحانی صاحب سے یوں متعارف کروایا تھا: 'مولانا صاحب ان سے ملنے یہ ہمارے ہم زلف ہیں، ہم لوگ اسکول کے زمانے سے ہی ہم زلف چلے آتے ہیں۔ یہ سن کر ایک لمحے تو ان پر حیرت طاری رہی، پھر جب بات کی تہہ تک پہنچے تو بہت محظوظ ہوئے۔

آج سبحانی صاحب کچھ پریشان بلکہ مضطرب سے دکھائی دئے۔ کہنے لگے پتہ نہیں حکومت کیا چاہتی ہے۔ حالات بے قابو ہو رہے ہیں۔ ڈر ہے کہ عید کے اجتماع میں کوئی بڑا حادثہ نہ پیش آجائے۔

'مگر اس بار تو ہلکی پھلکی عید منانے کا فیصلہ کیا گیا ہے، مجاہد نے وضاحت کی۔

بولے: 'آزادی کے بعد اس ملک میں ہماری ہر عید ہلکی پھلکی بلکہ محزون و مغموم ہی ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی لوگوں کا اجتماع تو ہوگا نا؟ سنا ہے کہ مراد آباد کے نعرے لگائے جا رہے ہیں۔'

'جی ہاں! اور یہ سب حکومت کی عین سرپرستی میں ہو رہا ہے، آپ نے نانی یاد کرانے والی تقریر نہیں سنی؟ معین نے مداخلت کی۔

بولے: ارے بھئی اب تو پھر سے تقسیم ہند والے حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ سنا ہے کہ ٹرینوں میں جدول مسافران کے ذریعے مسلمانوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔

'مگر اس مسئلے کا تو ہم لوگوں نے حل ڈھونڈ نکالا ہے، مجاہد نے وضاحت کی۔ بولے: عبداللہ کو تو آپ جانتے ہیں نا؟ وہ گورکھپور والے جو ہندی میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ انھوں نے ٹرین کے ٹکٹ میں اپنے نام کا ہندی ترجمہ لکھا ہے، یہ کہتے ہوئے مجاہد کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ طلوع ہوئی۔

اچھا! وہ کیا؟ میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

بولے: انتہائی شستہ اور بر محل ترجمہ ہے۔ لکھا ہے: بھگوان داس

اچھا تو میاں صاحب زادے اب بھگوان داس بن گئے ہیں، ذرا ملیں تو میں ان کی خبر لوں۔ سبحانی صاحب نے ترجمے کا لطف لیتے ہوئے مصنوعی حنفی کا اظہار کیا۔

اس میں حرج بھی کیا ہے؟ اگر دفع فتنے کی خاطر ہم نور اللہ کے بجائے اوم پراکاش کہلائیں یا سلمی بیگم کو شانتی دیوی کہا جائے۔ اس طرح زبان کا حجاب بھی جاتا رہے گا۔ مجاہد نے اپنی گفتگو میں مزید وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

بولے: یہ ایک انتہائی نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ زبان اپنے ہمراہ ثقافت بھی لئے آتی ہے۔ اگر ہم فاتح ہوں تو کچھ حرج نہیں زبان کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں لیکن مفتوح اگر تلوار کے زور پر نام تبدیل کرنے پر مجبور ہو جائے تو یہ عمل ہمیں نفسیاتی طور پر اندر سے مجروح کر دے گا۔ یہ کہتے ہوئے سبحانی صاحب ایک لمحے کو رکے، جیسے کوئی اہم بات یاد آگئی ہو۔ پھر فرمایا: یہ کام دراصل بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا۔ جس طرح مسلمانوں نے آتش پرستوں کے نماز روزے کا 'اسلامی کرن' کیا اسی طرح اگر دھیان گیان، پوجا پاٹ، برت اور یا ترا جیسی اصطلاحوں کو بھی بروقت اسلامیا لیا گیا ہوتا تو آج صورت حال مختلف ہوتی۔ ہم نے اصل میں اسلام کو عرب قالب میں محصور کر لیا۔ خیر یہ ایک علیحدہ موضوع ہے اس پر پھر کبھی گفتگو ہوگی۔ یہ کہتے ہوئے سبحانی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور مجلس اپنے اختتام کو پہنچی۔

## ۴۳

### سرزمین دہلی کی

دو ڈھائی ماہ سخت عالمِ اضطراب میں گزرے۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جب مختلف شہروں سے کشت و خون کی خبریں نہ آتی ہوں۔ اس دوران غلبہٴ اسلام کی کتابت مکمل ہو چکی تھی۔ میں نے اس کی اشاعت کے خیال سے دہلی کے سفر کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ ابھی کمرے سے نکلا ہی تھا کہ پتہ چلا کہ میرٹھ۔ بجنور بس سے گیارہ مسلمان مسافروں کو اتار کر تہہ تیغ کر دیا گیا ہے۔ دوستوں نے سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مجھے وہ رات یاد آئی جب بابری مسجد کی ریلی میں شرکت کے لیے میں بمشکل ٹرین کے ایک ڈبے میں گھسنے میں کامیاب ہو گیا تھا، لیکن ٹرین جیسے جیسے لیٹ ہوتی جاتی اور غیر متوقع طور پر چھوٹے اسٹیشنوں پر رکتی تو خطرات بڑھتے جاتے، جان کا دھڑکا لگا رہتا مگر پھر اس خیال سے کہ اب تو یہی اس ملک کے شب و روز ہیں، میں نے دہلی کی راہ لی۔ وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جامع مسجد کے صدر دروازے پر بڑے بڑے سیاہ بینر آویزاں ہیں جن میں مسلمانوں کے قتل عام اور ان پر ہونے والے ظلم و ستم پر سخت الفاظ میں احتجاج درج کیا گیا ہے۔ مسجد کے منارے سیاہ غلافوں سے ڈھک دیئے گئے تھے، جس سے ناظرین پر یہ تاثر قائم ہوتا تھا کہ مسلمانوں پر اس ملک میں کوئی سخت وقت آپڑا ہے۔ ان کے جذبات مجروح اور دل فگار ہیں اور اس نازک صورت حال پر جامع مسجد ماتم کناں ہے۔ پتہ چلا کہ رمضان کے چند دنوں بعد امام جامع مسجد عبداللہ بخاری نے میرٹھ کے فسادات سے دل برداشتہ ہو کر احتجاجاً نمازیوں اور زائرین پر جامع مسجد کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ کوئی دو ہفتوں تک مسجد نمازیوں اور سیاحوں کے لیے بند رہی۔ پھر حکومت کی اس یقین دہانی کے بعد کہ وہ خاطر آفیسروں کو سزا دلانے گی اور مظلوم مسلمانوں کو رہا کیا جائے گا، جامع مسجد تو کھول دی گئی تھی لیکن میناروں سے لپٹے سیاہ غلاف اب بھی اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ —

سرزمین دہلی کی مسجد دلِ غم دیدہ ہے۔

صدر دروازے سے اندر داخل ہوا تو ایک ڈومینیشن باکس پر نظر پڑی جو آدم سینا کی مالی معاونت کے لیے رکھا گیا تھا۔ آدم سینا کا تذکرہ تو گزشتہ سال ہی سننے میں آیا تھا لیکن ان فسادات میں مزاحمت یا مدافعت

کے لیے اس نوزائیدہ تنظیم کا کوئی عملی وجود دیکھنے کو نہ ملا تھا۔ اب جامع مسجد میں آویزاں چندے کے ڈبوں سے یہ پتہ چلا کہ یہ تنظیم نہ صرف یہ کہ قائم ہے بلکہ قومی اخبارات میں شیوسینا، بجرنگ دل اور وشو ہندو پریشد کے جنگجویانہ عزائم کے مقابلے میں مسلمانوں کی طرف سے اسی واحد تنظیم کا سہارا ہے۔ آدم سینا کی کاغذی تنظیم اگر نہ ہوتی تو اخبار والوں کے لئے شاید توازن پیدا کرنا مشکل ہو جاتا۔ پھر وہ اس پورے قضیے کو جو دراصل ریاستی مشنری بنام بے بس مسلمان تھی، ہندو-مسلم تنازع کے روپ میں کیسے پیش کر پاتے۔

مسلمانوں کو نانی یاد کر دینے کی سرکاری مہم کتنی چابک دستی اور موثر طریقے سے چلائی گئی اس کا کسی قدر اندازہ مظلومین کے ان بیانات سے ہوتا تھا جو انھوں نے میرٹھ اور دہلی میں ٹریبونل کے ممبران کے سامنے مارچ ۱۹۸۸ء میں دیئے تھے۔ ہاشم پورہ کے محمد عثمان نے اپنی روداد غم کچھ اس طرح سنائی تھی:

’۲۲ مئی ۱۹۸۸ء شام ۶ بجے کا وقت تھا جب پی اے سی، فوج اور پولیس والوں نے مجھے اور میرے تمام پڑوسیوں کو گرفتار کر لیا۔ ہم لوگ سڑک پر بٹھا دیئے گئے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے وہ تین ٹرکوں میں ہمارے محلے کے لوگوں کو لے گئے۔ بچے اور بوڑھے گھر واپس بھیج دیئے گئے۔ اب میں اور محلے کے پچاس دیگر لوگ باقی رہ گئے تھے، تب پی اے سی کمانڈر نے، جس کے ہاتھ میں مانک تھا، ہمیں یہ حکم دیا کہ ہم لوگ ٹرک میں سوار ہو جائیں۔ میرے ساتھ اس ٹرک میں قادر چائے والا، حاجی مستقیم، حاجی شمیم، نعیم، رضوان، عبدالحق اور دوسرے لوگ تھے، جن میں سے بعض لوگوں کو میں چہرے سے تو جانتا تھا مگر نام سے واقف نہ تھا۔ ہم لوگ اس ٹرک میں کسی طرح ٹھونس دیئے گئے۔ مجھے بچ میں بیٹھنے کی جگہ ملی اس لیے مجھے یہ پتہ نہ چل سکا کہ ٹرک کہاں جا رہا ہے۔ ٹرک ایک جگہ رکا اور وہاں دو یا تین پی اے سی والے اتر گئے۔ ٹرک پھر چل پڑا، پھر چلتا ہی رہا۔ ہم لوگ حیران تھے کہ ہم اب تک سول لائن پولیس اسٹیشن کیوں نہیں پہنچے۔

آگے چل کر ٹرک دائیں طرف کو مڑا۔ میں نے اپنے ایک محلے دار کو یہ کہتے سنا کہ یہ تو مرادنگر کنال ہے۔ یہاں پی اے سی والوں نے ایک شخص کو اتارا، اسے گولی مار کر نہر میں پھینک دیا۔ پھر انھوں نے دوسرے شخص کو اتارا اور اسے گولی مار کر نہر میں پھینک دیا۔ اسی طرح تیسرا آدمی بھی مارا گیا۔ اب ہم لوگوں کو ایسا لگا کہ ہم سب کی موت یقینی ہے۔ آخری لمحے میں اب ہمیں خدا کو یاد کرنا چاہئے۔ ہم لوگ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمیں چونکا دیکھ کر پی اے سی والوں نے ٹرک پر بندوٹوں کے دہانے کھول دیئے۔ جو بچ رہا اسے بھی گولی مار کر نہر میں پھینک دیا گیا۔ میرے اوپر ایک شخص گرا ہوا تھا، اس لیے میں بندوٹ کی گولی سے بچ گیا۔ پھر دو پی اے سی والوں

نے مجھے پکڑا، میں نے چیخ و پکار شروع کی، رحم کی بھیک مانگی، اپنے چھوٹے بچوں اور بوڑھے والدین کا حوالہ دیا تبھی ایک پی اے سی جوان میری طرف نشانہ لگاتے ہوئے آگے بڑھا۔ میں نے بندوق کا بیرل پکڑ کر اسے اپنی طرف سے دور کرنے کی کوشش کی۔ دو چار سیکنڈ اسی کنفیوژن میں گزرے۔ جوان نے گولی چلا دی تھی جو میرے پیٹ میں لگی تھی۔ میں چیخا او میں مارا گیا۔ انھوں نے مجھے مردہ سمجھ کر کنال میں پھینک دیا۔ کنال میں پہنچنے کے بعد میں نے تیرنے کی بہت کوشش کی لیکن میری ٹانگیں کام نہیں کر رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے کنارے پہنچا۔ پی اے سی کے ٹرک چلے جانے کے بعد نہر سے باہر نکلا۔ سڑک پر آیا تو دیکھا کہ وہاں دو بہاری مزدور جنھیں میری ہی طرح گولی لگی تھی، زخمی حالت میں موجود تھے۔ اس راستے پر دو ٹرک گزرے۔ میں نے روکنے کی کوشش کی لیکن کوئی نہ رکا۔ تھوڑی دیر بعد موٹر سائیکل پر کچھ پولیس والے متحرک دکھائی دیئے۔ میں نے انھیں ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ رک گئے۔ میں نے انھیں بتایا کہ پی اے سی والوں نے ہمیں گولی مار کر نہر میں پھینک دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم چیپ لے کر آرہے ہیں۔ اس دوران ایک پولیس والا ہمارے ساتھ ہی رکا رہا۔ پولیس والوں نے مجھ سے کہا کہ اگر میں اس طرح بیان دوں گا تو میری زندگی خطرے میں آجائے گی، اس لیے مجھے یہ کہنا چاہئے کہ میں اپنے بھائی سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ اسی دوران فساد شروع ہو گیا۔ کسی نے میری پیٹھ پر گولی ماری۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون تھا۔ آل انڈیا انسٹیٹیوٹ میں جب تک میرا علاج چلتا رہا، ایک سی آئی ڈی کا آدمی ہر وقت میرے قریب رہتا تھا جو کسی صحافی کو مجھ سے بات نہیں کرنے دیتا تھا۔ اس دوران جس نے بھی مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی میں اسے پولیس کی بتائی کہانی دہراتا رہا، اس لیے کہ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میری زندگی اب بھی خطرے میں ہے۔

ہاشم پورہ سے گرفتار کیے گئے بعض نوجوان یا تو پولیس کی پٹائی کے نتیجے میں شہید ہو گئے یا ان زخموں کی تاب نہ لا کر فتح گڑھ جیل میں چل بسے۔ پولیس کے بہیمانہ تشدد سے ایک عینی شاہد پرویز احمد جنھوں نے میرٹھ یونیورسٹی سے ایم اے اکنامکس کی ڈگری لے رکھی تھی، نے کچھ ان الفاظ میں پردہ اٹھایا تھا:

’میں، قمر الدین اور شیراز احمد، نصیر الدین کے گھر مکان نمبر ۹، باغچہ محمد حسین میں تھا۔ ساڑھے پانچ بجے شام کا وقت تھا جب فوجی ہمارے گھر میں داخل ہوئے۔ انھوں نے مجھے، قمر الدین، شیراز احمد، محمد نصر اور سالم کو گرفتار کر لیا اور ہمیں مین روڈ پر لے آئے۔ وہاں محلے کے دوسرے بہت سے لوگ پہلے سے موجود تھے۔ میجر پٹھانیا اور ایک سکھ کیپٹن اس کارروائی کی

سربراہی کر رہے تھے۔ مجھے ایک ٹرک میں بٹھایا گیا جس میں معین الدین بھی تھا۔ ہم لوگ پولیس لائن لائے گئے۔ جب ٹرک پولیس لائن پہنچا تو اسے پی اے سی کے جوانوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور ہماری پٹائی شروع کر دی۔ ہم لوگ ٹرک میں تھے اور یہ ایک کھلا ٹرک تھا۔ پٹائی سے بچنے کے لیے لوگ ایک طرف سے دوسری طرف بھاگتے۔ ٹرک کے اندر بھگدڑ کی ایک کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اسی بھگدڑ میں معین گر گیا اور اسے بری طرح چوٹ آئی۔ ہم لوگ دو تین گھنٹے پولیس لائن میں رہنے کے بعد سول لائن پولیس اسٹیشن لائے گئے۔ انہوں نے ہمیں ایک ایک کر کے کھینچ کر ٹرک سے نکالا اور انتہائی بے دردی سے ہماری پٹائی شروع کر دی۔ اس پٹائی کے نتیجے میں معین الدین، ظہیر احمد اور مینو بے ہوش ہو گئے۔ ان کے جسموں کو کھینچتے ہوئے درخت کے نیچے لائے۔ رات گیارہ بجے کا وقت رہا ہوگا۔ میرا خیال ہے یہ لوگ یا تو مر چکے تھے یا کچھ دیر بعد انہوں نے دم توڑ دیا ہوگا۔ صبح چار بجے پولیس ان تینوں کی لاشوں کو کہیں لے گئی۔ سخت پٹائی کے نتیجے میں میری دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔

غم کے مارے ان بے گناہ مسلم نوجوانوں کو جیل میں بھی تعذیب سے رہائی نہ مل سکی۔ فتح گڑھ جیل میں گرفتار ہو کر پہنچنے والے تاج الدین ولد شمس الدین نے جیل کے اندر بیتے واقعات کا کچھ ان الفاظ میں تذکرہ کیا:

’۲۴ مئی ۱۹۸۷ء کی شام میں اور میرے ایک ساتھی کو سول لائن پولیس اسٹیشن لایا گیا۔ وہاں سے ہم لوگ ۲۵ مئی کی صبح فتح گڑھ جیل پہنچے۔ صبح سات بجے کا وقت رہا ہوگا، جیسے ہی ہم جیل میں داخل ہوئے سزایافتہ مجرموں اور پولیس والوں نے لٹھی ڈنڈوں سے ہماری پٹائی شروع کر دی، جس کے نتیجے میں دین محمد اسی وقت مر گیا۔ حنیف خان اور جمیل احمد جو دوسرے ٹرک میں آئے تھے اور محمد سلیم نے دوسرے دن جیل کے ہسپتال میں دم توڑ دیا۔ مجھے ان کے جسموں کی شناخت کے لیے کہا گیا، لہذا میں نے دین محمد، حنیف خان اور جمیل احمد کے لاشوں کی شناخت کر دی۔ میں نے دیکھا محمد عثمان جو ایک دوسرے ٹرک سے فتح گڑھ جیل میں لائے گئے تھے، ان کی دونوں ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ دونوں بعد جیل کے ہسپتال میں ان کی بھی وفات ہو گئی۔ یہ تو مرنے والوں کا قصہ تھا۔ جو لوہا حقین بچ گئے ان پر کیا گزری، اس کا کسی قدر اندازہ شکیلہ بیگم کے اس بیان سے ہوتا ہے، جنہیں اپنے شوہر حنیف کی موت کی خبر پولیس والوں نے کچھ اس طرح سنائی تھی:

’۲۲ مئی سے پہر تین چار بجے کے قریب پی اے سی اور خاتون پولیس میرے گھر میں گھسی۔ میرے

شوہر جو گزشتہ تین سال سے بیمار چلے آتے تھے، گھر کے اندر تھے۔ میں نے پولیس سے بہت کہا کہ وہ میرے بیمار شوہر کو نہ لے جائے لیکن وہ نہیں مانی۔ اس نے بندوق کے دستے سے ان کے پیٹ پر ٹھوکر ماری اور انھیں زبردستی اپنے ساتھ لے گئی۔ میں نے انھیں اپنے شوہر کی ایکسرے رپورٹ اور علاج کے کاغذات دکھائے، منت سماجت کی اور جب ہمارے چھ سالہ پوتے نے مزاحمت کی کوشش کی تو اسے بھی کھینچ کر لے جانے لگے۔ میں باہر نکلی اور بڑی مشکل سے اپنے پوتے کو ان سے چھیننے میں کامیاب ہوئی۔ ۲۷ تاریخ کو پی اے سی والے ہمارے پاس آئے، بولے: حنیف کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کوئی ہمارے ساتھ چل سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ تم لوگ تو سب کو لے گئے اب یہاں ساتھ جانے کو بچا ہی کون ہے؟ میں ان کے ساتھ سول لائن پولیس اسٹیشن گئی جہاں انھوں نے مجھے بتایا کہ ہم تمہیں عید کے موقع پر ایک تحفہ دینے والے ہیں اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے میرے شوہر کی لاش میرے حوالے کر دی۔ انھوں نے مجھے گالی دیتے ہوئے کہا کہ وہ اس کے لیے یہ تحفہ دور فتح پور جیل سے لے کر آئے ہیں۔

شکلیہ بیگم کی طرح عید کی یہ رات نہ جانے کتنے مسلمانوں پر شب عاشور بن کر آئی۔ کوئی ڈھائی ہزار نوجوان میرٹھ کے مختلف علاقوں سے اٹھائے گئے تھے جن میں بیالیس کا تذکرہ ہاشم پورہ قتل عام کے حوالے سے اخبارات کی زینت بنا۔ بقیہ لوگ کہاں گئے کسی کو نہیں معلوم۔ ایم جے اکبر جو ان دنوں کانگریس کے ترجمان ہوا کرتے تھے اور جنھوں نے وزیراعظم راجیو کے ساتھ میرٹھ کا دورہ بھی کیا تھا، انھوں نے ہاشم پورہ کی گھر گھر تلاشی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد پولیس عبدالماجد کے گھر میں داخل ہوئی۔ گھر کے صحن میں ایک نیم کا درخت تھا۔ پولیس نے میاں بیوی سے کہا کہ وہ گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں، اس دوران وہ پیڑ کے نیچے بیٹھے رہیں۔ تلاشی میں پولیس کو کچھ اور تو نہ ملا وہ عبدالماجد کے بیس سالہ جوان بیٹے دین محمد کو اپنے ساتھ لے گئی۔ ۲۸ مئی کو چاند رات تھی۔ عشاء کے بعد کچھ پولیس والے عبدالماجد کے گھر یہ خبر لے کر آئے کہ اس کا بیٹا جیل میں اس سے ملنے کے لیے بے چین ہے، لہذا وہ اس کے ساتھ چلے۔ عبدالماجد کو اندیشہ ہوا کہ شاید پولیس کے تشدد کے سبب جیل میں اس کے بیٹے کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ پولیس اسٹیشن پہنچا جہاں اسے بہت دیر بٹھائے رکھا گیا۔ ڈھائی بجے رات میں جب پولیس نے اس کے بیٹے کی لاش اس کے حوالے کی تو وہ حواس باختہ ہو گیا۔ پولیس کی سخت ہدایت تھی کہ اسے صبح ہونے سے پہلے ہی دفنا دیا جائے۔ پولیس والوں نے پہلے سے ہی قبر کھدوا رکھی تھی۔ جب عبدالماجد اپنے دوستوں کے ساتھ جواں سال بیٹے کا جنازہ لے کر قبرستان پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ اکیلا نہیں ہے،

تین اور باپ اپنے جوان بیٹوں کا جنازہ لے کر قبرستان آئے ہیں۔ یہ سب وہ مسلم نوجوان تھے جو جیل میں پولیس کی حراست کے دوران بہیمانہ تشدد کا شکار ہوئے تھے۔ ہاشم پورہ کے واقعات بھی اس ملک میں ذرائع ابلاغ کی سرخیوں میں نہ آتے اگر نہر میں پھینک دیئے جانے والے نوجوانوں میں کوئی زندہ نہ بچتا اور اگر ایک فرض شناس پولیس آفیسر بھوتی نارائن کی بروقت مداخلت سے پی اے سی کی ٹالین ۴۱ کے خلاف ایف آئی آر درج نہ ہوتی۔ بھوتی نارائن بنیادی طور پر ایک حساس قلم کار تھے۔ آگے چل کر انھوں نے Hashimpura 22May کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ کیس درج ہوا۔ برسہا برس کی کوششوں کے بعد ۱۹۹۶ء میں سی بی آئی اور سی آئی ڈی نے چیف جوڈیشیل مجسٹریٹ، غازی آباد کی عدالت میں ۱۹ اپریل ۱۹۹۶ء کے خلاف چارج شیٹ داخل کی۔ متاثرین کی درخواست پر ۲۰۰۲ء میں یہ مقدمہ دہلی کی عدالت میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۵ مارچ ۲۰۱۵ء کو جب فیصلہ سامنے آیا اس وقت تک تین پولیس والے اپنی فطری موت مر چکے تھے، باقی جو سولہ رہ گئے انھیں کورٹ نے شہادتوں کی کمی کے سبب بری کر دیا۔ ستائیس سال کی یہ قانونی جنگ جس طرح اپنے انجام کو پہنچی اس نے بابو دین اور ان کے ان تین ساتھیوں کو، جو معجزاتی طور پر بچ گئے تھے، ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ طرفہ یہ کہ اس دوران اتر پردیش میں ملائم سنگھ کی 'اسلامی حکومت قائم ہوئی، مایاوتی کی مسلم دوستی کا چرچا رہا، لیکن متاثرین کی دادرسی کی کسی کو توفیق نہ ہوئی۔ بھوتی نارائن کہتے ہیں کہ ہاشم پورہ اس ملک میں کوئی نادر اور انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ ہاشم پورہ دراصل کوئی وقوعہ نہیں بلکہ ایک طرز فکر کا نام ہے۔ اس لیے اس بات پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے کہ اس ملک میں فرقہ وارانہ فسادات بالعموم مسلمانوں اور پولیس کے مابین ہوتے ہیں، مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان نہیں۔ رائے کا کہنا تھا کہ میرٹھ میں جو کچھ ہوا اس کے تار اوپر تک ملتے ہیں۔ ایک معمولی سب انسپکٹر کی یہ مجال نہیں کہ وہ اس طرح قتل عام کا حکم صادر کر سکے۔ واقف کاروں کا کہنا ہے کہ ہاشم پورہ سانحہ کے بعد جب راجیو گاندھی میرٹھ کے دورے پر گئے تھے تو وہاں پی اے سی زندہ باد کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ محسنہ قدوائی اس وقت میرٹھ سے ممبر پارلیمنٹ ہوا کرتی تھیں، وہ راجیو کی کابینہ میں وزارت کے عہدے پر بھی فائز تھیں، انھوں نے سانحے کے بعد میرٹھ کا دورہ بھی کیا تھا، لیکن افسوس کہ ان کی زبان سے ایک کلمہ اف بھی نہ نکل سکا۔

## بریف کیس داعی

ملک میں ایک عمومی بے چینی تھی۔ مسلمان خود کو ایک اذیت ناک گھٹن میں محسوس کر رہے تھے۔ مسلم علماء کی تحفظ شریعت مہم کے لطن سے ہندو احواء پرستی کے عفریت نے جنم لیا تھا۔ نطقہ مطلقہ کے مسئلے پر ایک لغو اور بے ضرر قانون کے عوض ہندوؤں کو بابرئ مسجد کا تحفہ عطا کر کے راجوگاندھی نے ہندوؤں کی خوشنودی کا سامان کر لیا تھا۔ انھوں نے علماء کے ترکش سے شریعت کا تیر کچھ اس طرح اڑالیا کہ ہمارے مولوی صاحبان اور ان کے معاون دانشوروں کو اس بات کی ہوا بھی نہ لگی۔ دوسری طرف بابرئ مسجد کی سیکولر قیادت نے مسلمانوں کو ان کے نظری مقام سے ہٹا کر انھیں ایک خالص قومی جنگ میں جھونک دیا تھا۔ طرفہ یہ کہ مسلمانوں کی ملی تنظیمیں، جن میں مسلم مجلس مشاورت اور جماعت اسلامی جیسی تنظیمیں بھی شامل تھیں، وہ بھی قومی افتخاری کی اس لڑائی میں پوری قوت سے شامل ہو گئی تھیں۔ ایک عام تاثر تھا کہ جو لوگ بابرئ مسجد کے مسئلے پر مجاہدانہ جوش و جذبے کا مظاہرہ نہیں کریں گے وہ سواد اعظم سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ رہے مسجد کے قائدین تو ان کے پاس جذباتی نعروں اور گرم بیانات کے علاوہ قوم کو دینے کے لئے اور کچھ بھی نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ پوری قوم ایک بندگی میں پھنس کر رہ گئی ہو۔ ان حالات میں غلبہ اسلام کی اشاعت نے امید کی ایک نئی کرن روشن کی۔

غلبہ اسلام جسے ہندوستان میں احواء اسلام کے منشور کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا، محض کوئی علمی تصنیف نہ تھی بلکہ ایک انقلابی منصوبے کا اعلان تھا۔ کتاب کے ساتھ ایک جوابی کارڈ بھی شامل تھا جس میں قارئین سے ان کے ذاتی کوائف طلب کیے گئے تھے اور ان سے یہ پوچھا گیا تھا کہ آیا وہ غلبہ اسلام کے اس نئے مشن کو تعاون دینے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟ گویا ہم رشتہ کارڈ کی حیثیت ایک تحریری بیعت نامہ کی تھی۔ کتاب جہاں جہاں پہنچی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ سیکڑوں کی تعداد میں بیعت نامے کی کاپیاں ملک کے مختلف علاقوں سے موصول ہونے لگیں۔ بہار اور اتر پردیش کے بعض شہروں سے بعض گرم جوش مسلمان بنفس نفیس مجھ سے ملنے کے لیے علی گڑھ تشریف لے آئے۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ لوگ

صاحب کتاب کو عقیدت و محبت کے اس مقام علیا پر فائز کر دیں گے جو کسی عہد کے کبار مصلحین کا خاصہ ہوا کرتا ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے امت کو مدت سے کسی آنے والے کا انتظار رہا ہو۔ ایک دن جامع مسجد دہلی کے علاقے میں اردو بازار کے ایک مکتبہ میں تھا کہ وہیں مجھے یہ اطلاع ملی کہ تبلیغی جماعت کے حضرت جی مولانا انعام الرحمن صاحب غلبہ اسلام کے نوجوان مصنف سے ملنے کے خواہاں ہیں۔ ان دنوں چتلی قبر میں جماعت اسلامی کا مرکزی دفتر ہوا کرتا تھا۔ افضل حسین صاحب قیم جماعت اسلامی، جنہیں ہم لوگ افضل چچا کہتے تھے، اکثر فائلوں میں مشغول رہتے۔ خوش اخلاقی میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا مگر گفتگو مختصر کرتے، جیسے ابھی بہت سے کام نپٹانے ہوں۔ البتہ اس دن جب میں نے سلام کر کے آگے بڑھ جانا چاہا تو انہوں نے اپنی فائلیں لپیٹ کر رکھ دیں، سنبھل کر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے: امیر جماعت کہہ رہے تھے کہ تم نے جماعت پر سخت تنقید کر دی ہے۔ ویسے تمہاری تنقید درست ہے محاکمہ تو ہونا چاہئے۔ ہم لوگ بھی کیا کریں۔ بڑے سخت حالات میں گاڑی یہاں تک کھینچ لائے ہیں۔ ان ہی دنوں مولانا وحید الدین خان صاحب سے میری دو ایک ملاقات رہی۔ ان کی گفتگو مولانا مودودی پر تنقید سے مملو ہوتی۔ کتاب کی غیر معمولی مقبولیت دیکھ کر خیال ہوا کیوں نہ اس کا عربی اور انگریزی میں بھی ترجمہ شائع ہو جائے۔ شعبہ انگریزی کے ایک سینئر استاذ مجیب صاحب نے ششہ انگریزی میں ترجمہ کر دیا۔ مولانا اکرم ندوی ان دنوں ایک جواں سال قلم کار کی حیثیت سے ابھر رہے تھے، انہوں نے بڑی سرعت کے ساتھ کتاب کا عربی قالب تیار کر ڈالا۔ محبت مکرم کمال حلباوی صاحب نے عربی ترجمے کی تزئین و تہجیح کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ گویا دیکھتے دیکھتے ایک چھوٹی سی کتاب نے وہ شہرت حاصل کر لی کہ میں جہاں جاتا اس کتاب کی شہرت میرے تعاقب میں لگی رہتی۔ یہ صحوہ کا وہی زمانہ تھا جب سعودی اور ایرانی خیمے کے داعیان فتح اسلامی کے بڑے بڑے منصوبے بناتے۔ اور جیسا کہ پہلے بھی ذکر آیا ہے جہاد افغانستان میں امریکی شمولیت اور حمایت کے سبب اسلامی منصوبوں کو بظاہر تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس ماحول میں دین کا کام کرنا خطرات کو دعوت دینے کے بجائے بہت سے لوگوں کے لئے دنیا طلبی کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس تکلیف دہ صورت حال کی طرف متوجہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا:

’بے شمار اسلامی اداروں، انجمنوں اور تنظیموں کی موجودگی کے باوجود آخر کیا وجہ ہے کہ اسلام کی تحریک کسی قابل ذکر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو رہی ہے؟ اس اہم سوال کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ عہد جدید کے بریف کیس داعیوں میں اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے بے چینی، غلبہ اسلام کے لیے انتہائی درجے کی تڑپ اور اللہ کی راہ میں مرٹنے کی تمنا کا بڑی حد تک فقدان ہے۔ اور جب تک انسانوں کے ایک قابل ذکر گروہ میں فکر و عمل کی اس درجہ تبدیلی نہیں ہوتی اور جب تک

اسلام کے انقلابی رویے کے حاملین کا ایک گروہ پیدا نہیں ہوتا ذلت کی زندگی سے مسلمانوں کی نجات ناممکن ہے، اسلام کے غلبہ کا خیال عبث ہے۔ اس کتاب کا مقصد اسی تڑپ کو عام کرنا ہے۔ بریف کیس داعیوں پر یہ جملہ بہت شاق گزرے۔ کسی نے کہا کہ 'غلبہ' اسلام میں جن دس نکاتی منصوبے کا تذکرہ کیا گیا ہے، مصنف اسے احکام عشر (Ten Commandments) سے کم نہیں سمجھتے اور خود اپنے آپ کو حضرت موسیٰ کے مقام پر فائز سمجھتے ہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ الفاظ کا شکوہ اور لہجہ کی بلند آہنگی سے تو یہی تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے گویا اب تک اس ملک میں اشاعت اسلام کی جو کوششیں ہوئی ہیں ان کی بنا ہی غلط رکھی گئی تھی اور اب ان حضرت کو نئے دور کے مجدد کا کام سونپا گیا ہے۔ ایک صاحب جو کئی کتابوں کے مصنف تھے انھوں نے یہ پھتی کسی کہ خیر سے شاز صاحب بھی صاحب کتاب ہو گئے ہیں۔ دوسرے نے کہا: صاحب کتاب نہ کہو بلکہ اہل کتاب کہنا کہیں بہتر ہے۔ یونیورسٹی کے سیکولر حلقوں میں اس کتاب کی اشاعت کو کچھ اس طرح دیکھا گیا جیسے ایک نئی radical قیادت ظہور میں آنے کو بیتاب ہو۔

ایک دن شعبہ انگریزی میں بیٹھا پی ایچ ڈی کے مقالے کی ترتیب و تصویب میں مصروف تھا کہ غیر متوقع طور پر سٹنسی کی آمد ہوئی۔ ان کے ہاتھ میں 'غلبہ' اسلام کا ایک نسخہ تھا جس کے حاشیے پر جا بجا انھوں نے اپنے ملاحظت لکھ رکھے تھے۔ چھوٹے ہی کہنے لگے: ارے بھئی یہ کیا بات ہوئی ہمارے خیال میں تو غلبہ کا پیراڈائم (paradigm) ہی غلط ہے۔ کیوں چاہئے ہمیں غلبہ؟ کیا غلبہ کے بغیر ہم مسلمان نہیں رہ سکتے؟ اور حدیبیہ کو ہم مشعل راہ کیوں نہیں بناتے؟ ہمارے خیال میں توفیق مبین کا راستہ حدیبیہ سے ہو کر ہی گزرتا ہے۔ میں نے کہا، یہ سب کچھ حدیبیہ تک لے جانے کی ہی سعی ہے۔ حدیبیہ دراصل برپا کرنا پڑتا ہے، اسے انقلابی تحریک کا منہا سمجھو۔ جو لوگ اسے صرف pacifism کا علامیہ سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ کہنے لگے، ریاست اور خلافت کی بات میرے خیال میں دراصل ایک اضافی شئی ہے۔ سٹنسی ان دنوں مولانا وحید الدین خاں کی تحریروں کے زیر اثر تھے۔ لوگوں کو ان کی تعبیر کی غلطیوں پر کچھ اسی اعتماد کے ساتھ مطلع کرتے کہ کس طرح خدا اس دن بعض لوگوں کی دینی خدمات کو یہ کہہ کر ان کے منہ پر دے مارے گا کہ یہ باتیں جن پر تم دین سمجھ کر عامل رہے ان باتوں کا تو ہم نے سرے سے حکم ہی نہیں دیا تھا۔ کہنے لگے کہ دنیا میں امن قائم کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں کہ مروجہ نظام (status quo) کو غیر مشروط طور پر قبول کر لیا جائے۔ میں نے کہا کہ انبیاء status quo کو توڑنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ خود رسول کا مقصد بعثت و یضع عنہم اصرہم والاعلال التی کانت علیہم بتایا گیا ہے۔ انبیاء ہوں یا ان کے پیروکار اگر انھوں نے نظام ظلم کے آگے سرخم کر دیئے تو کونو اقوامین بالقسط کا علم کون اٹھائے گا۔

مگر یہ جو ریاست کو دین کے مرکز و محور میں رکھ دیا جاتا ہے یہ تو مناسب نہیں۔

میں نے کہا: محور میں نہ رکھو مگر حاشیے سے غائب بھی نہ کرو۔ جس چیز کا جو مقام ہے اسے وہیں رہنے دو۔ تم کہتے ہو خلافت بعد کی ایجاد ہے تو میرے بھائی خلافت تو نام ہی اس نظام کا ہے جو صال نبویؐ کے بعد پہلی نسل کے مسلمانوں نے امت کے شیرازہ کو متحد رکھنے کے لیے تشکیل دیا تھا۔ ابو بکرؓ نے اپنی امارت کو خلیفہ رسول اللہ کی حیثیت سے جواز بخشا۔ عمرؓ نے خود کو خلیفہ خلیفہ رسول اللہ کہا۔ گویا امت کی شیرازہ بندی رسولؐ کو محور میں رکھ کر کی گئی اور امیر المؤمنین کی اتباع خلیفہ رسولؐ ہونے کے سبب لازم ٹھہری۔ کبھی ثقیفہ کے مجمع میں خلیفہ کی تقرری ہوئی تو کبھی مشاورت سے نامزد کیا گیا اور کبھی کبار صحابہؓ کی کمیٹی نے باہمی مشاورت سے اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی۔ بس یہ سمجھو کہ ایک نبوی محور کے گرد امت کی شیرازہ بندی کا کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اسے خلافت کہو یا امامت یا امرہم شورئ بینہم کے تحت کوئی اور نام دے لو۔ اس حقیقت سے تو انکار ممکن نہیں کہ رسول اللہ نے اپنی زندگی میں اور آپ کے بعد مسلمانوں کی پہلی نسل نے اس بات کا بھرپور التزام کیا کہ مسلمان نہ صرف یہ کہ ایک اجتماعی نظم کا حصہ بنیں بلکہ ان کی اجتماعی اور ملی قوت سے چہار دانگ عالم میں عدل و قسط کے قیام کا کام لیا جائے۔

سٹمش سے ہماری گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ اسی دوران احمد سورتی صاحب تشریف لے آئے۔ سورتی صاحب ان دنوں یونیورسٹی سے سبکدوش ہو چکے تھے البتہ جب کبھی لائبریری آتے تو ہمیں بھی اپنی آمد سے مشرف فرماتے۔ کہنے لگے: ارے بھئی میں تو سمجھا یہاں کوئی کلاس ہو رہی ہے، پھر شاز میاں کی آواز سنی تو خیال آیا کہ جس کلاس میں شاز موجود ہوں تو وہ کلاس آف کلاس ہوگی، میتھ میٹکس میں وہ سٹ تھیوری ہے نا....

’مگر سٹمش کو تو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ آگے کیا ہوگا، اس ملک میں ہم اپنی شناخت کے ساتھ باقی بھی رہ پائیں گے یا نہیں، میں نے سورتی صاحب کی آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سوال کا رخ ان کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔

بولے: بہت ہی اہم اور حساس سوال ہے، تم لوگوں کو اس پر ضرور غور کرنا چاہئے۔ ہمارا واسطہ انتہائی مکار اور مچٹ لوگوں سے ہے۔ مکر کا مقابلہ مکر محض سے نہیں ہو سکتا اس کے لئے پیمبرانہ بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مکروا و مکر اللہ عام طور پر لوگ ترجمہ کرتے ہیں کہ وہ مکر کرتے ہیں اور خدا مکر کرتا یعنی چالیں چلتا ہے۔ حالانکہ خدا کی چالوں کی نوعیت ہی الگ ہے۔ اہل کفر کی دسیسہ کاریوں کے مقابلے میں خدائی ترکیبوں کی مثال یوں سمجھو جیسے سامری کے مقابلے میں عصائے موسیٰ۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم وقت کے سامری کا مقابلہ پیمبرانہ سطح پر کریں، عام ساحروں کے روایتی ہتھیاروں سے نہیں۔

’گویا ہندو احياء پرستی کا مقابلہ مسلم احياء پرستی سے نہ کیا جائے، سٹشی نے گفتگو کے اطلاق پہلو کو کھولنے کی کوشش کی۔

بولے: ’تم نے بالکل صحیح سمجھا۔ پہلے بھی ہم نے ہندو قوم پرستی بنام مسلم قوم پرستی سے بہت نقصان اٹھایا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ملک دو لخت ہوا بلکہ اس حادثے میں ہماری عددی قوت تحلیل ہو کر رہ گئی۔ اب ان ہی خطوط پر ایک قومی جنگ کی تیاری ہو رہی ہے، یہ کسی طور بھی ایک صحت مند ترکیب نہیں ہے، اس راستے میں شکست ہمارا مقدر ہے۔

’اور ہاں! میں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں تمہارا موقف درست ہے، البتہ اس میں مزید تراس خراش کی ضرورت ہے، انہوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

’مگر اس وقت تو پوری امت اس بات پر متفق ہو گئی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہے۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی والے جو ایک اسلامی آئیڈیل ازم کے داعی رہے ہیں وہ بھی مسلمانوں کی اس قومی جنگ کا حصہ بن گئے ہیں، سٹشی نے تشویش ظاہر کی۔

بولے: ایک دور تھا، گو کہ وہ بہت مختصر رہا، جب جماعت اسلامی کی دعوت میں پیسیرانہ لب و لہجے کی شان پائی جاتی تھی۔ مولانا مودودی کی ابتدائی تحریروں میں دیکھئے، ان کا ذہن اس بارے میں خاصا صاف ہے کہ روزِ حشر خدا اس بنیاد پر فیصلہ نہیں کرے گا کہ کسی کا نام عبداللہ ہے یا رام پرشاد۔ وہاں فیصلے کی بنیاد نیک اعمال ہوں گے، محض زبانی اقرار نہیں۔ انہوں نے خطبات میں اس نکتے کو بہت آسان اسلوب میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی خدا کی رحمت صرف ان ہی کے لئے ہے جو اس کو پہچانتے اور اس کی فرماں برداری کرتے ہیں۔ جن لوگوں میں یہ صفت نہیں ہے ان کے نام خواہ عبدالرحمن ہوں یا دین دیال، خدا کے نزدیک ان دونوں میں کوئی فرق نہیں اور ان کو اس کی رحمت سے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ مگر بعد کے دنوں میں یہ پیسیرانہ شان باقی نہیں رہ سکی۔ اور اب تو مسلمانوں کے دوسرے دھڑوں کی طرح ان کے ہاں بھی قومی، ملی اور تہذیبی شناخت پر بڑا اصرار ہے۔

پھر تو ہمیں چاہیے کہ ہم موجودہ صورت حال میں اپنے پیسیرانہ رنگ و آہنگ کو صیقل کرتے رہیں تاکہ اہل وطن کو یہ پتہ چلے کہ ہم کوئی اور نہیں اس آخری پیغام کے امین ہیں جس کے بغیر تاریخ کے آگے کا سفر بے معنی ہو جاتا ہے۔ سٹشی نے امت مختار کی نظری حیثیت کو واضح کرنے کی کوشش کی۔

’جی ہاں! اس ملک کے باسیوں کو اگر پتہ چل جائے کہ ہم واقعی کون ہیں، ہمارا مستقبل کی خدائی اسکیم میں کیا مقام ہے تو جو لوگ حجر و شجر کی پرستش کو لازم جانتے ہیں تو کیا عجب کہ وہ ہم سے لڑنے کے بجائے

ہماری تقدیس و تعظیم پر آمادہ ہو جائیں۔ انہیں اگر معلوم ہو جائے کہ ہم امتِ مختار ہیں، اس ملک میں رحمتیں ہماری وجہ سے نازل ہوتی ہیں، ہم نہ ہوں تو بارش رک جائے، زمین نعمتیں اگلا بند کر دے، سورج اپنی ضیاء پاشی سے پہلو تہی کرے۔ میں نے ایک ممکنہ اسٹریٹیجی کی طرف اشارہ کیا۔

بولے: یہ امتِ مختار والی ترکیب بھی ایک جال (trap) ہے، ایک گورکھ دھندا ہے جس میں بسا اوقات شکاری خود ہی پھنس جاتا ہے۔ اس ملک میں صوفیا اور سادات کے حلقوں نے اپنی تقدیس و تکریم کا غلغلہ بلند کیا۔ وہ برکتیں بانٹتے رہے، لوگ ان کا آشیر واد لیتے رہے، درشن کرتے رہے۔ مگر ان باتوں سے کیا ہوا۔ یہ کام تو اپنے انداز میں برہمن بھی کرتے ہیں۔ ہمارا کام تو ہانکے پکارے کو نوار بانین کی دعوت دینا ہے۔ نبی کہتا ہے ربّانی بنو، اس کے برعکس جو لوگ منصبِ نبوت کا صحیح شعور نہیں رکھتے وہ اس دعوت کو نوا عباد اُلی میں بدل دیتے ہیں، اپنی تقدیس و تکریم کی دعوت ان کے درس و ارشاد کا محور بن جاتا ہے۔ خود کو امتِ مختار سمجھنا ایک بات ہے اور اس منصبِ عظیم پر فائز ہونا ایک بالکل ہی دوسری بات۔

’میں سمجھا نہیں! باتیں ایسا لگتا ہے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئی ہوں، سٹمشی نے وضاحت طلب کی۔

بولے: ’ہمارا امتِ مختار ہونا اس کارِ نبوت کے سبب ہے جو نبی کے نائب اور وارث کی حیثیت سے ہمیں تفویض ہوا ہے۔ اگر ہم نے اس کارِ نبوت سے پہلو تہی کی تو ہم اس اعزاز کے مستحق نہیں رہتے۔ اہل یہود بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندوں میں ہیں، انہیں خدا نے تمام اقوامِ عالم پر فضیلت دے رکھی ہے۔ حالانکہ ان کی یہ فضیلت تورات کے حاملین ہونے کے سبب تھی، جب انہوں نے تورات کی تعلیمات اور اپنے قائدانہ مقام کا پاس نہ رکھا تو وہ از خود اس منصب سے معزول ہو گئے۔ پھر ان کی خوش فہمیاں ان کے کچھ بھی کام نہ آسکیں۔ نازی جرمنی کی عقوبت گاہوں میں جب ان پر ظلم و ستم کی رات طویل ہوتی گئی تو ان کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ خدا نے اپنی فضیلت یافتہ قوم کو اس طرح بے یار و مددگار کیوں چھوڑ دیا۔

’گویا یہ احساس ایک طرح کے جذبِ عظمت کو بھی جنم دے سکتا ہے۔

بولے: ہاں! اگر کوئی قوم ایک false sense of chosenness میں مبتلا ہو جائے تو وہ خود بھی تباہ ہوتی ہے اور دوسروں کی تباہی کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ اب اسی نازی جرمنی کے واقعے کو لو۔ اہل یہود کا روایتی جذبِ عظمت انہیں لے ڈوبا، وہ نوشتہ دیوار کو نہ پڑھ سکے۔ دوسری طرف جو لوگ انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے وہ بھی اپنے آپ کو ایک خدائی مشن پر مامور سمجھتے تھے۔

کیا مطلب؟ ہٹلر بھی کیا کوئی مذہبی آدمی تھا؟ سٹمشی نے حیرت سے پوچھا۔

’مذہبی تو اہل یہود بھی نہیں رہ گئے تھے۔ خطِ عظمت کا اسیر ہونے کے لئے آدمی کا مذہبی ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ ہٹلر کا یہ خیال کہ جرمن قوم کو خدا نے نسلی اعتبار سے برتر بنایا ہے، سیادت ان کے لئے مقدر کی گئی ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ اس خیال کے تانے بانے بھی دراصل لوہر کی تحریک اصلاح سے جاملتے ہیں۔‘  
’واقعی؟ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔‘

ہاں! اس طرف لوگوں کی توجہ کم ہی گئی ہے بلکہ اس سیاق میں نازی جرمنی کے ظہور کا مطالعہ ابھی باقی ہے۔ واقع نگاروں نے لکھا ہے کہ ۱۸۷۱ء میں پروشین (جرمن) فوجیں جب فرانسیسیوں کو شکست دینے کے بعد برلن کو واپس آرہی تھیں انہوں نے ایک بڑا بینر آویزاں کر رکھا تھا جس پر لکھا تھا: "Welch eine Wendung durch Gottes Fugung" (یعنی خدائی مداخلت سے اچانک حالات نے کیسے پلٹا کھایا)۔ اس عہد میں پروٹسٹنٹ علماء اپنی تقریروں میں اس بات کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے کہ خدا نے بے دین فرانسیسیوں کی تذلیل کے لئے جرمن قوم کو منتخب کیا ہے۔ لوہر کی معنوی اولاد کے ہاتھوں ان لوگوں کی تذلیل جنہوں نے انسانی عقل کو اپنا خدا بنایا، حکمرانی کے حقوق بادشاہوں سے لے کر اپنے جیسے عام انسانوں کو دے دئے، سیکولرازم کی کوکھ سے جنم لینے والی تحریکِ تنویر (Enlightenment) کی حمایت کی جس کے یطن سے انقلابِ فرانس کا ظہور ہوا اور جس کے سبب چرچ کی حکمرانی کا تصور پاش پاش ہو گیا۔ ایسے لوگوں کو سزا دینے کے لئے اگر خدا نے جرمن قوم کو منتخب کیا ہو تو ان کے لئے اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی تھی۔

گویا اس عہد میں نظری اعتبار سے جرمنی اور فرانس دو مختلف کیمپوں میں بٹے ہوئے تھے؟

ہاں! اس عہد کے سماجی منظر نامے پر نظر ڈالو تو بڑی دلچسپ تصویر نظر آتی ہے۔ ۱۸۱۳ء میں نپولین پر جرمن قوم کی فتح کا معاملہ ہو، یا ۱۸۷۰ء کی جنگ ہو یا پہلی جنگِ عظیم کے ایام، ہر موقع پر پروٹسٹنٹ علماء کی تقریروں سے ایسا لگتا ہے کہ جرمن قوم ایک خدائی مشن پر مامور ہو۔ ان کے نزدیک نپولین کی حیثیت ایک مسیحِ دجال کی تھی جس کی بیخ کنی کے لئے خدا نے جرمن قوم کو منتخب کیا تھا۔ اس عہد میں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے خیمے میں غیر معمولی سرگرمیاں نظر آتی ہیں۔ جابجا خانقاہیں قائم ہوتی ہیں، معذوروں اور یتیموں کی مدد کے لئے مراکز وجود میں آتے ہیں، مشنری سرگرمیاں تیز ہو جاتی ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے مسیح کے ظہورِ ثانی کا وقت اب قریب آ گیا ہو، جیسے خدائی بادشاہت کے قیام میں اب محض چند ثانیے رہ گئے ہوں۔

’مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک خالص مذہبی تحریک کے یطن سے نسل پرستی اور وہ بھی جارح نسل پرستی کا ظہور کیوں کر ہوا؟‘ سٹمش نے تخصیص کے ساتھ جاننا چاہا۔

بولے: بات بہت واضح ہے۔ مذہب کا تو یہاں صرف نام استعمال ہو رہا تھا ورنہ اصل دعوت تو نسلی

تفوق کی ہی دی جا رہی تھی۔ لو تھر کو ایک مذہبی مصلح سے کہیں زیادہ ایک قومی ہیرو کی حیثیت حاصل تھی۔ لو تھر نے خود کو جرمن قوم کے نجات دہندہ کی حیثیت سے پیش کیا تھا، ان کی دعوت میں نہ صرف یہ کہ پیپیر انہ لب و لہجے کا فقدان تھا بلکہ ان کے دل میں اہل یہود کے لئے نفرت و عداوت کا طوفان برپا تھا۔

’عجیب! مگر لو تھر کی شخصیت کے اس تاریک پہلو پر گفتگو کم ہی کی جاتی ہے۔ عام طور پر تو انہیں ایک روشن خیال مصلح تصور کیا جاتا ہے، بلکہ بہت سے سیکولر مسلمانوں کی زبان سے گا ہے بگا ہے یہ جملہ بھی سننے کو ماتا ہے کہ کاش اسلام کو بھی کوئی لو تھر ملا ہوتا، میں نے خیال ظاہر کیا۔

بولے: یہ سب نادانی کی باتیں ہیں میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر لو تھر نہ ہوتے تو شاید ہٹلر کا ظہور بھی نہ ہوتا۔ وہ کیسے؟ لو تھر تو ایک مذہبی مصلح ہیں، پروٹسٹنٹ چرچ میں ان بڑی اہمیت ہے جبکہ ہٹلر کو عام طور پر بدی کی ایک علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

بولے: گو کہ ان دو شخصیات کے بیچ کوئی چار سو سال کا فاصلہ حائل ہے، نظری طور پر یہ دونوں ہی جارج قوم پرستی کے نقیب ہیں، دونوں ہی اہل یہود کو زندہ رہنے کا حق دینا نہیں چاہتے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ لو تھر کے ہاں یہ سب کچھ مذہبی لب و لہجے میں ہے تو ہٹلر کے ہاں سیکولر عہد کے دلائل، مثلاً سوشل ڈارووزم کو بھی جرمن نسل پرستی کے حق میں استعمال کیا گیا ہے۔ مگر حل دونوں کے ہاں ایک ہے۔ وہ یہ کہ اہل یہود سے مذہبی تشخص کے ساتھ جینے کا حق چھین لیا جائے۔

’مگر عجیب بات ہے کہ ہٹلر جہاں مجمع خلألق میں راندہ درگاہ ہے وہاں لو تھر کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔‘

بولے: مذہبی تقدس کا یہی تو فائدہ ہے۔ عام لوگوں کے جرائم باسانی طشت از بام ہو جاتے ہیں جبکہ مذہبی دسیسہ کاریوں اور قیل و قال پر تقدس کا پردہ پڑا رہ جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کھلی آنکھوں سے لو تھر کا رسالہ 'On the Jews and their Lies' پڑھے گا تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ لو تھر نے اہل یہود کے مسئلے سے نپٹنے کی جو ترکیبیں بتائی تھیں، ہٹلر نے ان ہی ترکیبوں کو مزید نئے اضافوں کے ساتھ عملی جامہ پہنایا ہے۔ اچھا! دونوں کے نقطہ نظر میں اس قدر مماثلت ہے، شمسی نے حیرت سے پوچھا۔

بولے: ہاں لو تھر نے اہل یہود کی عبادت گاہوں کو جلانے، ان کے گھروں کو تباہ کرنے، ان کی مذہبی کتابوں کو ان سے چھین لینے، ان کے رہائشیوں کو درس و اشاعت سے روکنے، ان پر سفری پابندی عائد کرنے، ان کی سودی مالیات کو ختم کرنے اور ان کے نوجوان لڑکے لڑکیوں سے جبراً کام لینے کی تلقین کی تھی۔ ہٹلر نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنی طرف سے کچھ اور اضافے کر دیئے، مثلاً اہل یہود کی آریائی نسل سے شادی پر

روک، یہودیوں کی علیحدہ بستیاں یعنی ghettos کا قیام، کمنٹریل جس میں یہودیوں کو بھی شامل کیا جاتا تھا ان کی نس بندی وغیرہ۔ گو کہ جرمن یہودی اپنے آپ کو جرمن شہری سمجھتے تھے، لیکن لوٹھر اور ہٹلر دونوں انھیں محض یہودی تسلیم کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہودی ہونے کا مطلب تھا کہ وہ جرمن مخالف ہیں۔ ہٹلر کی نگاہوں میں لوٹھر کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ اپنی کتاب مین کیمپ (Mein Kampf) میں اس نے لوٹھر کو دنیا کے عظیم ترین سورما کا لقب دیا ہے۔ ہٹلر کے زوال کے بعد جب ان کے پیروکاروں پر مقدمہ چلایا گیا تو ان میں سے بعض سرکردہ لیڈروں نے یہ بات کہی تھی کہ آج اگر مارٹن لوٹھر ہوتے تو وہ بھی ہمارے ساتھ اس کٹھرے میں کھڑے ہوتے کہ ان کا خیال تھا کہ یہودی سانپ کی قبیل سے ہیں، ان کی عبادت گاہوں کو آگ لگا دینا چاہئے اور انھیں تہ تیغ کر دینا چاہئے۔ ہٹلر کے بہت سے پیروکار انھیں مارٹن لوٹھر کا اوتار سمجھتے تھے۔ جرمن نیشنلزم کا خمیر یہودی مخالف جذبات سے تیار ہوا تھا۔ اس اعتبار سے ہٹلر اور لوٹھر ایک ہی سکہ کے دو رخ معلوم ہوتے ہیں۔

’گویا جرمن نیشنلزم خیرامت کی ہی ایک سیکولر تعبیر تھی؟‘

سیکولر نہ کہو، گمراہ کن کہو۔ آمریت اپنے ساتھ بہت سے مفاسد لاتی ہے۔ نفسیات کی اصطلاح میں ایک لفظ ہے: ہیوبرس (hubris)۔ یہ نرگسیت سے ایک درجہ آگے کا مرحلہ ہے۔ جب لیڈر کا تعلق حقائق کی دنیا سے بڑی حد تک منقطع ہو جاتا ہے اسے ایسا لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، ایسا کرنے میں خواہ اسے خلق کی تائید حاصل نہ ہو، مگر کائنات کی تمام قوت اس کے ساتھ ہے۔ اس کے ہاتھوں میں قوت کا ارتکاز اسے باور کراتا ہے کہ وہ ایک الہی مشن پر مامور ہے، حالانکہ یہ سب کچھ بنیادی طور پر پرسنالٹی ڈس آرڈر (personality disorder) کے سبب ہوتا ہے۔ ہم جنہیں کرشماتی شخصیات سمجھتے ہیں، ان کے دل و دماغ میں کس قسم کے توہمات و مسلمات کا ڈیرہ ہوتا ہے تو اس پر سے بھی سریت کا نقاب اٹھنا باقی ہے، یہ کہتے ہوئے سورتی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں نے سوچا سورتی صاحب شاید صحیح کہتے ہیں۔ خیرامت ہونا ایک نازک اور حساس امر ہے۔ بسا اوقات پتہ نہیں چلتا کہ آپ پیمبرانہ مقام سے کب پھسلے اور کب قومی افتخار کی لڑائی میں شامل ہو گئے۔ بابر مسجد کے قائدین ہی پر کیا موقوف دنیا میں بڑی بڑی فتنہ سامانیاں قیام امن اور حصول انصاف کے بہانے ہی روارکھی جاتی ہیں۔ امریکی استعمار اپنی توسیع پسندی کو انسانی حقوق اور فرد کی آزادی کا نام دیتا ہے۔ امریکی ڈالر کی سطوت بھی اسی تقدیری حوالے سے قائم ہے جس پر لکھا ہوتا ہے: In God We Trust۔

## گولامی کا بوجھا

ملک میں حالات اب بھی تشویشناک بلکہ ہنگامی اور اضطراری نوعیت کے تھے۔ ان حالات میں تحقیقی اور علمی کاموں کی گنجائش کہاں تھی۔ مگر استاذ مکرم پروفیسر جعفر ذکی صاحب رضوی کا مشفقانہ اصرار تھا کہ اب میں پوری تندہی کے ساتھ اپنے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے کی تیاری میں لگ جاؤں۔ انھوں نے خاص اس مقصد کے لئے یونیورسٹی سے ایک سال کی چھٹی بھی لے لی تھی۔ لیکن ابھی پہلے باب کے ابتدائی صفحات پر ہی نگاہ ڈالی تھی کہ ان پر انجانا کا شدید حملہ ہوا۔ چند دنوں بعد جب طبیعت نے سنبھالا لیا تو مجھے اس امر میں تکلف محسوس ہوا کہ استاذ محترم پر علمی کاموں کا بوجھ ڈالا جائے۔ میرے شدید اصرار پر وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ سردست مقالے کی تصحیح و تبویب کا کام ان کی جگہ نقوی صاحب انجام دے ڈالیں۔ اب کام کی ترتیب یہ بنی کہ میں ہر روز ایک منصوبے کے تحت دس بارہ صفحات لکھتا اور اگلی صبح نقوی صاحب کو دکھاتا۔ میری عادت ایک انگلی سے ٹائپ کرنے کی تھی۔ ابھی اس عمل پر دس بارہ دن ہی گزرے ہوں گے کہ انگلیاں ونگار ہونے لگیں۔ خدا کا کرنا ان ہی دنوں مغربی بنگال سے ایک نوجوان اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ علی گڑھ میں وارد ہوئے تھے۔ ان کی شادی نے سماجی تنازع کی شکل اختیار کر لی تھی اور دفعِ فتنہ کے خیال سے انہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ وہ کسی مناسب دفتری کام کی تلاش میں تھے۔ میرے عم زاد محترم جاوید ذوالقرنین صاحب کے توسط سے وہ میرے پاس تشریف لائے۔ ان کا نام شریف تھا، آدمی اسم بامسمیٰ تھے، انگریزی ٹائپنگ کا اچھا تجربہ تھا۔ ایسا لگا جیسے خدا نے انہیں میری معاونت کے لئے خاص طور پر بھیجا ہو۔ شریف بھائی روز سہ پہر میں تشریف لاتے، میں انہیں مسودہ املا کراتا اور وہ بڑے سلیقے سے ٹائپ شدہ اوراق میرے حوالے کر جاتے۔ اس طرح چار پانچ ماہ کے مختصر عرصے میں مقالے کا پہلا ڈرافٹ تیار ہو گیا۔

ایک دن شریف بھائی کے ساتھ مسودے کی تصحیح و تزئین میں مصروف تھا کہ اسی دوران عبدالقادر ادھر آنکے۔ عبدالقادر سے میری پرانی شناسائی تھی، وہ صومالیہ کے رہنے والے تھے اور اب دارالحکومت مقدیشو میں ہونے والی خانہ جنگی کے سبب وطن واپسی کا ارادہ ترک کر چکے تھے۔ ان پریشان کن حالات میں بھی

ہمیشہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی لیکن اس دن غیر معمولی طور پر متوحش نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے: برودر! یونو شیطان از ویری کلیور، اگر فوراً کچھ نہ کیا گیا تو وہ اپنا کام کر جائے گا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ شیطان کو اپنا کام کرنے دو۔ رحمان کے بندے اپنا کام کریں۔ بولے: بات بہت سنگین ہے، مذاق کا موقع نہیں۔ عثمان سے تم واقف ہو، اچھا خاصا نمازی اور پرہیزگار آدمی ہے، اس کے اور ایندھن کے بیچ الفت و محبت کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر فوری طور پر کوئی مناسب حل نہ نکالا گیا تو خطرہ ہے کہ شیطان بیچ میں آجائے۔ میں نے کہا شیطان کو چھوڑو بس تم بیچ میں نہ آنا۔ بولے: میں تو قاضی کی تلاش میں نکلا ہوں اور تم سے مدد کا خواہاں ہوں۔ میں نے کہا یہ لوگ چند دن رک کیوں نہیں جاتے تاکہ ان کے والدین بھی اس تقریب میں شامل ہو جائیں؟ بولے: ان کے گھر تک یہ بات پہنچی تو یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ لڑکی ابغال قبیلے کی ہے اور عثمان کا تعلق ہجر جدیر قبیلے سے ہے۔ صومالیہ کی خانہ جنگی میں یہ دونوں قبائل ایک دوسرے سے برس پیکار ہیں۔ سردست نکاح کے علاوہ اس مسئلہ کا کوئی اور حل ہے نہیں۔ عبدالقادر کی باتیں سن کر اچانک مجھے اپنا پرانا کلاس نیلوعلی باقر یاد آیا۔ باقر ایک عراقی طالب علم تھا، کچھ دنوں سے کلاس سے غائب رہا، نظر آیا تو میں نے خیریت پوچھی۔ بولا: کچھ مسائل درپیش تھے، اچھی بات یہ ہے کہ ہم نے بالآخر شیطان کو دور بھگا دیا ہے۔ میں حیران ہوا، پوچھا وہ کیسے؟ مسکراتے ہوئے بولا: متعہ کر لیا ہے اور اب بے خوف جیتا ہوں۔

عبدالقادر مصر تھے کہ فوری طور پر کسی قاضی کی خدمات حاصل کی جائیں۔ میں نے سوچا کیوں نہ مولانا تقی امینی صاحب سے اس بارے میں مشورہ کیا جائے۔ مولانا بڑے آدمی تھے، مگر ہم طلباء سے ایک طرح کی بے تکلفی روا رکھتے۔ اگلے دن مولانا کی رہائش گاہ پر نکاح کی تقریب انجام پا گئی اور اس طرح شیطان کو ایک بار پھر منہ کی کھانا پڑی۔

چند دن بعد جب میں ولیمہ کی سادہ سی تقریب میں شرکت کے لیے عثمان کے گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ شریف بھائی بھی اسی مکان کے ایک گوشے میں رہتے ہیں۔ بڑے اصرار سے وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ اپنی اہلیہ عائشہ سے متعارف کرایا۔ ابتدائی گفتگو کے بعد اندازہ ہوا کہ عائشہ ایک دلت نو مسلم کے گھر پیدا ہوئیں۔ عمرانیات میں ایم اے کی طالبہ رہی ہیں اور انہیں اپنی تعلیم کے انقطاع کا افسوس ہے۔ کہنے لگیں: شاید دو چار ماہ میں لوگوں کی فتنہ سامانیاں ٹھنڈی ہو جائیں اور ہمارے لیے وطن واپسی کی راہ آسان ہو۔

میں نے کہا اسلام آپ کا خاندانی نہیں بلکہ اختیاری دین ہے، ایک اعتبار سے آپ کا تعلق مسلمانوں کی دوسری نسل سے ہے، جنہیں ہم تاریخ میں تابعین کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ ایک بڑا اعزاز ہے۔ ایمان

کے اس سفر میں آپ جہاں تک پہنچی ہیں وہاں سے آگے کی منزل کیسی دکھائی دیتی ہے؟ یہ سن کر عائشہ کے چہرے پر ایک لہرائی گئی، پھر ایسا لگا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہوں۔ بولیں: شریف اکثر ایک شعر پڑھا کرتے ہیں:

یہ شہادت گمہ اُلفت میں قدم رکھنا ہے  
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

میں بھی سمجھتی ہوں کہ ایمان کی زندگی جینا کچھ آسان نہیں۔ ابھی ایک چیلنج سے نکلے نہیں کہ دوسرا چیلنج سامنے آجاتا ہے۔ اور ہم لوگ تو کئی جزییشن سے اپنی اصل آتما کی تلاش میں ہیں۔ آتما کیا عزت نفس کہو۔ ایک زمانے تک ہم لوگ بدھ مت کے اسیر رہے۔ پھر اللہ نے اسلام کی طرف رہنمائی کی اور اب ایسا لگتا ہے کہ یہاں سے آگے کی بھی کوئی منزل ہے، پتہ نہیں خدا کو کیا منظور ہے۔

اسلام سے آگے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

بولیں: جس اسلام کی تلاش میں ہمارے پرکھوں نے اسلام قبول کیا تھا، وہ تو ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس بھی نہیں۔

کیا مطلب؟ میں نے وضاحت چاہی۔

بولیں: ایک ہے نظری اسلام اور ایک ہے عوامی اور عملی اسلام یعنی وہ اسلام جس کا سکہ مسلمانوں میں چلتا ہے۔ میں آج کل اشرف اور اجلف کی بحثیں پڑھ رہی ہوں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں بھی اونچی ذات کے لوگ، نیچی ذات کے لیے کفو نہیں ہو سکتے۔ فتاویٰ رضویہ میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ جلاہا، دھنیا، تیلی جیسی قوموں کے لوگ اگر عالم بھی بن جائیں جب بھی وہ سید اور شیخ کے کفو نہیں ہو سکتے۔ میں حیران ہوں کہ یہ وہی اسلام ہے جس کے خدا کا فرمان ہے: **إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتِّقَاكُمْ**۔ اسلام کیا تھا اور کیا سے کیا بنا دیا گیا۔

علماء کے دواوین تو ان کے انفرادی رجحانات کو ظاہر کرتے ہیں۔

بولیں: تمہاری بات درست ہے مگر چلتی تو ان ہی کی ہے۔ دین کے نمائندے یہی سمجھے جاتے ہیں۔ فتاوے ان ہی کے قلم سے صادر ہوتے ہیں۔ عام لوگ تو انہیں دین مبین کا سچا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ ان کا حکم چل جاتا ہے اور قرآن کی بات پیچھے رہ جاتی ہے۔ جب بھی کوئی شخص دھرم کے حوالے سے انسان کا اپمان کرتا ہے تو میں اپنا توازن کھودیتی ہوں۔ شاید میں اس معاملہ میں بہت حساس ہوں، مگر میں بھی کیا کروں۔ میں تو اس سماج سے آئی ہوں، جہاں لوگ صدیوں سے اپنی آتما پوتر کرنے کے لیے ترکیبیں تلاش کرتے

رہے ہیں، لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ اپنی آتما کو پالینا، اپنے وقار کو حاصل کر لینا، تو ابھی تک سچ پوچھو تو ہم یہ حاصل نہیں کر پائے ہیں۔

یہ صدیوں والی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے عائشہ کو کریدنے کی کوشش کی۔ بولیں: شاید شریف نے تمہیں بتایا نہیں۔ ہم لوگ پہلے بدھ مت سے تعلق رکھتے تھے۔ والد صاحب نے اسلام قبول کیا۔ اس اعتبار سے میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی۔ جب مجھے اپنی پرانی تاریخ کا علم ہوا تو مجھے حیرت ہوئی کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے آپ کو آدمی ثابت کرنے کے لیے کتنا لمبا سفر طے کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اب بھی پورا آدمی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ لوگوں کو لگتا ہے کہ ہم لوگ کوئی کمتر درجے کی مخلوق ہیں۔ چلی ذات یعنی انسان سے ایک درجہ کم۔

یہ احساس آپ کو پہلی بار کب ہوا؟

بولیں: میں ممبر میں پیدا ہوئی جہاں میرے والد قبول اسلام کے بعد بمبئی سے نقل مکانی کر کے آگئے تھے۔ میری عمر یہی کوئی چار پانچ سال رہی ہوگی۔ نیا شہر تھا، نئے لوگ تھے۔ والد صاحب نے ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک چھوٹی سی دکان ڈال لی تھی۔ میرا داخلہ ایک اردو میڈیم اسکول میں ہو گیا تھا۔ اسکول کیا چھوٹا سا غیر رسمی مدرسہ کہہ لیجئے جہاں محلے کی اور بھی بہت سی لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ کئی سال تک تو مجھے اس بات کا پتہ ہی نہ چلا کہ میں کون ہوں، کہاں سے آئی ہوں۔ ایک دن والد صاحب کے پاس خبر آئی کہ ہمارے خاندان میں کسی بزرگ کا انتقال ہو گیا ہے۔ پونہ کے مضافات میں ایک چھوٹی سی بستی ہے جہاں سے ہم لوگوں کا آبائی تعلق ہے۔ شروع کے دو چار دن تو بڑی افراتفری رہی۔ سوگ کا ماحول جب کم ہوا اور جب میں خاندان کے بچوں میں گھلی ملی تو پتہ چلا کہ ہم لوگ دراصل مہارذات سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارے پرکھوں نے بابا صاحب امبیڈکر کی تحریک پر تبدیلیی مذہب کے بعد بدھ مت قبول کر لیا تھا۔ گاؤں میں ہمارے خاندان کے بقیہ لوگ اپنے پرانے بدھ مذہب پر اب بھی قائم تھے۔ قائم کیا تھے دراصل وہ ہندو مذہب سے اپنے قطع تعلق کو ثابت کرنے پر مصر تھے، مگر ثقافتی اور سماجی سطح پر ان کی علیحدہ شناخت اب بھی قائم نہ ہو پائی تھی کہ بدھ مت بھی ثقافتی طور پر ہندو مذہب کا ہی حصہ سمجھا جاتا تھا۔ ہولی اور دیوالی کے ہندو تہواروں سے بھی ہمارا پیچھانہ چھوٹا تھا۔

بدھ مت اپنانے کے بعد بھی ہولی اور دیوالی؟ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

بولیں: ہاں! پرانی عادتیں بڑی مشکل سے جاتی ہیں۔ حالانکہ بابا صاحب نے ۱۹۵۶ء میں جب ناگپور میں ۲ ملین دلتوں کے ساتھ تبدیلیی مذہب کا اعلان کیا تھا اس وقت اپنے ہم مذہبوں سے انہوں نے

خاص طور پر اس بات کا عہد لیا تھا کہ وہ ہندو ازم کو پوری طرح خیر باد کہیں گے، برہما و شنوا اور مہیش کی عبادت کبھی نہیں کریں گے، رام اور کرشن کو ہرگز خدا کا اوتار تسلیم نہیں کریں گے، گوری گنپتی اور دوسرے ہندو معبودوں کی پرستش نہیں کریں گے۔ اس طرح کے ۲۲ نکات تھے جس کا انہوں نے اپنے ماننے والوں سے عہد لیا تھا۔

’پھر یہ ہندو تہوار کہاں سے آگئے؟‘

’اسے حیلِ فقہی کہو یا تعبیرِ نفسانی۔ اکثر دولت اس خیال سے ان تہواروں میں شریک ہو جاتے ہیں کہ ان کے بچے ان اوسروں پر ماننے نہیں، بعضے کہتے ہیں کہ ہم مذہبی طور پر اس تہوار کو نہیں مناتے بچوں کی خوشی کے لئے اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہوئی کہ بابا صاحب کو تبدیلیِ مذہب کے بعد زیادہ دنوں زندہ رہنے کا موقع نہیں ملا ورنہ آج دلتوں کی صورتِ حال مختلف ہوتی۔‘

کیا وہ کوئی اور مذہب اختیار کر لیتے؟

یہ کہنا تو مشکل ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہوتا کہ برہمنیت کا خیمہ زمیں بوس ہو جاتا۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

بولیں: تمہیں معلوم ہے تبدیلیِ مذہب کے بعد بابا صاحب دو ماہ سے بھی کم زندہ رہے۔ ۱۱۴ اکتوبر کو انہوں نے ناگپور کا جلسہ کیا، ۱۶ دسمبر کو اسی قسم کا ایک بڑا جلسہ بمبئی میں ہونے والا تھا اور پھر اس کے بعد دوسرے شہروں کی باری تھی، ان اقدامات سے برہمنیت کا خیمہ زمیں بوس ہونے کو تھا کہ ۶ دسمبر کو اچانک ان کی موت واقع ہو گئی۔

اچانک؟ پھر تو اس کے پیچھے کوئی گہری سازش لگتی ہے، میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

بولیں: حقیقت کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اچھا بھلا آدمی جس کے انقلابی اقدامات سے اونچی ذات کے ہندوؤں پر ہیجان طاری تھا اتنی خاموشی سے سوتے ہوئے موت سے کیسے ہمکنار ہو گیا۔ واللہ اعلم! خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ تحقیق کا موضوع ہے۔ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ میں نسبی طور اسی مہار ذات سے تعلق رکھتی ہوں جس نے بابا صاحب جیسا سپوت پیدا کیا۔ جب میں پہلی بار گاؤں گئی تو مجھے اپنی اس شناخت کا علم ہوا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ گاؤں میں جہاں اونچی ذات کے ہندو رہتے ہیں وہاں اب بھی ہمارا داخلہ ممنوع تھا۔ ہماری قوم کے لوگ اب بھی گاؤں کی سرحد کے باہر رہتے تھے جسے یہ لوگ مہاروارہ کا نام دیتے ہیں، یعنی وہ علاقہ جہاں نیچی ذات کے مہار رہتے ہیں۔

گاؤں سے واپسی پر میرے اندر اپنی جڑوں کی تلاش کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں نے مہار قوم کی

تاریخ کا مطالعہ کیا۔ امبیڈکر کی سیاسی جدوجہد اور ان کی انقلابی تحریروں نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ ابتداً یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ انھوں نے اسلام کے ہوتے ہوئے بدھ مت کو کیوں ترجیح دی؟ اب برسوں کے مطالعہ کے بعد مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری طرح امبیڈکر کے سامنے بھی یہ سوال رہا ہوگا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کے کس ورن میں انھیں جگہ ملے گی۔ سید، شیخ، مغل اور پٹھان تو وہ بن نہیں سکتے تھے کہ اس کے لیے نسلی سلسلے سے تعلق ضروری تھا۔ اب رہی انصاری، منصورہ برادریوں میں شمولیت کی بات تو اگر اسلام قبول کرنے کے بعد بھی سماج کے نچلے پائیدان پر ہی جگہ ملنی تھی تو ایسا اسلام کس کام کا؟ مگر بدھ مت میں بھی انھیں کیا ملا۔ میں نے اعتراض کیا۔

بولیں: بدھ مت تو ان کے لیے ایک اسٹیشن تھا، منزل نہیں۔ یہ بات تو بابا صاحب نے پہلے دن طے کر لی تھی کہ اگر انھیں منوادی نظام سے نکلنا ہے اور اپنی آدمیت کو دوبارہ حاصل کرنا ہے تو انھیں ہندو دھرم کو خیر باد کہنا ہوگا۔ اسلام ایک متبادل ہو سکتا تھا۔ مسلمانوں سے ان کے اچھے مراسم بھی تھے، لیکن وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ ایک نامحسوس برہمنیت ہندوستانی مسلمانوں کے ہاں بھی موجود ہے۔ جس طرح برہمنوں کے سترگانہ معاف ہیں اسی طرح یہاں بھی سادات کی تکریم میں حد درجہ غلو سے کام لیا جاتا ہے۔ مسلمان اشرف اور اجلف کے خانوں میں بٹے ہیں۔ صدیوں سے دہلی کچلی قوم کو ایک سماجی نظام کی غلامی سے نکال کر دوسرے سماجی نظام کی غلامی میں دے دینا کوئی دانش مندی تو نہیں ہو سکتی تھی۔ امبیڈکر کا اصل مشن ذات پات کے نظام کا خاتمہ تھا خواہ وہ ہندوؤں میں ہو یا مسلمانوں میں، بدھ مت تو ایک ہالٹ تھا جہاں وہ تھوڑی دیر کے لیے رکن چاہتے تھے۔

پھر پونہ معاہدہ کے بارے میں آپ کیا کہیں گی جس کے سبب عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ امبیڈکر کے لئے ہندو ازم کا ترک کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

بولیں: پونہ معاہدہ میں تو کوئی ایسی بات نہ تھی، شاید تم ۱۹۳۶ء کے امبیڈکر۔ منجھی معاہدہ کی بات کر رہے ہو۔ پونہ معاہدہ (۱۹۳۳ء) میں تو صرف اتنی بات تھی کہ بابا صاحب دلتوں کے لئے ایک علیحدہ قومی شناخت اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ ترک کر دیں گے اور اس کے عوض انہیں صوبائی اسمبلی میں محفوظ نشستیں دی جائیں گی اور مرکزی اسمبلی کی ۱۸ فیصد نشستیں بھی ان کے لئے مخصوص ہوں گی۔ البتہ اگست ۱۹۳۶ء کے معاہدہ میں اس بات کی خاص طور پر صراحت کر دی گئی کہ جو دلت اسلام یا عیسائیت قبول کر لیں گے وہ ریزرویشن کی سہولت کے مستحق نہیں ہوں گے۔ اس اعتبار سے تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ان کے قبول اسلام کی راہ میں ریزرویشن ایک سد سکندری بن کر سامنے آ گیا تھا۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ

امبیڈکر کو ایک عبوری فیصلہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ کرتے بھی کیا، ایک طرف ہندوؤں نے ان کے سامنے ریزرویشن اور سرکاری مراعات کی فہرست کھڑی کر دی تھی تو دوسری طرف برہمن زدہ اسلام انہیں پورے اکرامِ آدمیت کے ساتھ، اونچی ذات کے مسلمان کی حیثیت سے قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

’مگر اسلام میں تو نظری طور پر ذات پات کی کوئی گنجائش نہیں، یہ تو سماجی برائی ہے جو مسلمانوں کو ہندوؤں کے تعامل سے ملی ہے۔‘

بولیں: تم کس اسلام کی بات کرتے ہو۔ جب مسلمانوں کی پوری سوسائٹی ذات پات میں بیٹی ہو۔ سادات کو اپنے مزعومہ نسبی سلسلے پر فخر ہو اور جب ہندوستانی علماء کا اس بات پر اتفاق ہو، خواہ وہ دیوبندی اسکول کے اشرف علی تھانوی ہوں یا بریلوی جماعت کے احمد رضا خاں، کہ نیچی ذات کے مسلمان سادات کے کفو نہیں ہو سکتے۔ یہ کہتے ہوئے عائشہ کے ٹھہرے اور متین لہجے میں ایک اشتعال سا پیدا ہوا۔ بولیں: بہشتی زیور پڑھی ہے آپ نے؟ وہاں تو یہ بھی لکھا ہے کہ اشرف کو کن لوگوں سے میل جول رکھنا چاہئے۔ نیچی ذات کے مسلمان سوہلا ننگ کے لیے ممنوع قرار دیئے گئے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ جو لوگ انسانی وقار کی تلاش میں نکلے ہوں، جو اس بات کے خواہاں ہوں کہ انہیں اکرامِ آدمیت کا سزاوار سمجھا جائے، بھلا ان کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کے اس منوادی سماجی نظام میں کیا کشش ہو سکتی تھی۔

عائشہ کی گفتگو جاری تھی۔ اسی دوران شریف بھائی چائے کی پیالیاں لئے داخل ہوئے۔ بولے: لگتا ہے بات بہشتی زیور تک آ پہنچی ہے۔ جی ہاں آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ عائشہ ہمارے مولویوں سے بہت خفا ہیں۔ بولے: کیا بتائیں بہت دکھ دیا ہے ان مولویوں نے۔ کلکتہ میں ہم لوگ ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ کوئی پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے۔ عائشہ کے والد ایک مقامی اسکول میں پرنسپل ہو کر آئے تھے۔ والد صاحب سے ان کی دوستی ہو گئی۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا۔ والد صاحب عائشہ کو بہت مانتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے، میں عائشہ کو اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں۔ دیندار ہے، باشعور ہے اور پڑھائی لکھائی میں بھی کسی سے کم نہیں۔ آج کے دور میں ایسی بچیاں کہاں ملتی ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہم لوگ سادات خاندان سے تھے اور عائشہ کے بارے میں پتہ تھا کہ وہ دلت خاندان سے مسلمان ہوئی ہیں۔ والدہ تو کسی طرح تیار ہو گئیں لیکن خاندان کے دوسرے بزرگوں نے سنا تو انہوں نے دانتوں تلے انگلیاں دبالیں۔ بھلا کوئی دلت لڑکی کو بھی سید کے گھر میں بیاہ کر لاتا ہے۔ صورت حال نے نزاع کی شکل اختیار کر لی۔ والد صاحب کا تعلق چونکہ ایک دینی جماعت سے تھا، وہ اس رشتے کو ایک کار خیر سمجھ کر اس پر جم گئے، لیکن ہمیں اس کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ عین نکاح کے دن رشتے داروں نے گھر پر بلہ بول دیا۔ پولیس آئی، حالات

سنگین ہو گئے۔ ہم لوگوں کو فی الفور شہر چھوڑ کر نکل جانا پڑا۔ سنا ہے کہ اب سمجھانے بجھانے سے معاملہ ٹھنڈا ہو گیا ہے، لیکن مہاجر ت تو کرنا پڑی نا۔ آج بھی اسلام کے ایک اصول پر عمل کرنے میں دیکھو مسلم معاشرے میں کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ جب مجھ سے اپنا چھوٹا سا یہ غم سنبھالا نہیں جاتا تو آپ اندازہ کریں کہ عائنہ پر کیا گزرتی ہوگی۔ اس کے پرکھے تو جہنم جہنم جیتے رہے ہیں۔

’چلئے اتنا تو ہوا کہ اس طرح آپ سماجی مراتب کی بلندی پر پہنچ گئیں‘۔

کیسی بلندی؟ یہی تو میری لڑائی ہے کہ میں اسے بلندی مانتی ہی نہیں۔ جب سارے انسان برابر ہیں۔ تکریم آدمیت کا واحد معیار تقویٰ ہے۔ پھر سادات کی بہو بن جانے کو باعثِ افتخار کیوں سمجھا جائے؟ ہاں تم اتنا کہہ سکتے ہو کہ سماجی طور پر میں اب ایک ایسی پوزیشن میں ہوں جہاں سے اکرام آدمیت کی جنگ کہیں بہتر طور پر لڑ سکتی ہوں۔ مسلم معاشرے میں نسل پرستی کے جو بت ہیں ان پر ضرب لگا سکتی ہوں۔ کالج میں میری ایک برہمن سہیلی تھی۔ ایم اے کے پہلے سال میں وہ مجھ سے بڑی گھلی ملی رہی۔ ہم لوگ اکثر ساتھ رہتے۔ میرا مسلمان ہونا اس کی دوستی کی راہ میں حائل نہیں تھا، لیکن جب اسے ایک دن یہ پتہ چلا کہ میں ذات کی مہار ہوں تو ایسا لگا جیسے اس پر اوس پڑ گئی ہو۔ ہماری دوستی میں پہلی سی وہ گرم جوشی نہ رہی۔ ایک دن اس نے مجھ سے دبے لفظوں میں یہ شکایت بھی کی کہ میں اس کے ساتھ کھاتی بیٹی رہی اور اس طرح اس کا دھرم بھر شٹ ہو گیا۔ دوستی عداوت میں بدلی، پھر تو صورت حال یہ ہو گئی کہ وہ مجھ پر میری ذات کے حوالے سے جملے کستی۔ دوستوں کی مجلس میں بیٹھتی تو میری موجودگی میں ذومعنی جملے کہتی۔ ارے بھئی آج کل کالج کا ٹوائلٹ بڑا گندہ رہتا ہے۔ میں یہ سب سنتی اور مسکرا کر رہ جاتی۔

’گو یا پبلک اسپیس میں ابھی اونچی ذات کے ہندوؤں نے دلتوں کو قبول نہیں کیا ہے؟‘

بولیں: بالکل نہیں، بس سمجھو برداشت کیا ہوا ہے۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ اگر نہ کریں تو نیچی ذات کے ہندو دوسرا دھرم قبول کر لیں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کی مصنوعی اکثریت ختم ہو جائے۔

اب جو لوگ پیچھے رہ گئے ان کے بارے میں آپ کیا سوچتی ہیں؟

کون لوگ؟

وہی جو اب بھی دلت ہیں، اپنے پرانے دین پر قائم۔ ان کے لیے نجات کی کیا سبیل ہو سکتی ہے؟ بولیں: نجات تو بڑا لفظ ہے۔ بھلا جن لوگوں کی آدمیت ہی مشتبہ ہو، جو لوگ آدمی سے کمتر درجے کی مخلوق سمجھے جاتے ہوں وہ نجات اور جنت و جہنم کے بارے میں کیسے سوچ سکتے ہیں۔ وہ تو صدیوں سے اپنے آپ کو ایک جہنم میں پاتے ہیں، جہاں نسلوں سے ان کے ذمہ انسانی غلاظت اٹھانے کا کام سونپا گیا ہے۔

صفائی کرنے والے کس معاشرے میں نہیں ہوتے۔ بول و براز تو تمام ہی قومیں کرتی ہیں، لیکن دنیا کی کسی قوم میں اس کام کے لیے اتنا دایلا نہیں مچایا جاتا کہ جنم جنم سے انسانوں کی ایک بڑی آبادی کو اپنے ہی جیسے انسانوں کے بول و براز اٹھانے کے لیے مختص کر دیا گیا ہو اور طرفہ یہ کہ اسے مذہبی فریضہ بتایا جاتا ہو۔ بابا صاحب نے سماجی تبدیلی کے لیے جو اقدامات کیے تھے اس نے ملت سماج میں ایک انقلابی کیفیت تو پیدا کر دی ہے، اب باشعور اور تعلیم یافتہ ملت نوجوانوں کی ایک نسل میدان میں ہے، لیکن سماجی دباؤ اتنا شدید ہے کہ اس کے لیے راستہ بنانا آسان نہیں۔ دلتوں نے بہت سے دروازے کھٹکھٹائے ہیں، لیکن انھیں کہیں بھی پورے آدمی کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

یہ جو آپ بار بار پورے آدمی کی بات کرتی ہیں یا انسانی وقار کے حصول کو سب باتوں پر ترجیح دیتی ہیں تو کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سب کچھ شدتِ احساس کے سبب ہے کہ ظلم و زیادتی تو مسلمانوں پر بھی کم نہیں ہو رہی ہے۔

بولیں: ہم دلت مسلمانوں کا غم دوہرا ہے۔ مسلمان بہت گئی گزری حالت میں ہیں، لیکن ہم تبدیلی مذہب کے بعد بھی اس گئی گزری حالت کو حاصل نہیں کر پاتے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ہماری سماجی حالت نہیں بدلتی۔ ہمیں دلت مسلمان کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم لاکھ پڑھ لکھ لیں، پاستی، ڈھنڈیا اور بھنگی ہی رہتے ہیں۔ حالانکہ پیشے کے اعتبار سے ہمارا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کلکتہ میں ہمارے ایک استاد ہیں ڈاکٹر نور عالم، بڑے قابل ٹیچر ہیں۔ پتہ چلا کہ ذات کے پمرا ہیں اور ان کی شیوخ و سادات سے ہمیشہ ان بن رہتی ہے۔

پمرا یا؟

بہار میں یہ لفظ شاید پاسی کے لیے مستعمل ہے، میں نے کہا۔

برسوں بعد جب کے آرنائن صدر جمہوریہ کے عہدے پر فائز ہوئے، میں ایک دن پریس کلب آف انڈیا میں چند غیر مسلم صحافیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ حاضرین میں زیادہ تر اونچی ذات کے ہندو تھے۔ ایک صاحب نے جن کے ہاتھ میں کوئی اخبار تھا، اس میں چھپی کے آرنائن کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا: جانتے ہو آرنائن کوکل جب راشٹرپتی بھون میں پہلی بار جھنڈا لہرانے کا موقع ملا تو اس کی کیفیت کیا ہوئی۔ تصویر میں دیکھو ایسا لگتا ہے من ہی من میں کہہ رہا ہو جی تو چاہتا کہ کھمبے پر چڑھ جاؤں۔ یہ سن کر حاضرین نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کا نسبی تعلق پڑوا یعنی پاسی ذات سے تھا۔

پھر آپ کے خیال میں مسئلہ کا حل کیا ہے؟ میں نے عائشہ کے احتجاج کو سمجھنے کی کوشش کی۔

بولیں: جب تک برہمنیت کو مکمل شکست نہیں دی جاتی اس ملک میں اکرام آدمیت اور انسانی حقوق کی لڑائی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

’مگر آپ تو کہتی ہیں کہ مسلمان ہو کر بھی ہم وہیں رہے۔‘

بولیں: برہمنیت نے ہر جگہ پنچے گاڑ رکھے ہیں۔ ہندوستان کا کوئی مذہب اس کی زد سے بچا نہیں ہے۔ جو لوگ اپنی آتما کی تلاش میں عیسائی ہوئے تھے وہ وہاں دلت عیسائی بن کر رہنے پر مجبور ہیں۔ بعض علاقوں میں تو دلتوں کے چرچ بھی الگ ہیں۔ اسی طرح جو لوگ سکھ مت میں داخل ہوئے تھے انھیں مذہبی سکھ کہا جاتا ہے، انھیں بھی کمتر سمجھا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دلتوں کو اگر اپنے وقار کی بحالی کا راستہ مل جائے تو وہ جوق در جوق اس راستے پر چل نکلیں گے۔

بھلا اسلام سے بہتر کیا آپشن ہو سکتا ہے، اس بارے میں ایک مؤثر حکمت عملی بنانے کی ضرورت ہے۔ شریف بھائی نے رائے دی۔ بولے: پروفیسر نور عالم کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں مساوات کا تصور صرف پانچ منٹ کے لیے ہے۔ جب تک نماز میں ہیں، اونچی اور نیچی ذات والے ایک ہی صف میں کھڑے رہتے ہیں، لیکن جیسے ہی مسجد سے باہر قدم نکالے، نسبی اور سماجی تفریق اپنا کام کرنے لگتی ہے۔

’دیکھئے مجھے یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ اس ملک میں دلتوں، آدی باسیوں اور دوسرے دبے کچلے لوگوں کا مستقبل اسلام کے ساتھ وابستہ ہے، لیکن اس اسلام کے ساتھ جو پہلی صدی ہجری میں مالابار کے ساحلوں پر آیا۔ مسلمان تاجروں اور مبلغین کی اس نسل نے مقامی لوگوں کو انسان سمجھ کر انھیں اسلام کی دعوت دی اور پھر ان اقوام کے ساتھ رنگ و نسل کے امتیاز سے بے پروا ہو کر خاندانی رشتے قائم کیے۔ رہی مسلمانوں کی موجودہ نسل اور اس کے کبار شارحین تو ان میں سے بیشتر ایک طرح کی برہمنیت کے شکار ہیں۔ جب تک اسلام کو ان مفسد سے پاک نہیں کیا جاتا مظلوم انسانیت کے لیے اس کے دروازے و انہیں ہو سکتے۔‘

عائشہ کی باتوں میں بلا کا درد تھا۔ ان کی گفتگو گہرے مطالعے، مشاہدے اور ذاتی تجربات سے مملو تھی۔ جی تو چاہتا تھا کہ ان کے دلت مکاشفات کو اسی طرح سنتا رہوں۔ مگر رات زیادہ ہو چکی تھی، میں نے شریف بھائی سے اجازت لی۔ لوٹتے ہوئے اقبال کا یہ شعر میرے دل و دماغ پر چھایا رہا:

شب ہندی غلاماں را سحر نیست

بایں خاک آفتاب را گزر نیست

عائشہ گو کہ پیدائشی طور پر مسلمان تھیں، ایک دلت نو مسلم گھرانے میں ان کی پرورش ہونے کے سبب بابا صاحب کی عظمت کا نقش ان کے دل پر قائم تھا۔ میں نے سوچا غلاموں کی قوم سے اگر ایک آدمی بھی اپنی

زنجیروں کو توڑنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو تو وہ ایک عالم کو تہہ و بالا کر دیتا ہے۔ مجھے آج امبیڈکر جینتی پر گائے جانے والے وہ لوگ گیت بھی یاد آئے جس میں ڈھول کی تھاپ پر گانے والا کچھ اس طرح گاتا ہے:

’ہم رے بابا کا لکھل ادھیکار چاہئے

گولامی کے بوجھا ڈھوئے جب چاہے مرجی

اب جھوٹ نہ کوئی اکرار چاہئے، ہماریا چاہئے۔‘

مجھے ایسا لگا کہ یہ لوگ گیت ہم ہندوستانی مسلمانوں پر ایک لطیف طنز ہوں۔ آخر کچھ تو ہے کہ امبیڈکر کروڑوں دبے کچلے پریشاں حال لوگوں کے لئے نجات دہندہ بن کر سامنے آئے اور جن لوگوں کو مستضعفین کی مسیحتی کا فریضہ انجام دینا تھا انہوں نے کفو اور غیر کفو کی فقہی تاویلات کے ذریعہ اپنے ہی جیسے انسانوں پر اکرام آدمیت کے تمام دروازے بند کر دیئے۔

## گر بھیم نہیں ہوتے

آج مجھے اپنے بچپن کے ایک برہمن پڑوسی کی گفتگو بھی یاد آئی۔ تب میری عمر یہی کوئی دس بارہ سال کی رہی ہوگی۔ جاڑے کے ایام تھے، امیری لال دھوپ میں بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ نہ جانے کس بات پر ذکر اونچی اور نیچی ذات کا چل نکلا۔ بولے: خدا نے کسی کو اونچا اور کسی کو نیچا پیدا کیا ہے، یہی اس کا نظام ہے۔ تم نہیں دیکھتے کہ اصیل گائے میں بانئیں سیر دودھ دیتی ہے جبکہ عام گائے تین چار سیر سے زیادہ نہیں دیتی۔ نسل کا تو فرق ہوتا ہے نا! خدا نے بعض انسانوں کو اپنے سر سے پیدا کیا اور بعض کو پیر سے۔ اب اگر پیر سے پیدا ہونے والے شور درماغ والوں کا کام کرنا چاہیں تو سب چیز الٹ پلٹ ہو جائے۔ میں حیرت سے ان کی باتوں کو سنتا رہا۔ بولے: اب تم ہی بتاؤ اگر میں اپنا پیر سر کی جگہ لگا لوں، یا ناک کاٹ کر آنکھ کی جگہ پر چپکا دوں تو کیا کسی کام کا رہوں گا۔ بس یہی مثال ان ورنوں کی ہے جس میں انسان پیدا ہوا ہے۔ جو جس کام کے لئے بنایا گیا ہے اسے وہی کام کرنا چاہئے۔ شاستروں میں ایسا ہی لکھا ہے۔ جو لوگ تمام انسانوں کو ایک سامان بتاتے ہیں، یا جو چھو اچھوت کو نہیں مانتے وہ شاستروں کا اپمان کرتے ہیں۔ میرے اس اعتراض پر کہ اللہ نے ہر انسان کو ایک ہی فطرت پر پیدا کیا ہے پھر کسی کو اچھوت یا قابل نفیس کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ کہنے لگے: اچھوت تو جسم ہوتا ہے، روح نہیں ہوتی۔ جو لوگ الٹی سیدھی غذائیں کھاتے ہیں، گوشت مچھلی سے اپنے جسم کو آلودہ کرتے ہیں۔ ان کے جسم پوتر نہیں ہو سکتے۔ ہاں اگر یہ لوگ اپنے ورن میں رہ کر خوش خوش اپنے کام کرتے رہیں تو اگلے جنم میں انہیں اونچے ورن میں شامل ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔

’اور اس جنم میں ان کے لئے نجات کا کوئی امکان نہیں؟ میں نے معصومیت سے پوچھا۔

بولے: انہیں نجات کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ سوچ ہی غلط ہے۔ یہ چاروں ورن مل کر ایک جسم بناتے ہیں۔ جب تمہارے پیر میں ٹھوکر لگتی ہے تو سب سے پہلے اس کی تکلیف پر کون آواز بلند کرتا ہے۔ منہ سے ہی تو چیخ نکلتی ہے نا؟ اب دیکھو! ٹھوکر شوردر (پیر) کو لگی اور چیخ کہاں سے نکلی؟ منہ (برہمن) سے۔ اور دوڑ کر اس کی مدد کو کون آیا؟ انہی ہاتھوں (چھتری) نے اسے سہلایا۔ تو یہ ایک سسٹم ہے جس سے سماج چلتا

ہے۔ اب شودر کہے کہ ہم کرسی پر بیٹھیں گے، پیشوائی کا فریضہ انجام دیں گے تو ایسا کرنا خدائی نظام میں خلل ڈالنے کے مترادف ہوگا۔ منو کے شاستروں میں صاف طور پر لکھا ہے کہ برہمن کے سامنے شودر زمین پر بیٹھے اور جو ایسا نہ کرے اس کی ڈنڈے سے تنبیہ کی جائے۔ اور شاستروں میں جو لکھا ہے وہی سچ ہے اس میں اپنی عقل نہیں لگانی چاہئے۔ انسان شاستروں پر چلتے ہیں اور جانور اپنی عقل کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

اس دن مجھے امیری لال کی باتوں پر بڑی حیرت ہوئی۔ تب مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ذات پات کے اس منوادی نظام نے اس ملک میں صدیوں سے (مفروضہ) نچلی ذات کے کروڑوں انسانوں کو شرف آدمیت سے محروم کر رکھا ہے۔ مجھے اپنے بچپن کا وہ گاؤں بھی یاد آیا جس کے مضافات میں نیچی ذات کے ہندوؤں کی بستیاں ہوا کرتی تھیں۔ گوالا، ملاح، ڈوم، پھار اور اس قبیل کے دیگر طائفے جو دن رات ہماری خدمت میں حاضر رہتے، مالک مالکن کے القاب سے ہمیں مخاطب کرتے اور اپنا پیارا منگلا جو پھولوں کی کیاریوں میں پانی ڈالتا، ہمارے لئے بڑے چاؤ سے سرخ اور پیلے گلاب توڑ لاتا، یہ لوگ خوشی اور غم کے ہر موقع پر ہمارے کام آتے، ان کے دم سے آم کے موسم اور فصل کے موقع پر گھروں میں رونق رہتی، لیکن میرے دل میں کبھی بھول کر بھی خیال نہیں آیا کہ میں ان کے گھر جاتا کہ جاگیر دارانہ اور طبقاتی معاشرے نے اسلام کا جو قالب تیار کیا تھا اس میں شریف اور کمین لوگوں کے درمیان حد فاصل کھینچ دی گئی تھی اور یہ سب کچھ ان دیندار گھرانوں میں تھا جہاں ولی اللہی اسلام اور ان کے دیوبندی اور بریلوی شارحین آرتھوڈوکسی کا میعار سمجھے جاتے تھے۔

ان ہی دنوں کی بات ہے، ایک دن لاہریری کینٹین کے قریب سے گزر رہا تھا کہ شریف بھائی نے آواز دی۔ کینٹین کے بیرونی حصے میں جہاں درختوں کے نیچے آہنی کرسیاں ایستادہ تھیں، شریف بھائی کسی شیخ الاسلام قسم کی شخصیت کے ساتھ ڈوسے کا لطف لے رہے تھے۔ تعارف ہوا تو حیرت ہوئی کہ جناب کا نام سچ شیخ الاسلام ہے۔ کیم شیم قدر کاٹھ، سفیدی مائل طویل داڑھی، محراب چشمے سے جھانکتی ہوئی بارعب آکھیں۔ پتہ چلا کہ آپ شریف بھائی کے خسر ہیں اور دہلی جاتے ہوئے اپنی بیٹی سے ملاقات کے لیے رک گئے ہیں۔ انھیں جب ہمارے باہمی مراسم کا پتہ چلا تو بہت خوش ہوئے۔ اب تک ان کی شخصیت پر شیخ الاسلام کے جاہ و حشم اور تکلفات کا جو پردہ پڑا تھا اسے انھوں نے فی الفور ترک کر دیا۔ شاید وہ اپنے نام کے حوالے سے میری حیرانگی کو بھانپ چکے تھے۔ بڑی ہی اپنائیت سے بولے: میرے شیخ الاسلام بننے کے پیچھے بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ یہ کوئی تیس سال پہلے کی بات ہے جب میں نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کیا تو سوچا کہ اپنا نام اسلام رکھوں گا۔ اور بمبئی کے علاقے میں جہاں میں اس وقت رہتا تھا بہت سے مسلمانوں کے

ناموں کا آخری حصہ شیخ ہوا کرتا تھا۔ اس طرح میں نے اپنا نام اسلام شیخ رکھا، لیکن بڑی مسجد میں جب میں کلمہ پڑھنے گیا تو امام صاحب سے میری تفصیلی گفتگو ہوئی۔ وہ میرے مطالعہ سے بہت خوش ہوئے۔ فرمایا: اسلام شیخ نہیں، خدا تمہیں شیخ الاسلام بنائے اور اپنے دین کی خدمت کا کام لے۔ انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے ناموں کی تبدیلی کے فارم میں میرا نام شیخ الاسلام لکھ دیا۔ تب سے اب تک پل تلمے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ آج بھی مجھ سے میرا یہ نام، ایسا لگتا ہے جیسے کچھ مطالبہ کر رہا ہو۔ یہ کہتے ہوئے شیخ الاسلام کسی گہری فکر میں ڈوب گئے۔ میری نگاہوں میں چند دن پہلے عائشہ سے ہونے والی گفتگو کا منظر تازہ ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ شیخ الاسلام تو کسی طرح بھی (مفروضہ) نیچی ذات سے آئے ہوئے مسلمان نہیں لگتے۔ کتنا رعب ہے ان کی شخصیت میں، چہرے پر وہی مردانہ وجاہت، جلال و جمال کا وہی امتزاج جو رجال اللہ کے چہروں پر ہوا کرتا ہے۔

انھیں جب یہ پتہ چلا کہ عائشہ سے مختلف امور پر ہماری گفتگو ہوتی رہی ہے تو کہنے لگے کہ عائشہ نئے زمانے کی بچی ہے، حساس ہے۔ وہ عمرانیات (Anthropology) کی طالبہ ہے۔ اسے ان باتوں کی فنی باریکیوں کا شاید زیادہ اندازہ ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ عز و وقار کی لڑائی میں جس چیز کی سب سے زیادہ اہمیت ہے وہ ہے آپ کا سیلف ڈیفینیشن (Self defination)۔ اب دیکھئے ہم مہاروں نے اس نکتہ کو پالیا تو ہماری قوم میں ایک انقلاب آگیا کیفیت پیدا ہوگئی۔ اب مہار ہونا ہمارے لیے حقارت کی بات نہیں، فخر کا علامہ ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ سب امبیڈ کر کے سبب ہے؟ بولے امبیڈ کر کا ایک کلیدی رول ضرور ہے، لیکن امبیڈ کر اس تقلیب فکری کی بنیاد نہیں ہیں۔ امبیڈ کر کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہماری تاریخ کو دریافت کیا اور اس نئے بیانیے کو کام پر لگایا۔ بھیما کورے گاؤں کا نام سنا ہے تم نے؟ نہیں، میں نے لاعلمی ظاہر کی۔

بولے: امبیڈ کر کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے ہماری تاریخ کا ایک استوانہ دریافت کیا۔ موقع ملے تو کبھی کورے گاؤں کا تفصیلی مطالعہ کرنا۔ تمہیں اس بات کا اندازہ ہوگا کہ کسی قوم کی تاریخ اگر کھوجائے تو وہ کس طرح بے دست و پا ہو جاتی ہے۔

کورے گاؤں کیا کوئی مذہبی مقام ہے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: مذہبی تو نہیں مگر اس کی اہمیت اس سے کم بھی نہیں۔ یہ واقعہ ۱۸۱۸ء کا ہے جب کورے گاؤں کے مقام پر کوئی آٹھ سو مہار اٹھائیس ہزار برہمنی پیشوا فوج سے ٹکرائے تھے۔ جس میں مہاروں کو فتح عظیم حاصل ہوئی تھی اور جہاں انگریزوں نے مہار فاتحین کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے کورے گاؤں میں

ایک یادگاری ستون قائم کر دیا تھا۔ امبیڈکر جن دنوں انگلینڈ میں اپنی تاریخ کا مطالعہ کر رہے تھے انھیں اپنی قوم کی اس تابناک تاریخی فتح کا پتہ چلا۔ ہندوستان آنے کے بعد انھوں نے اس مقام کی نشان دہی کی۔ اس یادگاری ستون کو ڈھونڈ نکالا اور پھر اسے مہاروں کے لیے ایک زیارت گاہ کی حیثیت دے دی۔ وہ ہر سال بنفس نفیس یکم جنوری کو اس فتح عظیم کی یاد منانے کے لیے وہاں جاتے۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کا اثر دہام ہونے لگا۔ بہت جلد مہاروں کو ایسا لگا کہ وہ ان بہادروں کی قوم سے ہیں جو قلت تعداد کے باوجود اونچی ذات کے برہمنوں کی اینٹ سے اینٹ بج چکے ہیں۔

آٹھ سو بنام اٹھائیس ہزار یہ تو کسی معجزے سے کم نہیں، میں نے کہا۔

بولے: اس فتح عظیم کے پیچھے جو نفسیاتی اور سماجی محرکات کارفرما رہے ہیں، انھیں سمجھے بغیر یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ہم مہاروں کی بھی عجیب تاریخ ہے۔ ہم لوگ بنیادی طور پر ناگ ونشی ہیں۔ تم نے مہاتما بدھ کے مجسموں کے اوپر ناگ کو سایہ کیے ہوئے دیکھا ہوگا۔ ایک وقت تھا جب بدھ مت کے ماننے والے ہندوستان سے افغانستان اور چین سے جاپان تک غالب تھے۔ بدھ نے اخوت اور مساوات کی بنیاد پر ایک معاشرہ تشکیل دیا تھا۔ یہاں مورتی پوجا کی کوئی گنجائش نہ تھی، لیکن جیسا کہ مذاہب کی تاریخ میں ہوتا ہے، بدھ کے ماننے والوں نے ان کے مجسمے بنا ڈالے۔ پھر جب ان پر برہمنیت کا حملہ ہوا تو وہ اس حملے کا دفاع نہ کر سکے۔ بدھ کی مورتیاں نئے اضافوں اور تراش خراش کے بعد برہما، وشنو اور مہیش کی شکل میں نظر آنے لگیں۔ بدھ مندروں پر برہمنوں کا قبضہ ہو گیا اور جو لوگ بدھ مت کے اعوان و انصار تھے انھیں غلام بنالیا گیا۔ مذہب کی نئی تعبیر عمل میں آئی اور یہ کہا جانے لگا کہ کچھ لوگ دائمی غلامی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ہماری گندگیاں اٹھائیں، مردہ جانوروں کو ٹھکانے لگائیں، بستیوں کے باہر اچھوتوں کی طرح رہیں، مبادا ان کا سایہ عبادت گزاروں کا دھرم بھرشٹ نہ کر دے۔

گویا یہ اونچی اور نیچی ذات کی لڑائی بدھ مت اور ہندو ازم کے تصادم کی پیداوار ہے؟

بولے: ہندو ازم نہ کہو۔ ہندو ازم تو ویسے بھی کوئی مذہب نہیں ہے۔ یہ تو عربوں کی دی ہوئی ایک جغرافیائی نسبت ہے، ورنہ وید، پران، گیتا، اپنیشدیا ہندوؤں کی کسی مذہبی کتاب میں لفظ ہندو کا ذکر نہیں ملتا۔ برہمنیت نے مذہب کے نام پر ہم مہاروں پر بدترین قسم کا تشدد روا رکھا۔ تمہیں حیرت ہوگی کہ صدیوں سے ہماری گردنوں میں ہانڈیاں بندھی رہیں۔ کمر سے جھاڑو لگتی رہی تاکہ دیکھنے والے دور ہی سے پہچان لیں کہ ہم اچھوت لوگ ہیں جنہیں بنیادی طور پر لوگوں کی گندگیاں اٹھانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

جھاڑو تو بات سمجھ میں آتی ہے، یہ گردنوں سے ہانڈیاں لٹکنے کی کیا منطق تھی؟ میں نے پوچھا۔

بولے: اچھوت جو ٹھہرے تو ان کا لعاب زمین پر نہ گرے سو اس خیال سے ان کی گردنوں سے ہانڈیاں لٹکادی گئیں۔

یہ تو بڑی نا انصافی کی بات تھی۔ اس صورت حال کو مہاروں نے کیسے قبول کر لیا؟  
بولے: مہاروں پر ہی موقوف نہیں، ملک کے مختلف حصوں میں نیچی ذات کی مختلف قوموں پر ذلت کا یہ عذاب مسلط کیا گیا۔ بعضوں نے آبادیوں کو خیر باد کہا اور جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ تم جنہیں آدیاسی کہتے ہو، یہ وہی تو ہیں مصیبت کے مارے لوگ۔  
مگر انھوں نے اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ذلت کی اس زندگی کو ٹھنڈے پپڑوں کیسے قبول کر لیا؟

بولے: گا ہے بگا ہے بغاوتیں ہوتی رہیں لیکن چونکہ شودروں پر زندگی کا یہ عذاب مذہب کے حوالے سے مسلط کیا گیا تھا، یہ بتایا گیا تھا کہ اگر وہ اپنی موجودہ زندگی میں اس خدائی اسکیم کو خوش دلی سے قبول کر لیں گے تو ہو سکتا ہے کہ اگلے جنم میں ان کی پیدائش اونچے ورن میں ہو جائے اور وہ بھی برہمنوں، چھتریوں اور بیوں کی طرح اگلے جنم میں زندگی کا لطف لے سکیں۔ بس یہ سمجھو کہ ایک طرح کی برین واشنگ تھی جس کے نتیجے میں انسانوں کی ایک بڑی آبادی خود کو خود سمجھنے لگی اور اسے اپنی ابدی ناپاکی پر یقین آ گیا۔  
مگر بلیچے تو مسلمانوں کو بھی کہا گیا۔

بولے: یہ ہتھکنڈہ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف استعمال تو کیا مگر یہ داؤ چلا نہیں۔ مسلمان چونکہ سیاسی طور پر غالب آ گئے تھے اس لیے ان کا سماجی مقاطعہ ممکن نہ تھا، البتہ انھوں نے اب ایک نئی اصطلاح کو کام پر لگایا ہے اور یہ نسخہ بڑا کارگر ثابت ہوا ہے۔  
وہ کیا؟ میں نے پوچھا۔

بولے: بلیچے والی بات تو نہ چلی مگر آزادی سے پہلے ہی جب ان برہمنوں کو مردم شماری کے بعد اس بات کا اندازہ ہوا کہ محض اونچی ذات کے ہندو اس ملک میں عددی طور پر فیصلہ کن رول ادا نہیں کر سکتے تو انھوں نے اولاً مختلف نچلی ذاتوں کو ہندوؤں کے خیمے میں بجز شامل کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں ۱۹۳۲ء میں جیسا کہ تم جانتے ہو گے گاندھی کو مرن ورت رکھنا پڑا۔ دوسری چال انھوں نے یہ چلی کہ مسلمانوں کو مختلف حیلے بہانوں سے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ اس ملک میں اقلیت میں ہیں اور اس لیے اب انھیں ہمیشہ ہمیش کے لیے حاشیے پر رہنا ہے۔

پھر اس ذہنی آزردگی (mental-conditioning) کا آپ کے پاس توڑ کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: دلت تو اب برہمنیت کے اس سحر سے رفتہ رفتہ آزاد ہو رہے ہیں۔ امبیڈکر نے انہیں ایک راہ دکھائی ہے البتہ مسلمانوں کے ہاں صورت حال کہیں نازک ہے۔ جب میں ان کے کبار علماء اور دانشوروں کی زبان سے اپنے لیے اقلیت کا لفظ سنتا ہوں تو مجھے ان کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر آپ صبح شام اپنی کمزوری کا ورد کرتے رہیں تو آپ کو اپنے کمزور ہونے پر خود بھی یقین آجاتا ہے، اور جب آپ کے اندر سے ہوانکل گئی ہو تو بیرونی سہارے کام نہیں آتے۔

اور یہ جو دلت - مسلم اتحاد کے ذریعہ اس ملک میں ایک نئے انقلاب کی باتیں ہو رہی ہیں اسے آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

بولے: میں اسے ایک نیک فال ضرور سمجھتا ہوں مگر مسلمانوں میں اس کے لیے ابھی دلی آمادگی کا فقدان ہے۔ وہ ابھی تک سماجی طور پر چماروں اور بھنگیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ بھی دراصل ایک طرح کی برہمنیت کے اسیر ہیں۔ ایسی صورت میں ایک مشترکہ محاذ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا۔ وہ مدت سے کانگریسی برہمن اور بیوں کی جماعت کو افرادی قوت فراہم کرتے رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے شاکی ہیں، لیکن انہیں ان شاطروں کے خیمے میں رہنے میں شرم نہیں آتی۔ حیرت ہوتی ہے کہ بڑے بڑے علماء و دانشوروں نے اس تکلیف دہ صورت حال کو قبول کر رکھا ہے۔ ان سے کہیں باشعور تو ہمارے دلت ہندو ہیں۔ میں جب اپنے غیر مسلم رشتہ داروں میں اٹھتا بیٹھتا ہوں تو کیا بتاؤں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے دلوں میں ہر لمحہ اونچی ذات کے خلاف آگ جل رہی ہو۔ انہیں یہ شدید احساس ہے کہ ہم بہت ستائے گئے۔ ابھی پچھلے سال میں پونہ کے ایک جلسہ میں تھا۔ ایک نوجوان کی تقریر سنی کہ دلت اور دوسری نچلی ذات کے ہندو رام مندر کی تحریک سے دور رہیں۔ یہ ہمیں ایک نئے جال میں پھنسانے کی تیاری ہے۔ ویسے بھی ہم ہندو نہیں۔ جو مذہب ہمیں اچھوت سمجھتا ہو اور جس مندر میں ہمارا داخلہ ممنوع ہو اس کے استھاپنا میں ہمارا یوگدان بالکل نہیں ہونا چاہئے۔ گو کہ یہ آوازیں ابھی کمزور ہیں لیکن دلتوں کی نئی تعلیم یافتہ نسل زیر زمین اپنا کام کر رہی ہے۔

تو کیا آپ کو ایسا لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں دلتوں کا سیاسی شعور انہیں مسلمانوں سے قریب لے آئے گا؟ بولے: سردست تو ایسا نہیں لگتا۔ ایک تو قانونی پیچیدگی ہے۔ دستور کی دفعہ ۳۴۱ دلتوں کے قبول اسلام کی راہ میں حائل ہے۔ دوسری نفسیاتی وجہ بابا صاحب کا اسلام کے مقابلے میں بدھ ازم کو ترجیح دینا ہے۔

آخر اس کی کیا وجہ تھی کہ ایک پڑھا لکھا آدمی جس کے مسلمانوں سے مراسم بھی اچھے تھے اس نے

اسلام کے مقابلے میں بدھ مت کا انتخاب کیا۔

بولے: ایک تو مسلمانوں کی سردمہری جو چماروں اور بھنگیوں کے لیے اب بھی ان کے ہاں پائی جاتی ہے اور دوسرے امبیڈکر کا اس نتیجے پر پہنچنا کہ بدھ مت سے ان کے پرکھوں کی عظیم الشان تاریخ کا سرا جامتا ہے۔ انھوں نے اپنے قومی عز و وقار کی لڑائی میں تاریخ کے اس شیر کو جگایا جو مہار قوم کی عظمت رفتہ کی داستان بنا سکے۔ اس عمل میں انھوں نے اپنی قوم کو تو یقیناً غیر معمولی اعتماد سے سرشار کیا، نہ صرف یہ کہ مہاتما بدھ کے حواریوں سے اپنا رشتہ جوڑا بلکہ جغرافیائی اعتبار سے کورے گاؤں میں ایک قومی نشانِ افتخار بھی ڈھونڈ نکالا جو ہر سال کیم جنوری کو برہمن پیشواؤں پر بہادر مہاروں کے غلبے کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن تاریخ کا شیر جب ایک بار بیدار ہو جائے اور قومی افتخار کا بت آپ کو اپنے سحر میں لے لے تو کسی دانش مندانہ اور آزادانہ فیصلے کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔

برسوں بعد جب بھیما کورے گاؤں کا موضوع ذرائع ابلاغ کی شہ سرخیوں میں آیا تو میرے ذہن میں شیخ الاسلام کی گفتگو پھر سے تازہ ہو گئی۔ تب مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ امبیڈکر نے بھیما کورے گاؤں کے حوالے سے نہ صرف یہ کہ دلتوں کو ہمیشہ ہمیش کے لیے قومی افتخار کا ایک استوانہ فراہم کر دیا تھا، بلکہ سچ پوچھے تو انھوں نے اپنے اس اقدام سے ذات پات پر مبنی برہمنی سماج کی اُلٹی گنتی کا بٹن بھی دبا دیا تھا۔ کورے گاؤں میں دو سو سالہ جشن کے موقع پر جو کچھ ہوا اس سے پہلی بار دنیا کو یہ اندازہ ہوا کہ امبیڈکر نے ریزرویشن اور دوسرے دستوری تحفظات کے ذریعہ دہلی کچلی اقوام کو اوپر اٹھانے کی جس تحریک کی بنیاد رکھی تھی اس نے اب ایک تو آواز کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ایک دن پرکاش ناتھ پائٹکر کی قوالی سنتے ہوئے جب میں ان لائنوں تک پہنچا تو مجھے ایسا لگا کہ بچپن کی بہت سی گتھیاں اچانک حل ہو گئی ہوں۔

وہ بات کرو پیدا تم اپنی زبانوں میں  
دنیا بھی کہے کچھ ہے ان بھیم دونوں میں  
گر بھیم نہیں ہوتے (تو) ہم آج کہاں جاتے  
قسم بھگوان گوتم کی ہم کبھی کے مر گئے ہوتے  
دبا کر جیتے جی رکھا تھا ہم دلتوں کو ان پنڈوں نے  
چوٹی والوں نے یہ بھگوے کپڑے والوں نے  
چھو چھوتی کا بوجھ لاد رکھا تھا ان غنڈوں نے

بہت ظلم و ستم کے تیر بے ایمانوں نے برسائے  
ہمیں کھانا تو کیا ایک لوٹا بھر پانی کو ترسائے  
قلم کی نوک پر بھیم راؤ نے جب ان کو نچوائے  
تبھی یہ بھیڑیے سیدھی طرح سے راہ پر آئے

مجھے اوائل عمری میں مکتبہ کی ایک مجلس میں ہونے والی والد صاحب کی وہ گفتگو بھی یاد آئی کہ ہندوستان کے سیکولرازم کے پیچھے ارباب اقتدار کی وسیع انظری نہ تھی بلکہ یہ سب کچھ ایک عملی اور سیاسی مجبوری کے سبب تھا کہ ہندو راشٹر کا ایک ایسا تصور جو ذات پات کے مروجہ نظام پر مبنی ہو، امبیڈکر اور ان کے کروڑوں تابعین کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے ہر یجنوں کے تین گاندھی کی وسیع اقلی، ان کی ہمدردی اور ان کے پیار کی حقیقت بھی آج ہی سمجھ میں آئی۔ وہ بہت پہلے اس نکتہ سے آگاہ ہو گئے تھے کہ اگر نچلی ذات کی اقوام اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑی ہوں تو ہندو اکثریت کا مصنوعی طلسم ہوا ہو جائے گا۔ انہوں نے دراصل ایک سیاسی حکمت عملی کے طور پر اچھوتوں کو ہر یجن یعنی خدا کے بندے کے پیارے لقب سے نوازا۔ ان کے لیے مندروں کے دروازے کھولنے کی وکالت کی، لیکن ان کی علیحدہ سیاسی قوت کے قیام کے راستے میں اپنے مرن ورت کا پتھر رکھ کر بیٹھ گئے۔ بالآخر ۱۹۳۲ء میں امبیڈکر کو گاندھی کے آگے جھکنا پڑا۔ انہوں نے جداگانہ انتخاب کے مطالبے کو تو واپس لے لیا لیکن سیاسی نمائندگی میں دلتوں کے لیے ریزرویشن اور آگے چل کر ملازمتوں میں ملنے والی مراعات نے اور خاص طور پر کورے گاؤں کے نظری استوانہ نے دلتوں کو ایک علیحدہ شناخت فراہم کر دیا۔ ۱۹۵۶ء میں اپنے لاکھوں تابعین کے ساتھ ناگپور کے عوامی جلسہ میں ہندو ازم کے خیمے سے باہر آنے کے اعلان نے تو گویا برہمنی سماج کی بنیاد ہی ہلا ڈالی۔

یکم جنوری ۲۰۱۸ء کو کورے گاؤں میں منعقد ہونے والے دو سو سالہ جشن کو جس طرح سرکاری سطح پر سبوتاژ کرنے کی کوشش کی گئی اس سے بھی اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ آج بھی امبیڈکر کی تحریک زیر زمین اپنا کام کر رہی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں ایک سرکاری حکم نامہ کے ذریعے دفعہ ۳۳۱ کا اضافہ اس خیال سے کیا گیا تھا کہ دلتوں کو ہندو ازم کے خیمے میں کسی طرح باندھ کر رکھا جائے، لہذا یہ کہا گیا کہ جو لوگ ہندو ازم کو خیر باد کہہ دیں گے وہ شیڈول کاسٹ کو ملنے والی مراعات کے مستحق نہیں ہوں گے۔ بعد میں لوگوں کے بہت کچھ احتجاج کے بعد سکھ مت اور بدھ مت قبول کرنے والوں کو تو ان مراعات میں شامل کر لیا گیا البتہ آج بھی عیسائی یا مسلمان ہونے والے دلت اس سہولت سے محروم ہیں۔

## خدا کو معافی

رام مندر کی تحریک نے رفتہ رفتہ ایک عوامی غیظ و غضب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ عام ہندوؤں کو احواء پرستوں کے اس پروپیگنڈے پر یقین آنے لگا تھا کہ اس ملک میں ہندو اپنی کثرتِ تعداد کے باوجود محفوظ و مامون نہیں۔ انھیں پرشوتم رام کے شایانِ شان ان کی جنم بھومی پر ایک عظیم الشان مندر کی استھاپنا کی اجازت نہیں اور یہ سب اس لیے ہے کہ حکومت مدت سے مسلمانوں کی منہ بھرائی اور خوشامد کی پالیسی پر کاربند ہے۔ مسلم قائدین کو یہ غلط فہمی تھی کہ پریس ان کے بیانات کو اہمیت دیتا ہے۔ مجاہدانہ رنگ و آہنگ والے پریس اعلامیوں کو شہ سرخیوں میں جگہ ملتی ہے، لیکن امر واقعہ یہ تھا کہ پریس بڑی چابک دستی کے ساتھ ایک جارح ہندو بیانیے میں رنگ بھرنے کے لیے ان قائدین کے گرما گرم بیانات کو استعمال کر رہا تھا۔ دوسری طرف مسلم تنظیموں کا حال یہ تھا کہ مسلم مجلس مشاورت اپنا قومی کنونشن صرف اس لیے منعقد نہ کر پائی تھی کہ اس کے پاس بقول سید شہاب الدین (نائب صدر) ایک قومی کنونشن کے انعقاد کے لیے نہ تو مالی وسائل تھے اور نہ ہی انتظامی ڈھانچہ۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ مسلم خواتین ایکٹ ۱۹۸۶ء کے نقائص کو دور کرنے میں بھی کوئی عملی پیش رفت نہ کر سکا تھا۔ پرسنل لاء کی تقنین (codification) سے متعلق طول طویل بحثیں بھی کسی فیصلہ کن گفتگو تک پہنچنے میں اب تک ناکام رہی تھیں۔ codification کا کام ہوتا بھی تو کیسے۔ فقہی تاویلات و تعبیرات اور احکام قرآنی کے مابین جو تعارض پایا جاتا تھا اسے دور کرنے کی بورڈ کے علماء کے پاس کوئی ترکیب نہ تھی۔ تین طلاق، نفقہ مطلقہ اور یتیم پوتے کی وراثت جیسے مسائل کے سلسلے میں قرآن کا موقف فقہاء کے دواوین سے مغائر نظر آتا تھا۔ ہمارے علماء کے لیے فقہاء کو مسترد کرنا ممکن نہ تھا لیکن ان کا دل اس بات پر بھی مطمئن نہ ہوتا تھا کہ وہ قرآن مجید کے علی الرغم ان منحرفہ دواوین کو ابدی صداقت کے طور پر قبول کر لیں، لہذا codification کا کام مسلسل التوا کا شکار رہا۔

ایک طرف ہندو احواء پرست تحریکیں جہاں نئے نعروں اور نئی سچ دھج کے ساتھ سامنے آرہی تھیں وہیں دوسری طرف مسلم تنظیموں پر نزاع کا عالم طاری تھا۔ جمعیۃ العلماء ہند تقسیم کا شکار تھی جس کے ایک

دھڑے کی قیادت اب مولانا سید احمد ہاشمی کر رہے تھے۔ اُدھر مولانا اسعد مدنی نے ایک خود ساختہ تنظیم امارت ہندیہ کی قیادت کا علم بلند کر رکھا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کی طرح مدرسہ مظاہر العلوم بھی اختلاف امتی رحمة کی راہ پر گامزن تھا۔ اس دوران اگر کوئی چیز آگے بڑھی تھی تو وہ مشاورت کا مرکزی ریلیف فنڈ تھا جو بقول سید شہاب الدین آپریشنل (operational) ہو گیا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ ۸۷ء کے میرٹھ فساد اور خاص طور پر ملیانہ اور ہاشم پورہ کے واقعات نے عالم عرب کے اخبارات میں بڑی شہرت پائی تھی۔ عربی اخبارات میرٹھ کو (بر وزن بیروت) میروت لکھ رہے تھے اور وہاں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و ستم سے متاثر ہو کر بعض اصحاب خیر نے متاثرین کی باز آباد کاری کے لیے اپنے طور پر چھوٹی موٹی رقمیں بھی بھجوائی تھیں۔ میرٹھ کے لرزہ خیز حادثات نے صرف مشاورت کے مرکزی ریلیف فنڈ کو ہی متحرک نہیں کیا تھا بلکہ بہت سی مسلم تنظیموں کے لیے ریلیف کے نام پر سماجی خدمت کا ایک نیا میدان نکل آیا تھا۔

ایک طرف مسلم تنظیموں کا مسلسل رویہ زوال گراف، مسجد کے قائدین کے غیر ذمہ دارانہ اشتعال انگیز بیانات، آدم سینا اور امارت ہندیہ جیسی کاغذی تنظیموں کے خالی خول دعوے اور دوسری طرف ملک بھر میں ہندو احیاء پرستی کی ایک ایسی عوامی لہر کہ وقت کا وزیر اعظم بھی شیلا پوجن میں شرکت اور مندروں کی زیارت کو اپنے سیاسی بقا اور استحکام کے لیے ضروری سمجھتا۔ راستہ آگے کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب اس ملک میں مسلمانوں کے لیے صرف ایک تاریک اور طویل رات رہ گئی ہے، ایک کبھی نہ ختم ہونے والی رات۔

اس غیر یقینی صورت حال کے سبب میں ان دنوں ایک عالم اضطراب میں رہتا۔ کبھی دیر رات گئے تک سبزہ زاروں پر ٹہلتا اور کبھی بے تابانہ دیران سرکوں اور وسیع میدانوں میں جا ٹکتا۔ غلبہ اسلام کی اشاعت کے بعد سے ہی والد صاحب نے قیام اللیل کو میرے لئے بمنزلہ فرض قرار دیا تھا۔ ان راتوں میں لطف و انبساط کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ کبھی اوراد و وظائف میں دل لگاتا تو کبھی منظوم مناجاتوں اور مثنوی مولانا روم کی جھوم جھوم کرتلاوت کرتا۔ ان دنوں عالم عرب کے ایک سفر میں ادعیہ ماثرہ نامی ایک کتاب بھی میرے ہاتھ لگ گئی تھی جس کے بارے میں اول اول تو یہ تاثر تھا کہ شاید یہ اہل دل کے مجرباتی نسخوں سے ماوراء خالص کتاب و سنت پر مشتمل خدا سے لو لگائے رکھنے کا کوئی مستند نسخہ ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ اس بات کا اندازہ ہونے لگا کہ وظائف کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی دراصل سالکین کو مشغول رکھنے کے خیال سے مرتب کی گئی ہے۔ پھر بھی ان شبینہ مجلسوں میں انبساط کی ایک کیفیت طاری رہتی۔ البتہ یہ سوال بھی سر اٹھاتا کہ اگر ان ریاضتوں اور روحانی نصابوں میں حالات کو بدل ڈالنے اور دشمن کو زیر کر لینے کا کوئی واقعی امکان پایا جاتا تو یہ کام تو اب تک اہل صفا کی ان مجلسوں سے انجام پا چکا ہوتا جہاں میں اٹھتا بیٹھتا آیا تھا اور

جہاں ان اور ادکی ادائیگی کے سلسلے میں احتیاط و التزام کا یہ عالم تھا کہ وہ شیخ کی خاص اجازت کے بعد ہی مستحق سالکین کے ذریعہ پڑھے جاتے تھے۔ سو جب اتنے بڑے بڑے شیوخ جن کے دستار طریقت کا سلسلہ قطب الاقطاب سے ہوتا ہو اور اس حضرت علی سے جا ملتا ہو یا جو لوگ نیمہ صدیقی سے اپنا تعلق بتاتے ہوں، سو جب ان کی مشترکہ ہائے ہو حالات میں کوئی مثبت تبدیلی لانے سے قاصر ہو تو بھلا مجھ جیسے نوآموز وظیفہ کار سے کیا ہو سکے گا جس پر ابھی مثنوی معنوی کے معانی بھی پوری طرح کھلنے باقی ہوں۔

ایک دن نقوی صاحب سے ملک کی صورت حال پر گفتگو چھڑ گئی۔ کہنے لگے اسپینوزا کو پڑھا ہے تم نے؟ اتنی بڑی کائنات اور اس کائنات میں ہماری زمین کی حقیقت ایک ذرے سے زیادہ نہیں۔ اور اس ذرے میں موجود حضرت انسان کو دیکھئے کہ وہ اپنی کہانی کو محور کائنات سمجھے بیٹھے ہیں۔ بعضوں کو یہ زعم ہے کہ خدا اس کی سزا اور جزا کا گوشوارہ مرتب کر رہا ہے۔ وہ کسی کی سنتا اور کسی کی فریاد مسترد کر دیتا ہے۔ یہ سب حضرت انسان کی خوش فہمیاں ہیں۔ بھلا خدا کو کیا پڑی ہے کہ وہ ہمارے لئے ابدی جہنم تیار کرے۔ ارے بھئی خدا تو یہ چاہتا ہے کہ اس نے تمہیں زندگی کی جو نعمت عطا کی ہے اس سے لطف اندوز ہو، فطرت کی وادیوں میں چلو پھرو، درختوں کے نیچے جھولے ڈالو، دریا کے کنارے سکون کی بانسری بجاؤ۔ خود بھی خوش رہو اور دوسروں کو بھی اس خوشی میں شامل کرو۔ یہ جو نفرت کی آندھی اس ملک میں اٹھ رہی ہے یہ بھی تو ایک مذہبی بیانیے کی پیداوار ہے۔ ورنہ کون رام اور کس کی جائے پیدائش؟ مگر اہل مذاہب کو ان سوالوں سے کیا دلچسپی؟ نقوی صاحب کی نامذہبیت بڑی حد تک شخصی اور غیر جارح تھی جسے ان کے مسکراتے چہرے کے خدوخال نے ایک خاص کشش عطا کر دی تھی۔ وہ مذہبی امور پر بحث سے گریز کرتے۔ وہ مذہب کو یکسر مسترد نہیں کرتے، سوالات قائم کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ بی بی منزل جہاں وہ رہتے تھے اس کے ٹھیک سامنے محلہ کی مسجد تھی جو اب نئے اضافوں کے ساتھ ایک بڑے مدرسے میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ان کی اہلیہ پابندی سے اس میں چندہ دیتیں۔ وہ اس بات پر تعرض تو کیا کرتے، بس مسکراتے ہوئے ایک دن کہنے لگے کہ انہوں نے مذہبی امور کی وزارت بیگم کے حوالے کر رکھی ہے۔ ان کے برعکس رضا امام صاحب کا رویہ نسبتاً تبلیغی ہوتا۔ ضیاء ان کا خاص شاگرد تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کی میٹنگوں میں ان کے ساتھ شریک ہوتا۔ ایک دن ان ہی مجلسوں میں پڑھائے جانے والے تازہ سبق کچھ اس طرح سنانے لگا۔ بولا: خدا کوئی علیحدہ ہستی نہیں یہ دراصل ہمارے لاشعور کا پیدا کردہ نفسیاتی وجود ہے۔ خدا کو تو دراصل ہم انسانوں نے بنایا ہے۔ انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کی وہ آرزو جو نا تمام رہ گئی یا جس کو پورا کرنے کی وہ قدرت نہیں رکھتا، اسے کسی ایسی ہستی سے طلب کرے جو عقل کل بھی ہو اور جسے قدرت کاملہ بھی حاصل ہو۔

میں نے کہا: لگتا ہے آج کل تم فائر بانخ کو پڑھ رہے ہو۔ کچھ ہرج نہیں۔ لطف تو جب ہے کہ اصل  
 ماخذ سے پڑھو ورنہ مجلسی گپ شپ میں پتہ نہیں چلتا کہ پانی مرنا کہاں ہے۔ وہاں تو مارکس علیہ رحمہ کا یہ  
 خالص روحانی جملہ بھی ایک مذہب مخالف بیانیے کے طور پر دیکھا جاتا ہے:

Religion is the sigh of the oppressed creature, the heart of a heartless world,  
 and the soul of soulless conditions. It is the opium of the people.

اچھا تو تم نے مارکس میں بھی روحانیت ڈھونڈ نکالی ہے! ضیاء نے حیرت کا اظہار کیا۔  
 ہاں! کیوں نہیں، اگر ان سطروں کو اس کے اصل سیاق میں دیکھو۔ بقول مارکس:

...the criticism of religion is, therefore, in embryo, the criticism of that  
 vale of tears of which religion is the halo.

مارکس کا ہدف ملامت فی نفسہ مذہب نہیں بلکہ وہ اجتماعی نظام تھا جس کی بنیادیں نا انصافی پر مبنی  
 تھیں۔ مذہب تو ایک طرح کی سروائیول اسٹریٹیجی تھا، سر جھکا کر جئے جانے کی اسکیم۔ مذہب کی آڑ میں  
 دراصل وہ اس سیاسی نظام کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے جو اس غیر صحت مندانہ فیملی کی مسلسل افزائش کر رہا تھا۔ ہم یہ  
 کیوں بھولے جاتے ہیں کہ یہ اس معاشرے کا تذکرہ ہے جس کے بارے میں اینگلز نے ۱۸۶۰ء میں کہا  
 تھا، ہم لوگ ہر اعتبار سے ایک سیکولر ملک بن چکے ہیں حتیٰ کہ ہمارے مذہبی تصورات بھی سیکولر قالب میں ڈھل  
 گئے ہیں۔ مارکس کو اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ مروجہ نظام کو اس کی جڑوں سے جب تک نہیں اکھاڑ پھینکتے،  
 نئے نظام انصاف کا سورج طلوع نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مارکس نے اپنے عہد میں اسی  
 پرانے کارپیمیری کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا جس کی کوشش ہر عہد میں مخلص مصلحین کرتے رہے ہیں۔

ضیاء کو تو میں نے خیر کسی طرح رخصت کر دیا مگر میرے پاس اس سوال کا اب بھی کوئی جواب نہ تھا کہ  
 ہمارا خدا جس کے رحمن و رحیم ہونے کا اس قدر شہرہ ہے اس نے ہم ہندوستانی مسلمانوں کو مدت سے ایک  
 تعذیب مسلسل میں کیوں مبتلا کر رکھا ہے۔ ہم ابھی ایک حادثے سے پوری طرح ابھرتے بھی نہیں کہ دوسرا  
 اس سے کہیں بھیا تک حادثہ ہمیں آلیتا ہے۔ ہماری ملی زندگی ایک کرب مسلسل سے عبارت ہے۔ آخر خدا کو  
 ہمارے حال پر رحم کیوں نہیں آتا؟ سیانے کہتے کہ یہ سب ہمارے پرکھوں کی غلط کاریوں کا ثمرہ ہے۔ لیکن  
 میری سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ آخر خدا ہمارے پرکھوں کی غلطیوں کا حساب کتاب ہم سے کیوں چکا رہا ہے۔  
 خدا کے بارے میں میرا اپنا ذاتی تجربہ انتہائی خوش کن تھا۔ میں اسے جب بھی پکارتا اپنی مدد پر مستعد پاتا۔ ایسا  
 لگتا جیسے میں اس کی انگلی پکڑ کر چلتا ہوں اور گاہے کسی شریر بچے کی طرح انگلی چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ نکلتا  
 ہوں مگر میرا خدا اس بات کا برا بھی نہیں مناتا۔ مجھے اپنے خدا سے ڈر بالکل نہیں لگتا۔ کبھی نماز پڑھتا اور کبھی

ٹال جاتا۔ مجھے تو یہ اطمینان تھا کہ وہ میرے شب و روز سے واقف ہے، میری تنہائی کا رفق ہے، بھلا وہ مجھ سے تعرض کیوں کرے گا۔ البتہ ادھر کچھ دنوں سے مجھے اپنے پیارے خدا سے گلہ اور شکوہ پیدا ہونے لگا تھا۔ دعاؤں میں الحاج و زاری کے بجائے مناقشے اور محاربے کی زبان در آئی تھی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آتا کہ آخر مجھ جیسے ناتواں کی زبان سے اس طرح کے جسارت آمیز الفاظ کیونکر نکل رہے ہیں۔ ان فی البدیہہ مناقشوں کو جو ان مضطرب ایام میں میرے اور خدا کے بیچ ہوتے رہے تھے میں نے مختلف کیسٹوں میں محفوظ کر لیا:

بار الہا!

کیا واقعی تو نے طے کر لیا ہے کہ باہری مسجد ہم ہندوستانی مسلمانوں کا گولگا تھا بن جائے؟  
تیرے مذبح خانے میں میرے یقین کی کشتی بچکولے کھا رہی ہے۔

تو کتنا مخفی تھا، مگر جب سے تیرا ظہور ہوا ہمارے حالات دگرگوں ہیں۔

کمزور دبا لئے گئے، نقص من الاموال والجوع کی باتیں اب ہمیں تسلی نہیں دیتیں۔

کسی نے نازی تعذیب گاہ کی دیوار پر یہ کیا لکھ دیا:

’اگر کوئی خدا ہے تو اسے ایک دن مجھ سے اس بات کے لئے معافی مانگنی پڑے گی جو مجھ پر گذر رہی

ہے۔ آخر کس جرم کی پاداش میں؟‘

تنگ آمد بچنگ آمد! یعقوب نے تجھ سے دودو ہاتھ کیے

مگر ہم تو تیرے آخری علمبردار ٹھہرے، ہمارے حق میں بھی تو بروٹس بنا پھرتا ہے؟

ہم نہ رہے تو تیری ربوبیت کا علم کون اٹھائے گا؟

تو کہتا ہے ہم امت مختار ہیں، واقعی! لطیف طنز میں تیرا کوئی ثانی نہیں۔

بہت ہو چکا اب ہمیں بخش دے، کارِ پیغمبری کسی اور کو تفویض کر

یا رقیب بالعباد! اب بس کر۔

## قدسیوں کا جلوس

خدا سے مجھے بہت شکایت تھی مگر میں جانتا کہاں۔ میں اس کھونٹے سے جتنا بھی اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا مجھے ایسا لگتا جیسے میری ڈور مزید اس کھونٹے میں الجھتی جا رہی ہو۔ مجھے ایسا لگتا کہ جو خدا میرے ذاتی معاملات میں میری انگلی پکڑے لئے چلتا ہے، وہی خدا قومی اور ملی معاملات میں میری باتوں کی سنی ان سنی کر دیتا ہے۔ مگر کرتا بھی کیا میرے پاس کوئی اور دوسرا کھونٹا بھی تو نہ تھا جہاں اپنا سر ٹکاتا۔ سو کبھی رات کی تنہائی میں ٹٹماتی شمع کی پراسرار روشنی میں الحاح و زاری کرتا اور کبھی اوراد و وظائف کی زمبیل سے کسی نئے فارمولے کی تلاش میں رہتا۔ ایک عرصہ اسی اضطراب میں گزرا۔ کبھی درختوں کے نیچے قیام نیم شبی کو آزما یا اور کبھی روحانی ارتکاز میں محل ہونے والی بجلی کی روشنی کے تمام تار کاٹ ڈالے مبادا اس زاہد شب بیدار کے مصلے سے روشنی کا کوئی روزن ملائے اعلیٰ میں کھلتا دکھائی دے۔ ان کوششوں سے ملائے اعلیٰ میں کوئی ہلچل تو کیا پیدا ہوتی البتہ ہم غم کے مارے ہندوستانی مسلمانوں پر ایک نئی افنا ڈوٹ پڑی۔

اس دفعہ اذیت ناک خبروں کا سلسلہ بھاگلپور سے تھا جہاں ہندوستانی مسلمانوں کو قتل عام کے ایک نئے ماڈل اور تعذیب کی ایک نئی صورت کا سامنا تھا۔ نیلی (آسام) میں جہاں ایک غیر سرکاری اندازے کے مطابق کوئی دس ہزار بے بس مسلمان تہہ تیغ کر دیے گئے تھے، قتل عام کا یہ واقعہ صبح سے شروع ہو کر دیر رات گئے تک اپنے انجام کو پہنچا تھا۔ مراد آباد میں عید گاہ کے مجمع عام میں پولیس کی ایک طرفہ اور بے جا فائرنگ کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں کی عید خون میں نہلائی گئی تھی۔ ملیانہ اور ہاشم پورہ میں مسلمانوں کو سبق سکھانے کے لیے ان نوجوانوں کو چن چن کر قتل کیا گیا تھا جن میں صدائے احتجاج بلند کرنے کی کوئی ادنیٰ سی رمت بھی پائی جاتی تھی۔ بھاگلپور کا یہ فساد اس اعتبار سے پچھلے تمام فسادات سے بڑھ کر اور اپنی نوعیت میں کہیں دور رس اثرات کا حامل تھا کہ یہاں ریاستی پولیس کی سرپرستی میں ہندو اہیاء پرست تنظیمیں ایک منظم منصوبے کے تحت اس ملک سے مسلمانوں کے انخلاء اور ان کے کلی صفایا کے پروگرام پر عامل تھیں اور اس پورے منصوبے کو وقت کے وزیراعظم کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ مسلمانوں کے انخلاء کا یہ منصوبہ اس اعتبار

سے بھی مختلف تھا کہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو رام شیلا کے جلوس سے مسلمانوں کا جو قتل عام شروع ہوا وہ اسی شدت کے ساتھ دو ماہ سے زائد کے عرصے تک جاری رہا۔ ریاستی پولیس نے نہ صرف یہ کہ بلوائیوں کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی بلکہ اکثر مقامات پر وہ بلوائیوں کی قیادت کر رہی تھی۔ کوئی ڈھائی سو گاؤں انخلاء کے اس منصوبے کا حصہ بنائے گئے۔ 'جئے ماں کالی' - تاتار پور کرو خالی اور 'ہندی، ہندو، ہندوستان - ملّا بھاگو پاکستان' جیسے نعرے اپنی شدت اور خون آشامی میں ۱۹۴۶ء کے بھاگلپور فساد سے بھی کہیں بڑھ کر تھے جس کا تذکرہ آج بھی شہاب نامہ میں پڑھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ منت اللہ رحمانی جنھوں نے ۱۹۴۶ء کے فساد کی رپورٹیں مرتب کی تھیں، انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ ۱۹۸۹ء کا فساد اپنی شدت اور کیفیت میں ۱۹۴۶ء سے کہیں بڑھ کر تھا۔ ۱۹۴۶ء میں فساد زدہ علاقوں کا جب ہم لوگ دورہ کرتے تو علاقہ کے لوگ اس بربریت پر اظہارِ شرمندگی کرتے، لیکن آزاد ہندوستان میں شرمندگی تو کجا، متاثرہ علاقوں میں نفرت کے عمومی ماحول کے سبب مسلمانوں کا خود اپنے ہی گاؤں میں لوٹنا ممکن نہ تھا۔

یہ تاثر عام تھا کہ یہ فسادات ہونے نہیں رہے ہیں بلکہ کرواتے جا رہے ہیں۔ صوبے اور مرکز دونوں جگہ کانگریس کی حکومت تھی۔ ستمبر نارائن سنہا جو اس وقت بہار کے وزیر اعلیٰ تھے، ان کا کہنا تھا کہ ان کے سیاسی رقیب دراصل ان فسادات کے ذریعہ ان کے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ مقامی ایس پی، ایس کے دویدی جن پر یکطرفہ طور پر مسلم مخالف کارروائی انجام دینے کا الزام تھا، ان کے فی الفور تبادلے کا حکم ریاستی حکومت نے جاری کر دیا تھا۔ لیکن جب راجیو گاندھی صورت حال کا جائزہ لینے وہاں پہنچے تو اس کرنیوز دہ شہر میں ہندو احمیاء پرستوں نے دویدی کے تبادلے کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے۔ راجیو گاندھی نے مظاہرین کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے انھیں فی الفور یہ یقین دہانی کرائی کہ Mr. Divedi will remain here۔ دویدی کے تبادلے کا یوں اس طرح وزیر اعظم کی مداخلت سے رک جانا گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب آنے والے دنوں میں مسلمانوں کے انخلاء اور ان کے مکمل صفایا کے اس منصوبے کو ریاستی سرپرستی حاصل رہے گی۔ بعد میں اس واقعہ کی جتنی بھی سرکاری یا غیر سرکاری تحقیقات سامنے آئیں اس میں واضح طور پر اس بات کا اعتراف کیا گیا تھا کہ اگر دویدی کا بروقت تبادلہ ہو گیا ہوتا تو سیکڑوں بے بس مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی املاک پر غاصبانہ قبضے کو فی الفور روکا جاسکتا تھا۔

بھاگلپور کے واقعہ نے بہار سے کانگریس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ لالو پرساد مسلمانوں کے تحفظ کے نعروں کے ساتھ اقتدار میں آئے، لیکن انھوں نے اپنے وزیر شکیل احمد خان کے ذریعہ اس خیال کی تبلیغ شروع کر دی کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے مسلمان اپنے درد کو بھول جائیں تاکہ ایک نئی شروعات کی

جاسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج بھی مسلمانوں کی عبادت گاہوں اور ان کی زمینوں اور ان کے گھروں پر فساد یوں کا قبضہ ہے۔ مسلمان اپنے ہی ملک میں بے وطن، خانہ بدوش اور محرومی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ نیش کمار جو لالیوایا دو کی مسلم منافقت اور بھاگلپور میں کملیشور یا دو جیسے مجرمین کو سیاسی پناہ دینے کے الزام پر مسلمانوں کی ہمدردی کے مستحق ٹھہرے تھے، خود ان کی حکومت میں دویدی جیسے پولیس افسر کو بہار پولیس کا سربراہ مقرر کیا جانا ایک ایسا منحصر ہے جس کے سیاسی اور نظری اطلاقات کو سمجھنا کچھ آسان نہیں۔

Mr. Divedi will remain here کا یہ جملہ میرے حافظے پر کچھ ایسا چپکا کہ ایک مدت تک اس جملے کی یاد آتے ہی دل و دماغ پر ایک جھرجھری کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اب یہ بات شک و شبہ سے بالاتر تھی کہ اس ملک میں مسلمانوں کو زندگی کے ہر موڑ پر مختلف قسم کے دویدیوں کا سامنا ہے۔ عین حکومت کی سرپرستی میں اس بات کا کھلم کھلا اعلان کہ دویدی اب یہیں رہیں گے خواہ ان کی شاعت اور ان کا جرم کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو۔ اب ان کے وقتی تبادلے کے ذریعہ مسلمانوں کے زخم پر کسی قسم کا نفسیاتی مرہم بھی نہیں رکھا جائے گا۔ میں جتنا اس صورت حال پر غور کرتا، اپنے آپ کو ایک ہلا مارنے والی بے بسی کے گرداب میں پاتا۔ دویدی کی مسلم دشمنی کا ہر خاص و عام کی زبان پر چرچا تھا۔ یہ بات معروف تھی وہ پچھلے کئی ماہ سے احیاء پرست ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ۲۴ اکتوبر کو جب رام شیلا کے جلوس کو انھوں نے مسلم علاقے سے گزرنے کی اجازت دی جس کے نتیجے میں حالات بے قابو ہو گئے اور ہر طرف قتل و غارتگری کا بازار گرم ہو گیا۔ اس کے بعد دویدی کا تبادلہ تو ایک منطقی اور معمول کی کارروائی سمجھی جاتی تھی۔ یہ کم سے کم عمل تھا جس کی مسلمان ہی نہیں بلکہ دوسرے امن پسند ہندو بھی توقع کر رہے تھے۔ برسوں بعد ستمبر نارائن نے اپنی یادداشت ”میری یادیں میری بھولیں“ میں اس راز سے پردہ اٹھایا کہ راجیو گاندھی جو وزیر اعظم کی حیثیت سے بھاگلپور کی صورت حال کا جائزہ لینے آئے تھے، وہ جب ہیلی پیڈ سے سرکٹ ہاؤس کی طرف جا رہے تھے تو انھیں راستے میں مختلف مقامات پر احیاء پرست ہندوؤں کے مظاہروں کا سامنا کرنا پڑا، مطالبہ تھا کہ دویدی کے تبادلے کو فی الفور روک دیا جائے کہ ان کے بغیر ہندو خود کو محفوظ محسوس نہیں کریں گے۔ راجیو گاندھی نے بلوائیوں کے زیر اثر جن میں سادہ لباس میں بعض پولیس کے جوان بھی شامل تھے، اس مطالبہ کو فی الفور مان لیا اور انھوں نے مظاہرین کے جارحانہ تیور کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کیا کہ

-Mr. Divedi will remain here

دسمبر کا آخری عشرہ تھا، سردی اپنے شباب پر تھی۔ ایک دن میں مولانا آزاد لائبریری کے مرکزی ہال میں، جہاں ان دنوں اخبارات و رسائل کا ایک گوشہ نیا نیا قائم ہوا تھا، India Today کا تازہ شمارہ دیکھ رہا تھا

جس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح فسادات کے دو ماہ بعد بھی شہر میں مستقل قتل و خون کے واقعات پیش آرہے ہیں۔ ہر طرف خوف و دہشت کا سایہ ہے۔ کوئی ۳۰ ہزار لوگ ریلیف کیمپوں میں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔ کرفیو میں ڈھیل ملتے ہی خونریزی کے واقعات دوبارہ شروع ہو جاتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ حالات معمول پر کب لوٹیں گے۔ چاندیری گاؤں کی ملکہ بیگم جو گاؤں کی مسلم آبادی میں تنہا زندہ بچ گئی تھی، اس کا کہنا تھا کہ میرا تو وشواس اُٹھ گیا اور دوسری طرف اٹھ سالہ اگنی کماری کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ اپنی ماں کی گود میں دہشت سے سمٹی ہوئی تھی۔ بم کے حملے میں اس کا چہرہ زخمی ہو چکا تھا۔ محمد جہانگیر اپنا رکشہ لے کر ہندو علاقے میں جانے کی نہیں سوچ سکتا اور نہ ہی لٹن شاہ مسلم علاقے میں سواری کی تلاش میں جاسکتا ہے۔ وجہ دونوں طرف ایک ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے ڈر لگتا ہے۔ محمد بہرام جو شہر میں ریشم کے ایک بڑے تاجر ہیں اور جن کے ایکسپورٹ کاروبار نیویارک تک پھیلا ہوا ہے، وہ اب اپنے کاروبار کو مغربی بنگال میں منتقل کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔

ابھی میں اس رپورٹ کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ مجھے اپنے کندھے پر کسی بے تکلف ہاتھ کی تھپکی محسوس ہوئی۔ اچھا تو تم پھر سے اخبارات و رسائل کی دنیا میں لوٹ آئے ہو۔ اس نے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ شمسی کی آواز میں پہلے ہی پہچان چکا تھا، کہنے لگا: یہ کیا پڑھ رہے ہو؟ یہ سب ٹریش (trash) ہے۔ یہ رپورٹیں امر واقعہ پر ہمیں مطلع نہیں کرتیں۔ یہ سب صحافت کی دنیا کا ایک بیلیننگ ایکٹ (balancing act) ہے جو جان بوجھ کر صداقت پر پردہ ڈالتی ہے۔ پڑھنے والے کو ایسا لگتا ہے جیسے معاملہ برابر کا ہو، جیسے واقعتاً کوئی ہندو مسلم فساد برپا ہوا ہو، جہاں دونوں طرف کے مجروحین ایک دوسرے سے خوف زدہ ہیں۔ اگر ایک طرف ملکہ بیگم کی آنکھوں میں خوف ہے تو دوسری طرف اگنی کماری بھی کم دہشت زدہ نہیں۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ بھاگلپور میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی نوعیت فرقہ وارانہ فساد کی نہیں بلکہ مسلمانوں کے منظم انخلاء اور عین ریاستی سرپرستی میں ان کے نسلی صفایا کی مہم ہے۔ مہلوکین میں نوے فیصد سے زیادہ مسلمان ہیں اور مختلف جگہوں پر ریفوجی کیمپ بھی ان ہی کے دم سے آباد ہیں۔ میڈیا میں ایک جھوٹی خبر یہ چلائی گئی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام نگر میں پناہ لے رکھی ہے اور ہندو رام نگر کے کیمپوں میں پناہ گزیں ہیں، لیکن کسی کو نہیں پتہ کہ یہ دونوں جگہیں کہاں پائی جاتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ میں اصل صورت حال کا عشر عشر بھی نہیں آ رہا ہے جس سے بھاگلپور کے مسلمان دوچار ہیں۔ شاید تم نے اس سلسلے میں اندو بھارتی کی رپورٹ نہیں پڑھی۔ یہ کہتے ہوئے شمسی سامنے کی الماری سے ای پی ڈبلیو (EPW) کا ایک شمارہ نکال لائے۔ غالباً یہ ۳ دسمبر کی اشاعت تھی جس میں بہار حکومت کے جانبدارانہ رول پر سوال اٹھائے

گئے تھے۔ مصنف نے واضح الفاظ میں لکھا تھا:

’بہار ملٹری پولیس کی نفری نے نہ صرف یہ کہ بلوائیوں کی کھلے عام حمایت کی بلکہ خود بھی مسلمانوں کے قتل عام میں شامل رہی۔ چاندیری گاؤں سے جن ایک سو پچاس مسلمانوں کو فوجی دستوں نے خطرے سے نکال کر بہار پولیس کے حوالے کیا تھا وہ سب کے سب پناہ گزیں کیمپ میں ہی قتل کر دیے گئے تھے۔ محمد حسین آزاد، جو صوبائی حکومت میں وزیر تھے، ان کے مسلسل مطالبے کے باوجود متاثرہ علاقوں سے بہار پولیس کے دستے نہیں ہٹائے گئے تھے۔ تین دنوں تک حساس مقامات میں جہاں قتل و غارتگری کا بازار گرم تھا کمان مکمل طور پر بہار پولیس کے ہاتھوں میں تھی جو اقلیتوں کے سلسلے میں اپنے تعصب کے لیے بدنام تھی اور جس کے ہاتھ مٹی میں ہونے والے ہزاری باغ فساد میں مسلمانوں کے خون سے رنگیں تھے۔ حتیٰ کہ راجیو گاندھی کے دورہ بھاگلپور سے چند گھنٹے پہلے نیا بازار کے علاقے میں تیس اموات ہو چکی تھیں اور ان علاقوں میں بھی بہار ملٹری پولیس کا پہرہ برقرار تھا۔‘

آگے چل کر مصنف نے لکھا تھا:

’بعض جگہوں پر تو اقلیتی فرقوں کے پورے خاندان کو ان کے گھروں میں بند کر کے نذر آتش کر دیا گیا اور وہ سب کے سب رات کے اندھیروں میں زندہ جل کر مر گئے۔ ناتھ نگر، چمپانگر، نیا بازار، صاحب گنج، پریتی، اسحاق چک، جوکسار، کریم، رحمن پور اور منصور گنج کے علاقوں میں ایسی تباہی مچائی گئی کہ اب یہ علاقے پہچان میں نہیں آ رہے ہیں۔ چاندیری اور سندھیری جیسے گاؤں کا مکمل صفایا ہو چکا ہے۔ چمپانگر اور ناتھ نگر کے علاقے جو ریشمی کپڑوں کی صنعت کے لیے جانے جاتے تھے، وہاں اب بنکروں کا کوئی بھی خاندان زندہ نہیں بچا ہے۔ بنکروں کی مشینیں کچھ اس انداز سے تباہ کی گئی ہیں کہ ان علاقوں سے مسلم بنکروں کو ہر حال میں نقل مکانی پر مجبور کر دیا جائے۔ بھاگل پور اور اس کے اطراف میں مہلوکین کی تعداد سرکاری طور پر ڈھائی سو بتائی جاتی ہے، لیکن غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اصل تعداد ہزار سے بھی کہیں زیادہ ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ لاشوں سے بھرے دوڑک انتظامیہ نے گنگا ندی میں بھی پھینکوائے ہیں۔‘

رپورٹ نگار کا کہنا تھا کہ:

’بھاگلپور، سیتامڑھی، مونگیر اور موٹیہاری میں ہونے والے قتل عام نے بہار کے مسلمانوں کا حکومت میں اعتماد بری طرح متزلزل کر دیا ہے۔ مسلمان اس قدر خوف زدہ ہیں کہ ۹ نومبر کو جبکہ

ایودھیا میں شیلا پوجن کی بنیاد رکھی جانی تھی اس سے تین چار دن پہلے ہی سے پٹنہ شہر کے چھوٹے چھوٹے دکان داروں نے اپنی دکانیں اور کاروبار بند کر کے شہر سے فرار ہونے میں عافیت جانی۔ کوئی ہفتہ عشرہ تک مسلمانوں کے کاروبار پر تالے پڑے رہے۔ اب یہ چھوٹے موٹے مسلمان کاروباری شہر میں واپس آنا شروع ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک حکومتی نظم و نسق میں ان کا اعتماد واپس نہیں آسکا ہے۔

حالات انتہائی نازک تھے۔ ایک طرف انتہا پسند ہندو تنظیموں کو حکومتی مشنری کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور دوسری طرف بے بس مسلمانوں کا اس آسمان کے نیچے خدا کے علاوہ اور کوئی سہارا نہ تھا۔ وہ جس بے بسی کے ساتھ اپنے اپنے گھروں سے مقتل کی طرف لے جائے گئے اور جس طرح گاؤں کے گاؤں مسلم آبادیوں سے خالی ہو گئے اس سے اس بات کا صاف عندیہ ملتا تھا کہ ان کے اندر اپنی مدافعت میں کچھ کر گزرنے کا کس بل بھی باقی نہیں بچا ہے۔ ایسی صورت میں مسلمان کریں تو کیا کریں۔ جان و مال کی مدافعت کس طرح کی جائے، اس بارے میں اسلام کی مدینہ تعلیمات کیا ہیں اور یہ کہ موجودہ صورت حال میں ایک مؤثر اور نبوی اقدامی عمل کا ڈول کس طرح ڈالا جانا چاہئے۔ میں نے ’مسلم ملیشیا کی ضرورت‘ نامی کتابچہ میں ان ہی سوالات کو محور گفتگو بنایا تھا۔ یہ کتابچہ احباب کے حلقے میں کچھ اسی احتیاط و التزام کے ساتھ تقسیم کیا گیا جس طرح امیر جنسی کے زمانے میں مولوی منت اللہ رحمانی کا کتابچہ ’زیر زمین شائع ہو کر ان کے مؤیدین کے حلقے میں پہنچا تھا۔ ابھی اس کی اشاعت پر چند ہفتے بھی نہ گزرے تھے کہ خفیہ پولیس حرکت میں آگئی۔ ادھر مکتبہ میں پولیس کا چھاپہ پڑا۔ اس دوران پولیس والے مکتبہ کی تلاش لیتے رہے۔ کتابیں الٹی پلٹی جاتی رہیں۔ الماریوں کے اندرونی حصے کاغذات کی درازیں اور فائلیں نہ جانے کیا کیا الٹ پلٹ ڈالا، لیکن کتابچے نہ ملنے تھے نہ ملے اور ملتے بھی کیسے، خدا نے ان کی بصارت پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ ’مسلم ملیشیا‘ کے کتابچوں پر اردو کا قاعدہ کچھ اس شان سے براجمان رہا کہ خفیہ پولیس کی گھنٹوں کی کارروائی بے اثر ہو کر رہ گئی۔

اسی دوران بہار میں وزیر اعلیٰ کی تبدیلی عمل میں آگئی۔ نئے کانگریسی وزیر اعلیٰ جگن ناتھ مشرا اردو کے حوالے سے مسلمانوں میں اچھی شبیہ رکھتے تھے۔ اس تبدیلی سے فوری طور پر ایک نفسیاتی راحت کا احساس ہوا۔ ان کی وزارت پر ابھی تین ماہ کا عرصہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ نئے ریاستی انتخابات میں کانگریس کا صفایا ہو گیا اور لالو یادو وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے سامنے آئے۔ گوکہ نئی حکومت مسلمانوں کے تحفظ کے نام پر وجود میں آئی تھی، لیکن عملی طور پر اپنی پندرہ سالہ حکومت میں اس نے بھاگلپور کے لٹے پٹے مسلمانوں کی باز آباد کاری کی کوئی مؤثر کوشش نہیں کی اور نہ ہی ان کی زمینیں انھیں باج گزار کرانی جاسکیں۔

برسوں بعد ۱۹۹۵ء میں جب بھاگلپور قتل عام کی تحقیقاتی رپورٹیں سامنے آئیں تو پتہ چلا کہ بیشتر معاملات میں پولیس نے ایف آئی آر درج کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ کل پانچ سو پچانوے (۵۹۵) ایف آئی آر درج کیے گئے، جس میں لوٹ، آتش زنی اور قتل کے مختلف واقعات شامل تھے۔ پولیس کے اپنے ریکارڈ کے مطابق نو سو بیاسی (۹۸۲) افراد قتل ہوئے تھے، لیکن ایف آئی آر میں صرف تین سو چون (۳۵۴) مقتولین کا تذکرہ تھا۔ پانچ سو اموات تو خود پولیس کی اپنی رپورٹ کے مطابق اس کے تفتیشی دائرے سے باہر رہ گئی تھیں۔ مجرمین کھلے عام دندناتے پھر رہے تھے اور جن آنکھوں نے انہیں قتل کرتے دیکھا تھا ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ان مجرمین کا نام لے سکتے۔ پھر یہ ایف آئی آر بھی اتنی تاخیر سے درج ہوئی تھیں کہ ان کے لیے شواہد کا جٹا پانا کچھ آسان نہ تھا۔ مثال کے طور پر لوگانیں گاؤں میں جہاں پولیس کی ملی بھگت سے ایک سو آٹھ لاشوں کی اجتماعی قبر پر گوبھی کے پھول اُگادیئے گئے تھے، اس جرم کی ایف آئی آر اکتالیس دنوں بعد درج کی گئی تھی۔ جب قتل کے اتنے بڑے واقعہ کو اتنے دنوں تک ٹالا جاسکتا ہو تو اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رپورٹ درج کرنے والوں کی نیت کیا رہی ہوگی۔ مجرمین چونکہ کھلے عام حکومت کی مشنری میں دخیل تھے یا خود اس کا حصہ تھے اس لیے جو کل پانچ سو پچانوے ایف آئی آر درج کی گئیں ان میں چار سو سولہ ایف آئی آر میں کسی معین شخص کا نام نہیں لیا گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ صرف ایک سو چالیس ایف آئی آر کے سلسلے میں پولیس نے باقاعدہ چارج شیٹ داخل کی، بقیہ معاملات کی فائلیں شواہد نہ ملنے کی وجہ سے بند کر دی گئیں۔ کورٹ نے بھی پولیس کی اس دلیل کو کافی مان کر ان مقدمات کی فائلیں بند کر دیں۔ اسے اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ چار سو ایف آئی آر کو مسترد کرنے کے بجائے وہ ان مقدمات کو کسی دوسری تفتیشی ایجنسی کو سپرد کرنے کا حکم دیتی۔

زندہ بچ جانے والوں میں لوگانیں کے اشرف علی، پرنتی کے محمد جاوید اور چاندیری کی ملکہ بیگم کے نام ذرائع ابلاغ میں آجانے اور ان کی عینی شہادتوں کے سبب بعض واقعات عوامی معلومات کا حصہ بنے ورنہ ۲۵۰ گاؤں میں کون کہاں اور کیسے مارا گیا اس کی تفصیلات سنانے کے لئے کوئی نہیں بچ سکا۔ لوگانیں جہاں مقتولین کی اجتماعی قبروں پر گوبھی کے پھول بودیے گئے تھے اس کے بارے میں کلکٹر آفس کی ایک رپورٹ میں یہ معلومات درج تھی کہ ۱۰۵ مقتولین میں بچوں کی تعداد ۵۲ تھی۔ بقول مانی خاں جنھوں نے ریلیف کے کام میں اہم رول ادا کیا، ان کا کہنا تھا کہ لوگانیں میں جب لاشوں کی دریافت کا سلسلہ شروع ہوا تو معصوم بچیوں کے ربن اور ان کی چھوٹی چھوٹی چٹیا دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ اشرف علی آج بھی جب اپنی بیوی اور ماں کے کپڑے دیکھ لیتے ہیں تو ان پر پاگل پن کا دورہ پڑنے لگتا ہے۔ بقول ملکہ بیگم: 'لوگانیں میں مسلمان ایک

گھر میں جمع ہو گئے تھے، اسی دوران فوج آگئی مگر فوج کے چلے جانے کے بعد انھیں گھروں سے نکالا گیا، پھر قتل عام کچھ اس طرح شروع ہوا کہ بلوائیوں کا گروہ آگے سے بڑھا، آگے سے کاٹنا شروع کیا، پیچھے سے بڑھا، پیچھے سے کاٹنا شروع کیا۔ ایک آدمی کے تین چار ٹکڑے کئے، گلا اتارا، پیٹ کاٹا، گلا کاٹا پیٹ کاٹا۔ جاوید جن کے خاندان کے ۱۲ افراد مارے گئے اور صرف وہی زندہ بچ گئے، وہ تو قاتلوں کو پہچانتے بھی ہیں۔ گو سوامی اور منڈل کے حملوں سے وہ کسی طرح نکل بھاگے تھے، لیکن وہ ان کا نام نہیں لے سکتے۔ پولیس اور بلوائی، مسلمانوں کو ان کے گھروں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال رہے تھے۔ تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق:

"The manner in which search was conducted was reminiscent of the searches in occupied Europe by the Nazis."

بھاگلپور کا قتل عام اپنی نوعیت کے اعتبار سے منقسم ہندوستان میں مسلمانوں پر اب تک کا سب سے کاری وارتھا جس کا مقصد مسلمانوں کا مکمل انخلاء، انہیں ملیا میٹ کرنا اور ان کی زمینوں اور املاک پر قبضہ کرنا تھا۔ بعض رپورٹوں کے مطابق آج بھی کوئی تین ہزار ایکڑ زمینوں پر غیر مسلمین قابض ہیں۔ مظلومین کی دادرسانی کے لئے جو مختلف کمیشن بٹھائے گئے اس نے بھی اس پہلو کو بالکل ہی قابل اعتناء نہیں سمجھا۔ گو کہ اس دوران ایسی حکومتیں بنتی رہیں جو مسلمانوں کی بھی خواہی کا دم بھرتی تھیں۔ لالو اور نیش دونوں پر ہی ہماری مسلم قیادت فریفتہ رہی۔ مولوی مجاہد الاسلام جو اس وقت قاضی شریعت اور بعد میں پرسنل لائبریری کی صدارت کے منصب پر بھی پہنچے وہ اپنے دست مبارک سے لالو یا دوکو لڈو کھلاتے دیکھے گئے۔ اخبارات میں باہمی الفت و محبت پر مبنی اس قسم کی تصویریں شائع ہوئیں۔ نیش عہد میں تو مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع پٹنہ کے گاندھی میدان میں منعقد ہوا جس پر نیش کمار کا دست شفقت اتنا واضح تھا کہ ناظم اجتماع کو اسی شام ایم ایل سی کے منصب پر نامزد کرنا انہوں نے ضروری سمجھا۔ لیکن مسلم قیادت کے سرکار دربار سے اس خوشگوار تعلقات کے باوجود بھاگلپور کے محرومین کو انصاف نہ مل سکا۔ برسوں بعد ۲۰۱۶ء میں *Splintered Justice* کے مصنفین نے اس راز سے پردہ اٹھایا کہ انصاف کو ایک منصوبہ بند طریقے سے تاراج کرنے اور زخموں کو دانستہ کھلا اور رستا چھوڑ دینے کے معاملے میں ۱۹۸۹ء کے بھاگلپور کے فساد اور ۲۰۰۲ء کے گجرات فساد میں بڑی واضح مماثلت ہے۔ بھاگلپور کا فساد کانگریس کے عہد میں پیش آیا اور بعد کے دنوں میں سرکاری مولویوں کی خوش الحانی اور سیاسی مسلمانوں کی تگ و تاز نے اس کی سنگینی پر بڑی حد تک پردہ ڈال دیا جبکہ گجرات کے قاتلوں کو سرکاری مسلمانوں اور درباری مولویوں کی فوری کمک نہ ملنے کے سبب اس واقعہ کی شاعت گزرتے وقتوں کے ساتھ واضح ہوتی چلی گئی۔

بھاگلپور قتل عام کے چند ماہ بعد جب میں وطن مالوف پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ابا کی شخصیت کے گرد مختلف غیر مرئی سرگرمیوں کا ظہور ہے۔ ایسے لوگ جو کبھی نہ دیکھے گئے اور دہقانیوں کے غول کے غول نہ جانے کہاں سے آتے، ان سے چند لمحے گفتگو کرتے، حوصلہ پاتے اور پھر اپنی راہ لیتے۔ ایمر جنسی میں ابا کی گرفتاری کے بعد ان کے متاثرین اور مجبین کے جس زیر زمین اور خاموش نیٹ ورک کا ہمیں تھوڑا بہت اندازہ ہوا تھا، وہ ایسا لگتا تھا اب پوری طرح متحرک ہو۔ دروازے علاقوں سے لوگ آتے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ یہ کون لوگ ہیں، کہاں سے آتے ہیں۔ ایک دن ایک سفید ریش بزرگ تشریف لائے۔ چہرے بشرے سے خضریٰ کی صورت معلوم ہوتے تھے۔ ابا نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ اچھا تو آپ ہی راشد میاں ہیں۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے فرطِ محبت سے مجھے گلے لگا لیا۔ چند لمحے میرا ہاتھ تھامے رہے، فرمایا: بیٹا! تم نے بروقت کتابچہ تحریر کیا۔ لوگوں کو اقدامی عمل کی ترغیب دی۔ بڑے بڑے مشکل معرکے ہمت اور حوصلے سے سر کر لیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں سینٹا مڑھی کے علاقے میں بعض مسلم بستیوں کو بھاگلپور والی صورت حال درپیش تھی۔ مسلح بلوائیوں کے غول کے غول نہتے مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ہم لوگ جہاں رہتے ہیں اس کے چاروں طرف غیر مسلموں کی آبادیاں ہیں، جن کے دلوں میں ہمارے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ہمارے بچوں نے بے بسی کی موت مرنے کے بجائے اقدامی عمل کا پروگرام بنایا۔ گاؤں کی کل آبادی کوئی ڈیڑھ سو مرد و زن پر مشتمل تھی، جن میں بچے بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ ہم نے اپنے پاس موجود دیسی اسلحوں کو صیقل کیا اور مرد و عورت اور بوڑھے بچے سبھوں نے مردانہ لباس اختیار کیا۔ اپنے سروں پر سفید پگڑیاں جمائیں اور ہاتھوں میں بلم اور لاٹھیاں لیے چاندنی رات کے منظر نامے میں گاؤں سے باہر شاہراہ عام پر نکل آئے۔ قدسیوں کا یہ خاموش جلوس تو گاؤں اور اس کے اطراف کی زیارت کے بعد واپس آ گیا، لیکن جن لوگوں نے بھی یہ منظر دیکھا ان کے اوپر ہیبت طاری ہو گئی۔ انہیں ایسا لگا جیسے آسمان سے کوئی مخلوق اہل ایمان کی حفاظت کے لیے اتر آئی ہو۔ ہمارا عزم تھا اور ہمارے بچے اس بات کے لیے تیار بھی تھے کہ ہم بے بسی کی موت مرنے کے بجائے شہادت کو ترجیح دیں گے۔ جب آپ مرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو زندگی آپ کے قدم چومنے لگتی ہے۔

ابا نے ان دنوں ایک خطیر رقم بھاگلپور کے متاثرین کے لیے بھی بھجوائی تھی، حالانکہ ان دنوں خود ان کی اپنی مالی حالت بہت اچھی نہ تھی۔ لیکن حوصلوں کی اس جنگ میں جو بھاگلپور قتل عام کے بعد بہار کے مختلف حصوں میں لڑی جا رہی تھی، ابا کسی قیمت پر بھی شکست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ انھوں نے میرے کتا بچے کی اشاعت سے پیدا ہونے والی مشکلات پر نہ صرف یہ کہ مجھ سے کوئی اعراض نہ کیا بلکہ میرے پشت

پناہ بن کر کھڑے ہو گئے۔ کتا بچے پر خفیہ پولیس کی کارروائی کا سلسلہ شاید مزید طول کھینچتا مگر خدا کا کرنا کہ اتر پردیش اور بہار کے سیاسی منظر نامے میں ڈرامائی تبدیلی آگئی۔ دونوں ریاستوں سے کانگریس کی حکومتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ مرکز میں وی پی سنگھ نے وزیراعظم کی حیثیت سے زمام اقتدار سنبھال لی اور اسی دوران قدرت نے عربی تعلیم کے لئے میرے سوڈان جانے کا فیصلہ صادر کر دیا۔

چند ماہ بعد جب میں سوڈان سے واپس آیا تو علی گڑھ کے اسلامی حلقوں میں کتا بچے کی دھمک ابھی باقی تھی۔ اس دوران خفیہ ایجنسیوں کے بعض وفود تفتیش کی غرض سے دہلی سے علی گڑھ کا رخ کرتے رہے تھے۔ خفیہ پولیس کی ان سرگرمیوں کے پیش نظر بعض احباب نے تو یہ پیشن گوئی بھی کر رکھی تھی کہ میں ہندوستان واپسی پر شاید ایرپورٹ سے ہی گرفتار کر لیا جاؤں۔ لیکن خدا کی شان کہ ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ البتہ ان رسمی تفتیشی کاروائیوں کو جو بالعموم مسلمانوں کی ملی سرگرمیوں کے سلسلے میں روا رکھی جاتی ہیں اور جن کا مقصد مسلم نوجوانوں کو خوف زدہ کرنا ہوتا ہے، اسے بعض کج کلاہ مخالفین نے میرے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مجھے ایک ایسے سخت گیر اور شدت پسند نوجوان کی حیثیت سے پیش کیا گیا جس کی موجودگی کیمپس کے پرسکون تعلیمی ماحول کو درہم برہم کر سکتی تھی۔

استاذی جعفر ذکی صاحب اب شعبہ انگریزی کے صدر تھے۔ میری ملی سرگرمیوں کے سبب ان کا رویہ بڑی حد تک معتقدانہ تھا۔ وہ میری عمر کے دوسرے ایرانی اور عراقی طلباء کو بھی جو دین کی سر بلندی کے لئے سرگرم رہتے، اپنی ناز برداریوں کا محور بنائے رکھتے۔ ان کا حکم تھا کہ میں نئے تعلیمی سال کی ابتداء سے شعبہ میں درس و تدریس کی ذمہ داریاں سنبھال لوں۔ گو کہ باقاعدہ تقرری میں ابھی چند دن باقی تھے لیکن انھوں نے میرے حصے کا کام مجھے تفویض کر دیا اور میں انٹرویو کی تیاری میں منہمک ہو گیا۔ لیکن چند دنوں بعد جب انٹرویو کا نتیجہ آیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ غیر متوقع طور پر میرا نام اس فہرست سے غائب تھا۔ استاذی جعفر ذکی کی سربراہی میں منعقد ہونے والی سلیکشن کمیٹی مجھے مسترد کر دے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے لیے اس خبر پر یقین کرنا مشکل تھا۔ انھوں نے پیشکش بھی تو خود ہی کی تھی۔ پھر اچانک ان کے فیصلے میں اس تبدیلی کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ میرے لیے تقرر سے کہیں زیادہ استاد محترم کا یہ رویہ تھا جن کی شفقتوں اور محبتوں کے سہارے میں نے اب تک علمی زندگی کی مختلف منزلیں طے کی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے اتھلے پانی میں ڈوب جانے کے سبب میری موت واقع ہو گئی ہو۔

ایک دن آزاد لائبریری سے نکلتے ہوئے استاد محترم پر نظر پڑی، انھوں نے اشارے سے قریب بلایا، خیریت پوچھی۔ ان کی نگاہوں میں پشیمانی نمایاں تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے، لیکن ایسا لگا جیسے زبان نے

ساتھ نہ دیا ہو۔ اپنے ساتھ ڈپارٹمنٹ لے کر آئے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں اور کہنے کا یارا نہ ہو۔ اس واقعہ کے بعد علی گڑھ سے میرا دل اُچاٹ ہو گیا۔ میں مختلف بلاد و امصار کی سیر کرتا ہوا دہلی پہنچا، جہاں سے کئی برسوں تک ملی ٹائمز انٹرنیشنل نکالتا رہا۔ اس دوران جب بھی علی گڑھ آتا اپنے شفیق استاد کی زیارت کو اپنی سعادت جانتا۔ ایک دن ان سے رہا نہ گیا، بولے: راشد میاں! دل پر ایک بوجھ تھا۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ مجھے لوگوں نے متوحش کر دیا تھا۔ یہ بات گو کہ گفتگو کے سیاق و سباق سے بالکل الگ اور بے جوڑ تھی۔ انھوں نے کسی کا نام نہ لیا تھا لیکن اشارہ واضح تھا۔ ہم دونوں نے خفت مٹاتے ہوئے بات آگے بڑھادی کہ ملی کام کرنے والوں کو تفتیشی ایجنسیاں اتنا نقصان نہیں پہنچاتیں جتنا ہمارے بزدل کج کلاہوں کی ریشہ دوانیاں اور معاندانہ پروپیگنڈے انھیں حاشے پر لگا دیتے ہیں۔

## کریسٹال ناخت

علی گڑھ میں میرے لئے اب کچھ زیادہ دلچسپی کا سامان نہ رہا تھا۔ مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہو چکی تھی۔ سوڈان میں عربی زبان کی تعلیم سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اب عالمِ غرب کے ساتھ ساتھ عالمِ شرق بھی میرے راست رابطے میں تھا۔ اس دوران مغرب کی تحریکِ امن کی تنظیموں سے بھی میرے گہرے روابط ہو گئے تھے۔ یہ ایک الگ دنیا تھی جس میں ابتداً میرے لئے چونک کا بڑا سامان تھا۔ طرح طرح کے صوتی منٹ لوگ ایک نئی دنیا کا خواب سجائے اپنی کاوشوں میں مست رہتے۔ البتہ اب تک میری سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ میں اپنے کاموں کی ابتدا کہاں سے کروں؟ کبھی پر آسائش زندگی کا خواب اپنی طرف کھینچتا تو کبھی انقلابی خیالات انگڑائی لینے لگتے۔ ان دنوں کثرت سے ایسے خواب آتے جن میں اپنے آپ کو کسی دورا ہے پر پاتا اور کبھی بلند و بالا عمارتوں سے اترتے ہوئے زینے اتنے تنگ ہونے لگتے کہ سانس کھٹتی ہوئی محسوس ہوتی اور آنکھ کھل جاتی۔ ایک بار صرف اسی خیال سے حجاز مقدس گیا کہ وہاں حرم کی تنہائی میں اپنے مستقبل کے سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ لوں مگر صحوۃ اسلامی کے حلقوں میں میرے وسیع تر تعارف کے بعد حرم میں بھی تنہائی میسر نہ رہی۔ ایک دن کچھ ان ہی سوالات میں غمطوں حطیم سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ ہاشم مہدی نے آلیا، بڑے اصرار سے اپنے گھر لے گئے۔ جس ستون سے ٹیک لگائے ایسا لگتا تھا کہ خدانے وہیں کسی شناسا کو بٹھا رکھا ہے، جیسے کوئی مجھ پر مسلسل نظر رکھے ہوئے ہے۔ ایک دن مسجدِ نبوی کو اپنے ارتکاز کا مرکز بنایا، دنیا و مافیہا سے بے خبر سبز گنبد کے نظارے میں کھویا تھا کہ شیخ الحسین نے کندھا تھپتھپایا: ماشا اللہ! ماشا اللہ! کی صدا بلند ہوئی۔ بچھلی ملاقاتوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ شیخ ان دنوں مسجدِ نبوی سے متصل ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ مالونے کی ڈش ان کے ہاں بہت لذیذ ہوا کرتی تھی۔ مشرق میں صحوۃ کے احباب جن میں بعض میری ہی طرح انگریزی زبان و ادب میں پی ایچ ڈی تھے اور اعلیٰ مناصب پر متمکن تھے اور مغرب میں تحریکِ امن کے علمبردار جن میں کوئیکر بھی تھے جو اپنے اندر روشنی کی تلاش میں رہتے اور آزاد منٹ مدینیت بیزار نفوس بھی جو فطری اور سادہ زندگی کی جستجو میں ایک خواب آسا دنیا کا منصوبہ بناتے۔ ان دنوں میرے پاس ایک پوٹلی نما

بیگ ہوا کرتا تھا جو میری کل کائنات تھی۔ زندگی سادہ اور تکلفات سے ماوراء تھی۔ اپنی اس پوٹلی کو اٹھائے ہوئے کبھی مشرق کے چکر لگاتا اور کبھی مغرب کے اصفیاء کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوتا۔ فیصلہ ابھی معلق تھا۔ زندگی کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ اسے معمول کے انداز سے نہ جیا جائے، کچھ آسان نہ تھا۔ ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ مجھے ہالینڈ میں منعقد ہونے والی ایک ہفت روزہ بین الاقوامی ورکشاپ میں شرکت کا دعوت نامہ ملا جس کا مرکزی موضوع عدم تشدد تھا۔ ایک ریڈیکل، شدت پسند اور انقلابی نوجوان کے لئے، ذائقہ کی تبدیلی کے لئے، کسی ایسے ورکشاپ کی بڑی اہمیت تھی۔ میں نے فی الفور اس میں شرکت کا ارادہ کر لیا۔

اس بین الاقوامی ورکشاپ میں گوکہ شرکاء مختلف اطراف و اکناف سے آئے تھے، ان کی اغلب تعداد یورپی ممالک کے طلباء و طالبات پر مشتمل تھی۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو حال ہی میں اپنے تعلیمی سلسلے کی تکمیل کے بعد اب مختلف رفاہی تنظیموں کے ساتھ اپنی عملی زندگی کا آغاز کرنے والے تھے۔ چل جو امریکہ سے آئی تھی اس نے نوٹریڈیم سے مطالعات امن میں ایم اے کر رکھا تھا اور اب اگلے ماہ ہالینڈ کی ایک رفاہی تنظیم میں اہم ذمہ داری سنبھالنے والی تھی۔ نتاشا اور یوری نے روسی ٹیلیویشن میں اپنی باقاعدہ ملازمت کا حال ہی میں آغاز کیا تھا۔ نتاشا نے غضب کی آواز پائی تھی جب وہ برلن پر کوئی نغمہ چھیڑتی تو سامعین پر وجد کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی، جی چاہتا کہ وقت یوں ہی ٹھہرا رہے اور نغمہ کبھی تمام نہ ہو۔ ٹیری جو ہم سب لوگوں سے نسبتاً عمر میں بڑا تھا ناتھ آئرلینڈ کی انقلابی تحریکوں میں خاصا وقت گزار چکا تھا، اب عدم تشدد کے راستے کو اپنانے کا خواہاں تھا۔ صوفیہ جو کبھی مشرقی جرمنی میں سوشلسٹ پارٹی کی اہم کارکن ہوا کرتی تھی اب دیوار برلن کے انہدام کے سبب سخت ذہنی تشنج سے دوچار رہتی، وقتاً فوقتاً اس کی محزون آنکھوں سے آنسو کے دوچار قطرے ڈھلکتے دکھائی دیتے۔ للیانہ یوکرین میں رقص کی طالبہ تھی اور اسی فن کو دنیا میں قیام امن کے لئے استعمال کرنے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔ اس نے مجھے بھی رقص سکھانے کی پیشکش کی مگر بات نل غیاروں سے آگے نہ بڑھ سکی۔

ورکشاپ میں صبح سے شام تک مختلف قسم کے پروگرام ہوتے؛ کبھی کوئی معروف دانشور اور مبلغ امن ہمارے درمیان ہوتا اور کبھی طلباء و طالبات کے چھوٹے چھوٹے گروپ باہمی حل کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ شرکاء کا ذہنی اور فکری پس منظر گوکہ ایک دوسرے سے خاصا مختلف تھا لیکن مسلسل کئی دنوں کی مشترکہ بودوباش اور گفت و شنید نے ہمارے اندر ایک commune (خاندان) کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ کانفرنس ہال سے متصل ایک مختصر سی لائبریری تھی جہاں اس ورکشاپ کے روح رواں اور ہمارے میزبان اہل

(ہائیل) انتظامی امور کی نگرانی میں منہمک رہتے۔ اب جو تکلفات کا پردہ اٹھا تو ہم نے ان کی لائبریری میں جھانک تاک شروع کی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ان کی لائبریری میں اہل یہود سے متعلق ویڈیو کیسٹس کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اب خالی اوقات میں میرے لئے ایک نیا مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ پروفیسر لیپوچ، ربائی ٹیٹل باؤم، مارٹن بوبر، حنا آرنٹ، بن اہریزنج، اسرائیل شحاک اور ان جیسے دسیوں یہودی اہل علم سے میرا پہلا باضابطہ تعارف یہیں ہوا۔ یہ بات بھی میرے علم میں آئی کہ سارے یہودی ریاست اسرائیل کے حامی نہیں ہیں بلکہ نائورے کارٹا فرے کے یہودی ربائی موشتے لیب ہرش تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انہیں ایک صیہونی ریاست قبول نہیں خواہ اس خیال کو عربوں کی حمایت ہی کیوں نہ حاصل ہو جائے۔ انیسویں صدی کے ایک قد آور ربائی سامسون ہرش نے تو فلسطین واپسی کی کسی بھی باضابطہ مہم کو بمنزلہ گناہ قرار دیا ہے۔

ایک دن ایبل فرصت سے تھے، ورکشاپ کے زیادہ تر شرکاء شام کی سیر کے لئے نکل چکے تھے، کچھ لوگ باہر سبزہ زار سے متصل آہنی بچوں پر گپ شپ میں مصروف تھے، اسی دوران مخدا اپنی بیٹی شاشا کے ساتھ چائے کے لوازمات لئے لائبریری میں داخل ہوئیں اور بات ہالینڈ کے نازی ایام پر چل نکلی۔

’ایسٹریڈم میں نہروں کے سہارے دور تک بلند و بالا مکانات کا جو سلسلہ ہے، میں ان ہی میں سے ایک گھر میں پیدا ہوا تھا، پھر نازی آگئے اور سب کچھ بدل گیا، ایبل نے اپنی روداد زندگی اچانک ایک سانس میں کچھ اس طرح بیان کر دی کہ پہلے تو مجھے اس بات کا اندازہ ہی نہ ہوا کہ اس بیان کا یہ محل کیا ہے۔ پھر جو غور کیا تو ایک لمحے کے لئے اجنبیت، نامانوسیت اور خوف کی کوئی لہر ایسا لگا جیسے میرے وجود کو مس کرتی ہوئی گذر گئی ہو۔ تو کیا ایبل کا تعلق بھی اہل یہود کے کسی طائفے سے ہے؟ اور مخدا؟ مخدا تو اپنے آپ کو ایک قدامت پسند روایتی بَشپ کی بیٹی بتاتی ہیں۔ اور یہ دونوں میاں بیوی اپنی راست بازی اور خدمتِ خلق کے کاموں کے سبب تحریکِ امن کے حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اہل یہود اب تک میرے لئے ایک علمی دلچسپی کا موضوع رہے تھے، اب جو اچانک ایبل کی شکل میں ایک گوشت پوست کے یہودی سے سابقہ پڑا تو، چند لمحے کے لئے ہی سہی، میں دہشت زدہ ہو کر رہ گیا۔ بچپن سے ہی یہودیوں کی ایک منفی اور پراسرار تصویر میرے نہاں خانہ دل میں آویزاں چلی آتی تھی۔ اب قدرت نے میرے لئے ایک ایسے یہودی سے ملاقات کا سامان کر دیا تھا جو نہ صرف یہ کہ نازیوں کی ستم گری کا چشم دید گواہ تھا بلکہ ریاست اسرائیل کا زبردست ناقد بھی۔

ایک دن لائبریری میں چیزوں کو الٹ پلٹ کر رہا تھا کہ میری نظر ایک ویڈیو کیسٹ پر پڑی جس پر لکھا

تھا: Kristallnacht 50۔ پہلے تو کچھ اندازہ نہ ہوا کہ یہ کریسٹال ناخت کیا بلا ہے۔ پھر شوقِ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر جب اسے دیکھنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ یہ اس شبِ غم کی داستان ہے جب نازی جرمنی میں اہلِ یہود پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک پولش یہودی نوجوان نے حالات سے تنگ آ کر پیرس میں ایک جرمن سفارت کار کو گولی ماری۔ نازی حکومت کے لئے یہودیوں کو مطعون کرنے کے لئے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ جرمن پروپیگنڈہ منسٹر نے اس واقعہ پر سخت غیض و غضب کا اظہار کیا۔ پوری جرمن قوم حکومت کی پشت پناہی میں یہودیوں سے انتقام لینے کے لئے سڑکوں پر اتر آئی۔ ۹ نومبر ۱۹۳۸ء کی شب پورے جرمنی اور جرمن قبضہ والے آسٹریا میں ایک قیامت سے کم نہ تھی۔ رات بھر جرمن قوم پرستوں کے منظم غول یہودی گھروں، عبادت گاہوں اور تجارتی املاک کو نشانہ بناتے رہے۔ دونوں تک لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی کھلی چھوٹ رہی۔ آگ بجھانے والا عملہ اگر موقع واردات پر آیا بھی تو صرف اس لئے کہ آگ کو غیر یہودی علاقوں میں پھیلنے سے روکا جاسکے۔ کہتے ہیں کہ صرف ان دونوں میں ۹۱ یہودی قتل ہوئے، ڈھائی سو سے زیادہ سینا گوگ جلا کر خاکستر کر دئے گئے، کوئی تیس ہزار لوگوں کو پولس ان کے گھروں سے اٹھا کر تعذیب گاہوں میں پہنچا آئی۔ صبح اس طرح ہوئی کہ پورے ملک میں ہر طرف تباہی تھی۔ ٹوٹے شیشے، شکستہ دروازے، جلتے مکانات اور لٹے ہوئے مال و اسباب کے اس منظر نامے کو دیکھ کر یہودیوں کو اس بات کا یقین آ گیا کہ اب جرمنی میں ان کا کوئی مستقبل نہیں رہا۔

کریسٹال ناخت کی پچاسویں برسی پر جو پروگرام منعقد ہوا تھا اس میں ایک یہودی ربائی مسئلہ سکوت پر وعظ فرما رہے تھے۔ بولے: عزیزانِ گرامی! کریسٹال ناخت سے تو ہمارا جنم جنم کا رشتہ ہے۔ جب ہم معبد کی تباہی کے بعد بابل میں جلا وطنی کے دن گزار رہے تھے، غالباً کسی شادی کی تقریب تھی، لوگ خوشی اور مسرت سے سرشار تھے، جیسا کہ عام طور پر ایسے مواقع پر ہوتا ہے، تبھی ایک مرد دانا ان کے درمیان سے اٹھا، بولا: 'معبد تباہ ہو گیا، داؤد و سلیمان کی قائم کردہ سلطنت چھن گئی، ہم ارضِ کنعان سے نکالے گئے، جلا وطنی ہمارا مقدر بنی، پھر بھی چہروں پر اتنی مسکراہٹ، خوشی کا اس قدر احساس، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، یہ کہتے ہوئے اس نے سامنے رکھے ہوئے شیشے کے انتہائی قیمتی اور خوبصورت گل دان کو پوری قوت سے زمین پر دے مارا۔ ایک زبردست چھنا کے دار آواز کے ساتھ مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ 'تو عزیزو! یہ ہے وہ کریسٹال ناخت جس کا تذکرہ تلمود میں موجود ہے۔ اور یہ جو خاموشی ہے، یہ جو سکوت ہے تو اس میں بھی بڑے معانی پوشیدہ ہیں۔ ایک خاموشی تو وہ ہے جس کا مطلب ہے رضامندی۔ آج سے پچاس سال پہلے ۱۰ اور ۱۰ نومبر کی تاریخوں میں قومِ یہود پر جو مظالم ڈھائے گئے اس پر پوری جرمن قوم خاموش رہی۔ یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ ہمارے

قتل عام کو ان کی خاموش تائید حاصل تھی۔ خاموشی کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمارے سربراہ اور وہ لوگ جو اپنی سماجی حیثیت اور اثر و رسوخ کے سبب پہلے مرحلے میں بچ جاتے ہیں۔ وہ اس لئے خاموش رہ جاتے ہیں کہ اگر بولے تو مصائب میں گرفتار ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ میرے بھائیو! ایسے لوگوں کی بڑی مسئولیت ہے۔ ایسے لوگ جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ یہ رویہ کہ ہم تو بچ گئے، ہم کیوں بولیں دراصل آپ کو مجرموں میں شامل کر دیتا ہے۔ خاموشی کی ایک قسم وہ ہے جب آدمی اس لئے خاموش رہتا ہے کہ وہ غور و فکر کرے، سوچے کہ کس بحران میں پھنسا ہے اور اس سے نکلنے کا راستہ کیا ہو سکتا ہے؟۔ ابھی میں نے تلمود کا حوالہ دیا، آج کریسٹال ناخت کی پچاسویں برسی پر شکستہ شیشوں کی مہیب آوازیں ہم سے سوائی ہیں کہ ہم نے اس واقعہ سے کیا سیکھا؟ اس واقعہ کے چند ہی دنوں بعد اس وقت کے امریکی صدر نے ایک پریس کانفرنس کی تھی جس میں انہوں نے اس حادثے کی مذمت کی۔ کسی نے پوچھا: کیا اس نازک صورت حال کے پیش نظر جو یہودیوں کو جرمنی میں درپیش ہے، امریکہ اپنی ایمیگریشن پالیسی میں تبدیلی لائے گا؟ انہوں نے اس بات کی ضرورت سے صاف انکار کر دیا۔ تو بھائیو! خالی خالی ہمدردی جس کے پیچھے کچھ کرنے کا داعیہ نہ ہو وہ بھی دراصل جرم میں شامل ہونے کے مترادف ہے۔ اور ہاں کوئی بتائے کہ یہودی تنظیمیں اس وقت کہاں تھیں، کیا کر رہی تھیں؟ ایلی ویزل جو خود بھی تعذیبی کیمپوں میں رہے، انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب ہولوکاسٹ ختم ہوا تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ دنیا نے اس واقعہ سے سبق لے لیا ہے، شاید اب دوبارہ انسانوں کو اس صورت حال سے سابقہ پیش نہ آئے گا۔ لیکن ابھی ہولوکاسٹ کو صرف چند سال گزرے ہیں اور بہت سے لوگ یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ہولوکاسٹ واقعتاً پیش بھی آیا تھا۔ لوگو! آؤ اس بات کا پختہ عہد کریں کہ اب دوبارہ کبھی کریسٹال ناخت نہ ہونے دیں گے۔ داؤد کی لازوال سلطنت تمہاری راہ تک رہی ہے۔ اگلے سال یروشلم میں! اے بابل کی ندیو! اگر ہم یروشلم کو فراموش کریں تو ہمارا دایاں ہاتھ تباہ ہو جائے۔

ربائی کی تقریر میں وہی گھن گرج اور بلند آہنگی تھی جو عام طور پر ہمارے ہاں مذہبی علماء کی گفتگو کا خاصہ ہوا کرتی ہے۔ میں نے اسبل سے پوچھا: کریسٹال ناخت کے واقعہ کو پچاس سال ہو گئے مگر ان تقریروں کو سن کر تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ کل کا واقعہ ہو۔ اس ڈاکومنٹری میں تصویروں اور اخباری تراشوں کو بھی بڑی فنکاری سے استعمال کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ۱۹۳۸ء کے نازی ایام مختلف ابعاد کے ساتھ مرصع ہو کر نگاہوں کے سامنے آگئے ہوں۔ آخر اہل یہود نازی ایام کو اپنی نگاہوں کے سامنے اس قدر متحضر کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟

بولے: ایک سبب تو یہی ہے تاکہ مستقبل میں یہ حادثہ دوبارہ پیش نہ آئے۔ لوگ چوکتا رہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جب سے ہولوکاسٹ ایک علمی اور تحقیقی موضوع کے طور پر سامنے آیا ہے اس کی جزئیات اور ذیلی محرکات کی تفصیلات میں لوگوں کی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ تعذیبی کیمپوں سے زندہ بچ جانے والوں نے جب اپنی آپ بیتیاں لکھنا شروع کی تھیں اس وقت کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا کہ آگے چل کر ہولوکاسٹ ایک باضابطہ ڈسپلن کے طور پر سامنے آئے گا اور دنیا بھر میں ہولوکاسٹ میوزیم کو عوامی زیارت گاہوں کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔

’سنا ہے کہ اب جرمنی میں ایک عام احساسِ تأسف پایا جاتا ہے۔ مظلومین کی یاد میں جا بجا تعظیمی نشانات آویزاں کئے جا رہے ہیں۔‘

بولے: ہاں! ایک اعتبار سے تو یہ Never Again! بیانیے کا ایک خوشگوار پہلو ہے۔ لوگوں میں اپنی غلطیوں پر احساسِ پشیمانی عام ہے۔ اوشوٹز جیسی بدنام زمانہ تعذیب گاہوں کی باقیات اور ان کی عوامی زیارتوں سے بھی مسلسل یہ پیغام عام ہو رہا ہے کہ ظلم قوموں کے ضمیر پر گہرا داغ چھوڑ جاتا ہے۔ البتہ ظلم و نا انصافی کے خلاف اس یہودی بیانیے نے رفتہ رفتہ ایک کلٹ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ہم صرف اپنے ظلم پر نوحہ کناں ہیں، اس کی یاد میں میوزیم قائم کرتے ہیں اس میں فی نفسہ کوئی برائی بھی نہیں، لیکن ہم دوسروں پر ہونے والے ظلم کا تذکرہ بھی نہیں کرتے۔

یہ تو آپ نے بڑی بات کہہ دی ہے۔ کیا اہل یہود میں اور بھی ایسے اہل فکر ہیں جو Never Again! والے بیانیے کو گروہی تنگ نظری پر محمول کرتے ہیں؟

بولے: ہاں! یہ بات تو بہت سے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ہم اہل یہود جو اپنے معبد کے قیام نو کے نعرے کے ساتھ اٹھے تھے، ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر تو نہ کر پائے البتہ ہم نے ہولوکاسٹ میوزیم کی شکل میں نئے دور کا معبد ضرور تعمیر کر لیا جہاں چیف ربائی کی مسند پر بڑی شان کے ساتھ Elie Weizel متمکن چلے آتے ہیں۔

’ایلی ویزل؟ دی نائٹ والے؟ انہیں تو ادب کا نوبل انعام بھی ملا ہے، میں نے ایلی ویزل سے اپنی واقفیت جتانے کی کوشش کی۔‘

بولے: ایلی ایک اچھے ادیب ہیں، میں ان کے فن کا قائل ہوں مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ اپنے قومی اور ملی حوادث کا درد تو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں لیکن دوسری قوموں کے آلام و مصائب پر کیوں نہیں تڑپتے؟ میں نے نہیں دیکھا کہ کبھی انہوں نے فلسطینیوں پر روار کھے جانے والے مظالم پر کلمہ

اف بھی کہا ہو۔ حالانکہ یہودیوں میں اور بھی ادیب و شاعر ہیں جو ریاست اسرائیل کی سخت تنقید کرتے رہے ہیں۔ بعضوں نے تو یہاں تک کہا کہ ریاست اسرائیل میں فلسطینی 'نئے یہودی' بن گئے ہیں اور ہم اہل یہود نے نازیوں والا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ تو ایسا نہیں ہے کہ کلمہ 'حق' کہنے والے لوگ ہمارے درمیان موجود نہیں۔ مگر ایلی ویزل جو ایک بڑے ادیب ہیں، نوبل انعام یافتہ ہیں، انہیں ریاست اسرائیل کی غلط کاریاں نظر نہیں آتیں۔ یہ بڑا افسوسناک پہلو ہے۔

'آخر ایسا کیوں ہے؟' میں نے پوچھا۔

بولے: 'کلمہ 'حق' کہنا آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اپنی قوم کے خلاف زبان کھولنا جو آپ کو کاندھوں پر اٹھائے پھرتی ہو۔ کلمہ 'حق' کہنے والے لوگ حاشیہ پر چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ چلتے ہیں وہی اعزاز و اکرام سے نوازے جاتے ہیں۔ ایسا ہر قوم اور ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے۔ یہ بڑے بڑے نام جو تم دیکھتے ہو جن کی توقیر میں لوگ پلکیں بچھاتے ہیں، حکومتیں ان کی پشت پناہی کرتی ہیں تو اس کا سبب بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ حضرات دانستاً پورا سچ نہیں بولتے۔ اور سچ جب تک کامل نہ ہو، اسے بلا خوف لومتمہ لائم نہ بولا جائے، اس پر جھوٹ کا شائبہ ہوتا رہتا ہے۔'

ایبل کی باتوں میں میرے لئے چونک کا بڑا سامان تھا۔ ایلی ویزل میرے مدوح تھے۔ ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میری نظر میں ان کا بڑا مقام تھا۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ نازیوں کے جرائم کو دنیا کے سامنے بے نقاب کرنے والے ایلی ویزل مسئلہ فلسطین پر نہ صرف یہ کہ خاموش رہے ہیں بلکہ وہ بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ ریاست اسرائیل کے ساتھ کھڑے ہیں۔

سچ بولنا کیا واقعی اتنا ہی مشکل ہوتا ہے؟ اب جو میں نے اپنے ارد گرد اہل تقویٰ پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ پورا سچ تو شاید ہی کوئی بولتا ہو۔ خاص طور پر وہ لوگ جنہیں مسلم عوام اپنے سروں پر اٹھائے پھرتے ہیں، جن کے ہٹو بچو کے گرد تقدس کا ایک ہالہ قائم ہے اور جن کے بیرونی اسفار سے ان کی شخصیت کا قد کاٹھ متعین ہوتا ہے، ان میں سے اکثر لوگوں نے اپنی غیر مشروط وفاداری مختلف مسلکی گروہوں اور ان کے سرپرست حکمرانوں کے ہاتھوں رہن رکھی ہوئی ہے۔ کوئی سعودی بلاک کا حمایتی ہے تو کسی نے ایرانی انقلاب کی حمایت کا علم اٹھا رکھا ہے۔ ان کے پاس اپنے دلائل ہیں لیکن کوئی بھی اپنی مدوح حکومتوں کے خلاف کلمہ 'حق' کہنے کا یار نہیں رکھتا۔ بلکہ ان میں سے بیشتر حضرات تو اتنی ہمت بھی نہیں جٹا پاتے کہ اپنے بیرونی سفر کے دوران ذرائع ابلاغ میں اپنے مظلوم ہندوستانی بھائیوں کا مقدمہ رکھ سکیں۔ خود ہندوستان میں ان کی زبانیں مشکل ہی سے کھلتی ہیں۔ مجھے مراد آباد کے قتل عام کے بعد دہلی میں منعقد ہونے والا مسلم مجلس مشاورت کا وہ جلسہ

یاد آیا جس کی روداد حلیم بھائی نے سنائی تھی۔ مسلم لیڈران مراد آباد کے فوری دورے کے لئے تیار نہ تھے تا آنکہ انہیں وزیراعظم اندرا گاندھی کی ایما حاصل ہوگئی۔ اور گئے بھی تو اس طرح جیسے کوئی رسم پوری کرنے آئے ہوں۔ نہ متاثرہ علاقوں کا دورہ، نہ مظلوم مسلمانوں کی مدد کی کوئی اسکیم اور نہ ہی ظالموں کے خلاف مقدمے قائم کرنے کی کوئی کوشش۔ ہاں لکھنؤ میں ایک بڑا جلسہ ضرور ہو جس میں سیاسی لیڈروں کی گل افشانی گفتار سے ایسا لگا جیسے اس ملک میں مسلمان غیر محفوظ نہیں ہیں۔ مجھے نیلی کا قتل عام بھی یاد آیا؛ وہ جانوروں کی طرح غریب اور بے بس مسلمانوں کو ان کے گھروں سے ہانک کر لایا جانا اور انہیں ہزاروں کی تعداد میں تہہ تیغ کیا جانا۔ اس موقع پر بھی مسلمانوں کے سیاسی لیڈران کی زبان گنگ رہی، علمائے حق کے خیموں میں بھی کوئی ہلچل دکھائی نہ دی۔ ہاشم پورہ کا قتل عام بھی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتا اگر اس موقع پر بھوتی نرائن جیسے فرض شناس پولس آفیسر نے بروقت مداخلت نہ کی ہوتی۔ ہمارے علماء و قائدین تو ہمیں یہی بتاتے رہے کہ ہندوستان میں اسلام آزاد اور مسلمان محفوظ ہیں۔ ملک میں سیکولر جمہوریت قائم ہے اور ہم مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ ہم اس ملک میں سیکولر ازم کی بقا اور اس کے استحکام کے لئے کام کرتے رہیں۔

میں نے سوچا آدھا سچ تو واقعی بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ آدھا سچ مظلوم فلسطینیوں کی آہ و کراہ کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا، آدھا سچ سیکولر ازم کی تعذیب گاہ میں موت موت زندگی جینے کو قابل تحسین قرار دیتا ہے، آدھا سچ مصلحت اور حکمت کے نام پر ہمیں مدامت کا خوگر بناتا ہے۔ جھوٹ کی شناخت تو ہر خاص و عام پر عیاں ہوتی ہے مگر مقدس ہستیوں کے آدھے سچ کو شکست دینا کچھ آسان نہیں ہوتا۔

کریسٹال ناخت کی ویڈیو دیکھتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال آیا کہ جو قومیں اپنی صورتِ حال کا صحیح تحلیل و تجزیہ کر لیتی ہیں اور جو بروقت کسی وقوعہ کا کوئی مناسب نام بھی دے لیتی ہیں ان کے لئے صورتِ حال کی نزاکت پر مطلع ہونا اور پھر اس وقوعہ کو دوبارہ نہ ہونے دینا ممکن ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جو لوگ اپنی مصیبتوں کا نہ تو صحیح تجزیہ کر سکیں اور نہ ہی اسے کوئی مناسب نام دے سکیں وہ بھلا اس صورتِ حال سے کیسے باہر آسکتے ہیں۔ کریسٹال ناخت گو کہ نازیوں کا عطا کردہ نام ہے۔ اہل یہود نے شکستہ شیشے کی اس رات کو اپنی آہ و بکا اور نالہ و شیبون سے کچھ اس طرح بھر دیا کہ اب ہر سال اس واقعہ کی یاد منانے والوں کو وہ شبِ وحشت اپنی تمام ابعاد کے ساتھ نگاہوں میں مرصع ہونے لگتی ہے۔ مجرمین کٹہرے میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں، ہر طرف سے Never Again! Never Again! کی صدائیں بلند ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس ہم ہندوستانی مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہم اپنے قومی اور ملی حوادث کا نہ تو صحیح تجزیہ کر پاتے ہیں اور نہ ہی اسے کوئی مناسب نام دے پاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ قتل عام اور نسلی انخلاء کے بڑے بڑے واقعات پر فساد

جیسے بے ضرر لفظ کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ جرمنی کا کریسٹال ناخت تو صرف دو دنوں پر مشتمل تھا، بھاگلپور میں تو پورے دو ماہ تک شب و روز کریسٹال ناخت جیسی صورت حال رہی۔ گاؤں کے گاؤں مسلمانوں سے خالی ہو گئے۔ ہزاروں خانماں برباد مسلمان در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوئے جنہیں آج تک کوئی ٹھکانہ نہ مل سکا۔ حکومتیں بدلیں مگر مسلمانوں کی اشک شونی کی کسی کو توفیق نہ ہوئی خود مسلم قیادت نے امن عامہ اور باہمی خیر سگالی کے نام پر صورت حال سے سمجھوتہ کر لیا۔

میں نے بہت سوچا کہ ہم اپنے مصائب و حوادث کو، جن سے منقسم ہندوستان میں ہم مسلسل دوچار ہیں، کوئی ڈھنگ کا نام کیوں نہیں دیتے؟ خیال آیا کہ 'قتل عام' ہو یا 'نسلی تطہیر'، جبری انخلاء کا معاملہ ہو یا ریاستی دہشت گردی کا عذاب، یہ سارے الفاظ مشترکہ طور پر بھی اس صورت حال کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ ہمیں ایسا لگا کہ ہم ہندوستانی مسلمان گذشتہ برسہا برس سے ایک bottomless pit میں گرتے جا رہے ہوں اور ہر لمحہ ہمارے گرنے کی رفتار اور زندگی کے عذاب میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہو۔ ذرا یہ سلسلہ رکے تو اسے کوئی مناسب نام دیا جائے۔

مراد آباد، نیلی اور 'میروت' کی طرح بھاگلپور کریسٹال ناخت کی یادیں ہمارے اجتماعی حافظے سے محو ہوتی گئیں۔ ریاست کا جبری انتظامی چکّہ بے بس مسلمانوں کو روندتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس دوران عین دن کی روشنی میں، ذرائع ابلاغ کے کیمروں کے سامنے، باہری مسجد کے انہدام کا واقعہ بھی پیش آیا۔ آگے چل کر ۲۰۰۲ء میں گجرات میں ایک بار پھر ہم کریسٹال ناخت جیسی صورت حال سے دوچار ہوئے جس میں دو ہزار سے زیادہ مسلمان تاراج ہوئے، سیکڑوں زندہ جلادئے گئے مگر کریسٹال ناخت کے لفظ تک کسی کا ذہن نہ گیا۔ پہلی بار ۲۰۰۲ء کے دہلی 'دنگوں' کے موقع پر کریسٹال ناخت کا لفظ اس وقت سننے میں آیا جب کیمبرج یونیورسٹی کی ایک جواں سال لیکچرر پریا گوپال نے اپنے ایک ویڈیو پیغام میں دنیا کو متنبہ کیا کہ دہلی میں مسلمانوں کو جس صورت حال کا سامنا ہے وہ کوئی ہندو مسلم فساد نہیں بلکہ یہ کریسٹال ناخت کی وہی صورت حال ہے جو نازی جرمنی میں یہودیوں کو پیش آئی تھی۔ بھاگلپور کے سانحہ سے دہلی کے قتل عام تک تیس سال کا عرصہ گذرا تب کہیں جا کر ہندوستانی مسلمانوں کو اس بات کا اندازہ ہو سکا کہ انہیں اس ملک میں جس صورت حال کا سامنا ہے اس کے لئے مناسب لفظ فساد نہیں بلکہ کریسٹال ناخت ہے، ایک ازلی اور ابدی کریسٹال ناخت۔

## حبِ کلام

ہالینڈ کے بعد اب ہماری اگلی منزل انگلستان تھی۔ ادھر جب سے یورپ میں آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا تھا لندن کو میرے بین الاقوامی اسفار میں کچھ وہی مرکزیت حاصل ہوگئی تھی جو عالم اسلام کے سفر میں جدہ اور ریاض کو حاصل تھی۔ ان دنوں یہ خیال عام تھا کہ عالم اسلام کے جس زدہ ماحول کے برعکس لندن میں ہر قسم کی کھلی اور بے لاگ گفتگو کی خاصی گنجائش موجود ہے۔ معتدل اور جمہوریت پسند اخوانی قائدین سے لے کر حزب التحریر کے جوشیلے نوجوان، برطانوی یونیورسٹی کیمپسوں کو اپنی تگ و تاز کا خاص میدان سمجھتے۔ شاید ہی کوئی ایسا مہینہ جاتا جب کسی نہ کسی بہانے میں لندنستان میں اپنے اسلامی دوستوں کی مجلسوں کا حصہ نہ ہوتا۔ سوچا کیوں نہ اس بار بس کے ذریعہ لندن کے سفر کا لطف لیا جائے۔ اس طرح دوران سفر رودبار انگلستان کی سیر کا موقع بھی مل جائے گا۔

ڈن ہاخ سے بلجیم اور فرانس کی سرحدوں سے گذرتی ہوئی ہماری بس شام ڈھلے ساحل سمندر تک پہنچی جہاں ایک بحری جہاز ہمارا منتظر تھا۔ ابھی ایمیگریشن کی قطار سے نکلا ہی تھا کہ میری نظر ڈاکٹر ہیری پر پڑی جو میری طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ انہیں اچانک اس طرح دیکھ کر حیرت ہوئی۔ پتہ چلا کہ وہ بودا پاسٹ میں کسی کانفرنس میں شرکت کے بعد اپنے رفقاء کے ساتھ لندن کو لوٹ رہے ہیں۔ ڈاکٹر ہیری سے میری پہلی ملاقات چند برس پہلے لندن کی ایک جنگ مخالف کانفرنس میں ہوئی تھی جہاں یہ ورلڈ پاسپورٹ کا اسٹال لگائے بیٹھے تھے۔ محض دس پاؤنڈ ادا کیجئے اور مستقبل میں وجود میں آنے والی عالمی حکومت کے شہری بن جائیے۔ شنید ہے کہ اس خیال کے ابتدائی موسم گیری ڈیوس نے جب ایک عالمی شہریت کا تصور وضع کیا تھا تو ان کی اس خیالی دنیا اور اس کے پاسپورٹ کے اجراء کا بہت سے لوگوں نے مذاق اڑایا تھا لیکن ڈیوس ان مخالفتوں سے بددل نہ ہوئے، انھوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ اس بارے میں آر تھر کینیٹس، جنھوں نے آگے چل کر ڈیوس کی زندگی پر ایک مرقع فلم بنائی، نے بڑی دلچسپ بات کہی ہے۔ بقول کینیٹس: اس میں شبہ نہیں کہ ورلڈ پاسپورٹ کا اجراء بادی النظر میں ایک مذاق معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ بات تو دنیا کے

تمام پاسپورٹ کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ (بھلا خدا کی زمین پر انسانوں کو یہ اختیار کہاں سے حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی نقل و حرکت پر روک لگائے)۔ بقول کیلنگس: ان کا جاری کردہ پاسپورٹ ہمارے اوپر ایک تمسخر ہے اور ہمارا پاسپورٹ ان کے نظام پر ایک طمانچہ۔

ہمارے ایک دوست ہیں پروفیسر گلین مارٹن، انھوں نے بھی ایک عبوری عالمی پارلیامنٹ بنا رکھی ہے جس کے اجلاس وقتاً فوقتاً دنیا کے مختلف شہروں میں ہوتے رہتے ہیں۔ ایک بار نینی تال میں منعقدہ ایک اجلاس میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔ دنیا بھر سے مستقبل کے شہری یہاں جمع تھے۔ اس موقع پر نئی عالمی کرنسی ارتھ ڈالر کا اجراء ہونا تھا۔ شرکاء میں غیر معمولی جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ تبھی سخت حفاظتی حصار اور التزام کے جلو میں چند آہنی صندوق تھے کچھ اس شان سے لائے گئے کہ مجلس میں ہلچل کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ باری باری جب شرکاء کے ہاتھوں میں مستقبل کی کرنسی تھمائی گئی اور مستقبل کی عالمی حکومت کے رجسٹروں میں باقاعدہ اس کے اندراج کے بعد ہمارے دستخط لئے گئے تو اس موقع پر پارلیامنٹ کی خزانچی یوجین المن کی مسرت دیدنی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے مستقبل کی عالمی حکومت کے قیام کو بس اب چند لمحے رہ گئے ہوں۔ ڈاکٹر ہیری سے میں جب بھی ملا اس بات کا شدید احساس ہوا کہ سرمایہ دارانہ شکلے سے بچ نکلنے کا امکان ابھی باقی ہے اور یہ کہ ابھی بہت سے نیک نفسوں نے نظامِ جبر کے ہاتھوں اپنی شکست تسلیم نہیں کی ہے۔

جہاز کی پہلی منزل پر مختلف قسم کے ریستوراں اور خورد و نوش کی دکانیں تھیں، بچوں کی دلچسپی کے لئے مختلف قسم کے کھیل کود کے آلات اور ہاؤ ہو کی موسیقی کا بے ہنگم شور، گویا ایک محشر بپا تھا۔ بالائی منزل نسبتاً پرسکون تھی جہاں ہم لوگوں نے مجلس جمائی۔ جب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر جم گئے تو خیال آیا کیوں نہ ایک چکر عرشے کا لگایا جائے کہ سمندر کا اصل لطف تو عرشے پر ہی محسوس ہوتا ہے۔ عرشے پر شائقین کی تعداد خاصی کم تھی۔ نسبتاً نیم تاریک گوشے میں ایک بیچ پر قبضہ جمایا اور عشاء کی نماز میں مشغول ہو گیا۔ اوپر کھلا آسمان، نیچے لہروں کا طلاطم نیز شور اور تخیل بستہ ہواؤں کے پھیڑے۔ سمندر کی مہیب اور پراسرار وسعت کے مقابلے میں آج پھر اپنی کشتی بہت چھوٹی اور بے وقعت سی لگی۔ کچھ دیر ان ہی مناظر میں کھویا رہا۔ پھر نہ جانے کب ایک اونگھ سی طاری ہوگئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اب اسی بیچ کے دوسری جانب کچھ اس طرح ٹیک لگائے بیٹھے ہیں کہ ان کی پیٹھ میری جانب ہے، دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنی ٹھوری کو اس طرح سہارا دے رکھا ہے جیسے کسی گہری فکر میں ہوں۔ دفعتاً ان کی زبان پر یا مسبب الاسباب کا ورد جاری ہو جاتا ہے۔ 'بار الہا! اس ڈوبتے جہاز کو بچالے، یلغار چو طرفہ ہے اور تیرے علاوہ کوئی اور سہارا نہیں، کوئی اور ہمارا نہیں۔' پھر ان گریہ و زاری میں من ذریبتی من ذریبتی کی تکرار سنائی دیتی ہے، اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

ابا کو اس قدر مضطرب اور پریشان دیکھ کر میں بے چین ہوا تھا۔ میں نے سوچا نہ جانے اب کون سی مصیبت آنے کو ہے۔ پتہ نہیں یہ کس بات کا اشارہ ہے۔ خواب ہو یا بیداری، عالم رویا ہو یا عالم عمل، مشکل کی ہر گھڑی میں ابا میری پشت پناہی میں کھڑے ہو جاتے۔ ان کی موت کے بعد بھی یہ سلسلہ رکا نہیں۔ ایک بار مکان کی تزئین نو کے بعد بہت سے پرانے اسباب اور کاغذات کی فائلیں تلف کرنے کے خیال سے باہر ڈال دی گئی تھیں۔ اسی دوران ابا ایک دن غیر متوقع طور پر وارد ہوئے۔ فرمایا: ان فائلوں کو نہ پھینکو۔ دیکھنے پر پتہ چلا کہ ان میں بعض دستاویزی نوعیت کی چیزیں اور اہم شخصیات سے مراسلت کی فائلیں شامل تھیں جو ان کی بروقت مداخلت سے تلف ہونے سے بچ گئیں۔ ابا خواب میں بیداری کی باتیں کرتے اور عالم بیداری میں ہمیں خواب دیکھنے پر لگائے رکھتے۔ ان کے ہاں خواب اور بیداری کے مابین فاصلہ خاصا کم تھا۔ ایک بار حج سے فراغت کے بعد سیر و تفریح کی غرض سے انہیں جدہ میں بحر احمر کے ساحلوں پر لے گیا۔ دیر تک سمندر کی لہروں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پوچھنے پر پتہ لگا کہ اس سے پہلے یہ مناظر انھوں نے صرف خواب میں دیکھے تھے، عالم مشاہدہ میں پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ خواب کا ان کی زندگی میں بڑا دخل تھا بلکہ انہوں نے خواب ہی کے ذریعہ ہماری زندگیوں میں بھی ایک روزن کھول رکھا تھا۔

کچھ دیر میں ہمارا جہاز آبنائے ڈوور کے ساحل سے آگیا۔ ابھی ڈوور سے لندن کا سفر باقی تھا۔ میں نے قریب کی دکان سے گرما گرم کافی خریدی، برطانوی روزنامہ گارڈین کا تازہ شمارہ لیا اور بس میں اپنی نشست پر آبیٹھا تاکہ کافی کے ساتھ اخبار بینی کا لطف لیا جاسکے۔ اب جو خبروں پر نظر پڑی تو پتہ چلا کہ ابا کی بے چینی بلا سبب نہیں تھی۔ وطن عزیز میں ہندوستانی مسلمانوں کو جس ہلا مارنے والی صورت حال کا سامنا تھا، وہی کیا کم تھا کہ اب عراقی فوج نے کویت پر حملہ کر دیا جس کے سبب پورے شرق اوسط میں ایک غیر یقینی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ادھر کچھ دنوں سے میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر ایک ملک گیر کنونشن کے انعقاد کی سوچ رہا تھا، اب خلیج کی الجھتی صورت حال اس بات کی طالب تھی کہ بین الاقوامی مسائل کو بھی قومی تناظر سے الگ نہ سمجھا جائے۔

لندن میں ان دنوں میرا قیام شیخ عبدالخالق کے ہاں ہوا کرتا تھا۔ شیخ غیر معمولی خوبیوں کے مالک تھے، ورع اور تقویٰ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ان کے اندر ایک مضطرب روح تھی جو غلبہ حق کے لئے نئے نئے راستے کی تلاش میں رہتی۔ انہوں نے عرب و عجم کے کبار علماء کی صحبتیں اٹھائی تھیں مگر معتقد وہ کسی کے نہ بن پائے تھے۔ اور ان کی شاید یہی خوبی ہماری دوستی کی بنیاد بن گئی تھی۔ ایک دن کہنے لگے ہندوستانی علماء کی جامد حقیقت بلکہ ان کا سڑا تقلیدی طرز فکر انہیں ایک نئی ابتداء سے روکتا ہے۔ اس معاملے میں سعودی اور

اخوانی علماء ہم سے کہیں آگے ہیں۔ ہم نے نطقہ مطلقہ کی حنفی تعبیر کو جس طرح مدار دین قرار دے رکھا ہے اور اس بارے میں متبادل تعبیرات کو صرف اس لئے سننا نہیں چاہتے مبادا ہمارا اتحاد جاتا رہے تو یہ سب کچھ اچھا شگون نہیں ہے۔ اب سنا ہے کہ عرش سے فرش تک مسجد کی بات ہو رہی ہے۔ دیکھئے اس تحریک کا کیا حشر ہوتا ہے۔

’جی ہاں! جن دنوں مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے اس قسم کے بیانات آرہے تھے کہ مسجد جہاں ایک بار بن گئی وہ جگہ قیامت تک کے لئے مسجد ہی رہتی ہے، فرش سے عرش تک مسجد۔ ان دنوں میں نے بورڈ کے صدر کو متعدد خطوط لکھے تھے کہ خود نطقہ حنفی میں عرش سے فرش تک اور مسجد کی جگہ کو قیامت تک کے لئے مسجد قرار دینے کا کوئی دائمی کلیہ موجود نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ کے ایک دوسرے شاگرد امام محمد اس بات کے قائل ہیں کہ مسجد اور اس کے متعلقات کسی وجہ سے ویران ہو گئے ہوں تو ایسی صورت میں اسے اور اس کے تعمیری لوازمات کو دوسری جگہ منتقل کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ پھر یہ عرش سے فرش تک مسجد کی بات کن بنیادوں پر کہی جا رہی ہے؟ مگر اس وقت بھی کسی نے میری ان معروضات پر توجہ نہ دی۔

بولے: اس وقت آپ کی بات کون سنے گا خاص طور پر جب دونوں طرف سے طبل جنگ بج چکا ہو۔ ہر ہر مہادیو کے مقابلے میں تو عرش سے فرش تک کا نعرہ ہی کارگر معلوم پڑتا ہے۔ ویسے سننے میں آرہا ہے کہ مولانا علی میاں صاحب اور کانچی پورم کے شنکر آچاریہ کے بیچ، حکومت کی سرپرستی میں کوئی بات چل رہی ہے، کیا عجب کہ باہمی افہام و تفہیم کی کوئی راہ نکل آئے۔

مولانا علی میاں اس وقت ایسی پوزیشن میں تو ہیں کہ ایک فیصلہ کن رول انجام دے سکیں۔ حکومت ان کا وزن محسوس کرتی ہے۔ پچھلے کئی وزرائے اعظم خاص طور پر مسز اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی سے ان کے ذاتی مراسم رہے ہیں۔ اندرا تو ایمر جنسی میں اپنی انتخابی شکست کے بعد ان کے ہاں آشیر واد لینے بھی جا چکی ہیں اور کانچی کے شنکر آچاریہ سے اس ملاقات کے پیچھے بھی وزیر اعظم وی پی سنگھ کا ذہن کام کر رہا ہے۔ اس اعتبار سے موجودہ منظر نامے میں مولانا کی اہمیت مسلم ہے۔ مگر مولانا کی مرتجعاں مرنج شخصیت اس بات کی متحمل نہیں ہوگی کہ وہ اس قسم کے حساس مسئلہ پر اپنی صوابدید سے کوئی فیصلہ لے سکیں۔

آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں؟ انھوں نے پوچھا۔

دیکھئے! مولانا کا جو مزاج ہے، جہاں تک میں نے انہیں سمجھا ہے، وہ کسی بھی فریق سے ٹکراؤ مول نہیں لے سکتے۔ ان کے لئے بابرئ مسجد کے قائدین کے مقابلے میں خم ٹھونک کر کھڑا ہونا اور اپنے موقف کو منوالینا آسان نہیں ہوگا۔ بعض لوگوں کی شخصیت میں کونے نہیں ہوتے، صرف گولائی ہوتی ہے۔ وہ دشمن نہیں

بناتے کہ یہی ان کی خوبی ہوتی ہے اور یہی ان کی کمزوری بھی۔ ایسے لوگ تاریخ کا رخ نہیں موڑتے بلکہ ان کی ساری قوت جاری صورت حال کو برقرار رکھنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی مولانا تحریر و تقریر کے آدمی ہیں۔ حب کلام سے قوموں کی قسمتیں نہیں سنورتیں۔

’حب کلام؟‘ شیخ عبدالخالق نے وضاحت چاہی۔

مکہ میں ہمارے ایک دوست ہیں محمد ناصر۔ بڑے ہی لائق و فائق اسکالر ہیں، رابطہ کے انگریزی جرنل کے مدیر ہیں، انہوں نے ایک بار مولانا سے پوچھا: آپ پابندی سے رابطہ کے پروگراموں میں آتے ہیں، بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں حالانکہ ان جلسوں سے امت کی صورت حال میں کسی تبدیلی کی توقع نہیں ہوتی؟ بقول محمد ناصر: مولانا نے فرمایا: ارے بھئی! حب کلام بھی ایک چیز ہوتی ہے۔

’اس وقت امت کو حب کلام کی نہیں بلکہ جرائتِ اظہار کی ضرورت ہے، شیخ عبدالخالق نے کہا۔

مولانا ہم دونوں کے ہی مدوح تھے۔ ان کی راست بازی اور تقویٰ شعاری کا ہمارے دل و دماغ پر گہرا اثر تھا۔ البتہ اس وقت یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ حکومت کے اعلیٰ ایوانوں میں اپنی چلت پھرت کے باوجود وہ مسلم مسائل پر کوئی ٹھوس اور جاندار موقف کیوں نہیں اپناتے؟ حالانکہ ان کے پیچھے عوامی حمایت بھی ہے اور مسز گاندھی سے لے کر راجیو گاندھی اور وزیراعظم وی پی سنگھ سبھی ان کا احترام کرتے رہے ہیں۔ میرے لئے یہ بات بھی سمجھنا مشکل تھی کہ مراد آباد میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد انہوں نے مراد آباد کا جو دورہ کیا تھا اس موقع پر بے بس مسلمانوں کی طرف سے قانونی چارہ جوئی اور ان کی اشک شوقی کی کوئی ٹھوس کوشش کیوں نہیں کی اور ساری توجہ اگلے مہینے لکھنؤ میں پیامِ انسانیت کے اجلاس پر کیوں مرکوز کر دی؟ مراد آباد کے بعد نیلی میں مسلمانوں کو تاراج کیا گیا، پھر ہاشم پورہ اور ملیانہ کے لرزہ خیز واقعات پیش آئے، بھاگلپور سے مسلمانوں کے انخلاء کی کوشش ہوئی۔ یہ سب کچھ عین حکومت کی سرپرستی میں ہوا اور طرفہ یہ کہ ان تمام حوادث کے بعد بے بس مسلمانوں کو ہی جھوٹے مقدمات میں پھنسا گیا۔ مجرم آزاد دندناتے رہے۔ اگر ہماری قیادت نے ان سانحات کے معاً بعد سخت موقف اپنایا ہوتا یا منظم اور منصوبہ بند طریقے سے مجرمین کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی ہوتی تو ان کے لئے ایک کے بعد دوسرا ’فسادِ برپا کرنا شاید اتنا آسان نہ ہوتا۔ پھر ہماری ملی قیادت نے محض جلسے جلوس، تقاریر و بیانات اور وزیراعظم سے ملاقات کو ہی کافی کیوں سمجھا؟ میں اس بارے میں جتنا بھی سوچتا مجھے یہ عقدہ لانیخلم معلوم ہوتا۔

ان واقعات کو چند برس گزرے۔ اس دوران مولانا علی میاں کی خودنوشت کاروانِ زندگی کی مختلف

جلدیں شائع ہوتی رہیں۔ ان مجلدات میں مولانا نے مراد آباد کے اپنے دورے کا ذکر کیا اور اس صورت

حال کے ازالے کے طور پر لکھنؤ میں پیامِ انسانیت کنونشن کے انعقاد کی بات کہی اور اعتراضاً یہ بھی لکھ گئے کہ اس کنونشن کے ذریعہ انہیں اپنی نجیف آواز کو ذرا بلند آہنگی کے ساتھ پہنچانے کا موقع ملا اور بڑی صفائی سے یہ بات بھی کہہ دی کہ اس سے زیادہ اپنے اختیار میں کچھ نہیں۔ انھوں نے مسز اندرا گاندھی سے اپنی ملاقاتوں اور مراسلت کی تفصیلات لکھی اور ان کے اس دورے کی رودادِ شوق لکھی جب وہ از خود عید کے دوسرے دن ان سے ملاقات کے لئے ان کے گھر رائے بریلی پہنچیں اور خواتین سے ملنے کے لئے گھر کے اندر بھی گئیں تاکہ مستورات کو سلام پیش کریں۔ (ج ۲، ص ۲۲۸) انھوں نے راجیو گاندھی سے اپنی بے تکلف اور بار بار کی ملاقاتوں اور ان کے شریفانہ طرزِ عمل، ان کی حقیقت پسندی، اور ان کی اخلاقی جرأت کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھا۔ (ج ۵، ص ۳۳) البتہ ریکارڈ کی درستگی کے لئے یہ وضاحت بھی کر دی کہ بھاپگپور فساد کے بعد مسلمانوں کے جذبات اتنے براہیختہ تھے کہ خصوصی مجلسوں میں بھی کانگریس کی حمایت میں بولنا دشوار ہو گیا تھا اور خود بھی حکومت کی تائید کے سلسلے میں وہ یکسوئی اور شرح صدر باقی نہیں رہا تھا جو بالعموم کانگریسی حکومت کے لئے رہا ہے۔ (ج ۴، ص ۱۴۹) اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس فساد کے بعد راجیو گاندھی نے بہار کا دورہ کیا تھا اور انھوں نے خاٹی پولس افسروں کو سزا دینے کے بجائے مہتم اور برطرف شدہ افسران کو دوبارہ بحال کر دیا تھا اور بقول مولانا علی میاں اس بات کی شہرت ریاست میں اور ریاست سے باہر پھیل گئی جس سے مرکزی حکومت کے اس تغافل اور تساہل کا مسلمانوں کو اور بھی احساس ہوا۔ (ج ۴، ص ۱۴۸) ان مجلدات کی ورق گردانی کرتے ہوئے بھی میرے لئے یہ عقدہ لاینحل ہی رہا کہ جن وزراء اعظم کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگین رہے ہوں اور جن کی سفاکی اور سنگ دلی کے شواہد خود مولانا نے اپنی کتاب میں فراہم کئے ہوں ان کی اخلاقی جرأت اور شریفانہ طرزِ عمل کے آخر وہ اس قدر کیوں قائل ہیں اور ان ظالموں سے اپنی راہ و رسم کو اتنی اہمیت کے ساتھ کیوں بیان کرتے ہیں؟

## گول کونے

ایک دن SOAS لائبریری کی زیریں منزل میں، جہاں اہل یہود کی فقہی، سماجی اور سیاسی تحریکوں پر کتابوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے، ایک نوجوان یہودی اسکالر سے ملاقات ہوگئی۔ گفتگو کا سلسلہ جب آگے بڑھا تو پتہ چلا کہ ان کا نام زگری ہے اور یہ صاحب نازی ایام کے حوالے سے اہل یہود کی قیادت پر کوئی تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر رہے ہیں۔ گفتگو کو آگے بڑھانے کے لئے میں نے پوچھا: کیا کوئی خاص لیڈر یا مصنف آپ کے محور تحقیق میں ہے یا آپ کے پیش نظر محض اس عہد کی اجمالی صورت حال کا جائزہ لینا ہے؟

بولے: ہاں! ایک صاحب ہیں اسٹیفن وانز، شاید آپ ان سے واقف نہ ہوں۔

وانز (تفکیر سے) بھلا کون واقف نہ ہوگا، ویسے بھی ہم لوگ عقل و حکمت کی تلاش میں رہتے ہیں، ہمارے رسول کا کہنا ہے: الحکمة ضالة المومن فحيث وجدها فهو احق بها یعنی حکمت مومن کی متاع گمشدہ ہے سو جہاں بھی اسے پائے وہی اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ اسٹیفن وانز کے تذکرے کے بغیر شوا یعنی ہولوکاسٹ کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ بڑا بدبہ رہا ہے ان کا اپنے زمانے میں، اور صدر روز ویلٹ تو ان کا خاص احترام کرتے تھے۔

میری زبان سے شوا (ہولوکاسٹ کا عبرانی متبادل) کا لفظ سن کر اور اسٹیفن وانز سے میری واقفیت جان کر زگری کے چہرے پر مسرت اور حیرت کے آثار طلوع ہوئے اور بات مسکراہٹوں کے تبادلے پر ختم ہوگئی۔

اگلے دن وہ مجھے لنچ پر کیفے ٹیریا کی قطار میں نظر آگئے۔ خیال آیا زگری اہل یہود کی قیادت پر لکھ رہے ہیں، کیوں نہ ان سے یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ ان کے ہاں قیادت کا حال ہم سے کس قدر مختلف ہے۔ مجھے کرسٹل ناخت کا وہ ویڈیو بھی یاد آیا جس میں، میں نے ایک ربائی کو بڑی شدت کے ساتھ یہ سوال اٹھاتے ہوئے سنا تھا کہ جب جرمنی اور اس کے قبضے والے علاقوں میں یہودیوں کو ہولوکاسٹ کی صورت حال درپیش تھی اس وقت یہودی قیادت کہاں تھی؟ ان کی تنظیمیں کیا کر رہی تھیں؟ اس سے پہلے کہ میں کوئی

پیش بندی کرتا زگرہ نے خود ہی اس بات کا تذکرہ چھیڑ دیا کہ وہ اگلے ہفتہ اسٹیفن وانز کے متعلق دستاویز کے مطالعے کے لیے نیویارک کے سفر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا: امریکہ میں یہودی قیادت تو اس وقت بھی بڑی بااثر تھی، پھر وہ نازیوں کے مقابلے میں اپنے ہم قوموں کی مدد کیوں نہ کر پائی؟ میرے اس سوال پر وہ اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ بولے: مجھے اس سلسلے میں اسٹیفن وانز کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط دیکھنے ہیں جو انھوں نے اپنے عہد کے دوسرے یہودی لیڈروں اور بعض حکومتی عہدے داروں کو لکھے تھے، اور جن کے حوالے جا بجا نظر آتے ہیں۔ میری تو یہی رائے ہے کہ ہمیں دراصل ہماری قیادت نے ڈبویا ہے۔ اگر ہمارے لیڈروں نے خواہ وہ جرمنی میں رہے ہوں یا امریکہ میں، اگر ان لوگوں نے بزدلی اور سردمہری کا رویہ اختیار نہ کیا ہوتا تو اتنی آسانی سے چھ ملین یہودیوں کا قتل عام نہ ہو گیا ہوتا۔

تو آپ بھی اپنے قائدین کو ہی مورد الزام گردانتے ہیں؟

بولے: دیکھئے بعض چیزیں بڑی واضح ہیں۔ جرمنی میں جو کچھ ہوا وہ ایک دن میں نہیں ہوا۔ ۱۹۳۳ء سے جب ہٹلر برسر اقتدار آیا، ۱۹۴۴ء تک جب اتحادیوں کی بمباری سے تعذیب گاہوں میں پھنسے یہودی آزاد ہونے لگے، دس گیارہ سال کے اس عرصے میں ایک منصوبہ بند طریقے سے یہودیوں کو فنا کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سوال تو بہر حال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم پر یہ قیامت برپا تھی اس وقت یورپ اور امریکہ میں جو بااثر یہودی قیادت تھی وہ کر کیا رہی تھی؟

تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہودی لیڈر بھی در پردہ نازیوں کی سازش میں شریک ہو گئے تھے؟

میرے اس سوال پر وہ قدرے جھنجھلائے، بولے: میں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ پیچیدہ سوالوں کو اس طرح غیر معمولی سادہ لوحی سے نہیں پوچھنا چاہئے۔ بعض صورت حال ایسی ہوتی ہے جب آپ کی مصلحت اور بزدلی دشمنوں کے لیے ہتھیار بن جاتی ہے۔ آپ جسے مصلحت کہتے ہیں وہ دراصل مدافعت پر مبنی ایک رویہ ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں نازی ایام کی یہودی قیادت اسی مرض کہن میں مبتلا تھی۔ اب ان ہی اسٹیفن وانز کو لیجئے، یہ اس عہد کے سب سے بڑے مذہبی قائد تھے۔ امریکہ میں جتنی بھی بڑی یہودی انجمنیں تھیں ان کی کرسی صدارت کی شان ان ہی کے دم سے قائم تھی۔ ایوان اقتدار میں ان کے عمل دخل کا عالم یہ تھا کہ صدر روز ویلٹ بے تکلفی سے انھیں صرف اسٹیفن کہہ کر بلاتے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے تیرہ مرتبہ صدر روز ویلٹ سے ملاقات کی تھی۔ روز ویلٹ سے ان کے ذاتی مراسم کے سبب اس زمانے میں یہ لطیفہ بھی زبان زد عام تھا کہ عام انسانوں کے لیے صرف دو دنیائیں ہیں، ایک die velt یعنی موجودہ دنیا اور دوسری yene velt یعنی آخرت، البتہ یہودیوں کے لیے ایک اور اضافی متبادل موجود ہے اور وہ ہیں Roosevelt۔

بہت خوب! میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

بولے: مگر روز ویلٹ پر اس غیر معمولی انحصار کا نتیجہ کیا نکلا، یہودیوں کو نہ تو دنیا ہی ملی اور نہ ہی آخرت۔ وہ اس تیسرے متبادل کی نذر ہو گئے۔ اس اعتبار سے اسٹیفن وائز اور اس عہد کے دوسرے لیڈروں کی مسؤلیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

ربائی اسٹیفن وائز کے جب صدر امریکہ سے ذاتی مراسم تھے، بے تکلفی تھی، بار بار کا ملنا جلنا تھا تو وہ ہولوکاسٹ کے نازک ایام میں صدر روز ویلٹ کو کوئی مؤثر اقدام اٹھانے پر کیوں نہ آمادہ کر سکے؟ میں نے پوچھا۔

بولے: بعض لوگوں کی طبیعت میں صلح گل کا مادہ ہوتا ہے بلکہ یہ کہہ لیجئے کہ ان کی ریڑھ میں ہڈی نہیں ہوتی۔ وہ کسی مسئلہ پر سخت اور فیصلہ کن موقف اختیار نہیں کر سکتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی قیادت کا دبدبہ سرکار دربار میں ان کی ذاتی توقیر سے وابستہ ہے۔ ان کی نظر میں یہ بات اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ صدر یا وزیر اعظم نے مجھے خاص طور پر مدعو کیا یا کسی مسئلہ پر میری رائے لی یا خود مجھ سے ملنے آئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک فیصلہ کن موقف اختیار کرنے کے نتیجے میں وہ حکمرانوں کی نگاہ ناز کے سزاوار نہ رہیں اور اس طرح خیر کی جو تھوڑی بہت موہوم سی امید باقی ہے وہ بھی جاتی رہے۔ حکمراں بھی اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں کہ جب تک ان قائدین کا وجود باقی ہے انھیں زبانی جمع خرچ اور خوش اخلاقی کے مظاہرے سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک کر کے ہماری مزاحمت کا حصار گرتا جاتا ہے اور ہر بار ہمارے یہ بے دم قائدین ایوان اقتدار میں اپنی مظلومی کی نئی داستان لے کر حاضر ہوتے رہتے ہیں۔

’آخر کیا وجہ ہے کہ انھیں ان مزاحمتی حصاروں کے گرنے کا ادراک نہیں ہوتا؟‘

بولے: جب خدا سے ناامیدی اور انسانوں سے امیدیں کسی کے دل میں گھر کر جائے تو وہ عزیمت کے بجائے رخصت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اب ان ہی ربائی اسٹیفن کو لیجئے، وہ اس بات پر پھولے نہیں سماتے تھے کہ صدر روز ویلٹ نے ان کی بیٹی اور داماد کو کھانے پر مدعو کیا ہے۔ صدر خود اس دعوت میں موجود ہیں اور یہ کہ انھوں نے مجھے خاص طور پر اپنا محبت بھرا سلام بھیجا ہے۔ انھیں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کاش کہ یہ شخص ہماری قوم کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھاتا: (If only he would do something for my people) ادھر جرمنی سے مسلسل یہودیوں کے انخلاء اور ان کے قتل عام کی خبریں آتی رہتیں۔ صدر روز ویلٹ کوئی مؤثر اقدام اٹھانے کے بجائے یہ کہنے پر اکتفا کرتے کہ یہودیوں کو بچانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہٹلر کو جنگ کے میدان میں شکست دی جائے۔ پوری یہودی دنیا مضطرب رہی۔ جرمن قبضے کے مختلف علاقوں سے یہودیوں

کوٹریوں میں بھر کر تعذیب گاہوں میں پہنچایا جاتا رہا۔ امریکی یہودی حلقوں میں مسلسل بے چینی بڑھتی رہی۔ نوجوان یہودیوں، جن میں برگساں بوائز کا ان دنوں بڑا چرچا تھا، نیویارک، واشنگٹن اور دوسرے شہروں میں مظاہرے کرتے رہے لیکن اسٹیفن وائز کے صدر سے ذاتی مراسم پر اس کا کوئی اثر نہ پڑا۔ بلکہ کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ انھوں نے صدر روز ویلٹ کو جو شیلے مظاہرین سے ملنے سے بھی منع کر دیا تھا، مبادا امریکہ میں ایک متبادل یہودی قیادت کو اعتبار مل جائے۔

’مگر اسٹیفن وائز تو ایک خدا ترس ربائی تھے، ان کی تحریریں اور تقریریں اہل یہود کے قومی اور مذہبی مفادات سے مملو ہوتیں اور اہل یہود کو تفوق عطا کرنے کے لیے صیہونی تحریک میں بھی وہ پیش پیش رہے تھے، پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر محض اپنی شخصی وجاہت اور بلندقامتی کے تحفظ کے لیے ایک نازک وقت میں اپنے مذہبی اور ملی مفاد سے بے وفائی کے مرتکب ہوئے۔‘

جان بوجھ کر نہیں۔ دراصل اس قسم کے لوگ منافق تو ہوتے نہیں کہ ان پر جانے بوجھے اپنے ملی مفاد کے خلاف کام کرنے کا الزام عائد کیا جائے۔ مقدس لوگوں پر شیطان کے وار بھی نرالے ہوتے ہیں۔ مزاحمت سے مسلسل دور رہنے کے سبب ان کی شخصیت کا کس بل نکل چکا ہوتا ہے۔ وہ فیصلہ کن لمحات میں بھی دشمنوں کے حق میں بے ضرر ثابت ہوتے ہیں۔

’یعنی گول کونے والی شخصیت؟‘ میں نے لقمہ دیا۔

پہلے تو وہ میری اس اصطلاح پر متحیر ہوئے، پھر بولے: ہاں تم نے صحیح سمجھا کہ یہ چاہتے تو ہیں کہ ارباب اقتدار کے سامنے اپنی قوم کا مقدمہ پوری شان کے ساتھ رکھیں۔ پھر انھیں خیال آتا ہے کہ کہیں ان کی کھری کھری باتیں مخاطب کو ناراض نہ کر دیں اور اس طرح باہم مل بیٹھنے اور اپنی قوم کا مقدمہ رکھنے کا موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ وہ چاہتے تو ہیں کہ کلمہ حق کہہ دیں لیکن سچ ان کے حلق میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ وہ اچانک اس اندیشے کا شکار ہو جاتے ہیں، مبادا ان کی تلخ نوائی ارباب اقتدار پر الٹا اثر نہ کر جائے۔ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ ہماری مذہبی اور ملی قیادت ارباب اقتدار سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی ہے، لیکن عملاً مسائل جوں کے توں رہتے ہیں، بلکہ ہر گزرتے دن ان کی سنگینی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

’پھر آپ کی نظر میں قیادت کو کیا کرنا چاہئے تھا؟‘

بولے: قیادت تو دراصل فرشی جھولے (seesaw) کا کھیل ہے۔ آپ اگر اپنا وزن محسوس نہیں کر سکتے تو فریق مخالف آپ کو ہلکے میں ہی لے گا۔ برسہا برس کی ملاقاتوں، بار بار کی عرض و معروضات اور فدیہ بانہ گزارش کے بعد جب اسے اس بات کا یقین ہو چلے کہ آپ کی ذات سے اسے کوئی بڑا خطرہ نہیں، ارباب

اقتدار کے لیے کوئی بڑی مشکل پیدا کرنا آپ کے مزاج سے ہی مغائر ہے تو بھلا اہل اقتدار آپ کی بات پر کان کیوں دھریں گے۔ ربائی اسٹیفن وانز جیسے سادہ لوح اور روز ویلٹ جیسے چرب زبان کے باہمی مراسم جو کوئی دس پندرہ سال کے عرصے پر محیط ہیں، اس خیال کی توثیق کرتے ہیں کہ بے ضرر ملٹی قیادتوں نے ہمیشہ اپنی قوم کو ہزیمت سے ہی دوچار کیا ہے۔

’مگر ربائی وانز جس دور میں جی رہے تھے وہ اس کے علاوہ اور کربھی کیا سکتے تھے۔ ان کے پاس متبادل کیا تھا؟‘ میں نے زگری کو گھیرنے کی کوشش کی۔

بولے: انھوں نے موہوم امیدوں میں بہت وقت ضائع کیا۔ وہ اپنے ذاتی خطوط میں صدر روز ویلٹ کے رویے کے شاک کی نظر آتے ہیں، لیکن اتنی ہمت نہیں جٹا پاتے کہ صدر کو صاف لفظوں میں متنبہ کر سکیں۔ نازی جرمنی میں جب یہودیوں کا قتل عام شروع ہوا اور یہ بات واضح ہو گئی کہ ہٹلر کے نزدیک یہودی مسئلہ کا آخری حل جرمنی سے ان کا انخلاء اور مکمل صفایا ہے اس وقت امریکہ میں یہ اطلاع سب سے پہلے ربائی وانز کے پاس پہنچی۔ انھوں نے امریکی محکمہ خارجہ کے ذمہ داروں سے گفتگو کی، جہاں سے انھیں یہ ہدایت ملی کہ وہ اس خبر کو اس وقت تک عام نہ کریں، جب تک حکومت اپنے طور پر اس خبر کی توثیق نہ کر لے۔ ربائی وانز اس خبر پر دو ماہ تک خاموش رہے تا آنکہ امریکی ذرائع ابلاغ میں ایک دن اچانک شور مچ گیا اور اور پھر متعلقہ حکومتی محکمے نے بھی اس خبر کی تصدیق کر دی۔ کہتے ہیں کہ اگر انھوں نے دو ماہ پہلے ہی ذرائع ابلاغ میں شور مچا دیا ہوتا تو دنیا اس خطرے کا پہلے ہی ادراک کر لیتی اور شاید بہت سے یہودیوں کی جان بچ جاتی۔

’مگر وانز تو کسی امید پر ایسا کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر انھوں نے امریکی حکمرانوں کے مصالح کا پاس و لحاظ رکھا تو ان کا تعاون حاصل کرنا آسان ہوگا۔‘

بولے: اسی کو تو میں seesaw کا کھیل کہتا ہوں۔ اگر آپ ملٹی اور مذہبی اہمیت کی خبروں کو صرف اس لیے ذہن کر دیتے ہیں کہ آپ نظام وقت کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتے تو پھر آپ نہ صرف یہ کہ اس کھیل کے لائق نہیں ہیں بلکہ آپ اپنی مانند حباب شخصیت کے سبب قومی مجرم بھی ہیں، قومی مجرم۔ یہ کہتے ہوئے زگری کسی قدر مشتعل ہو گئے۔ بولے: ربائی وانز کو میں برا آدمی نہیں سمجھتا، لیکن اتنے بڑے قتل عام کی جواب دہی تو طے کرنی پڑے گی نا!

’آپ کی بات درست ہے مگر اہل تقویٰ کے لیے اس طرح کے سخت الفاظ کا استعمال مناسب نہیں، آخر ان کے تقدس کا بھی تو کچھ خیال کرنا چاہئے۔‘ میں نے زگری کو سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے۔ بولے: یہ تقدس کیا چیز ہوتی ہے۔ یہ تو ہمارا اپنا پیدا کردہ سراب ہے۔ ہم بعض لوگوں کو روحانیت کے ہالے میں گھرا دیکھتے ہیں، لیکن اس بات کی کوئی عقلی توجیہ نہیں کر پاتے کہ آخر کس چیز نے انہیں مقدس بنا رکھا ہے؟ کیا خاص قسم کا لباس یا وضع قطع آدمی کو روحانی بناتا ہے یا تقویٰ شعاری کا معیار کچھ اور ہے؟ ہمارے ہاں تلمودی کہانیوں میں حکمت کے بڑے بیش قیمت تکتے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ایک شخص ارض مقدس کی زیارت کے بعد ایک ربائی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بولا: حضرت! میں ارض کنعان میں بہت چلا پھرا۔ میں دیوار گریہ کے قریب بھی گیا اور تمام مقدس مقامات کی زیارت کی لیکن مجھے وہاں تقدس کا کوئی پرتو یا روحانیت نظر نہیں آئی۔ یہ سن کر ربائی نے اس سے پوچھا: کیا تم بفوفسٹک تو نہیں؟

یہ کیا ہوتا ہے؟

دیکھو سوال کا سیدھا جواب دو۔ تم بفوفسٹک تو نہیں؟ ربائی نے زور دے کر پوچھا۔

بولا: میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

تو تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تقدس کیا چیز ہوتی ہے اور روحانیت کسے کہتے ہیں۔ جب تک تمہارے پاس تقدس اور روحانیت کی کوئی متعین تعریف نہ ہو بھلا تم انہیں کیسے پہچان پاؤ گے۔

اس حکایت کو سناتے ہوئے زکری کے چہرے پر ایک لطیف مسکراہٹ طلوع ہوئی۔ بولے: اکثر لوگ مریدانہ اور معتقدانہ ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ ایک خاص قسم کی وضع قطع کو روحانیت سمجھ بیٹھتے ہیں اور ان کے لیے اپنے ہی جیسے انسانوں کا محاکمہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بولے: میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہولوکاسٹ کے سانحہ کے لیے دشمنوں سے کہیں زیادہ ہمارے اپنے قائدین اور ہماری اپنی انجمنیں ذمہ دار ہیں۔ اگر یورپ اور امریکہ میں بیٹھے ہوئے یہودی قائدین اور خود جرمن کنٹرول کے علاقوں میں کام کرنے والی مختلف یہودی انجمنیں خود کو نوالہ تر بنا کر پیش نہ کرتیں تو اتنے بڑے پیمانے پر ہمارا قتل عام نہ ہوتا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہمارے بزرگوں کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے بغیر کسی قابل ذکر مزاحمت کے اپنے گھر بار اور کاروبار کو تاج کر گئیوں کی رہائش اختیار کر لی۔ پھر ان گینٹوں سے اٹھ کر ان ٹرینوں میں سوار ہو گئے جو مختلف تعذیب گاہوں کی طرف انہیں لے جانے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔ اس انخلاء میں جو ترتیب و تنظیم اور حسن انتظام نظر آتا ہے یہ بھی مختلف سطح کی یہودی قیادت نے فراہم کیا۔ جو قوم از خود مرنے کو کشاکش کشاکش تعذیب گاہوں کی طرف چلی آتی ہو، حالانکہ اسے معلوم ہو کہ اگلی منزل موت ہے۔ بھلا کسی ایسی قوم کو موت کے منہ سے کون بچا سکتا تھا۔ لوگ مجھے انٹرنلسٹ (internalist) کہتے ہیں، لیکن میں جس

قدر بھی ہولوکاسٹ کے سانحہ پر غور کرتا ہوں مجھے اپنے قائدین کے دامن خون آلودہ نظر آتے ہیں۔  
یہ تو آپ نے عجیب بات کہہ دی۔ اس طرح آپ کہیں نازیوں کا جرم تو ہلکا نہیں کر رہے ہیں۔ میں  
نے زگری کے شدت احساس کو سنبھالا دینے کی کوشش کی۔

بولے: ہرگز نہیں، نازیوں کا جرم اپنی جگہ، اس کی شاعت کسی طرح کم نہیں ہو سکتی۔ میں تو صرف یہ  
کہہ رہا ہوں کہ ان کو ہمارے قتل عام کے لیے اعوان و انصار ہماری قوم سے ملے۔ نازیوں نے ہر شہر کے  
یہودی علاقوں میں ایک مجلس بزرگاں بنا رکھی تھی جو بڑی مستعدی کے ساتھ ان کے احکام و فرامین پر عمل کرتی  
تھی۔ بعض لوگوں نے تو عجیب عجیب قسم کی خیانتیں کیں اس قوم کے ساتھ۔ آپ نے شاید امتحان مقدمہ  
(Eichmann trail) کے بارے میں کچھ سنا ہو۔

نہیں! مجھے نہیں معلوم۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔

بولے: امتحان ایک نازی آفیسر تھا جس کے ذمہ ملک کے مختلف علاقوں سے یہودیوں کو اکٹھا کرنا  
اور انھیں ٹرینوں میں بھر کر تعذیب گاہوں میں پہنچانے کا کام سونپا گیا تھا۔ بعد میں یہ صاحب اسرائیل میں  
پکڑ کر لائے گئے اور ان پر مقدمہ چلا۔ اس زمانے میں ذرائع ابلاغ میں اس کا بڑا چرچا تھا، لیکن مجھے یہاں  
امتحان سے کچھ شکایت نہیں۔ وہ تو ایک معمولی ہرکارہ تھا، اپنے کام پر مامور۔ ہنگری کے ایک بڑے یہودی  
لیڈر تھے کاسنر (Kastner)۔ انھوں نے بوداپاسٹ میں یہودیوں کی مدد کے لیے ایک ریلیف کمیٹی قائم کر رکھی  
تھی جس کا مقصد جرمن علاقوں سے یہودیوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانا تھا۔ کاسنر نے اہل ثروت یہودیوں کی  
جان بچانے کے لیے، جس میں بعض معروف یہودی فنکار، شاعر اور مصنف بھی شامل تھے، امتحان سے ایک  
خفیہ سودا طے کیا تھا جس کے مطابق ہنگری سے سولہ سو یہودیوں کا ایک قافلہ بذریعہ ٹرین سوئٹزرلینڈ پہنچایا جانا  
تھا۔ کاسنر چونکہ امتحان کے مستقل رابطے میں تھے، ان پر یہ بات پوری طرح عیاں تھی کہ جرمن قبضہ کے  
مختلف علاقوں سے جوڑینیں یہودیوں کی منتقلی پر مامور ہیں اس کے پیچھے دراصل اجتماعی قتل کا منصوبہ ہے،  
لیکن سولہ سو یہودیوں کی جان بچانے اور انھیں بحفاظت سوئٹزرلینڈ تک پہنچانے کے لیے انھوں نے ان  
معلومات کو اپنی قوم سے پوشیدہ رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سولہ سو لوگوں کی جان تونچ گئی، لیکن اس اطلاع کے افشانه  
ہونے کے سبب لاکھوں دوسرے یہودی لقمہ اجل بن گئے۔ جس طرح ربائی وائز ہمارے قتل عام کی خبروں  
کو دو ماہ تک دبا کر بیٹھ گئے تھے، اسی طرح کاسنر نے مٹھی بھر یہودیوں کی جان بچانے کے لیے اپنی ہم قوموں  
کو حقیقی صورت حال سے نا آگاہ رکھا۔ اپنے اس عمل کے لیے تو ججیات دونوں کے پاس ہوں گی۔ مگر اتنی  
بات تو طے ہے کہ قیادت کی کرسیوں پر براجمان ان جیسوں کے ہاتھ ہمارے خون سے نا آلودہ نہیں۔

عجیب! کاسنر اور وائز کو آپ نے ایک صف میں کھڑا کر دیا؟

میرے اس احتجاج پر وہ مسکرائے، بولے: کاسنر تو پھر بھی چھوٹے مجرم ہیں، ان کے جرم کی شناعت ہر خاص و عام پر عیاں ہے۔ اسرائیلی ریاست میں کھلی عدالت میں ان پر مقدمہ چلا، جج نے انہیں شیطان کے زیر اثر کام کرنے کا خطا کار پایا۔ یہ بھی کہا گیا کہ انہوں نے وہ کام کیا جو صرف خدا کو زیب دیتا ہے، یعنی اس بات کا فیصلہ کہ کسے زندہ رہنا چاہئے اور کسے نہیں۔ ان کی ٹرین میں صرف وہی لوگ سوار ہو سکتے تھے جنہیں ان کی ایماء حاصل ہو۔ کاسنر تو اپنے اس جرم کے لئے سزائے موت کے مستحق قرار پائے۔ اس کے برعکس ربائی وائز کے جرم پر آج بھی تقدس کا پردہ پڑا ہے۔

لنچ کا وقفہ ختم ہونے کو تھا۔ کیفے ٹیریا میں برتنوں کے سمیٹے جانے اور کرسیوں کی ترتیب نو کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے زکری سے اجازت چاہی۔ واپس لائبریری میں اپنی نشست پر آ بیٹھا مگر ذہن کہیں اور بھٹکتا رہا۔ آج مجھے ہاشم علی اختر کی وہ گفتگو یاد آئی جب انہوں نے ہم طلباء کو ایک مسلمان بیرو کریٹ پر ہونے والی ستم کاریوں کے حوالے سے کہا تھا کہ پاکستان بننا شاید ناگزیر ہو گیا تھا۔ چلئے اس قصے کو چھوڑئے، جناح نے برصغیر کے آدھے مسلمانوں کا مسئلہ تو حل کر دیا، اب بقیہ آدھے مسلمانوں کا مسئلہ ہمیں حل کرنا ہے۔ اس وقت بھی میرے دل و دماغ پر یہ جملہ ایک ایٹم بم کی طرح گرا تھا۔ آج روڈ ولف کاسنر کی امدادی ٹرین کا قصہ سن کر ایسا لگا جیسے ہمارے قائدین نے بھی چند مراعات یافتہ مسلمانوں کی زندگی بچانے اور انہیں ایک محفوظ جولا نگاہ فراہم کرنے کے لئے برصغیر کی آدھی مسلم آبادی کو قربانی کی بھینٹ چڑھا دیا ہو۔

میں جس قدر غور کرتا مجھے ربائی وائز کی بارعب اور تقدس مآب شخصیت کچھ مانوس مانوس سی لگتی۔ ایسا لگتا جیسے یکے بعد دیگرے مختلف تصویریں اس فریم میں فٹ ہوتی جاتی ہوں۔ ان میں بعض تصویریں وہ تھیں جنہیں میں نے بہت قریب سے برتا تھا اور بعض کے بارے میں میرا تجربہ بس دور کے جلوہ پر مبنی تھا۔ پھر خیال آیا بھلا ایک راندہ درگاہ یہودی عالم کی جولانیوں سے ہمارے علماء و قائدین کو کیا علاقہ۔ سو یہ سوچ کر اس وسوسے پر لاجول پڑھنے میں عافیت جانی۔

## جراتِ کفر

لندن میں مجھے مطالعہ و مشاہدہ کی جو سہولت حاصل تھی توجی تو یہی چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ کچھ اور دراز ہو مگر ہندوستان سے آنے والی خبریں پریشان کئے رکھتیں۔ ایک دن شیخ عبدالخالق سے اس مسئلہ پر گفتگو چل نکل۔ کہنے لگے: ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت حالات سے بالکل بے خبر ہے، کاش کہ انہیں اس بات کا اندازہ ہوتا کہ اس وقت انہیں ایک عالمی یلغار کا سامنا ہے۔ ابھی گذشتہ برس لندن کے نواح میں واقع Milton Keynes میں جو ورلڈ ہندو سمیلن منعقد ہوا تھا اس کے پیچھے بھی رام مندر کی تحریک ہی کارفرما تھی۔ کوئی ایک لاکھ لوگ مختلف اطراف و اکناف سے آئے تھے۔ ہندو جاگے و شو جاگے، مانو کا وشواس جاگے، جیسے نغموں سے فضا گونج رہی تھی، ایسا لگتا تھا کہ رام مندر کی تحریک نے عالمی سطح پر ہندوؤں کی نشاۃ ثانیہ کا سامان کر دیا ہو۔ دوسری طرف بابرئ مسجد کے قائدین اور مسلم تنظیموں کے ذمہ داروں کو دیکھئے تو ایسا لگتا ہے کہ میر سپاہ ناسزا، لشکر یاں شکستہ صف ہائے وہ تیر نیم کش، جس کا نہیں کوئی ہدف کہنے لگے: محض اخباری بیانات سے معرکے سر نہیں ہوتے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو موگیانہ قیادت کی نہیں بلکہ پیمبرانہ عزائم کی ضرورت ہے۔

شیخ کے منہ سے 'موگیانہ قیادت' جیسی خالص دیہاتی اصطلاح سن کر پہلے تو مجھے ہنسی آئی، پھر خیال آیا، شاید 'مولویانہ' کہتے ہوں۔ میں نے صراحت چاہی تو بولے: 'ارے بھئی صرف مولویوں کو ہی مورد الزام کیوں ٹھہرایا جائے۔ ایک طرح کے وہن کا تو ہم سب ہی شکار ہیں۔ اور جب تک اس مرض مزمن کا شافی علاج نہ ہو، اقدامی عمل کی ہر منصوبہ بندی پر ایک بیمار ذہن کی نفسیات غالب رہے گی۔' میں نے سوچا شیخ شاید صحیح کہتے ہیں۔ کسی قوم کی نفسیاتی اور روحانی صحت اگر درست نہ ہو تو اسے بیس کروڑ اہل ایمان کی عددی قوت پر بھی محض 'اقلیت' ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ان کے علماء لوگوں کو رسالہ محمدی کی طرف بلانے کے بجائے 'حلف الفضول' جیسے ماقبل نبوۃ اسوہ میں پناہ لینا مناسب جانتے ہیں، ان کے دانشور خود کو مسلمان سمجھتے تو ہیں پر کہنا نہیں چاہتے، انہیں اپنی نظری شناخت کے افشاء ہو جانے سے ڈر لگتا ہے

مبادا ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگ جائے۔ اسلام کی یہ تصویر کہ یہ مسلمانوں کا قومی دین ہے اتنا مقبول اور شایع ہے کہ پیمبرانہ اسلام کی آواز کہیں دب کر رہ گئی ہے۔ جب طبقہ علماء نے ہی رسالہ محمدی کے علی الرغم حلف الفضول تک اپنی تگ و تاز کو محدود رکھا ہو تو عام لوگوں سے بھلا کیا شکوہ۔

چوں کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانانی

آج مجھے ہندوستانی مسلمانوں کا وہ قومی کنونشن بھی یاد آیا جو پچھلے سال سید شہاب الدین کی دعوت پر ماؤنٹن ہال میں منعقد ہوا تھا۔ اس موقع پر قرآن مجید کا ایک نسخہ میں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے تقریر کی ابتدا میں قرآن مجید کو ہاتھ میں لہراتے ہوئے سامعین سے کہا: لوگو! میں تمہیں اس کتاب کی سیاست کی طرف بلانے آیا ہوں۔ مسلمانوں کی قومی تحریک سے ہم پہلے ہی بہت نقصان اٹھا چکے ہیں۔ ہندو بنام مسلم کی جنگ میں ہم نے سابق دارالاسلام ہندوستان سے اپنا استحقاق کھو دیا۔ اب یہ قومی کشمکش جو باہری مسجد رام جنم بھومی کے تنازعہ کی شکل میں دوبارہ ہمارے سامنے آئی ہے، ہمیں پھر سے ایک خالص قومی جنگ میں گھسیٹنا چاہتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس وقت اپنے دستوری اور جمہوری حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کرنے کے بجائے اسلام کے اس آفاقی پیغام کو عام کریں جس میں تمام ہی قوموں کے لئے ان کے حقوق کی ضمانت ہے۔ اسلام کے عدل و قسط کا ایجنڈا آج بھی ملک کی ایک بڑی غیر مسلم آبادی کے لئے نعمتِ نشاط انگیز ثابت ہوگا۔ منڈل اور کنڈل کی جنگ نے آج پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ ہمیں ایک مصنوعی اکثریت کے مقابلے میں اقلیت باور کرایا گیا ہے۔ اکرامِ آدمیت کا اسلامی ایجنڈا آج بھی اس ملک میں ایک نئی صبح کا نقیب بن سکتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے میں نے پھر سے قرآن مجید کو ہاتھ میں بلند کیا اور کہا کہ وقت آ گیا ہے کہ اس کتاب کی سیاست کا اس ملک میں آغاز کر دیا جائے۔ قرآن مجید کے اس طرح لہرانے سے سامعین نے گفتگو شوق اور توجہ سے سنی چند لمحوں کے لئے مجلس میں ایک ہلچل کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جلسے کے اختتام پر سید شہاب الدین صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں میرا نام لئے بغیر ان صاحب کی خوب نکیر کی جو بقول ان کے، یہاں یہ سمجھ کر آدھمکے تھے گویا یہ کنونشن کسی اسلامی حکومت کے قیام کے لئے بلایا گیا ہو۔ انہوں نے باسالیب مختلف اس بات کی صراحت کر دی کہ ان کے پیش نظر کوئی نئی سیاسی حکمتِ عملی نہیں بلکہ موجودہ سیکولر آرڈر کا دفاع ہے۔ اور بس۔

سید شہاب الدین میرے کرم فرماؤں میں تھے۔ ان سے میری مراسلت تھی۔ اور شاید اسی لئے انہوں نے مجھے اپنے کنونشن میں شرکت کی دعوت بھی دی تھی لیکن میں نے موقع کی نزاکت کا بالکل ہی خیال نہیں کیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ہمارے باہمی مراسم میں وہ پہلی سی بات نہ رہی۔ کوئی دو سال بعد قدرت نے

ہمیں پھر ایک اسٹیج پر جمع کر دیا۔ نیویارک میں امریکن فیڈریشن آف مسلمس فرام انڈیا (AFMI) کا پہلا کنونشن تھا جس میں شہاب الدین صاحب ہندوستان سے تشریف لائے تھے۔ میں ان دنوں واشنگٹن میں موجود تھا۔ میری موجودگی کا فائدہ اٹھا کر منتظمین نے مجھے بھی مدعو کر لیا تھا۔ وہاں بھی سید صاحب نے سیکولر آرڈر کے دفاع میں تقریر کی اور میں نے اس نظام کے چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر ہونے کا تذکرہ جاری رکھا۔ برسوں بعد جب میں نے مولوی محمود مدنی سکریٹری جمعیت العلماء ہند کو بانگِ دہل بلکہ کسی قدر افتخار کے ساتھ یہ کہتے سنا کہ انہوں نے (یعنی ان کے وطن پرست پرکھوں نے) موجودہ سیکولر نظام کے حق میں نظامِ مصطفیٰ کو مسترد کر دیا تھا تو مجھے اس بات پر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ ہاں مجھے ان کی اس صاف گوئی پر پیار آیا۔ ان کی جراتِ کفر سے میرے اس خیال کی مزید توثیق ہوتی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو منقسم ہندوستان میں شروع سے ہی ایک نظری اور سیاسی ارتداد کا سامنا تھا۔

## تیسری ہجرت

علی گڑھ میں ایک طرح کی خانہ بدوشی مجھ پر سایہ فگن ہونے کو تھی۔ گذشتہ چند برسوں سے میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ابھی ایک سفر کی تکان دور نہیں ہوتی کہ دوسرے سفر پر اچانک روانہ ہو جاتا۔ اس سفر مسلسل کے سبب بعض احباب یہ کہنے لگے تھے کہ یہ صاحب رہتے تو جہاز پر ہیں ہاں کبھی کبھی ادھر بھی آجاتے ہیں۔ اس دفعہ طویل غیر حاضری کے بعد جب علی گڑھ پہنچا تو پتہ چلا کہ میری کتابوں اور کاغذات کے بندل مختلف احباب کے کمروں میں بطور امانت رکھوا دئے گئے ہیں۔ غلبہٴ اسلام کا ڈھیر جن صاحب کے حصے میں آیا تھا انہیں مسلسل آنے والوں سے اس استفسار کا سامنا رہتا کہ یہ کون سی کتاب ہے، اس کے ڈھیر سارے نسخے یہاں کیوں رکھے ہیں اور یہ کہ اس کتاب کی خاص بات کیا ہے؟ ان صاحب کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کتاب پڑھے بغیر ہی بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان سوالوں کے شافی جواب دیتے رہتے۔

دو چار دن ایک طرح کی بے گھری کا احساس رہا پھر جلد ہی دوستوں کے لطف و کرم سے ایسا لگنے لگا کہ رہنے کو بہت سارے کمرے ہوں اور اب تک محض ایک کمرے میں رہنے کا تکلف خواہ مخواہ ہی پال رکھا تھا۔ ایک دن باہر برآمدے میں بیٹھا صبح کا اخبار دیکھ رہا تھا کہ پڑوس کے کمرے سے ایک بزرگ صورت مولوی صاحب باہر نکلے، چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ ارے یہ تو مولانا حمایت اللہ ہیں۔ ان سے مدینہ منورہ میں میرا ملنا جلنا رہا تھا۔ مولانا چند دنوں پہلے ہی ریاض سے تشریف لائے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ کویت پر صدام کے حملے کے بعد سعودی عرب میں خوف و دہشت کا ماحول ہے۔ شاہراہیں ویران اور ایئرپورٹ سنسان ہیں۔ پتہ نہیں آگے کیا ہونے والا ہے۔ میں نے سوچا کہ ایک ایسے وقت میں جب لوگ صورت حال سے خوف زدہ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں، کیوں نہ ریاض کے سفر کا پروگرام بنایا جائے تاکہ ایک بحرانی صورت حال کا قریب سے مشاہدہ کیا جاسکے۔ میرا سارا دفتری ساز و سامان، خط و کتابت کی فائلیں حتیٰ کہ علمی کام کے لیے مطلوب تحقیقی نوٹس بھی مختلف کارٹونوں میں بند تھے۔ اب میرا انحصار پوری طرح اس پوٹلی نما بیگ پر تھا جسے میں سفر و حضر میں اپنے ساتھ لیے پھرتا۔ سوچا جب ایک طرح کی بے

دری اور خانہ بدوشی اپنے حصے میں آہی گئی ہے تو کیوں نہ اپنے اونٹ کا رخ اس صحرا کی طرف موڑ دیا جائے جہاں اس وقت اہل ایمان ایک نئے معرکہ کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ اتفاق سے ان ہی دنوں رابطہ عالم اسلامی کی ایک کانفرنس بھی منعقد ہو رہی تھی۔ میں چونکہ اس ہجوم کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا، جو سعودی موقف کی غیر مشروط حمایت کے لیے اس موقع پر مکہ میں جمع ہو رہا تھا، سو میں نے رابطہ کی کانفرنس کا ویزا تو قبول کر لیا، البتہ اس سفر کی ذاتی حیثیت برقرار رکھی۔ مجھے کراچی میں کچھ ضروری کام نپٹانے تھے۔ 'اسلامی انقلاب کا دستور العمل' کی اشاعت آخری مرحلے میں تھی جسے مدیر تکبیر محمد صلاح الدین اپنے ادارے سے شائع کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ان دنوں پی آئی اے کی فلائٹ دہلی سے صبح پہنچتی تھی اور دیر رات گئے جدہ کے لیے روانہ ہوتی تھی، لیکن جب ایئر پورٹ سے باہر آیا تو خیال آیا کیوں نہ وسط شہر میں قیام کیا جائے۔ وائی ایم سی اے کی قیام گاہ میں پہلے بھی ٹھہر چکا تھا جس کے سامنے پی آئی اے کا بڑا دفتر ہوا کرتا تھا۔ نہادھو کر باہر نکلا تو میرے قدم غیر ارادی طور پر پی آئی اے کی دفتر کی طرف اٹھ گئے۔ خیال آیا اگر ایک دن کے لیے ٹکٹ میں توسیع ہو جائے تو لگے ہاتھوں جیلانی چچا سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ پچھلے سفر میں بھی یہ آرزو دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خاتون کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ اس نے میرا ہندوستانی پاسپورٹ دیکھ کر غیر معمولی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور اگلے دن کی سیٹ کنفرم کر دی۔

میرے پاس فیڈرل بی ایریا کا پتہ تھا۔ راستے میں ہماری ٹیکسی لیاقت آباد سے گزری جہاں الطاف حسین کے قدر کٹ آؤٹ اور دیو ہیکل ہورڈنکس آویزاں تھیں۔ میں نے اپنے ڈرائیور سے پوچھا: یہ جا بجا الطاف حسین کے فرمودات اور ان کی تصویریں کیوں آویزاں ہیں؟ کہنے لگا: آپ کو پتہ نہیں یہ شہر قائد ہے۔ وہ تو مجھے معلوم ہے کہ مزار قائد اسی شہر میں واقع ہے، میں نے کہا۔

بولا: آپ قائد اعظم کی بات کر رہے ہیں؟ ان کا دور گیا، اب یہ قائد انقلاب کا دور ہے۔

'تو کیا آپ لوگوں نے اب اپنا قائد بدل لیا ہے؟'

بولا: آپ ہی بتائیے کرتے بھی کیا۔ ہم لوگوں نے پاکستان کے لیے اپنا گھر بار چھوڑا۔ آباء و اجداد کی حویلیاں چھوڑ کر ہم لالو کھیت کے ویرانے میں آئے۔ اس بات کو چالیس بیالیس سال کا عرصہ ہوا۔ اس دوران ایک پوری نسل یہیں پیدا ہوئی، پھلی پھولی لیکن ابھی تک ہم اس مٹی کا حصہ نہیں بن سکے۔ اب بھی ہمارے بچے مہاجر ہی کہلاتے ہیں۔

'یہ تو اعزاز کی بات ہے، مہاجر تو بہت بڑا لفظ ہے۔'

میرے یہ کہنے پر وہ مشتعل سا ہو گیا۔ کہنے لگا کہ ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ ہمیں بلوچی، سندھی، پنجابی

اور پٹھانوں کی طرح ایک قوم تسلیم کر لو تا کہ ہمیں پاکستان میں باہری عنصر کے طور پر نہ دیکھا جائے۔  
 ’مگر مہاجر تو پاکستان کی بنا میں ہیں۔ ان کا رول مؤسسین کا رہا ہے۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ اپنا گھر  
 بار چھوڑ کر پاکستان آئے بلکہ یہ جن اقلیتی مسلم علاقوں سے آئے پاکستان کی تحریک ان ہی علاقوں میں سب  
 سے زیادہ مضبوط تھی۔ پھر آپ ایک تاریخی قائدانہ رول کو چھوڑ کر خود کو محض سندھی، بلوچی یا پنجابی قوم کے  
 مقام پر کیوں لانا چاہتے ہیں؟‘

بولا: یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ آپ صحافی تو نہیں؟ ہمارے ہاں بھی ایک بندہ ہے صلاح الدین۔ وہ  
 بھی اسی طرح کی باتیں کرتا ہے۔ وہ بھی مہاجر ہے مگر مہاجروں کے خلاف لکھتا ہے۔ عجیب آدمی ہے۔ آپ کو  
 پتہ ہے اس وقت بھی لاکھوں بہاری مسلمان بنگلہ دیش میں کیمپوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کا  
 تعلق بلوچی، سندھی، پنجابی یا پٹھان قوم سے ہوتا تو کیا وہ اسی طرح ان پناہ گزین کیمپوں میں پڑے سڑ رہے  
 ہوتے۔ ان قوموں کے پاس تو اپنے اپنے صوبے ہیں نا۔ اگر مہاجروں کے پاس بھی پاکستان میں کوئی صوبہ  
 ہوتا تو بنگلہ دیش میں پھنسے بہاری مسلمانوں کا مسئلہ کب کا حل ہو گیا ہوتا۔

ہماری ٹیکسی اب فیڈرل بی ایریا میں داخل ہو چکی تھی۔ سڑکیں کشادہ اور مکانون پر نمبر ڈلے تھے،  
 مطلوبہ پتے پر پہنچنے میں کچھ زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ میں نے ٹیکسی والے کو رخصت کیا۔ میرے سامنے ایک  
 وسیع بنگلہ نما مکان تھا۔ میں نے کھٹی بجائی، حاجب نے دروازہ کھولا۔ گھر میں جب یہ خبر پہنچی کہ ہندوستان سے  
 کوئی ملنے آیا ہے تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون اپنی دو تین بچیوں کے ساتھ میری ضیافت  
 میں لگ گئیں۔ لڑکیوں نے بتایا کہ دادا یہاں نہیں رہتے، وہ کچھ دن پہلے یہ گھر چھوڑ چکے ہیں، البتہ ابا کو فون  
 پر آپ کی آمد کی اطلاع دے دی گئی ہے۔ اسی دوران پڑوس کے گھروں سے غالباً ان لڑکیوں کی سہیلیاں بھی  
 ہندوستان سے آنے والے اس نووارد بھائی کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئیں۔ ایک خاص بات جو میں نے ان  
 لڑکیوں میں محسوس کی وہ یہ تھی کہ ان سبھوں کے رخساروں پر ایک خاص قسم کی سرخی ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں یہ حیا  
 کی سرخی تھی یا قدرت کا عطیہ حسن۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ کوئی خاص قسم کا غازہ تھا جس کا ان دنوں کراچی میں  
 فیشن عام تھا۔ بہنوں کا اصرار تھا کہ میں قیام کروں لیکن مجھے جیلانی چچا سے ملنے کی جلدی تھی۔ میرے اصرار  
 پر ایک صاحب موٹر سائیکل لے آئے اور میں ان کے ساتھ مختلف تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک گنجان  
 علاقے کی مسجد میں جا پہنچا، جس کے بیرونی گوشے میں جیلانی چچا نے سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ مجھے اس  
 طرح غیر متوقع طور پر دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے۔ دیر تک ابا کی خیریت پوچھتے رہے۔ وہ اس بات پر مصر  
 تھے کہ ایک شب میں ان کے ہاں ضرور قیام کروں تا کہ سیر حاصل گفتگو کا موقع مل سکے۔

میں نے ایک اچھتی نگاہ ان کے کمرے پر ڈالی جس کے ہر گوشے سے ایک بے سروسامانی عیاں تھی۔ کمرے میں ایک ہی چارپائی تھی جسے چچا نے بصد اصرار مجھے سونے کے لیے پیش کی اور خود چٹائی بچھا کر فرش پر لیٹ گئے۔ صبح تین بجے کھٹ پٹ ہوئی، آنکھ کھلی تو دیکھا کہ چچا تہجد سے فارغ ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اسٹووروشن کیا، چائے بنائی اور میری طرف ایک پیالی بڑھاتے ہوئے کہنے لگے: کیا کروں سگِ دنیا ہوں، عادتوں کا غلام ہوں، جہاں بھی جاتا ہوں اپنے اردگرد ایک دنیا اکٹھی کر لیتا ہوں۔ اب دیکھو کتنا ساز و سامان اس کمرے میں جمع ہو گیا ہے، جیسے قیامت تک یہیں رہنا ہو۔ مجھ جیسا سگِ دنیا بھی کوئی ہوگا۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ ان پر ترکِ علاقہ کا کوئی دورہ پڑا ہو، ورنہ جس پیالی میں انھوں نے مجھے چائے پیش کی تھی اس کا دستہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ یہ چند ٹوٹی پھوٹی پیالیاں، ایک بوسیدہ اسٹوو، کھونٹیوں سے لٹکتے ہوئے چند کپڑے، ایک چھوٹی سی میز جس پر قرآن پاک اور کچھ کتابیں ترتیب سے رکھی تھیں اور فرنیچر کے نام پر دو ہلتی کرسیاں اور ایک چارپائی۔ پھر بھی یہ احساس ستا رہا ہو کہ اس سگِ دنیا نے بہت دنیا جمع کر لی ہے۔

میں نے پوچھا: یہ کیا ماجرا ہے کہ آپ ایک کشادہ بنگلہ چھوڑ کر اس بے سروسامانی میں یہاں پڑے

ہیں۔

بولے: بیٹا بڑی گھٹن ہو گئی تھی اس بنگلے میں۔ پہلے پہل تو محض ترقی کا خوشگوار احساس رہا۔ پھر تکلفات نے ڈیرا ڈالا۔ حاجب اور دربان مقرر ہوئے۔ پھر وہ مرحلہ بھی آ گیا جب جاہ و مال کی طلب انسان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے، حلال و حرام کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ میں نے اپنے بیٹے سلیم کو بہت سمجھایا کہ حلال آمدنی میں اگر مشتبہ مال کی تھوڑی آمیزش بھی ہو جائے تو سارا مال ناپاک ہو جاتا ہے۔ مگر وہ نہ مانا۔ بالآخر میں نے ایک سخت فیصلہ لیا۔ میں نے طے کیا کہ میں ایک اور ہجرت کروں گا۔ اب مسجد کے اس گوشے میں مجھے بڑا سکون ہے۔ شام میں بچوں کو قرآن پڑھاتا ہوں اور یہ میرے گذر بسر کے لئے کافی ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔ یہ کہتے ہوئے چچا کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

آپ نے اپنے حصے کی بہت ہجرت کر لی۔ پہلے مشرقی پاکستان اور پھر بنگلہ دیش بن جانے کے بعد کراچی آئے اور اب اس بڑھاپے میں بال بچوں کو چھوڑ کر یہاں اس طرح پڑے رہنا کہاں تک مناسب ہے؟

بولے: سلیم آئے تھے، وہ گا ہے بگا ہے میری خبر گیری کے لئے آتے رہتے ہیں، انھوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ مشتبہ ذرائع آمدنی سے دور رہیں گے۔ خدا انہیں نیک عمل کی توفیق دے۔ انہیں یہ بات

سمجھ میں آجائے کہ ہم لوگ یہاں کوٹھی بنگلوں کی تلاش میں نہیں آئے تھے۔ باپ دادا کی حویلیاں اور قطعات اراضی تو ہمارے پاس وہاں ہندوستان میں بھی تھے۔ ہم تو ایک دارالاسلام کی آرزو میں یہاں آئے تھے تاکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے کھل کر جی سکیں۔ اب اگر ہمارے بچوں کی زندگی سے ہی اسلام نکل جائے تو ایسی مہاجرت کا کیا حاصل؟

آپ تو ڈبل مہاجر ہیں، کبھی جب آپ پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہیں تو آپ کو کیسا لگتا ہے؟ کتنا درست تھا ہجرت کا یہ فیصلہ؟

میرے اس سوال کے لئے شاید وہ تیار نہ تھے۔ کچھ دیر گہری خاموشی ان پر طاری رہی، پھر بولے: ہماری پہلی ہجرت بھی عجب رہی۔ ہم تو پاکستان سمجھ کر وہاں گئے تھے ہمیں کیا پتہ تھا کہ پاکستان ہی وہاں سے رخصت ہو جائے گا۔ بس یہ سمجھو کہ ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا، پھر بھی ایک آس باقی تھی سو یہاں آ گئے۔ یہاں بھی تو مہاجروں کو بڑے مسائل درپیش ہیں؛ کوئی سندھودیش کی بات کرتا ہے کہیں اس طرح کے نعرے لگائے جا رہے ہیں: سندھ میں ہوگا کیسے گزارہ؟ آدھا ہمارا، آدھا تمہارا۔

بولے: اس بات کا اندازہ تو ہمیں مشرقی پاکستان میں ہی ہو گیا تھا کہ ہم مہاجروں کو دراصل انصار میسر نہیں آئے۔ ہماری ایک پوری نسل مشرقی پاکستان میں جوان ہو گئی، ہمارے بچے بنگلہ زبان میں رنج بس گئے لیکن پھر بھی وہ بہاری کہلائے جاتے رہے۔ مقامی سماج انہیں کلی طور پر قبول کرنے سے انکاری رہا۔ یہاں بھی انہیں ایک ایسے گروہ کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے جس کی جڑیں کہیں اور ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ پاکستان صرف مسلم اکثریتی علاقوں کے مسلمانوں کا ہوم لینڈ ہو، اقلیتی علاقوں کے مسلمان جو اس تحریک میں پیش پیش رہے، اس کا ہراول دستہ بنے ان کے ہاتھ محرومی اور بے بسی کے علاوہ اور کچھ نہ آیا۔

’اور جو پیچھے رہ گئے ان کی آہ و فغان کا سلسلہ بھی تو تھمتا نظر نہیں آتا، میں نے مکملہ کے طور پر عرض کیا۔

بولے: ہاں یہ ایک الگ ہی دلخراش داستان ہے۔ یہ سب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ کسی کو نہیں معلوم۔ حالات ایک خاص رخ پر کچھ اس طرح آگے بڑھتے گئے کہ آخر آخر تک لوگوں کو خطرے کا احساس نہ ہو سکا اور جب آنکھ کھلی تو ہر طرف ایک پاگل پن تھا، نقل مکانی تھی۔

تو کیا مسلم علماء و قائدین کو اس بات کا واقعی اندازہ نہ تھا کہ آنے والے ایام مسلمانوں کے لئے اتنے سخت ہو جائیں گے۔

ہمارے علماء و قائدین خطابت کے اسیر تھے، عوام بھی پر جوش تقریروں کی عادی تھی۔ سنجیدہ تحلیل و

تجزیے کا رواج کم تھا، بے ہنگم نعروں کے لطن سے خلفشار جنم لے سکتا تھا، انقلاب نہیں۔ لیکن اس وقت یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

جیلانی چچا کی باتوں میں ایک عہد کا کرب سمٹ آیا تھا۔ جی تو چاہتا تھا کہ گفتگو کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے لیکن ابھی مدیر تکبیر سے ملاقات باقی تھی۔ میں نے چچا سے اجازت لی اور ناکو سنٹر کی جانب چل پڑا جہاں ان دنوں ہفت روزہ تکبیر کا دفتر واقع تھا۔

شام کو جب میں وائی ایم سی اے پہنچا تو وہاں دو پولس والوں کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے پہلے تو میرے پاسپورٹ کا ایک سرسری جائزہ لیا پھر یہ کہتے ہوئے میرے ساتھ اوپر آئے کہ چلئے وہیں کمرے میں بیٹھ کر بات کریں گے۔ پتہ چلا کہ میں کراچی میں دو دنوں سے گھوم رہا ہوں اور میرے پاس اس کے لئے کوئی باضابطہ ویزا نہیں ہے۔ یہ ضابطے کی خلاف ورزی تھی جس کا میں جانے انجانے مرتکب ہوا تھا۔ انہوں نے مختلف حیلے بہانوں سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ میرے پاس کتنا پیسہ ہے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ میں رزا طالب علم ہوں اور میرے پاس زاد سفر کے نام پر چند سو روپے اور ان پچاس ڈالر کے علاوہ اور کچھ نہیں جس کا اندراج پاسپورٹ پر موجود تھا تو ان کے اندر کا انسان جاگ اٹھا۔ اپنے ساتھی سے کہنے لگا ان پر ہاتھ ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بیچارے کسی کانفرنس کے لئے نکلے ہیں ان کے پاس نوکری کا ویزہ بھی نہیں۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا بولا: اچھا جناب یہ بتائیے آپ کانفرنس کے بعد مدینہ تو جائیں گے نا؟ جی! ان شاء اللہ، میں نے کہا۔ بولا یہ سب باتیں چھوڑیں، آپ کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں، آپ بس ایک کام کریں۔ جب آپ مدینہ جائیں تو سرکار کی خدمت میں میرا سلام پیش کر دیں۔ میرا نام صدیق خاں ہے۔ یاد سے! بھولنے گا نہیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے الوداعی مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا، اس کے چہرے پر ایک محبت آمیز مسکراہٹ طلوع ہوئی۔ اب اس کے رویے میں احترام تھا، عقیدت تھی کہ اب میری حیثیت سرکار کی خدمت میں سلام پہنچانے والے ایک قاصد کی تھی۔

## Gasping for breath

رابطہ کے ہنگامی اجلاس میں قدرے تاخیر سے پہنچا۔ آج سہ روزہ اجلاس کا آخری دن تھا۔ جب میں کانفرنس ہال میں داخل ہوا اس وقت مولانا علی میاں کی تقریر چل رہی تھی۔ وہ کلمہ مندوب پیش کر رہے تھے۔ میں نے مولانا علی میاں کی عربی خطابت اور ان کی سحرالبیانی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ لوگ کہتے کہ جب وہ بولتے ہیں تو اہل زبان دانتوں تلے انگلیاں دبالتے ہیں۔ آج انہیں عربوں کے درمیان براہ راست سن کر ایسا کچھ بھی نہ لگا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ سب باتیں 'مریداں می پرانند' کی قبیل سے ہیں۔ ہمارے ہاں علی گڑھ میں بھی ایک صاحب کی انگریزی دانی کا بڑا شہرہ تھا جو ہر سال انگریزوں کو انگریزی پڑھانے کے لئے انگلستان کا سفر کرتے تھے۔ آگے چل کر یہ بھی معلوم ہوا کہ کلمہ مندوب پیش کرنے کی ذمہ داری دراصل ان لوگوں کو تفویض ہوتی ہے جو مملکت کی پالیسیوں کی غیر مشروط حمایت کے قائل ہوں۔ جن دنوں پرنس سلمان ریاض کے گورنر تھے مجھے ایک بین الاقوامی کانفرنس کے شرکاء کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ توقع تھی کہ اس دوران گورنر ریاض سے کچھ کہنے اور سننے کا موقع ملے گا۔ لیکن وہاں بھی معروف سعودی روایت کے مطابق پہلے سے ہی دو انتہائی معتمد صاحبان کو کلمہ مندوب کے لئے نامزد کر دیا گیا تھا جنہوں نے گورنر کی تعریف و توصیف میں سارا وقت ضائع کر دیا۔ حالانکہ پرنس سلمان بار بار یہ کہتے رہے کہ ہم آپ سے جاننا چاہتے ہیں کہ باہر سے چیزیں کیسی نظر آتی ہیں، آپ ہمیں بتائیے، مشورہ دیجئے۔ مگر روایتی کلمہ مندوب میں اس کی گنجائش کہاں تھی۔ بالآخر پرنس سلمان نے زچ ہو کر مجلس برخاست کرنے میں ہی عافیت جانی۔

آج شیخ بن باز احرام میں دکھائی دیئے۔ شاید وہ بھی میری طرح عمرے سے فارغ ہو کر براہ راست جلسہ گاہ میں آگئے تھے۔ شرکاء میں اکثر لوگوں سے میں واقف نہ تھا۔ ایک انبوہ عظیم تھا جو اس موقع پر یہاں جمع ہو گیا تھا۔ اعلان مکہ کے باقاعدہ اجراء میں ابھی وقت تھا سو اس صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اپنے پرانے کرم فرما سید حسن مطہر صاحب کے دفتر کی طرف نکل آیا جو اسی عمارت کی دوسری منزل پر

واقعہ تھا۔ سید صاحب میری سرگرمیوں اور فتوحات میں بڑی دلچسپی لیتے، اسے بڑی توجہ سے سنتے اور مفید مشوروں سے نوازتے رہتے۔ میں نے انہیں مسلم ملیشیا کا کتابچہ بھی ارسال کیا تھا جس پر انہیں تشویش تھی۔ کہنے لگے: نتائج پر پہنچنے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ ہندوستانی مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں ابھی اس کے گہرے تحلیل و تجزیے کی ضرورت ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اہل یہود اپنے قومی سانچے کو ہولوکاسٹ سے تعبیر کرتے ہیں، فلسطینی مسلمانوں کو جو حادثہ فاجعہ پیش آیا اسے انہوں نے نکتہ کا نام دیا ہے۔ کیا ہندوستانی مسلمانوں کے سانچہ عظیمی کو بھی کوئی نام دیا جا سکتا ہے؟ میرے اس سوال پر وہ کچھ اس طرح چونکے، جیسے انہیں کوئی جھٹکا لگا ہو مگر خاموش رہے۔

اگلے دن وہ مجھے حرم میں مل گئے۔ کہنے لگے: تم نے بہت مناسب سوال قائم کیا ہے۔ اس حادثہ عظیمی کو کوئی نام تو دینا ہی چاہئے۔ مگر کیسے دیں؟ ہمیں اس بات کا ادراک تو ہو کہ ہمارے ساتھ واقعتاً ہوا کیا؟ ہم مہاجر بنے مگر ہجرت ہمیں مطلوب نہ تھی۔ اپنے ہی وطن میں جہاں ہم صدیوں سے رہتے آئے تھے ہم پناہ گزین کہلائے، محصورین میں ہمارا شمار ہوا، جلا وطنی ہمارا مقدر بنی، حتیٰ کہ جو لوگ کبھی اس ملک کے مقتدر اعلیٰ تھے انہیں ایک بے بس اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہماری زبان اور ثقافت اور وہ تہذیب جس کے دم سے اس ملک میں ہماری سطوت قائم تھی سب تباہ ہو گئی۔ تہذیب کی تباہی بڑا تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔ جس طرح رومن ایمپائر کے زوال، بازنطینی پایہ تخت کے انہدام اور عثمانی خلافت کے سقوط کو ہم بڑا تاریخی وقوعہ گردانتے ہیں اسی طرح دہلی کا سقوط اور پھر ملک کی فرقہ وارانہ تقسیم بھی کم اندوہناک حادثہ نہیں تھا۔ مگر اب تک اس کے مالہ و ماعلیہ کا صحیح اندازہ لگایا جانا باقی ہے۔

اچھا یہ بتاؤ کیسا لگتا ہے آزاد ہندوستان میں رہنا؟ انہوں نے غالباً مجھے زنج کرنے کے ارادے سے پوچھا۔ پھر فرمایا: مجھے تو انڈیا چھوڑے ایک زمانہ ہو گیا، ویسے بھی میری علی گڑھ کی یادوں میں طالب علمانہ رومانویت کے علاوہ اور ہے بھی کیا۔

’آزاد ہندوستان میں رہنا؟ بظاہر تو کوئی پریشانی نہیں بس یہ سمجھئے کہ ہر لمحہ ایسا لگتا ہے جیسے اندرون میں کوئی چیز ٹوٹ رہی ہو۔ جے پرکاش نرائن سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کو یہ آزادی کیسی لگی تو انہوں نے برملا کہا tasteless۔ بس اسی پر قیاس کیجئے۔‘

پھر تم میری طرح برطانیہ کیوں نہیں منتقل ہو جاتے؟

’اپنے ملک کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا بہت بڑا فیصلہ ہے۔ میری تحریروں نے لوگوں میں ایک امید جگائی ہے اگر میں نے ہی میدان چھوڑ دیا تو اس چیلنج کا، جو وہاں درپیش ہے، مقابلہ کون کرے گا؟ پھر ان

گلیوں اور کھیت کھلیا نوں سے میرے بچپن کی یادیں وابستہ ہیں۔

مگر وہاں تو زندگی بے مزہ ہے؟

بے مزہ نہ کہیں، شاید یہ بھی صحیح لفظ نہیں۔ بس یہ سمجھئے کہ ایک گھٹن ہے، سانس پوری طرح نہیں آتی،

ہر لمحہ جان پر بنی رہتی ہے۔ جیسے زندگی سے نشاط غائب ہو، وہ جو کہتے ہیں نا gasping for breath، میں اس

کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

عرصہ بعد جب آکسیجن کی شدید قلت کے سبب ملک بھر میں کرونا وائرس کے مریضوں کی بے دریغ

اموات ہو رہی تھیں، لوگ آکسیجن سلنڈر کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے اس وقت پریشاں حال

لوگوں کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے ایک معروف یوگ گرو نے کہا تھا کہ کون کہتا ہے ملک میں آکسیجن کی

کمی ہے۔ فضا میں آکسیجن کی کوئی کمی نہیں۔ کمی تو آپ کے کمزور پھیپھڑے میں ہے جو فضا سے مناسب مقدار

میں آکسیجن کشید نہیں کر پا رہا ہے۔ تب یہ سن کر مجھے ایسا لگا کہ یوگ گرو نے میری مشکل حل کر دی ہو۔ یہی تو

وہ گھٹن ہے جس کے ہم ہندوستانی مسلمان عرصے سے شکار ہیں۔ گزشتہ تہتر چوہتر برسوں سے ہم کھل کر

سانس نہیں لے پا رہے ہیں۔ وہ جب چاہتے ہیں آکسیجن کا بہاؤ روک لیتے ہیں اور ہم کسی ماہی بے آب کی

طرح تڑپنے لگتے ہیں۔ ہمارے پھیپھڑوں میں اتنی قوت نہیں اور دستوری تحفظات ہمیں نشاط زندگی کا آکسیجن

فراہم کرنے میں ناکام ہیں۔

تمت

## اشاریہ

۵۰	ارشاد بھائی (شکیب ارشد)	۴۴، ۳۰، ۲۷، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۱	ابا (حافظ محمد نور الہدیٰ)
۴۰۲، ۳۸۵	ارض کنگان	۸۴، ۷۵، ۷۲، ۷۰، ۶۲، ۶۳، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۴۸	
۲۹۰	ارون شوری	۱۰۲، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵	
۳۱۱	ارون نہرو	۱۴۰، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۳، ۱۰۷، ۱۰۳	
۱۵۶	اریک فرام	۲۲۲، ۲۲۰، ۲۱۸، ۲۱۷، ۲۱۱، ۲۰۸، ۲۰۷، ۱۸۵، ۱۴۱	
۱۵۳	ازبکستان	۳۱۳، ۳۱۲، ۳۱۱، ۳۰۷، ۳۰۶، ۲۸۷، ۲۶۵، ۲۴۵	
۳۱۳، ۹۳، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۵۱، ۱۱	ایچین	۴۱۰، ۳۹۳، ۳۹۲، ۳۷۹	
۳۶۸	اسپیوزا	۳۱۹، ۲۵۷، ۲۵۱، ۲۲۵	ابراہیم سلیمان سیٹھ
۹۵، ۱۱	اشنبول	۱۴۴	ابراہیم یزدی
۴۰۴، ۴۰۱، ۴۰۰، ۳۹۹، ۳۹۸، ۳۹۷	اسٹیفن وائز	۱۳۲	ابوالکارم (مولانا)
۴۰۳، ۳۸۸، ۳۸۴، ۳۱۳، ۲۵۴، ۶۰، ۵۸، ۴۰	اسرائیل	۲۷۱	ابوجزہ المصری
۳۸۴	اسرائیل شحاک	۳۹۴	ابوضیفہ
۳۶۷، ۱۲۱، ۲۹	اسعد مدنی	۲۳۵، ۱۲۹، ۶۱	اٹل بہاری واجپئی
۲۴۷، ۲۴۶، ۲۴۵، ۲۳۲، ۲۳۱، ۲۰۷	اسلوب انصاری	۱۰۸	اجے بوس
۲۶۶، ۲۶۵	اسطیعیل شہید	۳۵۳	احمد رضا خاں
۱۷۹	اشبیلیہ	۱۷۱، ۱۷۰، ۱۶۲، ۱۵۸، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴	احمد سورتی
۳۵۳، ۲۲۰	اشرف علی تھانوی	۳۴۶، ۳۳۱، ۲۳۰، ۱۷۷	
۲۹۸	اشوک سنگھ	۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۳، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷	احمد آباد
۱۸۲	اعجاز مقبول (ایڈووکیٹ سپریم کورٹ)	۱۶۶، ۴۰، ۳۹، ۳۸	
۱۳۱	اعجاز (مسج) پروفیسر	۱۷۸	اختر انصاری
۳۱۴	اعظم خان	۱۵۱، ۱۴۸	اخوان المسلمین
۳۳۹	افضل حسین (قیمم جماعت اسلامی)	۷۸، ۷۷، ۷۵، ۶۹، ۵۹، ۵۶، ۴۸، ۴۵، ۴۲، ۲۳، ۲۰	اردو
۲۶۶، ۲۶۱، ۲۶۰، ۲۵۴، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۴۹، ۱۴۰	افغانستان	۷۸، ۷۷، ۷۵، ۶۹، ۵۹، ۵۶، ۴۸، ۴۵، ۴۲، ۲۳، ۲۰	
۲۷۱، ۲۷۰، ۲۶۹، ۲۶۸، ۲۶۷، ۲۶۶، ۲۶۵، ۲۶۴		۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۳، ۳۲، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۰، ۱۸، ۱۳	

۳۲۰	ایل کے اڈوانی	۳۶۱، ۳۳۹، ۲۹۷، ۲۷۵، ۲۷۴، ۲۷۳، ۲۷۲	
۱۲۱	ایم ایف حسین	۲۳۱، ۱۵۶	اقبال انصاری
۱۰۸	ایم این بیچ (MN Buch)	۳۱۸	اکبر الہ آبادی
۳۳۶، ۱۶۰	ایم جے اکبر	۳۳۹	اکرم ندوی (مولانا)
۱۹۰	ایم وائی قاضی	۳۶۷	امارت ہندیہ
۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۸۹، ۸۶، ۸۳، ۱۱	ایمر جنسی	۳۹۴	امام ابوحنیفہ
۱۰۵، ۱۰۸، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۷		۳۹۴	امام محمد (امام ابوحنیفہ کے شاگرد)
۳۹۴، ۳۷۹، ۳۷۶، ۳۷۵، ۳۷۴، ۱۹۶، ۱۸۵، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۷		۳۹۴	امیڈ کر (۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۳۰۹، ۳۵۰، ۳۵۲، ۳۵۳)
۳۸۴	ایسٹریڈم	۳۶۵، ۳۶۴، ۳۶۳، ۳۶۱، ۳۶۰، ۳۵۷، ۳۵۳	
۷۳	ایزن جی گورے	۱۸۵	امت شاہ
۳۲۶	این ڈی تیواری	۱۲۱	امرتا سنگھ
۳۶۹، ۱۸۴	ایٹنگلس	۴۰۷	امریکن فیڈریشن آف مسلمس فرام انڈیا (IFMI)
۲۶۹	اینی برج	۹۲، ۶۶، ۶۱، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۴، ۴۳، ۳۹	اندرگانڈھی
۳۷۶، ۳۲۱، ۳۲۰، ۳۱۴، ۳۰۷، ۳۰۶، ۳۰۰، ۲۹۹، ۲۹۸	ایودھیا	۱۲۸، ۱۲۰، ۱۱۵، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷	
۳۰۲	اے جی نورانی	۳۹۶، ۳۹۴، ۳۸۹، ۲۴۰، ۲۳۷، ۲۲۷، ۱۶۸	
۳۷۴	اندو بھارتی	۱۷۹، ۹۳، ۷۸، ۷۵، ۵۱	اندلس
۳۶۷، ۳۳۳، ۳۳۲	آدم سینا	۳۳۹	انعام الرحمن (مولانا، حضرت جی)
۲۹۵، ۱۲۹، ۹۶، ۲۹	آر ایس ایس	۲۳۲	انور صدیقی
۷۷، ۶۹، ۶۸، ۵۳، ۵۰، ۴۸	آزاد (مولانا ابوالکلام)	۲۱۳	انور علی خاں سوز
۳۷۳، ۳۰۷، ۳۰۵، ۳۰۴، ۱۶۶، ۱۳۱، ۱۰۶		۲۳۶	انورہ تیور
۳۷۱، ۲۲۱، ۲۲۰، ۲۳۸، ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۵	آسام	۳۸۷، ۲۹۴، ۱۶۴	اوشوٹز
۲۳۷	آسام گن پریشنڈ	۱۷۳، ۱۶۷، ۱۶۳، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۲۶	اہل بیہود / بیہودی
۱۸۲	آل احمد سرور	۳۸۸، ۳۸۷، ۳۸۶، ۳۸۵، ۳۸۴، ۳۳۶، ۲۵۴	
۲۲۴، ۱۷۷	آل علی	۴۰۴، ۴۰۳، ۴۰۲، ۴۰۱، ۴۰۰، ۳۹۹، ۳۹۸، ۳۹۷	
۳۸۳، ۲۷۸	آئر لینڈ	۴۰۳	استخمان (اڈولف)
۲۸۰	آئین ہند	۱۹۳	ایڈورڈ سعید
۱۳۷	آیت اللہ خمینی (امام)	۱۹۷	ایزرا پاؤنڈ
۱۴۳، ۱۴۲، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۲	بابری مسجد	۲۳۳	ایس زین العابدین
۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۶، ۱۴۴		۳۷۳، ۳۷۲	ایس کے دویدی

۳۶۴، ۳۶۰	بھیم کورے گاؤں	۳۲۰، ۳۰۱	بابری مسجد ایکشن کمیٹی
۳۱۶	بی ایچ یو (بنارس ہندو یونیورسٹی)	۲۱۰	بابو سمبھو ناند
۳۱۰، ۲۳۵	بی جے پی	۱۴۳	باقر مجلسی
۲۸۴	بیگم اعجاز رسول	۱۲۹	بالا صاحب دیورس
۳۷۸، ۳۷۶، ۱۰۰، ۹۷، ۷۹	پٹنہ	۲۶۵	بالاکوٹ
۱۶۲	پرائیویٹ	۳۳۳	بجنگ دل
۲۱۱	پرتھوی راج	۳۳۲	بجنور
۲۴۰	پرفولا کمار مہنتا	۱۴۹	بحرین
۳۶۴	پرکاش ناتھ پائٹل	۳۶۵، ۳۶۴، ۳۶۱، ۳۵۲، ۳۵۰، ۳۴۹	بدھ مت
۱۹۴	پرما تاسرن	۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸	برائز ریگ (Bryar Rigg)
۴۱۴، ۲۷۴	پرنس سلطان (بن عبدالعزیز)	۴۱۵، ۳۱۴، ۲۸۷، ۲۷۹، ۲۲۳	برطانیہ
۲۲۱	پروین شاکر	۴۰۰	برگساں یوانز
۲۷۶، ۲۷۳، ۲۷۲، ۲۷۰، ۲۶۷، ۲۶۵، ۲۶۴، ۲۶۰، ۱۵۲	پشاور	۳۸۳، ۳۴۴	برلن
۲۸۵	پنڈت گووند ولھ پنت	۲۳۳	برنارڈ شا
۳۶۳، ۳۵۰، ۲۸۱	پونہ	۲۷۷، ۹۵، ۵۹	بغداد
۳۵۲	پونہ معاہدہ	۳۹۱	بلجیم
۳۰۶	پی این اوک	۲۹۰، ۱۹۸، ۱۹۱، ۱۲۸، ۱۲۲، ۱۱۶، ۳۴، ۳۰، ۲۵	بمبئی
۲۰۳	پیٹر ویٹسن	۳۵۹، ۳۵۱، ۳۵۰	
۳۰۸، ۳۰۷، ۳۰۶، ۲۰۵	تاج محل	۳۸۴	بن اہریزخ
۳۳۹، ۵۳	تبلیغی جماعت	۲۹۲، ۶۷، ۶۶	بنارس
۳۲۰، ۲۸۴، ۱۰۳، ۱۵	تحریک خلافت	۱۹۲، ۹۴، ۹۳، ۸۳، ۶۵، ۶۲، ۶۱، ۵۹، ۵۸	بنگلہ دیش
۳۲۰، ۲۸۴	تحریک عدم موالات	۴۱۱، ۴۱۰، ۲۹۷، ۲۷۹، ۲۳۷	
۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۸، ۱۰۵، ۱۰۳	ترکمان گیٹ	۲۷۵، ۲۷۴، ۲۷۳، ۲۷۲، ۲۷۱، ۲۷۰	بوسنیا
۱۲۹، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۷		۲۱۱، ۲۱۰، ۱۷۵، ۱۷۳، ۹۳، ۹۲، ۶۵	بھارت (وجہ تسمیہ)
۲۷۵	ترکی الفیصل	۳۱۰، ۳۰۸، ۲۹۹، ۲۹۷، ۲۹۶، ۲۸۲، ۲۳۶، ۲۲۲	
۲۶۹	ترگت اوزال	۳۷۷، ۳۷۶، ۳۷۵، ۳۷۴، ۳۷۳، ۳۷۲، ۳۷۱	بھاگلپور
۳۰۹، ۲۰۹، ۱۷۸، ۱۷، ۱۶	تقسیم ہند	۳۹۶، ۳۹۵، ۳۹۰، ۳۷۹، ۳۷۸	
۳۰۰	تلسی داس	۵۵	بھٹو (ذوالفقار علی)
۲۹۲	تترانیہ	۲۹۷	بھوٹان

۴۰۴، ۲۱۴، ۲۰۹، ۲۰۸، ۶۷، ۵۶	جناح	۲۳۸	ٹامس مان
۳۲۰، ۳۱۵، ۲۳۵، ۲۲۲، ۱۲۸، ۱۲۴، ۱۲۲	جنتا پارٹی	۱۹۷	ٹی ایس ایلٹ
۱۹۲	جنرل شاہ (جنرل ضمیر الدین شاہ)	۱۷۸	ثریا آپا (پروفیسر ثریا حسین)
۲۸۳	جنوبی افریقہ	۳۶۱	جاپان
۲۶۹	جورج شلٹز	۲۶۹	جارج بش (صدر)
۱۹۲	جوزف شوآرٹس برگ	۳۰۷، ۳۰۵، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۰۸	جامع مسجد (شاہجہانی)
۲۳۳	جونا تھن سونفٹ	۳۳۹، ۳۳۳، ۳۳۲، ۳۲۱، ۳۱۴، ۳۰۹	
۲۹۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۴۰	جہیمان العنقیہ	۱۳۲	جامعہ سلفیہ
۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷	جے این یو (جواہر لال نہرو یونیورسٹی)	۲۱۳، ۱۹۴، ۱۸۹، ۱۳۱، ۱۷	جامعہ ملیہ اسلامیہ
۲۳۳، ۲۰۰، ۱۹۹، ۱۹۷، ۱۹۰		۱۰۸	جان دیال
۱۲۸، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۸۳	جے پرکاش نارائن (جے پی)	۳۲۲، ۳۱۴، ۱۷۱، ۱۷۰	جاوید حبیب
۴۱۵، ۲۹۵		۳۴۷	جاوید ذوالقرنین (ڈاکٹر)
۲۶۷	چارلی ولسن	۴۰۹، ۳۹۳، ۳۹۱، ۳۱۸، ۲۷۲، ۲۳۳	جدہ
۵۷، ۵۵	چٹاگانگ	۳۴۳، ۳۲۸، ۳۱۳، ۳۱۲، ۲۷۸، ۱۶۳، ۱۱۸، ۱۱	جرمنی
۶۶	چرن سنگھ	۳۹۷، ۳۹۰، ۳۸۷، ۳۸۶، ۳۸۵، ۳۸۳، ۳۴۴	
۷۷	چکبست	۴۰۱، ۳۹۹، ۳۹۸	
۳۶۱	چین	۱۷۹	جسٹس امیر علی
۳۰۸	حافظ عثمان	۳۸۰، ۳۴۷، ۲۴۷، ۲۳۲، ۱۳۴	جعفر ذکی (پروفیسر)
۱۲۳	حامد بخاری	۱۷۱، ۱۲۲	جگ جیون رام
۲۸۴	حسرت موہانی	۱۷۳	جگت نارائن لال
۳۳۰	حسن سبحانی	۱۸۱	جگر مراد آبادی
۲۶۵، ۲۴۹	حسین سید	۱۲۰، ۱۰۵	جگموہن
۶۷، ۵۳	حسین احمد مدنی	۳۷۶	جگن ناتھ مشرا (وزیر اعلیٰ)
۲۸۴	حسین امام	۱۹۵، ۱۷۱، ۱۲۹، ۸۴، ۶۹، ۴۴	جماعت اسلامی
۳۱۸	حسین ذوالقرنین	۳۳۹، ۳۳۸	
۱۳۶	حسین	۱۸	جمعیت اہل حدیث
۴۰۶، ۴۰۵	حلف الفضول	۱۰۰، ۲۹	جمعیت علماء
۱۶۷، ۱۶۴، ۱۶۲، ۱۶۱، ۱۶۰	حلم بھائی (عبدالعلیم صدیقی)	۸۴	جمیل بھائی (ڈاکٹر جمیل اختر)
۲۲۴، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۱، ۱۶۹		۲۲۲، ۱۲۸، ۹۶، ۳۰، ۲۹	جن سنگھ

۳۱۱، ۲۱۲، ۲۱۱، ۶۹، ۵۷، ۴۰، ۳۹	ذکی (پروفیسر بدرالدینی)	۳۸۹، ۳۲۶، ۳۲۴، ۲۲۹، ۲۲۵	
۲۲۵	ذوالفقار اللہ	۳۸۴	حنا آرنٹ
۴۰۹، ۶۰	رابطہ عالم اسلامی	۲۵۹، ۲۱۴، ۱۹۱، ۹۷	حیدرآباد
۲۰۹	راجا آف محمود آباد	۶۷	خان عبدالغفار خان
۳۰۹	راجندر پرساد	۴۱۵، ۳۳۱، ۳۳۰، ۲۸۴، ۵۸، ۲۷، ۲۶، ۱۷، ۱۵	خلافت
۳۲۹، ۳۲۶، ۳۱۱، ۲۹۱، ۲۹۰، ۲۸۸، ۲۴۰	راجیوگانندھی	۲۸۴، ۲۱۰	خلافت تحریک
۳۹۶، ۳۹۵، ۳۹۴، ۳۷۵، ۳۷۳، ۳۷۲، ۳۳۸، ۳۳۷		۴۱	خواجہ حسن ثانی
۲۹۳	راشد راجح	۴۱	خواجہ نظام الدین
۷۷	رام بابو سکسینہ	۱۸۰، ۱۵۵	خورشید الاسلام (پروفیسر)
۳۰۰، ۲۹۹، ۳۲	رام چندر	۳۶۷، ۱۸۷	دارالعلوم دیوبند
۳۱۴، ۳۱۱، ۳۰۳، ۳۰۱، ۲۹۹، ۲۹۷، ۲۸۹، ۲۸۸	رام اللہ	۶۹	دارالمصنفین
۴۰۵، ۳۶۶، ۳۶۳، ۳۱۰، ۳۰۹	رام مندر	۳۲۸، ۱۰۲، ۸۰، ۷۹	دریچنگ
۲۱۰	رام منوہر لوہیا	۲۷۷	دمشق
۳۰۰، ۳۲، ۲۸	رامائن	۱۰۸، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۹۵، ۹۴، ۵۸، ۴۰، ۳۹، ۱۶	دہلی
۸۰	راچی	۱۸۴، ۱۸۲، ۱۸۱، ۱۷۰، ۱۶۲، ۱۴۴، ۱۳۹، ۱۳۱، ۱۲۲، ۱۱۸	
۳۹۶، ۲۵۰، ۲۴۸	رائے بریلی	۲۴۹، ۲۴۵، ۲۴۱، ۲۳۳، ۲۲۶، ۲۲۵، ۲۱۷، ۱۹۴، ۱۹۰	
۳۸۴	ربائی ٹیٹل باؤم	۳۰۷، ۳۰۵، ۳۰۴، ۳۰۳، ۲۸۸، ۲۸۷، ۲۶۰، ۲۵۳، ۲۵۰	
۳۸۴	ربائی سامون ہرش	۳۲۶، ۳۲۴، ۳۲۱، ۳۲۰، ۳۱۹، ۳۱۸، ۳۱۴، ۳۱۰، ۳۰۹	
۳۸۴	ربائی مویشے لیب ہرش	۳۳۹، ۳۳۷، ۳۳۳، ۳۳۲، ۳۳۰، ۳۲۹، ۳۲۸	
۶۰	رحمان سبحان	۴۵۱، ۴۰۹، ۳۹۰، ۳۸۸، ۳۸۱، ۳۸۰، ۳۵۹	
۵۳	رحمت اللہ (مولانا)	۷۷	دیاشنکر نسیم
۱۲۱، ۱۰۵	رخسانہ سلطانہ	۲۸۲	دیاشنکر سوتی
۳۶۸، ۳۴۷، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۴	رفیق احمد نقوی	۱۷۴، ۷۷	دیوناگری
۴۰۱، ۴۰۰، ۳۹۹، ۳۹۸، ۳۹۷	روز ویلٹ (صدر امریکہ)	۲۷۵، ۲۷۱، ۲۷۰	ڈاکٹن معاہدہ
۲۶۸، ۲۶۱، ۲۵۴، ۱۵۲، ۱۱	روس (سوویت یونین)	۲۴۵	ڈونالڈ یوجین اسمتھ
۲۶۹	رونا لڈریگن	۹۵، ۹۴، ۶۵، ۶۳، ۶۱، ۵۸، ۵۷	ڈھاکہ
۴۱۴، ۴۰۸، ۳۹۱، ۲۹۴، ۲۸۶، ۲۷۸، ۲۷۶، ۲۷۵	ریاض	۶۰	ڈینیل کوہن
۲۰۷	زابدہ زیدی	۱۲۱، ۱۱۷، ۷۴	ذاکر حسین خان (صدر جمہوریہ)
۲۸۵	زیڈا ایچ لاری	۵۳	ذکریا (مولانا)

۴۲۲			لا یموت
۱۸	سید بشارت کریم	۱۴۶، ۱۴۵	سارتز
، ۲۰۴، ۲۰۳، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۰، ۱۸۰، ۱۷۷	سید حامد	۱۱۷	سید راجوٹی
۳۱۵، ۲۵۶، ۲۴۷		۳۷۲	ستند نارائن سنہا (وزیر اعلیٰ بہار)
۴۱۴، ۲۸۷	سید حسن مطہر	۱۸۱	سجاد حیدر یلدرم
۱۳۱	سید شاہ محمد اسد اللہ	۱۴۱	سراج پراچہ
، ۳۱۹، ۳۱۵، ۲۸۸، ۲۵۱، ۲۲۵، ۱۹۴	سید شہاب الدین	۲۷۴، ۲۷۱	سربیا
۴۰۶، ۳۶۷، ۳۶۶، ۳۲۲، ۳۲۱، ۳۲۰		۳۰۹، ۳۰۳، ۲۸۵، ۲۸۴، ۲۱۴	سردار ولہ بھائی پٹیل
۱۴۴	سید قطب	۳۱۸، ۲۲۲	سر سید (سید احمد خان بہادر)
۲۵۹	سید محمود	۲۹۷	سری لنکا
۴۰۴، ۳۱۶، ۳۱۵	سید ہاشم علی اختر (وائس چانسلر)	، ۲۳۱، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۳۹	سعودی عرب
۱۹۹، ۱۸۱	سیما اکبر آبادی	۴۰۸، ۲۷۴، ۲۶۳	
۵۰، ۴۰	شاداں فاروقی	۵۸	سلطنت آصفیہ
، ۳۱۴، ۲۹۱، ۲۸۹، ۲۸۸	شاہ بانو	۲۹۱	سلمان خورشید
۲۶۹، ۱۴۰	شاہ خالد (بن عبدالعزیز)	۲۷۴	سلووینیا
۱۲۱	شاہ رخ خان	۳۱۴، ۲۴۱	سماج وادی پارٹی
۲۱۹	شاہ عبدالعزیز	۱۲۱، ۱۱۸، ۱۱۲، ۱۰۸، ۱۰۶، ۱۰۵	بچے گاندھی
۱۵۱	شاہ فہد (بن عبدالعزیز)	۴۱۲	سندھ
۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۱۸، ۱۱۷	شاہ کمیشن	۲۸۳، ۱۷۴	سنسکرت
۶۰	شاہ نعمت اللہ ولی	۲۸۲	سوامی دیویکانند
۲۶۶، ۲۱۹	شاہ ولی اللہ	۲۴۰	سوبا سری کرشنن
۳۰۸	شاہ جہاں	۳۸۲، ۳۸۰	سوڈان
۲۲۴، ۱۷۷	شاہد پرویز	۳۰۳، ۳۹۶	سو مناتھ
۸۷	شاہد سلمہ (ڈاکٹر محمد شاہد کمال)	۴۰۳	سوئٹزرلینڈ
۱۲۷	شریف کونین	۱۵۸	سوئیڈن
۱۲۳، ۱۲۱	شفیع محمد قریشی	۲۴۵	سہیل احمد
۳۷۲	شکیل احمد خان (وزیر)	۳۷۹، ۳۷۵، ۲۹۸، ۲۹۷	سیتا مڑھی
۱۱۶	شمس پیرزادہ	۲۶۵	سید احمد شہید
۲۹۶	شنگرا چاریہ نرنجناد پوتر	۳۶۷	سید احمد ہاشمی (مولانا)
۳۶۲، ۳۵۹، ۳۵۸، ۲۸۲، ۲۷۷، ۱۷۱	شودر/ دولت	۱۹۴	سید امین الحسن رضوی

۱۱۶	عبدالحفیظ خان	۱۵	شوکت علی
۳۰۸	عبدالحمید لاہوری	۱۸۰، ۱۰۶	شہر یار
۲۷۱، ۲۷۰	عبدالرحمن الدوسری	۱۲۳، ۱۲۱	شہنواز خان
۲۹۱	عبدالرحیم قریشی	۴۱۴، ۲۹۲، ۲۶۳، ۱۵۱	شیخ ابن باز
۸۹، ۶۷، ۴۷، ۴۴، ۴۳، ۴۲	عبدالقیوم انصاری	۳۸۲	شیخ الحسنین (ڈاکٹر ایکٹرا مورٹرین شریفین)
۲۵۹، ۲۵۸	عبدالکریم چھاگلہ	۲۷۴	شیخ انور شعبان
۳۳۲، ۳۲۹، ۳۲۲، ۳۲۰، ۳۱۴، ۲۴۳، ۱۲۲، ۱۲۱	عبداللہ بخاری	۳۹۵، ۳۹۳	شیخ عبدالخالق (ندوی، ڈاکٹر)
۲۵۱	عبداللہ عباس ندوی	۱۲۲، ۱۲۱، ۱۰۵، ۹۸	شیخ عبداللہ (کشمیر)
۲۷۴، ۲۷۳، ۲۶۳، ۲۶۲	عبداللہ عزام	۲۶۳	شیخ عثمانین
۱۵۱	عبداللہ قحطانی	۲۶۳	شیخ عمر سیف
۴۱۵، ۱۷	عثمانی خلافت	۲۶۳	شیخ منیع
۲۵۹	عثمانیہ یونیورسٹی	۱۹۳	شیریں موسوی (پروفیسر)
۱۴۹، ۱۴۸	عراق	۲۳۴، ۲۳۱، ۱۵۶	شینکسپیر
۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۰، ۱۸۹	عرفان حبیب (پروفیسر)	۳۳۳، ۲۹۹، ۳۰	شیدو سینا
۲۷۴، ۲۷۳	عزت بیگو وچ	۱۹۳	صادق اصفہانی
۳۵۶، ۲۵۰، ۲۴۸، ۲۳۶، ۲۱۴، ۱۴۰، ۵۰، ۴۸	علامہ اقبال	۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۵، ۱۴۰	صحوۃ اسلامیہ
۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳	علی شریعتی	۴۰۸، ۱۴۹، ۱۴۸	صدام حسین
۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۱۷، ۶۷، ۶۶	علی گڑھ	۳۴۸، ۳۴۷	صومالیہ
۱۸۹، ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۱، ۱۷۸، ۱۷۷، ۱۶۷، ۱۶۱، ۱۶۰		۱۲۲	ضیاء الدین بخاری
۲۲۳، ۲۱۱، ۲۰۷، ۲۰۵، ۲۰۳، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰		۲۹۱، ۲۸۸	طاہر محمود
۲۳۳، ۲۳۲، ۲۳۰، ۲۲۸، ۲۲۷، ۲۲۶، ۲۲۵، ۲۲۴		۴۸	طفیل احمد منگلوری
۲۵۰، ۲۴۹، ۲۴۸، ۲۴۷، ۲۴۶، ۲۴۵، ۲۳۹، ۲۳۷		۳۱۴	ظفر یاب جیلانی
۳۱۵، ۳۱۴، ۲۶۶، ۲۵۹، ۲۵۸، ۲۵۷، ۲۵۴، ۲۵۲		۲۳۱	ظہور عثمانی (پروفیسر)
۳۸۱، ۳۸۰، ۳۴۷، ۳۳۸، ۳۲۵، ۳۱۹، ۳۱۷، ۳۱۶		۱۰۶	عادل شہر یار
۴۱۵، ۴۱۴، ۴۰۸، ۳۸۲		۲۲۴، ۱۷۷	عادل محمود
۱۴۲، ۱۳۷، ۱۳۱، ۱۱۳، ۱۰۳، ۱۰۲	علی میاں ندوی (مولانا)	۲۵۱	عبدالحمید سوانور
۲۶۵، ۲۵۳، ۲۵۱، ۲۵۰، ۲۴۹، ۲۴۸، ۲۴۷، ۲۴۵		۳۰، ۲۹، ۲۷	عبدالاحد
۴۱۴، ۳۹۶، ۳۹۵، ۳۹۴، ۳۲۰، ۳۱۵، ۲۸۸		۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷	عبدالجلیل فریدی
۳۳۷، ۳۲۸	غازی آباد	۲۹۳	عبدالجلیل (پروفیسر)

۴۲۴			لاہور
۴۰۴، ۴۰۳	کاسنر (روڈولف)	۱۸۲، ۱۸۱	غالب انشٹیٹیوٹ دہلی
۳۳۰	کانپور	۳۱۳، ۹۳، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۵۹	غریب
۵۴، ۵۳، ۵۲، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۳، ۳۹، ۲۹	کانگریس	۱۳۹	غلام احمد قادیانی
۱۲۴، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۱۸، ۱۱۲، ۱۰۰، ۹۹، ۷۲، ۷۰، ۶۹، ۶۷		۷۹، ۷۸	غلام سرور
۲۲۲، ۲۱۴، ۲۱۰، ۲۰۹، ۲۰۲، ۱۹۶، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۲۹، ۱۲۸		۲۳۷	غنی خاں چودھری (مرکزی وزیر)
۲۹۵، ۲۹۰، ۲۸۵، ۲۵۹، ۲۳۸، ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۲۹		۲۸۳	غومالو
۳۷۲، ۳۶۳، ۳۳۶، ۳۳۰، ۳۲۹، ۳۰۸، ۳۰۳، ۲۹۹		۳۶۹	فاریاب
۳۹۶، ۳۸۰، ۳۷۸، ۳۷۶		۳۳۵، ۳۳۴	فتح گڑھ جیل
۴۱۳، ۴۱۱، ۴۱۰، ۴۰۹، ۲۶۶، ۲۵۷، ۲۵۶، ۲۲۱	کراچی	۱۲۱، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۰۵	فخر الدین علی احمد
۳۹۰، ۳۸۹، ۳۸۶، ۳۸۵، ۳۸۲	کرشل ناخست	۷۷	فراق گورکھپوری
۱۰۷	کرن سنگھ	۳۹۱، ۳۴۴، ۳۲۶، ۱۴۶، ۱۳۳	فرانس
۲۷۴، ۲۷۱	کروٹیا	۱۵۷	فرائیڈ
۲۳۶، ۱۲۲، ۱۰۷، ۹۷	کشمیر	۱۴۶، ۱۴۵	فرز فین
۳۵۵، ۳۵۳، ۲۲۳، ۱۹۱، ۲۵	کلکتہ	۱۸۴	فریز کافکا
۳۳۹	کمال حبابوی	۳۸۸، ۳۸۴، ۲۷۳، ۲۶۴	فلسطین
۳۷۳	کملیشوریادو	۲۵۰	فہیم بھائی (محمد فہیم اختر)
۲۲۲	کوکب قدر میرزا	۳۰۷، ۷۳، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶	فیروز آباد
۴۰۸، ۳۹۳، ۱۵۱، ۱۴۹	کوئٹہ	۳۰۳	فیض آباد
۳۰۹، ۲۸۰	کے ایم منشی	۱۰۳	قاری طیب
۳۵۵	کے آرنلٹن (نائب صدر جمہوریہ)	۴۰۹	قائد انقلاب (الطاف حسین)
۲۸۱، ۲۰۹، ۱۹۱، ۱۷۴، ۷۷، ۵۶، ۴۶	گانڈھی (مہاتما)	۲۷۷	قاہرہ
۳۲۰، ۳۰۹، ۳۰۵، ۳۰۳، ۲۸۴، ۲۸۳، ۲۸۲		۱۵۳، ۱۵۲، ۹۰، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۲۸، ۱۱	قرآن مجید
۳۷۸، ۳۶۵، ۳۶۲		۴۰۶، ۳۶۶، ۲۱۹	
۳۹۰، ۳۷۸، ۳۰۹، ۲۹	گجرات	۱۷۹، ۱۷۸، ۱۶۰	قرۃ العین حیدر (یعنی آپا)
۲۶۸	گلبدین حکمت یار	۱۹۹، ۱۹۷	قطب مینار
۴۶	گلزاری لال نندا	۲۲۴، ۱۷۷	قمر عباس
۳۹۲	گلین مارٹن (پروفیسر)	۱۶۹، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۵، ۱۶۴، ۱۶۳	کاپو
۱۸۳، ۱۸۲	گوپی چند نارنگ (پروفیسر)	۲۹۶	کاٹھمنڈو
۲۸	گولوالکر	۳۶۹، ۲۵۸	کارل مارکس

۲۸۴	محبوب علی بیگ	۲۸۵، ۳۰۲، ۲۱۴، ۲۱۰	گوند و لہ پنتھ
۱۱۵	محسن (درہنگوی)	۳۹۱	گیری ڈیوس
۳۳۷	محسنہ قدوائی	۱۲۸	لال بہادر شاستری
۲۳۲	محمد حامد انصاری	۳۰۹، ۳۰۸، ۳۰۶، ۳۰۵، ۳۰۴، ۹۳، ۹۲	لال قلعہ
۲۳۲	محمد حسن (پروفیسر)	۳۷۲	لالو پرساد یادو
۳۷۵	محمد حسین آزاد	۲۶۰، ۲۱۴، ۱۳	لاہور
۴۱۰، ۴۰۹، ۲۶۶	محمد صلاح الدین (مدیر تکبیر کراچی)	۱۲۱	لطیفہ فاطمہ
۳۰۷	محمد عرفان بیدار	۲۹۳	لقمان سلفی (مولانا)
۵۹، ۱۵	محمد علی (جوہر)	۲۲۱، ۲۲۰، ۲۱۵، ۲۱۴، ۱۳۳، ۶۷، ۶۶، ۵۸، ۲۶	لکھنؤ
۲۵۸	محمد مجیب (پروفیسر)	۳۹۶، ۳۹۵، ۳۸۹، ۳۱۴، ۲۴۹، ۲۲۸، ۲۲۳، ۲۲۲	
۳۹۵	محمد ناصر (مدیر مسلم ورڈ لیگ جرنل)	۳۱۹، ۳۱۸، ۲۹۲، ۲۰۶، ۲۰۳، ۱۴۹، ۱۱۹، ۹۴، ۱۲	لندن
۳۲۱	محمد نور اللہ	۴۰۵، ۳۹۳، ۳۹۱	
۲۲۵	محمد یوسف (مولانا)	۲۳۵	لوک دل
۱۲۱، ۱۲۰، ۱۰۶، ۱۰۵	محمد یونس	۲۸۳	لوس فشر
۳۰۳	محمود غزنوی	۲۷۷، ۲۷۶	لوس ورثہ
۲۱۱	محمود غوری	۲۱۰	لوہیا (رام منوہر)
۴۰۷	محمود مدنی	۳۸۴	لیویج (پروفیسر)
۲۵۹، ۶۷	محمود (ڈاکٹر)	۱۸۴	لینن
۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۶، ۱۶۴، ۱۶۰، ۱۵۹	مراد آباد	۳۸۴	مارٹن بوبر
۲۹۸، ۲۲۹، ۲۲۸، ۲۲۷، ۲۲۶، ۱۹۶، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۴		۳۴۶، ۳۴۵، ۳۴۴	مارٹن لوتھر
۳۹۵، ۳۹۰، ۳۸۹، ۳۸۸، ۳۷۱، ۳۳۱، ۳۳۰، ۳۲۵		۱۹۷، ۱۸۸، ۱۵۵، ۱۴۵	مارکسزم
۱۲۸، ۲۸، ۴۶	مرارجی ڈیسائی	۲۶۹	مارگریٹ تھیچر
۸۷	مرشد سلمہ (محمد مرشد کمال)	۳۵۶	مالابار
۲۸، ۲۶، ۲۴، ۲۱	مسجد اقصیٰ	۳۳۷، ۳۰۹	مایاوتی
۱۹۹، ۱۹۷	مسجد قوت الاسلام	۳۷۸، ۲۵۱، ۱۰۲	مجاہد الاسلام قاسمی (مولانا)
۱۸۲	مسعود حسین خاں (پروفیسر)	۳۳۹	مجیب صاحب (استاد شعبہ انگریزی)
۳۹۴، ۲۳۰، ۲۲۶	مسلم پرسنل لایورڈ	۹۴، ۹۳، ۵۵	مجیب (شیخ مجیب الرحمن)
۲۱۳، ۲۰۹، ۲۰۸، ۱۶۰، ۶۹، ۵۳	مسلم لیگ	۱۰۰	مجیب پٹنہ
۲۵۹، ۲۲۷، ۲۲۶، ۱۹۵، ۱۶۸، ۱۶۷	مسلم مجلس مشاورت	۳۰، ۲۹	محبوب عالم

۳۸۸، ۳۶۷، ۳۶۶، ۳۳۱، ۳۳۸، ۳۲۰، ۲۸۸	مومن کانفرنس	۴۱، ۴۶، ۴۴، ۴۳
۲۳۲	مونس رضا	۲۳۳
۱۸۹	موتگیر	۳۷۵، ۲۵۲، ۱۰۰
۵۸	مہا تمبا بدھ	۳۶۴، ۳۶۱
۳۶۷	میانمار	۲۹۷
۱۲۱	میرٹھ	۳۲۷، ۳۲۶، ۳۲۵، ۳۲۴، ۳۰۴، ۲۹۸، ۲۹
۳۱۴		۳۶۷، ۳۳۷، ۳۳۶، ۳۳۴، ۳۳۳، ۳۳۲
۱۸۹	میشل فو کو	۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴
۱۱۲	میکسم گورکی	۲۳۳
۱۷۹	ناگپور	۳۶۵، ۳۵۱، ۳۵۰، ۱۴۲، ۱۱۶
۳۷۴، ۳۴۷	نپولین (بوناپاٹ)	۳۴۴
۲۲۵	نیش کمار	۳۷۸، ۳۷۳
۲۹۲	نجمہ ہبت اللہ	۲۹۰
۳۴۷	نجیب اختر (بھائی جان، ڈاکٹر)	۹۰، ۸۴، ۸۰، ۷۹، ۷۷، ۷۶
۴۱۴، ۴۰۹، ۳۹۵، ۳۱۹، ۲۹۳	نذیر احمد (پروفیسر)	۲۸۷، ۲۱۳، ۱۸۹، ۱۲۵، ۱۲۴
۲۴۱، ۲۴۰، ۲۳۹	نرمہاراؤ	۱۸۱
۱۴۳	نریندر مودی	۱۰۶
۳۳۷	نعیم صدیقی	۳۰۸
۳۹۵، ۳۷۱، ۳۶۷، ۳۲۸، ۳۲۶، ۳۲۵	نکبہ	۲۶۵، ۲۶۰
۲۵۱، ۲۴۹، ۲۲۵، ۱۰۲، ۹۹	نواب صفوی	۴۱۵، ۳۱۳
۳۷۶، ۳۷۲، ۲۵۵، ۲۵۲	نواب واجد علی شاہ	۱۴۴
۱۳۷	نہرو (جواہر لال)	۲۲۳، ۲۲۲
۲۴۱		۹۷، ۹۶، ۹۳، ۶۸، ۶۷، ۵۹، ۴۶
۲۴۵		۱۹۰، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۲۱، ۱۱۰، ۱۰۸، ۱۰۶، ۱۰۵، ۹۸
۲۹۱		۳۰۵، ۳۰۴، ۳۰۳، ۲۸۵
۳۷۵	نیٹھے	۲۴۳
۷۱، ۱۵۵، ۵۰، ۴۹، ۲۱	نیلی	۲۴۰، ۲۳۹، ۲۳۸، ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۵، ۲۳۴
۳۴۲، ۳۳۹، ۲۶۵		۳۹۵، ۳۹۰، ۳۸۹، ۳۷۱، ۲۴۲، ۲۴۱
۷۶، ۷۵، ۵۲، ۵۱، ۱۱	نینی تال	۳۹۲
	مشائق احمد یوسفی	
	مشیر الحسن (پروفیسر)	
	مصطفی کمال	
	مظاہر العلوم	
	مظفر حسین برنی	
	مظفر حسین کچھوچھوی	
	مظفر عالم (پروفیسر)	
	مظفر نگر	
	معین احسن جذبی	
	مغربی بنگال	
	مفتی عتیق الرحمان	
	مقتدی حسن ازہری (مولانا)	
	مقدیشو	
	مکہ مکرمہ	
	ملکیو کیمورہ	
	ملا احمد زاتی	
	ملائم سنگھ	
	ملیانہ	
	منت اللہ رحمانی (مولانا)	
	منظور نعمانی (مولانا)	
	منموہن سنگھ	
	منوج یادو	
	منی شنگراہیر	
	موتہاری	
	مودودی (سید ابوالاعلیٰ، مولانا)	
	مورسکو مسلمان	

اشاریہ

۴۲۷

۳۳۴، ۳۳۳، ۳۲۸، ۳۲۷، ۳۲۶، ۳۲۵	ہاشم پورہ	۴۰۷، ۴۰۰، ۳۹۸، ۳۷۷	نیویارک
۳۹۵، ۳۸۹، ۳۷۱، ۳۶۷، ۳۳۷، ۳۳۶		۱۴۳	واحد بہ بہانی
۳۸۲	ہاشم محمد علی مہدی (ڈاکٹر)	۱۸۱	وارث کرمانی
۱۵۹، ۱۴۰	ہالوکاسٹ	۴۰۷، ۴۰۰	واشنگٹن
۳۹۱، ۳۸۴، ۳۸۳	ہالینڈ	۳۸۹، ۳۲۸	وہوتی نرائن سنہا (سینئر آئی پی ایس)
۳۲۶، ۳۲۵، ۳۲۴، ۳۲۳، ۱۶۴، ۱۱۹، ۱۱۸	ہٹلر	۳۳۹	وحید الدین خان (مولانا)
۴۰۱، ۳۹۹، ۳۹۸		۱۱۲	وڈیہ بھوشن
۳۷۵	ہزاری باغ	۳۳۳، ۲۹۵، ۳۰	وشو ہندو پریشد
۴۰۳	ہنگری	۳۱۳، ۲۰۲، ۱۲	وقار حسین (سید، پروفیسر)
۲۳۹	ہیمندر نارائن	۲۲۵	ولفرڈ کینچول اسمتھ
۲۵۹، ۲۵۸	یاور جنگ (علی)	۳۹۵، ۳۹۴، ۳۸۰، ۱۲۴	وی پی سنگھ
۳۸۶	یروشلم	۲۶۸، ۲۶۷	ویتنام
۲۶۷	یوسف اسلام (Cat Stevens)	۳۲۸، ۳۲۶، ۱۵۹	ویر بہادر سنگھ
۲۵۸	یوسف حسین خان	۶۶	ویر عبد الحمید





## لاہموت

مصنف کے ایام طالب علمی کی روداد ہے جو ۱۹۹۰ء تک پیش آنے والے واقعات و حوادث پر مشتمل ہے۔ اس روداد دلفگار میں مصنف کی اپنی کہانی کے ساتھ ہی آپ کو اس عہد کی مختلف آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ٹوٹی، پچی، بعلولی شخصیات کے اس طلسم خانے کی سیر کرتے ہوئے قاری کی ملاقات ہندوستانی مسلمانوں کی ایک ایسی نسل سے ہوتی ہے جو نفسیاتی طور پر مجروح، روحانی طور پر ناآسودہ اور دانشورانہ اعتبار سے مجبوط الحواس ہے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ مسلمانوں کی تشٹی کرن کے نام پر اس ملک میں ہوا کیا ہے؟ اس وقوعے کا کیا نام دیا جائے؟ اس حادثے کے بیان کے لئے لغت کہاں سے آئے؟ جب حالات کی شدت کے سبب کبار علماء و دانشوروں کی عقلیں گنگ اور حواس منجمد ہوں، جب لوگوں کا اپنا آپ صحیح سالم برقرار رکھنا مشکل ہو گیا ہو تو محاکمے کا کام وہ لوگ کیسے کر سکتے ہیں جو بیک وقت ناظر بھی ہیں اور منظر بھی۔

اس نا تمام، ناقص اور ناقابل بیان روداد کے بعد ملاحظہ کیجئے:

## ولایتی

جو ان شاء اللہ اس خودنوشت کے مکملہ کے طور پر جلد ہی منظر عام پر آئے گا

